[illegible]

„[illegible]“ [illegible]

[illegible] - ٧
[illegible]

[illegible] - ٦
[illegible]

[illegible] - ٥
[illegible]
[illegible]

[illegible] - ٤

[illegible] - ٣
[illegible]

[illegible] - ٢

[illegible] - ١

[illegible]

مروج اغلاط کی اصلاح بھی کی گئی ہے۔ یہ کتاب معلمین اور طلبا کے لئے بالخصوص اور پبلک کے لئے بالعموم مفید ثابت ہوگی۔ حجم ۱۶۰ صفحات۔ قیمت مجلد ایک روپیہ دو آنے۔ غیر مجلد دس آنے۔ پتا: — محمد عبدالحی صدیقی مدیر مکتبہ شرقیہ شہر سیال کوٹ۔

(ب ل)

۱- آخری فیصلہ
۲- دِل کی آواز
یہ دونوں ناول ہیں جن کے مصنف حضرت قیسی رام پوری ہیں۔ دونوں ناولوں کے دیباچے میں مصنف نے لکھا ہے کہ "میرے یہ ناول دراصل رومان کی کریہہ آواز کو دبانے کے لئے اٹھے ہیں۔ ہمارے ہندوستان کے ایک مشہور صوبے کی فواحش پسندی ہمارے ملک کے بعض رسائل میں نامعلوم دوشیزاؤں کی پُر اسرار ڈائریاں ہمارے نوجوانوں کی خلوتوں کو برانگیختہ کرنے والے سستے ناول مدت سے اصرار کئے جارہے ہیں کہ ان کی جگہ لینے کو سہاؤنا اور شریف لٹریچر آئے"۔

حضرتِ قیسی کا یہ مقصد بہت پاکیزہ اور شریفانہ ہے۔ اُن کے ناولوں سے اگر یہ مقصد پورا ہوگیا تو بڑا کام ہوگا۔ قیمت 'دل کی آواز' عہ 'آخری فیصلہ' عمہ۔ پتا:— کتابستان پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۴ بمبئی نمبر ۳

کرنیں ڈاکٹر شفیق الرحمٰن ایم بی۔ بی ایس ہمارے نوجوان اور ہونہار افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ ان کے بعض دِل چسپ افسانے 'ہمایوں' میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ موجودہ مجموعہ ان کے سات افسانوں پر مشتمل ہے۔ یہ سب افسانے دِل کش ہیں لیکن بعض افسانوں کی باہمدگر حد سے زیادہ یکسانی ذرا کھٹکتی ہے۔ ساتوں افسانے نوجوان لڑکوں لڑکیوں کی محبت کے قصوں پر مشتمل ہیں اور اُن میں تازگی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اندازِ بیان بہت شگفتہ ہے اور جگہ جگہ ہلکے مزاح کی خوش آئند چاشنی نے اُن کے افسانوں کو گوارا تر بنا دیا ہے۔ اس مجموعے کا دیباچہ بیگم حجاب امتیاز علی نے لکھا ہے جو بہت دِل چسپ ہے۔ افسانوں کے سمجھنے میں دیباچہ نگار کے یہ فقرے بہت مدد دے سکتے ہیں:—

بیشتر افسانے ایک ایسے نوجوان کی شخصیت کے گرد گھرے ہیں جسے اپنی بلند قامتی، خوبروئی اور مردانہ وجاہت کا احساس ہے۔ جو سیاہ عینک لگاتا اور موقع محل دیکھ کر بانکپن سے مناسب لباس پہنتا ہے اسپورٹس اور فنونِ لطیفہ میں دخل رکھتا ہے۔ چلبلے دل کا مالک ہے اور چاہنے سے زیادہ چاہا جانا پسند کرتا ہے۔

کتاب خوبصورت اور مجلد ہے۔ قیمت عہ۔ پتا:— مکتبۂ اُردو۔ لاہور

پبلسٹی مشاعرہ یہ تقریباً دو سو صفحے کی ایک کتاب ہے جس میں گورکھ پور کے ایک اُردو اور ہندی مشاعرے کی نظمیں مع حالاتِ شعراء درج کی گئی ہیں۔ اس کتاب کو جناب جیب احمد صاحب صدیقی ایم۔اے ایل ایل۔بی (علیگ) سول ڈیفنس مجسٹریٹ گورکھ پور و بانیٔ مشاعرہ نے مرتب کیا۔ پہلے ایک سو بیالیس صفحات اردو نظموں اور نظم نگاروں کے حالات پر مشتمل ہیں جن میں کافی دل چسپی کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ باقی صفحات میں ہندی نظمیں درج ہیں اس مشاعرے میں ملک کے اچھے اچھے نئے اور پرانے شعراء شامل ہوئے۔

قیمت درج نہیں۔ حضرت مؤلف سے طلب فرمائیے۔

لالہ زار یہ محترمہ محمودہ رضویہ کے تخیلی مضامین کا مجموعہ ہے جسے ایس کاردانی صاحب ایم۔ اے نے مرتب کیا ہے قیمت عہ۔ پتا:— اردو کتب خانہ۔ انجمن ترقی اُردو کراچی۔

سوز و ساز — یہ محترمہ محمودہ رضویہ کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ قیمت عہ۔ پتا اُوپر درج ہے۔

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس نمبر ۲ لیمن روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۳۲۔ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔ صرف سرورق ناف ٹون پرنٹنگ ام نگر لاہور

[illegible]

ނިމުނީ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مطبوعات

دیہاتی دُنیا یہ "ہندوستانی زبان" یعنی اُردو میں "نظموں کا ایک مجموعہ ہے جس میں دیہات اور دیہات کے رہنے والوں زمینداروں کاشتکاروں کے سود و بہبود کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے"۔ اس کے مصنف مہتہ امرناتھ موہن بی۔اے۔ایل ایل۔بی منشی فاضل ہیں جو کمشنر صاحب لاہور کے دفتر میں ہیڈ ورنیکلر کلرک ہیں۔

کتاب کے شروع میں سر عبد القادر، شمس العلما تاجور نجیب آبادی اور لالہ تلوک چند محروم کے دیباچے ہیں اور حفیظ جالندھری کی ایک نظم ہے جو خاص اس کتاب کے لئے لکھی گئی ہے:—

چلنا پڑا ہے مہتہ جی کو — ٹیڑھی ٹیڑھی راہوں میں
ڈھونڈا ہے شاعر نے خوشی کو — آنسوؤں میں اور آہوں میں

مصنف کی "گزارش" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محکمۂ دیہات سدھار پنجاب سے اپنی بعض دیہاتی نظموں پر انعام حاصل کر چکے ہیں اور انہوں نے اکثر ایسی نظمیں ایف۔ ایل۔ برین صاحب کی مشہور کتاب "دیہاتی اصلاح" سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ زبان صاف اور سادہ ہے اور بعض ایسے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں جنہیں "پنجاب میں رائج کرنا ضروری خیال کیا گیا ہے"، اسی لئے اخیر میں ایک مختصر سی فرہنگ بھی دی گئی ہے۔

کتاب دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ ایک حصہ کی نظمیں ایک بحر میں ہیں اور دوسرے حصے کی دوسری بحر میں۔ اس سے کتاب میں روانی پیدا ہو گئی ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:—

جو محنتی ہے خلق کا سرتاج ہے وہی — گھر کی وطن کی ملک کی بس لاج ہے وہی
پیشوں میں سب سے اچھا ہے پیشہ کسان کا — اَن داتا ہے کسان ہی سارے جہان کا

"پیارا پیارا گھر" کے عنوان سے لکھتے ہیں:—

یہ لونڈیاں نہیں یہ گھروں کی ہیں رانیاں — دنیائے بے وفا میں وفا کی کہانیاں
بندوں پہ رب کی بھیجی ہوئی مہربانیاں — قدموں کو جن کے چومتی ہیں کامرانیاں
افسوس ان کو سمجھا گیا اس قدر حقیر — جس کا خیال کرتے ہی لگتے ہیں دل پہ تیر

دیہاتی زندگی کا نقشہ جا بجا کھینچا گیا ہے:—

قدرت کے فیضِ عام کے ہیں در کھلے ہوئے — یہ در ہیں صبح و شام برابر کھلے ہوئے
چوہے کہاں ہیں فصل کے یہ حصہ دار ہیں — دو تین چار پانچ نہیں بے شمار ہیں
انسان کی بود و باش کے قابل وہ گھر نہیں — ہر وقت جس میں تازہ ہوا کا گزر نہیں

جیسا کہ محروم صاحب لکھتے ہیں "یہ منظوم نسخہ دیہاتیوں کے لئے نسخۂ اکسیر ہے۔ دیہات میں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہئے"۔ کتاب کی قیمت ۱۲/ ہے۔ مصنف سے طلب کیجئے۔

(ب)

اصلاحِ تلفظ مؤلفہ مولانا ابو الخیر صدیقی۔ کچھ عرصے سے زباندانی کے متعلق متعدد کتابیں اُردو میں شائع ہو رہی ہیں جن سے بعض یقیناً مفید ثابت ہوں گی۔ ان میں سے ایک یہ کتاب جو حال میں شائع ہوئی ہے اور جس میں اُردو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اصغر کی یاد میں

تقریباً اڑھائی سال ہو گئے کہ اصغر ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہوا لیکن آج بھی جب میں نے اُس کے لئے موت یا وفات کا لفظ لکھنا چاہا تو میرا دل اور ساتھ ہی میرا قلم رُکا اور کانپ گیا۔ کس قدر کمزور ہے انسان، کسی کو بھول جاتا ہے اپنے کاموں میں لگ جاتا ہے خوشی اور کامرانی کے نظریے قائم کر لیتا ہے لیکن پھر بھی اک ذرا سا لفظ اُس کے جسم و جان میں زلزلہ برپا کرنے کے لئے کافی ہے!

اصغر کی وفات کے بعد میں نے اُس کے چند ہمجولیوں کو لکھا کہ مجھے اس کے متعلق کچھ لکھ کر بھیجیں، بعض قلم نہ اٹھا سکے، بعضوں نے جی کڑا کر کے میری تسلی کے لئے کچھ لکھ دیا۔ یہ یادداشتیں ابھی پڑی ہیں۔ پچھلے روز پنجاب لٹریری لیگ کے سرگرم سکرٹری نے بہت اصرار کیا کہ میں ان کے سہ ماہی انگریزی رسالے "اوشا" کے لئے اصغر کی کوئی چیز دوں نیز اُس کے متعلق ایک مضمون لکھوں۔ میرے لئے اصغر پر کچھ لکھنا بے حد خوشی اور بے حد رنج و غم کا باعث ہے اور میں ہر وقت ایسا نہیں کر سکتا۔ بس میں نے اُس کے دوستوں کی تحریروں میں سے ایک نکال کر دے دی۔ یہ ڈاکٹر عبداللہ کے صاحبزادے گُل نے اصغر کی وفات کے تقریباً تین مہینے بعد ستمبر ۱۹۴۰ء میں لکھ کر مجھے بھیجی تھی۔ جب میں گُل کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ دن فوراً یاد آ جاتے ہیں جب اصغر اور اس کے ہم عمر دوست 'المنظر' کے چمن میں کھیل کود میں مصروف ہوتے تھے۔ اب صرف چند مضمون اُس فصلِ بہار کی یادگار باقی ہیں اور ہاں دلوں میں کچھ وہ جذبات جو گاہے گاہے مرے ہوئے کو زندہ اور گئے ہوئے کو پھر ہمارے پہلو میں لا بٹھاتے ہیں!

گُل کا مضمون محاکات کا بہترین نمونہ ہے کم از کم مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ دراصل یہ مضمون تھا ہی نہیں۔ اصغر کے ایک دلی دوست اور اصغر کے ماں باپ کی آپس میں ایک بے تکلف گفتگو تھی اصغر کی بابت۔ اسی لئے اس میں اصغر چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے جیسا کہ میں نے کہا ہے گیا ہوا گویا پھر واپس آ جاتا ہے۔ اس سے ہمیں رنج ہو لیکن سچ یہ ہے کہ کچھ خوشی سی بھی ہوتی ہے!

شاید اس مضمون کو میں کبھی پورے طور پر "ہمایوں" میں ترجمہ کر کے شائع کروں لیکن فی الحال اس کی گنجائش نہیں۔

شروع میں گُل اصغر کی اُس آخری جھلک کا ذکر کرتا ہے جو اُس نے لاہور چھاؤنی کے سٹیشن پر دیکھی جب اصغر چلتی ریل گاڑی میں سے منہ باہر نکالے ہوئے اپنی امّی کے ہاتھ کو بوسہ دے رہا تھا، اُس وقت کسے معلوم تھا کہ یہ اُن کا آخری مس ہے ایک دوسرے کے ساتھ! پھر گُل اُس دن کو یاد کرتا ہے جب دس سال ہوئے اصغر اور وہ پہلے پہل ملے اور چند ہی گھنٹوں میں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہو گئے گویا وہ برسوں کے ساتھ کھیلے ہوئے دوست ہیں۔ ہندوستان میں اپنے آخری سال کے دوران میں اصغر کی طبیعت میں کبھی کبھی ذرا سی تبدیلی نظر آئی چنانچہ گُل کہتا ہے کہ کئی بار اُس نے گویا مذاق کے طور پر مجھ سے کہا کہ "گُل میرے خیال میں مَیں جلد اُڑان چھو ہو جاؤں گا"، اُس کا مطلب تھا کہ میری زندگی کے تھوڑے ہی دن باقی ہیں۔ گُل نے اس کے دل سے یہ خیال نکالنا چاہا لیکن گُل کو یقین ہے کہ اصغر کا دل اس آنے والی حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس پر مجھے اپنے بھانجے مسعود کا وہ خط یاد آتا ہے جس میں اُس نے مجھے لکھا ہے کہ جب اصغر کے انگلستان روانہ ہوتے وقت اصغر اور وہ ادین بمبئی تک اُس کے ساتھ گئے تو شاید آخری روز اصغر نے اُس سے کہا کہ "مسعود! لاہور واپس جا کر تم 'المنظر' میں میرے کمرے کو میری طرف سے بوسہ دینا کیوں کہ ممکن ہے میں کبھی پھر اُسے نہ دیکھ سکوں!"

اصغر کے غیر معمولی دلی و دماغی اوصاف کے سلسلے میں اُس کی انتہائی محبت و ہمدردی اور اُس کی حیرت انگیز قابلیت و صلاحیت کا ذکر کر کے اپنے مضمون کے آخر میں گُل ہمیں ۱۹۴۰ء ۲۶ مئی کی یاد دلاتا ہے جب اُس نے اخبار میں یہ عنوان دیکھا "ہندوستانی طالب علم (آکسفورڈ میں) ڈوب گیا" ڈوبنے والے کا نام علی شبیر لکھا تھا لیکن گُل کے جی میں کھٹک تھی کہ اس میں کچھ غلطی ہے۔ وہ فوراً المنظر پہنچا جہاں بہت سی موٹریں کھڑی تھیں، اور جہاں باغ میں مالی کھڑا ہوا زار و قطار رو رہا تھا۔ گُل یہ کہہ کر اپنا مضمون ختم کرتا ہے کہ اُس وقت بے اختیار مجھے انگریزی شاعر شیلے کے وہ اشعار یاد آ گئے جو اصغر کو بہت پسند تھے:—

وہی ایک باقی رہتا ہے اور سب ادل بدل کر چل دیتے ہیں۔ آسمانی نور ہمیشہ فروزاں ہے، زمین کے سائے ڈھلتے پھرتے ہیں۔ زندگی زنگا رنگ شیشوں کے ایک گنبد کی طرح ازل کی سفید روشنی پر ایک دھندلا سا داغ ڈالتی رہتی ہے، یہاں تک کہ موت اُسے اپنے پاؤں تلے کچل کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے!

بشیر احمد

بخشی

بعد کچھ اپنی بھی قصیدہ خوانی ہوگی اور وہی ہوا کہ سلام ختم ہونے کے فوراً بعد حضرت مولانا نے رجز خوانی شروع فرما دی" برادرانِ اسلام! لقرون کے دل تڑپا دینے والے واقعات آپ کے سمع ہمایوں تک پہنچ چکے اور غالباً ان مبارک واقعات نے آپ کے سینوں کے اندر لام کی وہ سچی تڑپ بھی پیدا کر دی جو ابتلا و آزمائش کے وقت ہر طاغوتی قوت کے مقابلے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ بھائیوں یاد رکھو کہ جس طرح صدرِ لام میں مسلمانوں پر چاروں طرف سے نرغہ تھا ٹھیک اسی طرح آج ہم چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔ جہاں ہم اقلیت میں ہیں وہاں کا تو چھنا ہی کیا لیکن افسوس اس کا ہے کہ جہاں ہم اکثریت میں ہیں وہاں بھی ہمارے خود ہیں گندم نما جو فروش لیڈر ہمارے جائز حقوق پامال کر تے ہیں۔ برادرانِ اسلام آپ کو خوب معلوم ہے کہ ہمارے قصبے میں مدتوں تک ایک ہندو نائب بخشی رہا اور ہم نے اپنی روایتی رواداری اور بشال فیاضی کی وجہ سے کوئی احتجاج نہیں کیا لیکن آج جب وہ نائب بخشی مستعفی ہوتا ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس جگہ کوئی ہمارا آدمی جائے غیار کا کیا ذکر خود اپنے مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔ بھائیوں نائب بخشی کے تقرر میں تمہاری مذہبی جرأت اور قومی احساس کا امتحان ہے اگر میں کچھ بھی دینی غیرت باقی ہے تو اربابِ حل و عقد کو اپنے پے درپے مظاہروں سے مجبور کر دو کہ نائب بخشی وہ ہو جو جمیع مسلمین کا واحد امیدوار ہے"

(۴)

خان بہادر صاحب مذہبی اجتماعات کی شرکت سے کچھ گھبراتے سے تھے اس لئے رسماً مدعو ہونے کے باوجود میلاد شریف میں شریک نہیں ہوئے لیکن حال انہیں کسی نہ کسی طرح معلوم ہو ہی گیا کہ ان کے خلاف کیا کیا گل افشانیاں کی گئی تھیں اور دوسرے دن بیدار ہو کر انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا بخشی کو بلا بھیجا۔ بخشی آیا تو اس کی پھولی ہوئی سانس کے درست ہونے کا انتظار کئے بغیر انہوں نے اپنا دکھڑا شروع کر دیا" بھئی بخشی میں تو اس بخت صدارت سے تنگ ہوں۔ قدم قدم پر جھگڑے بات بات میں مشکل! اب بتاؤ نائب بخشی کی جگہ کے لئے اس فساد کی کیا ضرورت تھی؟ اماں ئی ہو جاتا۔ مگر نہیں وہ تو مطلب یہ ہے کہ ہندو مسلمان سوال پیدا کر کے مجھے عاجز کیا جائے۔ اب اگر میں رام کیول کے سالے کو نائب بخشی مقرر کرتا ہوں تو مسلمان بگڑے جاتے ہیں اور اگر مسعود علی کے بھتیجے کو رکھتا ہوں تو ہندو ناراض ہوئے جاتے ہیں۔ میاں میرا تو یہ دل چاہتا ہے کہ دونوں لعنت بھیج کر صدارت سے مستعفی ہو جاؤں"۔ "مستعفی ہوں حضور کے دشمن" بخشی نے گرج دار آواز میں کہا "سرکار خوب جانتے ہیں کہ یہاں ہندو مسلمانوں میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ یہاں تو منشی رام کیول اور مولوی مسعود علی کی ذات کا سوال ہے۔ ایسا ہی ہے تو حضور کسی تیسرے شخص کو نائب بخشی بنا دیں۔ دونوں اپنا منہ لے کر رہ جائیں گے۔ نہ شکوہ ہوگا نہ شکایت"۔

"واللہ! کیا بات کہی ہے بخشی"۔ خان بہادر صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا اور پھر ذرا متفکرانہ انداز سے پوچھا "مگر وہ تیسرا شخص ہو کون؟"

"ہونے کو حضور کا غلام ہی موجود ہے مگر ہے وہ مڈل فیل" بخشی نے مسکرا کر کہا۔

"مڈل فیل ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ ارے بھئی وہ مڈل تک پڑھا تو ہے؟ بس کافی ہے۔ تم آج ہی اپنے داماد کی عرضی بھجوا دینا" خان بہادر صاحب نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا اور تیسرے دن انہوں نے کمیٹی کے ممبروں کو مخاطب فرماتے ہوئے اپنے مخصوص پر وقار لہجے میں کہا "حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ نائب بخشی کی جگہ ایک مہینے سے خالی ہے۔ میری دلی خواہش تھی کہ نائب بخشی کی جگہ پر قصبے کے کسی لائق نوجوان کا تقرر ہو مگر افسوس کہ باہمی مخالفت کی وجہ سے یہ نہ ہو سکا۔ نائب بخشی کی جگہ کے لئے دو شخص امیدوار تھے لیکن ان میں سے کسی ایک کا تقرر دوسرے فریق کی خاطر شکنی کا باعث ہوتا اور یہ خاطر شکنی مجھے کسی صورت سے پسند نہ تھی اس لئے مجبور ہو کر میں نے اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لیا اور مجتبےٰ خان بخشی کے داماد کو نائب بخشی مقرر کر دیا چنانچہ اس نے آج سے اپنا کام شروع بھی کر دیا ہے۔ حضرات! میں جانتا ہوں کہ نیا نائب بخشی ہمارے قصبے کا رہنے والا نہیں ہے پھر بھی وہ اتنے دن سے ہمارے قصبے میں رہتا ہے کہ اسے قصبے کا باشندہ کہا جا سکتا ہے مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس انتخاب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے"

اور حقیقتہً اس انتخاب سے سناتن دھرم سبھا والے ناراض تھے نہ جمعیتہ الشبان والے ——— معلوم نہیں کیوں؟

طالب صفوی

قصبے کی ہوا خواہی کا بار بھی ان کی جانِ ناتواں پر تھا اور ہندؤوں کے حقوق کے تحفظ کا بوجھ بھی۔ منشی صاحب کے نزدیک قصبے کی فلاح و بہبود کا یہ مطلب تھا کہ ہر ہندو محلے میں بالعموم اور ان کے محلے میں بالخصوص صفائی اور روشنی کا اتنا بندوبست رہے کہ راہ گیر کو مہری کی بدبو چار پانچ قدم کے فاصلے سے نہ سنگھائی دے اور لالٹین کی روشنی اتنے ہی فاصلے سے دکھائی دے جائے۔ ہندو حقوق کے تحفظ سے یہ مراد تھی کہ ہو سکے تو صدر، اوّل و دوم نائب صدر، بخشی اور نائب بخشی سب ہندو ہوں ورنہ کم از کم اوّل نائب صدر اور نائب بخشی لازم طور سے ہندو ہوں اس لئے جب ان کے مخبروں نے یہ خبر پہنچائی کہ نائب بخشی کی جگہ کے لئے مولانا مسعود علی صدر جمعیتہ الشبان و دوم نائب صدر میونسپل کمیٹی قطب نگر مجتبےٰ خاں بخشی کی معیت میں خان بہادر صاحب سے کچھ کہنے سننے کے لئے گئے تھے تو وہ بے تاب ہو گئے اور ان کی نظر میں وہ آپت کا سمے آ گیا جب یہ ملچھ ورگ (جماعت) آریا ورت میں کسی آریا کو اوّل نائب صدر بھی نہیں رہنے دے گی۔ انہوں نے شام کے وقت تمام ہندو ممبروں کو بلوا لیا اور جب وہ لوگ آ گئے تو بخشی کو بھی بلا بھیجا۔ کوئی ناتجربہ کار حریف ہوتا تو مجمع مخالف میں جانے سے احتراز کرتا مگر گرگِ باراں دیدہ بخشی آیا اور اس شان سے آیا کہ فریقِ مخالف کو دیر تک شکوہ و شکایت کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر کار منشی رام کیول صاحب نے ایک خندۂ زیر لب کے ساتھ لبِ شکایت اِس طرح وا کیا "بخشی جی سنا جاتا ہے آج آپ بھی دوم نائب صدر کے ساتھ خان بہادر صاحب کے درشن کرنے کو گئے تھے"۔

"صاحب" بخشی جی نے اپنے پوپلے منہ سے پان چباتے ہوئے کہا "میں تو آپ سب صاحبوں کا خادم ہوں۔ مولوی مسعود علی صاحب نے حکم دیا کہ میرے ساتھ چل۔ میں ساتھ ہو لیا"۔

منشی صاحب نے مسکرا کر استفسار کیا "کیا کچھ نائب بخشی کی بات چیت تھی"

"جی ہاں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ مولوی صاحب کا بھتیجا بے کار ہے۔ بس اسی کے لئے کوشش کر رہے ہیں" بخشی نے عجیب روکھے انداز سے جواب دیا۔

منشی رام کیول نے بے تابانہ پوچھا "پھر خان بہادر صاحب نے کیا کہا"۔

بخشی نے اس اضطراب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا "ارے صاحب کہتے کیا۔ یہی کہہ دیا کہ میں ہندو مسلمان کا جھگڑا نہیں جانتا۔ جسے مناسب سمجھوں گا نائب بخشی بنا دوں گا"

بخشی کے اس جواب کا اتنا اچھا اثر پڑا کہ پنڈت رام رتن شاستری بھی مسکرا کر کہنے لگے "ہمارے نگر کے منڈل کے سبھاپتی مہا سُوکشم درشی (عقل مند) اور آبھجاتیہ (شریف) ہیں"۔

(۱۳)

قطب نگر میں آج سے نہیں برسوں سے نائب بخشی ہندو تھا اور مولانا مسعود علی کی "عدیم النظیر و فقید المثال" رواداری نے کبھی پہلے اس مسئلے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا لیکن اب یہ تو غضب تھا کہ اس خانوادۂ قدس کا ایک نوجوان مڈل پاس کرنے کے بعد بھی مستعفی نائب بخشی کی جگہ پر قابض نہ ہو سکے اور اس مسلمان نوجوان کے بجائے منشی رام کیول کے انٹرنس فیل سالے کے لئے کوشش کی جائے! خان بہادر صاحب سے بڑی بڑی امیدیں تھیں مگر جب انہوں نے اِس "خالص اسلامی سوال" کو دین و مذہب کی عینک سے نہیں دیکھا تو پھر مصلحت اس میں دیکھی گئی کہ قصبے کے تمام مسلمانوں کو مولود شریف میں جمع کیا جائے اور وعظ و پند کے ذریعے سے سربر آوردہ مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ خان بہادر صاحب کے ذہن نشین کریں کہ جناب مولانا کے بھتیجے کا عدمِ تقرر اور منشی رام کیول کے سالے کا تقرر حقیقتہً اسلام کی موت ہے۔ مولانا کے شریعت کدے میں میلاد شریف [illegible] حمد و نعت و منقبت

[illegible]

(۱۸)

[illegible]

(۱)

پیش

[illegible]

[illegible]

فلک پیما کا ایک خط

پیارے بشیر۔ حامد علی خاں صاحب سے یا کسی اور ادیب سے مشورہ کر کے ایک مشکل حل کردو۔ وہ مشکل دو چار سطروں میں پیش کرتا ہوں۔

مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم (مترجم کلام پاک، مصنف بنات النعش، مراۃ العروس وغیرہ) کے سر ایک خوبصورت لفظ کا خون ہے۔ مولانا مرحوم سے پہلے بھی

ابن الوقت

غالباً گالی کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا مگر حضرت نذیر احمد صاحب اسے ایک ایسے گھٹیا Character کے ساتھ چسپاں کر گئے کہ اب اس لفظ کی نجات مشکل ہے۔

علامہ اقبال مرحوم نے مجھ سے دو چار دفعہ کہا کہ atheist کو "دہریہ" کہنا صحیح نہیں کیونکہ خدا خود "دہر" ہے۔

حضرت اقبال خالی خولی مولوی نہ تھے۔ Bergson، Herbert Spencer، Kant کی تصانیف پر حاوی تھے وہ بھلا وقت یا زمانہ یا دہر جیسے خوبصورت لفظوں کا غلط استعمال کیسے برداشت کرتے؟

وقت (Time)، وسعت (Space) اور حرکت (Motion) تین خوبصورت طلائی زنجیریں ہیں جن سے انسانی تخیل کو رہائی نہیں۔ یہ تینوں زنجیریں بھی ہیں اور ساتھ ہی راستہ دکھلانے والی مشعلیں بھی ہیں۔ یہ زنجیریں نہ ہوں، یہ مشعلیں نہ ہوں تو زندگی کے صفر کو صفر کہنے والا بھی کوئی نہ ہو۔

زندگی کے لفظ کے ساتھ موت کا لفظ قطعی طور پر منعقد ہے۔ کسے معلوم نہیں کہ تمام کی تمام کائنات میں موت کے لئے ازل سے ابد تک Free pass مہیا ہے۔ روک تھام ہو نہیں سکتی۔ مگر خود

موت

وقت اور مقام کی پابند ہے۔ جو کچھ مرتا ہے (کوئی نظام شمسی ہو یا پسّو ہو) کسی جگہ اور کسی وقت مرتا ہے۔ وقت کی خوبصورتی یہ ہے کہ

موت

کو مجبور کر دیتا ہے کہ روسی اور جرمن کو پہلو بہ پہلو سلا دے۔

اگر ابن الوقت ہونا بُرا ہے تو کیا ابن الفضا یا ابن الحرکت ہونا اچھا ہے؟ کاش اردو لکھنے والے کوشش کریں کہ وقت بدنام نہ ہو۔ مولوی صاحب وقت کو بُرا سا بیٹا دے گئے۔ حکیم آئن شٹائن کا خدا بھلا کرے کہ وہ وقت اور فضا کو ایک اصلیت کے دو پہلو ثابت کرنے میں کامیاب ہوا۔ ساری کی ساری کائنات کا حسین ترین پہلو وقت ہے۔ وقت ہی دراصل

نورٌ علیٰ نور

ہے۔ کاش کوئی پڑھی لکھی خاتون مولوی صاحب کے جواب میں

بنت الوقت

ایسی ہیروئن پیش کرے جس سے وقت کا نام رہ جائے۔

"فلک پیما"

یادِ ایّام

اس طرح سے یاد آتے ہیں مجھے
عشرتوں کے دن، فسانے عیش کے
جس طرح "دھوپ" کے پیچھے ہوں عیاں
کچھ مناظر —— خوش نما و دلپذیر،
یا کوئی مبہم خیال ——
کھٹکھٹاتا ہو دربزمِ شعور،
یا کسی تالاب کی لہروں میں، گدلایا ہوا،
تیرتا پھرتا ہو عکسِ ماہتاب،
یا کئی دِن کا کوئی پیاسا جیسے
دشتِ غربت میں سراب آئیں نظر،
یا تھکا ماندہ مسافر خواب میں
دیکھ لے منزل کا اک دھندلا سا نقش،
اس طرح سے یاد آتے ہیں مجھے
عشرتوں کے دن، فسانے عیش کے

امتیاز اللہ خاں

خدا خیر کرے

چشمِ پرشوق ہے نمناک خدا خیر کرے
فرطِ غم سے ہے جگر چاک خدا خیر کرے
کچھ بھی ملتا نہیں مفہومِ تمنّا کا سراغ
تھک گیا اشہبِ ادراک خدا خیر کرے

منصور قریشی

میرا دل

تیر پر تیر جو کھائے یہ مرا ہی دل ہے
درد کے لطف اٹھائے یہ مرا ہی دل ہے
جُرم کوئی نہ کرے اور خطاوار بنے،
روٹھ جاؤ تو منائے یہ مرا ہی دل ہے
اچھی صورت جو کہیں دیکھ لے مِٹ مِٹ جائے
آ کے اک بار نہ جائے یہ مرا ہی دل ہے
سر گھڑی راحت و آرام کو ترسا جو کرے
چین اک لحظہ نہ پائے یہ مرا ہی دل ہے
رات بھر پہلو میں کھٹکا کرے کانٹے کی طرح
روز بہ روز دکھائے یہ مرا ہی دل ہے
روتے لوگوں کو ہنسائے یہ صفت ہے اِس میں
راہ چلتوں کو رُلائے یہ مرا ہی دل ہے
بے خبر اتنا ہو اپنی بھی خبر ہو نہ اسے
کائنات اِس میں سمائے یہ مرا ہی دل ہے

بُت کدہ اِس کو سمجھ لو تو یہ ہے ایسا ہی
گھر خدا کا جو کہائے یہ مرا ہی دل ہے

سیّد نذیر حسین ناشاد

آہستہ آہستہ حرکت کرتی ہیں اور باپ کی طرف جاتی ہیں۔
باپ کو دیکھ کر آنکھیں پھٹ جاتی ہیں۔ چہرہ پر وحشت
نمایاں ہوتی ہے اور قیصر ایک جھٹکے سے اپنے جسم کو انور
کے سینے سے الگ کر کے پلنگ کی طرف دوڑتی ہے۔ اور
باپ کے سر کے برابر اپنا سر رکھ دیتی ہے)

ابّا جان۔ میری بیٹی ...... کس نے کہا ؟ ...... کس نے کہا ؟
جھوٹ۔ بالکل جھوٹ !

قیصر۔ ابّا ...... ابّا جان !

ابّا جان۔ کون ؟ ...... کون ؟ ...... قیصر ...... ابھی میں
زندہ ہوں۔ میرے ہوتے تجھے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا !

قیصر۔ آپ سو جائیے ابّا !

ابّا جان۔ میری بیٹی ؟ ...... نہیں نہیں ...... ایسا نہیں
ہو سکتا .... وہ مجھے بہت چاہتی ہے ....

قیصر۔ ابّا۔ آپ کو آرام کرنا چاہئے۔ آپ کی طبیعت خراب
ہے ابّا !

ابّا جان۔ میرا خون کھول رہا ہے !

قیصر۔ (ملتجیانہ) ابّا۔ اپنی طبیعت سنبھالئے !

ابّا جان۔ جس کا باپ مر رہا ہو .... وہ بیٹی ... نہیں
...... نہیں ......

قیصر۔ (روتے ہوئے) ابّا ...... آپ کوشش کیجئے۔ میری
خاطر ...... اپنی طبیعت سنبھالئے !

ابّا جان۔ میں اچھا ہوں ...... اچھا ہوں ...... ہم چلیں گے۔
اپنے گھر ...... کل !

قیصر۔ ہاں ابّا۔ اب سو جائیے ...... کل چلیں گے ! ......
سو جائیے !
(قیصر سر پر گیلا تولیہ رکھتی ہے ...... اور چند منٹ
پلنگ پر جھکی رہتی ہے)

قیصر۔ جائیے۔ اب آپ بھی سو جائیے۔

انور۔ اب تم جاؤ گی تو نہیں !

قیصر۔ (نخرے سے) جائیے بھی !

انور۔ وعدہ کرتی ہو ؟

قیصر۔ (ہنس کر) آپ تو جرح کرنے لگتے ہیں۔

انور (ہنس کر) تم ہمیشہ غلط مطلب سمجھتی ہو۔
(دونوں ہنستے رہتے ہیں۔ انور قیصر کے نزدیک آنا چاہتا
ہے)

قیصر۔ شکریہ۔ بس اب جائیے !
(انور کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن قیصر پہلے سے ہی ہونٹوں
پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہے اور
ہاتھ سے جانے کو کہتی ہے۔ انور چلا جاتا ہے۔ قیصر
پُر معنی ہنسی ہنستی ہے اور پھر باپ کے سرہانے جھک کر
باپ کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی سی کرتی ہے۔
پھر ابّا کے برابر اپنا منہ تکیہ میں چھپا لیتی ہے۔ کچھ
دیر بعد سر اٹھاتی ہے اور ......)

قیصر۔ جس کا باپ مر رہا ہو ...... وہ بیٹی ؟ ....
ہاں۔ ہاں ! (بالکل آہستہ سے اعتراف کرتے ہوئے)
کیوں کہ وہ عورت بھی ہے !

سیّد ناصر الدین شمسی

ضروری اطلاع

مضمون نگار حضرات کو اپنے مضامین کی صاف اور صحیح طباعت کے لئے اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ان کا مسودہ نہایت واضح، صاف اور خوش خط لکھا ہو۔ شکستہ مبہم اور غیر واضح الفاظ کو کاتب عموماً غلط پڑھتے اور غلط لکھتے ہیں۔ اس طرح مسودوں اور کاپیوں کی صحت میں نہ صرف غیر ضروری کوفت اٹھانی پڑتی ہے بلکہ طباعت بھی صاف نہیں ہوتی اور غلطیاں بھی کم و بیش رہ جاتی ہیں۔

"ہمایوں"

بھابی جان- اس لڑکی کا تو دماغ پھر گیا ہے!

(بھابی جان اٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ انور حیرت سے دروازہ کی جانب دیکھتا رہ جاتا ہے۔ قیصر باپ کے سرہانے روتی رہتی ہے)

انور (قیصر کے پاس آتے ہوئے) آخر کیا بات ہوئی تھی؟

قیصر- (اور زور سے رونے لگتی ہے) آپ یہاں سے چلے جائیے!

انور- آخر کچھ بات بھی تو بتاؤ۔

قیصر- آپ کی اماں نہیں چاہتیں کہ آپ ایک منٹ بھی میرے پاس ٹھہریں۔

انور- (ایک قہقہہ لگاتا ہے) تم تو دیوانی ہوگئی ہو قیصر!

قیصر- آپ کی اماں جان نہ جانے کیا کیا کچھ ابا سے کہتی رہیں ...... میرے متعلق ......

انور- آخر کیا کچھ کہہ دیا معلوم تو ہو!

قیصر- ابا جان کو آج اس قدر دکھ پہنچا ہے ...... کہ بیان سے باہر ...... آپ جانیئے کسی کی بیٹی کے متعلق اُس کے سامنے ......

انور- سامنے ......!

قیصر- مجھے شرم آتی ہے کہتے!

انور- (قہقہہ لگاتے ہوئے) تم تو بالکل بچّی ہو!

قیصر- آپ کی تو ہنسی ہوتی ہے لیکن میں ناحق بدنام ہو جاؤں گی!

انور- (سنجیدگی سے) تو میرا نام ایسا برا ہے؟

قیصر- میں آپ کے نام کو تو نہیں کہہ رہی!

انور- میں تو کچھ یہ ہی سمجھا!

قیصر- خیر- اب ہم کل صبح چلے جائیں گے۔ پھر آپ کی اماں کو میری پرچھائی بھی نظر نہیں آئے گی۔

انور- لیکن تمہیں تو میں نے بلایا تھا!

قیصر- لیکن میں آپ کے پاس تو نہیں آئی تھی!

انور- لیکن اگر اب بلاؤں تو؟

قیصر- آپ بے کار کی باتیں کرتے ہیں!

انور- خیر- تم اب اس گھر سے نہیں جا سکتیں۔

قیصر- آپ کی زبردستی ہے؟

انور- البتہ اگر تمہیں مجھ سے ایسی ہی نفرت ہو تو ....

قیصر- آپ کیا باتیں کر رہے ہیں؟

انور- میں تمہیں اپنا کرنا چاہتا ہوں .... اپنا ......

(انور پیچھے سے قیصر کی دونوں باہیں پکڑ لیتا ہے)

قیصر- (انداز سے) چھوڑ دیئے بھی۔

انور- میں تمہیں چاہتا ہوں قیصر ...... میں چاہتا ہوں کہ تم ہر دم میرے پاس رہو ...... میرے سینے کے نزدیک تاکہ دل کی حرکت دوگنی ہو جائے۔

قیصر- (چھیڑ سے) بس صرف اسی لئے!

انور- (جھجکتے ہوئے) میں تمہیں جب دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے میرے سونے کا انجکشن لگا دیا ہے۔ جسم میں گرمی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ چہرہ تمتما اٹھتا ہے اور ایک عجیب حرارت محسوس ہونے لگتی ہے۔

(قیصر پر جیسے جادو کر دیا ہو۔ انور کے سینے سے اپنی پیٹھ لگائے سر ٹیڑھا کر کے انور کے شانے پر ٹکائے بے سکت کھڑی ہے)

انور- جب میں ہسپتال میں مریضوں کے آپریشن کرتا ہوں تو اُن کے سرد جسم کو چھو کر مجھے پھریری سی آتی ہے۔ اور میرے جسم میں سے بھی جان نکلنے لگتی ہے .. لیکن قیصر تمہیں چھو کر مجھ میں ایک نئی جان آجاتی ہے۔ رگ رگ میں خون دوڑنے لگتا ہے۔ تمہارا جسم آپریشن ٹیبل کے مریضوں کی طرح سرد نہیں ...... بلکہ تم میں سے اپریشن کے اوزاروں کو Disinfect کرنے والے ڈبے کی طرح گرم گرم بھاپیں اٹھتی ہیں جو دماغ میں چڑھ کر ایک عجیب خود رفتگی پیدا کر دیتی ہیں۔

(قیصر بھی از خود رفتہ انور کی باتوں میں محو ہے اور انور کا دماغ گرم گرم بھاپوں سے معطل کہ اتنی دیر میں ابا جان بری طرح ہاتھ پیر مارتے ہیں۔ اور کچھ بڑبڑاتے ہیں قیصر کی آنکھوں کی پتلیاں جواب تک ایک جگہ جمی ہوئی تھیں

باجان - (غصہ سے پلنگ پر سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) میں...... میں......

قیصر - (جلدی سے باپ کو پکڑتے ہوئے) آپ لیٹے رہیئے ابّا...... (روتے ہوئے) آپ کی طبیعت ابھی بگڑ چکی ہے - آپ کو بالکل آرام کرنا چاہیئے - (چچی سے) آپ کتنی ظالم ہیں - آپ کو اِن کی حالت پر بھی رحم نہیں آتا ؟

بھابی جان - تو بیٹی ہوکر باپ کے مرتے وقت اِس دُشمن میں ہے اور دوسرے کو ظالم کہتی ہے -

قیصر - آپ مجھ پر ناحق نہ جانے کیا طوفان اٹھا رہی ہیں !

بھابی جان - (غصہ سے) تو میں جھوٹ کہہ رہی ہوں ؟

قیصر - میں کیا جانوں ...... ابّا جان آپ تھوڑا سا دودھ پی لیجئے -

بھابی جان - (غصہ سے چیختے ہوئے) تو میری آنکھوں میں خاک ڈالنا چاہتی ہے ؟

ابّاجان - بھابی جان ..... آپ ..... آپ .....

قیصر - (فقرہ پورا کرتے ہوئے) آپ تشریف لے جائیے باپ کے شانے پکڑ پلنگ پر لٹا دیتی ہے)

بھابی جان - تو کون مجھے حکم دینے والی ! (دھم سے کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں) میں آج اس کا فیصلہ کر کے جاؤں گی !

قیصر - (روتے ہوئے) آپ (باپ کی طرف اشارہ کر کے) اِن کا فیصلہ کرنا چاہتی ہیں ؟

بھابی جان - (تلملا کر) میں تیری یہ ساری تیزی نکال دوں گی - کیا مروڑا ہے میری بات کو !

قیصر - نہیں تو اور کیا کرنا چاہتی ہیں ؟

بھابی جان - میں تیری عقل ٹھکانے لگانا چاہتی ہوں -

قیصر - تو آپ نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا ہوتا - آخر ان کے سامنے یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی -

بھابی جان - تاکہ انہیں بھی تو معلوم ہو جائے کہ مرتے باپ کے بستر کے برابر بیٹی اپنی سیج بسانا چاہتی ہے -

ابّاجان چیخ مار کر پلنگ سے اٹھتے ہیں لیکن نڈھال

قیصر

ہو کر گر پڑتے ہیں)

قیصر - (باپ کو سنبھالتے ہوئے چچی سے) پڑ گئی آپ کے کلیجے میں ٹھنڈک -

بھابی جان - چپ بدتمیز !

(انور داخل ہوتا ہے)

انور - میں نے ابھی چچا جان کی آواز سنی تھی - (جلدی سے پلنگ کی طرف لپکتے ہوئے) قیصر تم نے فوراً مجھے کیوں نہ بلایا ...... اِن کی پیشانی پر پسینے آ رہے ہیں - جلدی سے پیر کھول دو ...... بھلا دیکھو یہ حال ہو رہا ہے اور تم نے مجھ سے آ کر کہا تک نہیں -

(قیصر روتی رہتی ہے انور پلٹ کر اپنی ماں کو کھڑا دیکھتا ہے)

انور - اِن کی یہ حالت ہوتی دیکھ کر آپ نے بھی مجھ سے آ کر نہیں کہا ؟..... انہیں ایک دورہ ابھی اِس سے پہلے پڑ چکا ہے -

(ماں بھی کوئی جواب نہیں دیتی)

انور - کیوں - یہ بات کیا ہے ؟ (دونوں کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا ہے - قیصر روتی رہتی ہے اور بھابی جان منہ پھلائے کرسی پر بیٹھی رہتی ہیں دونوں میں سے کوئی جواب نہیں دیتا)

انور - تم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولتا .... آخر اتنی دیر میں کیا ہو گیا ؟

قیصر - آپ جائیے - ہو چکا علاج - ہم کل صبح کی ٹرین سے واپس جا رہے ہیں !

انور - تم دیوانی تو نہیں ہو گئی ہو ؟

قیصر - ہم یہاں علاج کرانے آئے تھے - ان کا خاتمہ کرانے نہیں -

انور - لیکن اِن کا خاتمہ کون کر رہا ہے ؟

قیصر - چچی جان !

(انور تیز تیز نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھتا ہے)

بھابی جان - سنئے! میں انور کا قیصر کے پاس آنا پسند نہیں کرتی .... اور مجھے شبہ ہے ..... کہ ....

ابّا جان - (احتجاجیہ) بھابی جان!

بھابی جان - آپ کے بھائی جان نے سر توڑ کوشش کی کہ یہ رشتہ ہو جائے لیکن نہ اُن کی زندگی میں یہ رشتہ ہوا اور نہ اب کبھی ہوگا۔

ابّا جان - بھائی جان کا اصرار ضرور تھا لیکن میں نے منظور نہیں کیا تھا!

بھابی جان - آپ منظور کر بھی دیتے تو بے کار تھا۔ میں کبھی راضی نہ ہوتی اور میری رضامندی کے بغیر وہ انگلی نہیں ہلا سکتے تھے۔

ابّا جان - (غصہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں) مجھے بھی یہ ہی شبہ تھا!

بھابی جان - مجھ پر تو شبہ ہو گیا لیکن اب اپنی بیٹی پر شبہ نہیں ہوتا!

ابّا جان - کس بات کا؟

بھابی جان - میں قیصر کے تیور ٹھیک نہیں دیکھ رہی۔

ابّا جان - (حیران) یعنی؟

بھابی جان - میں نے آپ کو یہاں علاج کرانے کے واسطے آنے دیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ آپ کی بیٹی میرے لڑکے پر ڈورے ڈالنے شروع کر دے۔

(ابّا جان کے چہرہ پر خون دوڑ جاتا ہے۔ آنکھیں امنڈ آتی ہیں۔ غصہ سے کانپنے لگتے ہیں)

ابّا جان - (چیخ کر) آپ ...... آپ نے کیسے کہا"..... آپ ..... آپ ....

(قیصر ہاتھ میں دودھ کا جگ لئے داخل ہوتی ہے۔ لیکن باپ کو مشتعل دیکھ کر جگ ہاتھ سے چھوڑ دوڑ کر باپ سے لپٹ جاتی ہے)

قیصر - کیا ہوا ابّا؟ ...... ابّا! آپ لیٹ جائیے ..... آپ کو آرام کرنا چاہئے .... انور بھائی نے سخت تاکید کی ہے!

ابّا جان - (بھابی سے مخاطب ہو کر، غصہ سے کانپتے ہوئے) آپ کے پاس چار پیسے ہیں اس لئے آپ ہم غریبوں کو جو چاہیں کہہ لیں۔

قیصر - ابّا۔ آپ لیٹ جائیے۔

ابّا جان - (اسی لہجہ میں) آپ نے میری بیٹی کو سمجھا کیا ہے؟

قیصر - (تیز تیز نگاہوں سے چچی کی طرف دیکھتی ہے) مجھے کچھ کہا ہے نا ابّا؟

ابّا جان - ایسی بات کہی ہے جو دشمن کی بیٹی کو بھی نہیں کہتے!

قیصر - تو کیا ہوا۔ بڑی چچی ہیں کہہ لینے دیجئے ...... آپ آرام کیجئے۔

ابّا جان - میرا خون کھول رہا ہے بیٹی!

قیصر - ایسی کیا بات کہہ دی؟

ابّا جان - میں تو زبان پر بھی نہیں لا سکتا۔ میری رگوں میں خون آگ کی طرح بھڑک رہا ہے۔

بھابی جان - (اطمینان کے ساتھ) یہ تجھے نہیں بتائیں گے لیکن میں بتائے دیتی ہوں۔

ابّا جان - اس سے کہتے شرم نہیں آتی آپ کو!

بھابی جان - جسے کرتے شرم نہ آئی اس سے کہتے کیا شرم

ابّا جان - (جیسے کوئی درد کی ٹیس میں چیختا ہو) بھابی جان!

قیصر - (ملتجیانہ) ابّا آپ آرام کیجئے۔ نہیں تو مرض میں زیادتی ہو جائے گی!

بھابی جان - سن قیصر!

قیصر - (تیار ہو کر) کہئے!

بھابی جان - مجھے شبہ ہے کہ تو باپ کی تیمارداری کی آڑ میں اپنے لئے زمین ہموار کر رہی ہے۔

قیصر - (حیرت سے) چچی جان!

بھابی جان بےچاری کیسی انجان بنتی ہے!

قیصر - آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

بھابی جان - گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ میں کیا کہہ رہی ہوں۔

[illegible]

ی کے مریض تھے اور یونہی یک بیک ایک دن ہارٹ فیلیر
سے دکھ اس طرح منہ بناتی ہے کہ مل بسے کا مفہوم
ادا ہو جاتا ہے)

ر۔ ہاں!

قیصر۔ آپ کو تو بہت رنج ہوا ہوگا!

انور۔ کیوں نہیں۔ باپ جیسی نعمت سر سے اٹھ جائے اور رنج نہ ہو

قیصر۔ (مغموم) اور جب میں سوچتی ہوں ....!

انور۔ کیا؟

قیصر۔ یہی کہ ابّا جان کے بعد جب اس دنیا میں میرا کوئی نہ رہے گا
......تو ...... تو میرا سر چکرانے لگتا ہے۔

انور۔ (مخاطب کرتے ہوئے) قیصر!

قیصر۔ (چونک کر) کیوں کیا ہے؟

انور۔ (جھجکتے ہوئے) میں تم سے کچھ..... کہنا چاہتا تھا.....
کئی دن سے!

قیصر۔ تو اب کہہ دیجئے (لیکن اٹھ کر میز کے پاس چلی جاتی ہے)

انور۔ پہلے یہاں آکر بیٹھو!

قیصر۔ (ایسا لہجہ جو خود ایک دعوت ہے) توبہ! آپ میرا کیا
کیجئے گا؟

انور۔ میں..... میں تمہیں..... تم کو.....

قیصر۔ (ایک سیمیں قہقہہ کے ساتھ) ارے آپ تو ہکلانے لگے
.... وہ بات ایسی کیا ہے؟

انور۔ (چڑ کر) جاؤ۔ نہیں کہتے..... تم مذاق اڑاتی ہو!

قیصر۔ (مناتے ہوئے) نہیں۔ کہہ بھی دیجئے..... اچھا!
اب نہیں ہنسوں گی!

انور۔ تو آؤ۔ یہاں بیٹھو۔ تب کہوں گا۔

قیصر۔ اس میں وہاں آکر بیٹھنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟

انور۔ (جھوٹ موٹ) تم کھڑی کھڑی تھک جاؤ گی!

قیصر۔ میں ایسی نازک تو نہیں کہ گھڑی بھر میں تھک جاؤں۔

انور۔ لیکن اگر بات گھنٹوں کی ہو تو؟

قیصر۔ (نخوت سے گردن ہلاتے ہوئے) جائیے! آپ بھی کیسی
باتیں کرتے ہیں!

انور۔ میں گھسیٹ کر تمہیں یہاں بٹھاؤں گا!

قیصر۔ میں چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لوں گی۔

(انور کھڑا ہوتا ہے اور قیصر کی طرف بڑھتا ہے)

قیصر (دو قدم پیچھے ہٹ کر) شی! ابّا جان جاگ جائیں گے۔

(انور رک جاتا ہے اور اندھیری جانب نیچے پلنگ کی طرف
دیکھتا ہے لیکن کوئی حرکت ہوتی نہ دیکھ کر)

انور۔ (معترفانہ) تم کیسی بلا کی تیز ہو قیصر!

قیصر۔ (شوخی سے) ہوں تو سہی.... لیکن.... آپ جتنی
نہیں!

انور۔ سچ!

قیصر۔ آپ کی قسم!

انور۔ (ہنس کر) میری قسم!

قیصر۔ اچھا وہ بات کیا تھی جو آپ کہہ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے
اور ہکلا رہے تھے (ہلکا سا قہقہہ)

(انور قیصر کی طرف بڑھتا ہے اور قیصر کرسیوں کی آڑ لیتی
ہے)

قیصر۔ اور جس کے لئے بلا کر پاس بٹھا رہے تھے (چڑانے کو
ہنستی ہے)

(انور قیصر کو پکڑنے ایک کرسی کے پیچھے پہنچتا ہے تو قیصر
دوسری کرسی کے پیچھے آجاتی ہے)

قیصر۔ اور پھر جس کے لئے خود پکڑنے آرہے تھے (کھلکھلا کر
ہنستی ہے)

انور۔ لیکن اب تو پکڑ کر ہی چھوڑوں گا!

قیصر۔ پکڑئیے تب جانیں۔

انور۔ اچھا تو پکڑوں؟

قیصر۔ (قہقہہ لگا کر) اور اب تک کیا کر رہے تھے؟

(انور اس بار کرسی کو ایک طرف لڑھکا کر قیصر کو پکڑ ہی
لیتا ہے۔ قیصر ہلکی سی چیخ مارتی ہے کہ اندھیری جانب
پلنگ پر ابّا جان کروٹ لیتے ہیں اور خفیف سی لَے
سنائی دیتی ہے۔ قیصر بوکھلا سی جاتی ہے اور انور
ایک طرف کرسی کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اب ابّا جان

قیصر

ایک مجلسی تمثیل

[ایک نیم روشن کمرہ! کمرے کے وسط میں دیوار کے قریب دو خانے والی ایک میز رکھی ہے۔ میز پر ایک لیمپ جس کا شیڈ ایک جانب جھکا ہوا ہے۔ اندھیری جانب ایک پلنگ نظر آرہا ہے جس پر کوئی کپڑا اوڑھے لیٹا ہوا ہے۔ روشن جانب دو کرسیاں پڑی ہیں۔ میز پر اور اس کے نیچے کے خانے میں دوا کی چھوٹی بڑی متعدد شیشیاں۔ تسلا، اگالدان، گلاس، پیالی وغیرہ، نرسنگ کا جملہ مزدری سامان رکھا ہوا ہے۔

روشن جانب میز سے دور ہٹ کر ایک پلنگ بچھا ہوا ہے جس پر ابھی تک پلنگ پوش پھیلا ہوا ہے۔

رات کے دس بج چکے ہیں۔ قیصر اور انور کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ دونوں کے ذہن اپنے اپنے خیالات کا پیچھا کر رہے ہیں اس لئے خاموشی طاری ہے۔ قیصر چھریرے بدن کی لڑکی ہے۔ کوئی اٹھارہ برس کا سن ہوگا! ...... شکل و صورت بالکل معمولی ہے لیکن چند باتیں بالکل واضح ہیں۔ ناک اور ٹھوڑی خود اعتمادی کا پتا دیتی ہیں۔ ساتھ ہی رخسار کا آنکھوں کی جانب اوپر کو کبھی کبھی کھنچ جانا بتاتا ہے کہ زندگی میں کچھ تلخیاں بھی سہی ہیں۔ پیشانی سے ذکاوت ٹپکتی ہے۔ اعضا کی معمولی سی حرکت بھی بہت کچھ بتانا چاہتی ہے اس لئے وہ حسن پیدا ہو جاتا ہے جسے انداز کی شوخی کہتے ہیں۔ آنکھوں میں ایک خاص مقناطیسی چمک ہے جس کی برابری آئینہ کی قلعی بھی نہیں کرتی۔ اور اب وہ جسے چاہیں شیشہ میں اتار لیتی ہیں۔ انور ایک خوبصورت جوان ہے۔ آنکھیں ڈاکٹری کی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے پڑھتے پھیکی پڑ چکی ہیں۔ دُہرا جسم ہے اور سینہ چکلا۔ چہرے پر خاصا اچھا گوشت چڑھا ہوا ہے شاید اس وجہ سے کہ اپنی غذا میں پروٹین، ہائیڈرو کلورائیڈ وغیرہ کا ٹھیک امتزاج قائم رکھتا ہے۔ حرکات میں ذرا سا بھونڈا پن ہے اور بات کرنے میں ذرا سی جھجک!]

قیصر۔ (خاموشی توڑتے ہوئے) جائیے۔ آپ تو جا کر سو جائیے (میز پر رکھی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) رات زیادہ ہو گئی ہے۔

انور۔ اور تم؟

قیصر۔ میں بھی سو ہی جاؤں گی!

انور۔ لیکن کب؟

قیصر۔ آپ تو جرح کرنے لگے!

انور۔ تم ہمیشہ غلط سمجھتی ہو!

قیصر۔ (ایک عارفانہ انداز میں زیر لب مسکراتی ہے اور انور کی نظروں سے چھپانے کے لئے پلنگ کی طرف گردن کر کے) اب تشویش کی تو کوئی ایسی بات نہیں؟

انور۔ نہیں۔ رات آرام سے گزر جائے گی۔ میں نے خواب آور دوا دے دی ہے۔

قیصر۔ نقصان تو نہیں کرے گی؟

انور۔ میں تمہارے (لفظ "تمہارے" کو سارے فقرے کا مرکز بناتے ہوئے) والد کو ایسی دوا دے سکتا ہوں؟ .... قیصر تمہیں یہ شبہ ہو سکتا ہے؟

قیصر۔ ("تمہارے" سے سرشار) نہیں! .... (مضطرب لہجہ میں) لیکن مجھے ڈر سا لگتا ہے۔

انور۔ آخر کیوں؟

قیصر۔ آپ جانتے ہیں ابا جان کا دل بہت کمزور ہے!

انور۔ (خاطر جمع کے لئے) یہ تو کچھ تسکین ہی دے گی۔ (قیصر کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر) معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہماری خاندانی کمزوری ہے۔

(ایک پر معنی ہلکا سا قہقہہ لگاتا ہے جس کا مفہوم قیصر فوراً تاڑ جاتی ہے اور فطری طور پر شرماتی ہے)

قیصر (تجاہل عارفانہ) جی ہاں۔ چچا جان بھی تو کمزوریٔ قلب

تنہا راتیں

محرمِ خوابِ محبت مری تنہا راتیں
وہ مئے عشق کی جنّت، مری تنہا راتیں
تا بہ ہنگامِ سحر، سلسلۂ راز و نیاز
شانۂ گیسوئے فرقت مری تنہا راتیں
ہائے، وہ عالمِ تنزیلِ پیاماتِ حبیب
معنئ عشق کی صورت مری تنہا راتیں
بوئے محبوب، ہم آغوشِ پیامِ محبوب
خلدِ رنگینی و نکہت مری تنہا راتیں
آہ وہ حسنِ تصوّر وہ جمالِ تنہا
غازۂ عارضِ خلوت مری تنہا راتیں
غمِ دوراں نے جھلک بھی نہیں دیکھی جن کی
وہ امینِ غمِ الفت مری تنہا راتیں
وسعتِ شوق سے ایک ایک نفس لامحدود
سر بسر جنّتِ فرصت مری تنہا راتیں
وہ حجاباتِ لطیف اور وہ انوارِ لطیف
وہ لطافت ہی لطافت مری تنہا راتیں
عشرتِ عشق کے آنچل میں چھپائے ہوئے رُخ
چہرہ افروزِ مسرت مری تنہا راتیں
کبھی خاموشئ انجم سے حکایت پرداز
اور کبھی خود ہی حکایت مری تنہا راتیں
اب وہ شب ہائے پُر اسرار کہاں سے لاؤں
خواب وہ لے دلِ بیدار کہاں سے لاؤں

روش صدیقی

تجلّیات

کیف و سرور و نور ہے رنج و غم و تعب نہیں
میرے جہانِ شوق میں اب تو کہیں بھی شب نہیں

چھایا ہوا ہے روح پر کیف و سرورِ جاوداں
شاہد و نغمہ گر نہیں، جامِ مئے طرب نہیں

حسن تو بے قرار ہے لطف و کرم کے واسطے
عشق ہے بے نیاز اب، اس کو غمِ طلب نہیں

تُو ہے قرارِ قلب و جاں، تُو ہے بہارِ شادماں
تیرے بغیر بے کلی روح کی بے سبب نہیں

دل ہو ہزار خوں ہی خوں، لاکھ ہو شورشِ جنوں
تیرے حضور ہے سکوں، شور نہیں، شغب نہیں

مجھ میں ترا ظہور ہے، پھر بھی تُو مجھ سے دُور ہے
تیرے بغیر کب ہوں میں! تیرے بغیر کب نہیں!!

بادۂ عشق کیا ملا، دولتِ دو جہاں ملی
مستِ الست کو اثرؔ کوئی بھی اب طلب نہیں

اثر صہبائی

دیوتا کی دعوت کا دن تھا۔ اور دیوتا مع اپنی بے حیا سہیلیوں کے، نشے میں چور تھا۔ دوست درختوں میں سے بھاگتے اور شور مچاتے چلے آ رہے تھے۔ ان لڑکیوں کو آرفی اُس سے مدت کا بیر تھا۔ کیوں کہ اس ناکام عاشق کے کان ہمیشہ ان کی مست آوازوں سے بے بہرہ اور آنکھیں ان کے ناچتے ہوئے نیم برہنہ جسموں سے بے اثر رہتی تھیں۔ انہوں نے آ کر پہلے آرفی اُس پر پتھر پھینکے اور ان سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو غصے اور شراب سے مغلوب ہو کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا میں پھینک دیا۔

کوہ اولمپس کی دیویوں نے رحم کھا کر آرفی اُس کی لاش کے ٹکڑے جمع کرائے اور انہیں پہاڑ کے دامن میں دفن کرا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقے کی بُلبُل جس قدر میٹھی آواز سے گاتی ہے دنیا میں اور کسی ملک کی بُلبُل نہیں گاتی کیوں کہ وہ اس محبت کا راگ گاتی ہے جو غیر فانی ہے اور جو سب سے طاقت ور چیز یعنی موت پر بھی فتح پا سکتی ہے۔

عطاءالرحمٰن

اِنتظار

بہار گزر بھی گئی
اور ہم اُس کا اِنتظار کرتے رہے
لیکن وہ نہ آئی۔
چاندنی رات میں ہم پھر اُس باغ میں گئے
جہاں وہ ہمارے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔
ہم نے اُن پھولوں کو چُن لیا
جنہیں وہ بکھیر گئی تھی۔
اور ایک مالا بنا کر
بید مجنوں کی شاخ پر لٹکا دیا۔
تاکہ جب وہ آئے تو اُسے پہنا دیں۔
لیکن رات بہت گزر گئی
اور ہم اُس کا انتظار کرتے رہے
اور وہ نہ آئی۔
چاند درختوں کے پیچھے سے مسکرا رہا تھا
لیکن ہماری آنکھوں میں آنسو تھے۔
اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اُٹھا کر
ہم نے ستاروں سے پوچھا
کیا وہ ہم سے روٹھ گئی ہے؟
کیا اُسے ہماری دنیا سے نفرت ہو گئی ہے؟

"گردشِ فلک"

آرفی اس

تا میں لے جائیے۔
پلوٹو اور پراسر پائن ایک دوسرے سے آنکھیں نہیں ملا سکتے تھے۔ تاہم ان کا جواب متفقہ تھا۔ یوریڈسی اسے واپس مل جائے لیکن اس شرط پر کہ جب تک وہ روئے زمین کی روشنی میں نہ پہنچ جائیں آرفی اس پیچھے مڑ کر اس چہرے پر نظر نہ ڈالے جسے دیکھنے کے لئے اس کا دل اتنا مشتاق تھا۔ آرفی اس نے نہایت شوق سے یہ شرط منظور کر لی اور اس کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی جب اس نے یوریڈسی کو بلائے جانے کا حکم سنا۔ وہ واپس مڑا اور ان چھوٹے چھوٹے نازک پاؤں کی مترنم چاپ اپنے پیچھے سنتے ہوئے دنیا کی طرف روانہ ہوا۔ اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا تھا۔ کیا واقعی وہ اس کے پیچھے آرہی تھی ——؟ وہی —؟ یوریڈسی —؟ تو گویا ان دونوں کے خوشی کے دن ختم نہیں ہو گئے تھے —— اور اس کی محبت اپنی محبوبہ کو اندھیرے کی دنیا سے بھی نکال لائی تھی —؟ اب وہ اس سے وہ تمام باتیں کہے گا جن کے کہنے کا اس سے پہلے موقع نہ ملا تھا۔ ان کے ملاپ میں جو خامیاں پہلے رہ گئیں تھیں انہیں دور کر دے گا۔ کیا وہ اتنی نزدیک تھی کہ اگر وہ اپنا ہاتھ بڑھائے تو اُسے چھو سکتا تھا —؟

اب اس کے دل میں ایک خوف پیدا ہوا۔ پہلے کم تھا لیکن رفتہ رفتہ زیادہ ہوتا گیا۔ کیا پلوٹو نے اس کو دھوکا تو نہیں دیا تھا —؟ ایسا تو نہیں کہ یوریڈسی کی بجائے کوئی اور ہستی اس کے پیچھے چلی آرہی ہو —— ہنسی اڑانے کے لئے۔ مذاق کرنے کے لئے ——؟ جوں جوں وہ روئے زمین کی طرف چلتا گیا یہ شک بڑھتا گیا۔ بعض اوقات خیال ہونے لگا کہ پاؤں کی چاپ سنائی دینا بند ہو گئی ہے اور جب وہ روشنی میں پہنچے گا تو پیچھے کوئی نہ ہوگا —— وہ پھر اکیلا رہ جائے گا —— تمام محنت بیکار جائے گی —— آخر شبہ اتنا مضبوط ہو گیا کہ یہی اصلیت معلوم ہونے لگی ——

اندھیرا دور ہو رہا تھا لیکن ابھی شام کا سا دھندلکا باقی تھا جب زمین پر لمبے لمبے سائے ہوتے ہیں کہ آرفی اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا ——

اس نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا، اس کی بیوی چلی آرہی تھی۔ لیکن صرف ایک لمحے کے لئے نظر آیا کہ وہ اسے آغوش میں لینے کے لئے باہیں پھیلا رہی ہے —— کسی نے یک لخت اسے پشت کی طرف اندھیرے میں کھینچ لیا۔ دور سے آواز آئی الوداع! —— الوداع ——! اور خاموشی چھا گئی۔

آرفی اس نے دیوانہ وار اس کے پیچھے جانے کی کوشش کی۔ لیکن جن مرحلوں پر سے اول مرتبہ وہ جوش میں گزر گیا تھا۔ ان میں سب سے پہلا ہی اب راستے میں حائل تھا۔ یعنی طوفانی سیاہ رنگ کے پانی والا بدبودار دلدل نما دریا ایکران جس کے کنارے پر کشتی کے پاس اس کا بڈھا ملاح شیران حسبِ معمول کھڑا تھا۔ اس سے جب آرفی اس نے پار لے جانے کو کہا تو شیران نے یہ کہہ کر دھتکار دیا کہ "جاؤ۔ جاؤ ——! اپنا رستہ پکڑو ——! اس کشتی پر وہی لوگ جا سکتے ہیں جنہیں واپس نہ آنا ہو ——"

سات دن اور سات راتیں آرفی اس اس دریا کے کنارے پڑا رہا کہ شاید شیران کو رحم آجائے، لیکن بے سود۔ آخر کار وہ اپنا ستار لے کر تھریس کے جنگلوں میں واپس آگیا اور پہلے کی طرح اس ستار کی درد بھری صدا درختوں میں گونجنے لگی۔

ایک دن وہ ایک دریا کے کنارے بیٹھا جنگل کی خاموشی میں ستار بجا رہا تھا کہ دور سے شور و غل سنائی دیا جس نے ستار کے نغمے کو اس طرح قتل کر دیا جس طرح چیل کی آواز بلبل کے گیت کو بیکار کر دیتی ہے۔ یہ بیکس یعنی شراب کے

Acheron. Charan. Bacchus. Baccantes.

دیوتا اور انسان سب پر ان درد بھرے نغموں کا اثر ہوتا تھا۔ لیکن اظہارِ غم سے آرفی اُس کے دل کو تسکین نہیں ہوتی تھی۔ آخر کار جب یہ غم ناقابلِ برداشت ہوگیا تو وہ خراب و خستہ ٹھوکریں کھاتا کوہِ اولمپس پر پہنچا اور زیوس دیوتا سے اپنی بیوی کو دوسری دنیا میں جاکر تلاش کرنے کی اجازت مانگی۔ زیوس نے اس کے حال پر رحم کھاکر اجازت تو دے دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ راستہ بہت خطرناک ہے۔ بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔

لیکن آرفی اُس کی محبت خوف سے ناآشنا تھی۔ وہ روانہ ہوگیا اور بڑی تلاش کے بعد جہنم کے دروازے پر پہنچ گیا۔ جہاں اس کا تین سروں والا محافظ کتا سربرس خوف ناک آواز سے بھونکتا ہوا ایک وحشی درندے کی طرح آرفی اُس پر جھپٹا۔ لیکن آرفی اُس نے اپنے ستار کے تاروں کو چھوا۔ کتا حیران سا ہوکر خاموش ہوگیا۔ آرفی اُس ستار بجاتا رہا اور کتا اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وہ جھلک پیدا ہوگئی جو ہماری دنیا کے کتوں کی آنکھوں میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اپنے مالک کو دیکھتے ہیں۔ آرفی اُس اسی طرح ستار بجاتے بجاتے دروازے میں داخل ہوگیا۔

جہنم کی تاریک گہرائیوں میں ستار کی آواز ایک نئی چیز تھی۔ اور پھر آرفی اُس کے ہاتھ کے بجائے ہوئے ستار کی! جس کے نغموں میں کامل محبت، نہ ختم ہونے والی آرزو، اور موت تک سے نہ مٹنے والا درد بھرا ہوا تھا۔ راستے میں دائمی سزا یافتہ ہستیاں ملیں۔ یعنی ایک شخص جو پیاس سے مجبور، کانٹے دار زبان اور سوکھے ہوئے ہونٹوں سے ہر وقت ندی میں سے پانی پینے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ لیکن ہونٹوں کے قریب آتے ہی ندی پرے ہٹ جاتی تھی۔ دوسرا جس کا کام ایک بڑے پتھر کو جو بیسوں گھنٹے لڑھکاتے رہنا تھا۔ تیسرا جس کے زخمی سینے میں سے ایک گدھ ہر وقت بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاتا تھا۔ چوتھے چند لڑکیاں جو ہر وقت ایک چھلنی میں سے پانی نکالتے رہنے کی سزا بھگت رہی تھیں۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے کام چھوڑ کر ستار کی آواز سننے لگے اور سزا دینے والی بلائیں اپنی عمر میں پہلی دفعہ اتنی متاثر ہوئیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اسی طرح ستار بجاتے ہوئے آخر کار آرفی اُس جہنم کے گورنر پلوٹو اور اس کی ملکہ پراسرپائن کے تخت کے سامنے جا پہنچا۔ وہ دونوں سر سے پاؤں تک سیاہ لباس پہنے نہایت خوف ناک رعب و داب کے ساتھ تخت پر جلوہ افروز تھے اور قسمت کے احکام تقسیم کرنے والی تین کنیزیں ان کے قدموں میں تخت کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں۔ ستار بج رہا تھا اور اس میں سے دنیا بھر کی تمنائیں، زمانے بھر کا غم، زمانۂ گذشتہ کی ناکامیاں اور زمانۂ آئندہ کی امیدیں نغموں کی شکل میں نکل نکل کر جہنم کی اندھیری فضا میں پھیلتی جارہی تھیں۔

ملکہ پراسرپائن کے دل میں ان دنوں کی یاد آنے لگی جب وہ ایک بے فکر لڑکی تھی اور جزیرۂ سسلی میں سمندر کے کنارے کھیلا کرتی تھی۔ اس کی ناک میں موسم بہار کے تازہ پھولوں کی خوشبو کا احساس ہونے لگا اور وہ غم تازہ ہوگیا جو اب ایک مدت سے تقریباً بھول چکا تھا۔ یعنی اندھیرے کے بادشاہ اور جہنم کے گورنر پلوٹو کا اس کو اپنے پیارے عزیزوں اور خوش گوار زندگی میں سے یک لخت زبردستی اٹھالانا۔ وہ اپنے درشت رُو خاوند کے پہلو میں خاموش بیٹھی تھی لیکن آنکھوں کو ارد گرد کی چیزیں دھندلی دکھائی دینے لگی تھیں۔

آخر ایک کانپتی ہوئی آہ کے ساتھ ستار کی آواز رُک گئی اور آرفی اُس نے اپنی استدعا پیش کی۔ یعنی اس کی بیوی یوریڈیسی اس کی آرزوؤں کا حاصل، اس کی خوشی، اس کی زندگی، اس کو واپس دی جائے تاکہ وہ اسے اپنے ساتھ دوبارہ آسمانی دنیا

Olympus دیوتاؤں کے رہنے کا مقام - Zeus دیوتاؤں کا باپ - Cerberus. Furies سزا دینے والی بلائیں
Pluto. Proserpine. Sicily. Fates قسمت کے احکام تقسیم کرنے والیاں۔

آرفی اُس

[illegible]

[illegible] مغرور جنگلی درندے چپ ہو جاتے۔ کوئی [illegible] موسیقی [illegible]
[illegible] تو تمام دنیا سو جاتی۔ صبح کا راگ بجاتا تو پھول ایک دم کھل جاتے۔ خواب آلود گلاب کی [illegible] اپنی آنکھیں [illegible]
[illegible] اور تمام فضا اس کے نکالے ہوئے سُروں سے بھری ہوئی معلوم ہوتی۔ اگر وہ جنگلی ترانہ بجاتا تو جنگل کے سوئے ہوئے
[illegible] اچھل کر کھڑے ہو جاتے اور غصے کے دانت دکھانے لگتے۔ تھریس کے نوجوان اپنے بزرگوں کی طرف جنگ کرنے کی اجازت
[illegible] دوڑتے اور پرانے جنگجو ہاتھ کے انگوٹھے سے اپنی تلواروں کی دھاریں آزمانا شروع کر دیتے۔ جب اس کا ستار بجنے لگتا تو
گویا پتھروں اور چٹانوں میں بھی حرکت پیدا ہو جاتی یا تمام کائنات ایک مجسم دل بن جاتی جو موسیقی کی لے کے ساتھ دھڑکنے
لگتا تھا۔

آرفی اُس جوان ہوا تو جہاں اُس کی موسیقی کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل چکی تھی۔ وہاں اُس نے حسین یوریڈیسی کے
دل پر بھی فتح پا کر اسے اپنا کر لیا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھر کی خوشیاں ان میاں بیوی کے حصے میں آئیں گی۔ لیکن گو ہائمن یعنی
شادی کے دیوتا نے خود آ کر اپنے ہاتھ سے ان کا رشتہ جوڑا۔ اس روز آسمانی علامات ان کے موافق نہ تھیں اور ہائمن کی مشعل میں سے
سنہری روشنی کے ساتھ ساتھ سیاہ دھواں بھی نکل رہا تھا۔

چند دن میں نتیجہ برآمد ہو گیا۔ کیوں کہ ایک روز جب دلہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ جنگل میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ ایک
جاہل گڈریا جسے معلوم نہ تھا وہ کون ہے، اسے اکیلے پا کر اس کے پیچھے بھاگا۔ وہ خوف کے مارے آگے آگے بھاگی جا رہی تھی اور
یہ نہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کے قدموں کے سامنے کیا ہے۔ اتفاقاً اس کا خوبصورت پیر ایک سانپ کے اوپر پڑا۔ سانپ نے اُسے
کاٹ لیا۔ تھوڑی دیر میں اس کی روح سایوں کی سرزمین کی طرف پرواز کر گئی۔ اور آرفی اس کو دل شکستہ چھوڑ گئی۔

وہ غمگین ہوائیں جو رات کو سمندر پر چلتی ہیں، وہ سسکیاں لے لے کر چلنے والی آندھیاں جو ٹوٹے ہوئے جہازوں اور موت
کی خبر دیتی ہیں، وہ پرندے جو اندھیرے میں اپنے گم شدہ جوڑوں کو آوازیں دیتے ہیں اور وہ غم انگیز آہیں جو سیاہی مائل نیلے
شمشاد کے درختوں میں سے اٹھتی ہیں، سب خاموش ہو گئیں۔ کیوں کہ ان سب سے زیادہ دلگیر کرنے والی، ان سب سے زیادہ حسرت
بھری، سایۂ موت کی وادی میں ایک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا تھی جو آرفی اُس کے ستار میں سے نکل رہی تھی۔

ORPHEUS. - آرفی اُس - THRACE. تھریس CALLIOPE. کیلی اوپی
EURYDICE. - یوریڈیسی - HYMEN ہائمن

[illegible]

ޤައުމީ [illegible] ކުރީމެ ސަލާމް
ޤައުމީ [illegible] ސަލާމް

[illegible]

ޤައުމީ [illegible]
ޤައުމީ [illegible] ސަލާމް

[illegible]

[illegible]

آرفی اُس

آرفی اُس دیوتاؤں کے عیش و عشرت کی سرزمین تھریس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اپالو تھا۔ یعنی سورج دیوتا، جو موسیقی اور راگ کا بھی دیوتا ہے۔ اور ماں دیوتاؤں کی ایک حسین خادمہ کیلی اوپی۔ اپالو نے اپنے ننھے بچے کو ایک ستار دیا اور خود بجانا سکھایا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ملک تھریس کے جنگلوں کی رہنے والی ہستیاں درختوں کے سبز پتوں اور لمبی گھاس میں سے نکل کر اور غاروں اور چٹانوں کے پیچھے سے برآمد ہو کر اس بچے کی نازک انگلیوں سے نکلے ہوئے نغمے سننے لگیں۔ جب وہ ستار بجاتا۔ فاختہ کی اپنے رفیق کو بلانے کی آواز، کوئل کی کوکو، بلبل کا چہچہانا، سب آوازیں یک لخت بند ہو جاتیں۔ ہوائیں جو درختوں کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول ہوتیں تھم جاتیں اور مغرور سے مغرور جنگلی درندے چُپ ہو جاتے۔ کوئی انسان یا جانور اس کی موسیقی کے اثر سے بچ نہ سکتا تھا۔ وہ شام کا راگ بجاتا تو تمام دنیا سو جاتی۔ صبح کا راگ بجاتا تو پھول ایک دم کھل جاتے۔ خواب آلود گلاب کی کلیاں اپنی مخملیں پتیاں کھول کر جھانکنے لگتیں اور تمام فضا اس کے نکالے ہوئے سُروں سے بھری ہوئی معلوم ہوتی۔ اگر وہ جنگی ترانہ بجاتا تو جنگل کے سوئے ہوئے ظالم اچھل کر کھڑے ہو جاتے اور غصے کے دانت دکھانے لگتے۔ تھریس کے نوجوان اپنے بزرگوں کی طرف جنگ کرنے کی اجازت لینے دوڑتے اور پرانے جنگجو ہاتھ کے انگوٹھے سے اپنی تلواروں کی دھاریں آزمانا شروع کر دیتے۔ جب اُس کا ستار بجنے لگتا تو گویا پتھروں اور چٹانوں میں بھی حرکت پیدا ہو جاتی یا تمام کائنات ایک مجسم دل بن جاتی جو موسیقی کی لَے کے ساتھ دھڑکنے لگتا تھا۔

آرفی اُس جوان ہوا تو جہاں اُس کی موسیقی کی شہرت چار دانگِ عالم میں پھیل چکی تھی۔ وہاں اُس نے حسین یوریڈیسی کے دل پر بھی فتح پا کر اسے اپنا کر لیا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھر کی خوشیاں ان میاں بیوی کے حصے میں آئیں گی۔ لیکن گو ہائمن یعنی شادی کے دیوتا نے خود آ کر اپنے ہاتھ سے ان کا رشتہ جوڑا، اُس روز آسمانی علامات ان کے موافق نہ تھیں اور ہائمن کی مشعل میں سے سنہری روشنی کے ساتھ ساتھ سیاہ دھواں بھی نکل رہا تھا۔

چند دن میں نتیجہ برآمد ہو گیا۔ کیوں کہ ایک روز جب دلہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ جنگل میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ ایک جاہل گڈریا جسے معلوم نہ تھا وہ کون ہے، اسے اکیلے پا کر اس کے پیچھے بھاگا۔ وہ خوف کے مارے آگے آگے بھاگی جا رہی تھی اور یہ نہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کے قدموں کے سامنے کیا ہے۔ اتفاقاً اس کا خوبصورت پیر ایک سانپ کے اوپر پڑا۔ سانپ نے اُسے کاٹ لیا۔ تھوڑی دیر میں اس کی روح سایوں کی سرزمین کی طرف پرواز کر گئی۔ اور آرفی اس کو دل شکستہ چھوڑ گئی۔

وہ غمگین ہوائیں جو رات کو سمندر پر چلتی ہیں، وہ سسکیاں لے لے کر چلنے والی آندھیاں جو ٹوٹے ہوئے جہازوں اور موت کی خبر دیتی ہیں، وہ پرندے جو اندھیرے میں اپنے گم شدہ جوڑوں کو آوازیں دیتے ہیں اور وہ غم انگیز آہیں جو سیاہی مائل نیلے شمشاد کے درختوں میں سے اٹھتی ہیں، سب خاموش ہو گئیں۔ کیوں کہ ان سب سے زیادہ دلگیر کرنے والی، ان سب سے زیادہ حسرت بھری، سایۂ موت کی وادی میں ایک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا تھی جو آرفی اُس کے ستار میں سے نکل رہی تھی۔

ORPHEUS. - آرفی اُس THRACE. تھریس CALLIOPE. کیلی اوپی
EURYDICE. - یوریڈیسی HYMEN ہائمن

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کہتا ہے :-

رابطۂ سالمات، ضابطۂ امہات ۔۔۔ سوزم و سازے دہم آتشِ میناگرم

یہ ابلیس دینیات کا ابلیس ہے۔ یہ شیطان ہے۔ اس کے مشیر بھی شیطنت سے پر ہیں۔ یہ انسان کے دشمن ہیں، یہ واقعی درپئے آزار ہیں۔ کوئی نشتر ہے کوئی نیش زن۔ پہلا مشیر کہتا ہے :-

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج ۔۔۔ صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی ۔۔۔ ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علمِ کلام

ذرا انہیں اشتراکیت سے ڈر ہے۔ کارل مارکس کے لائحہ عمل سے پریشان ہیں۔ تیسرا مشیر حیران ہے۔ کہتا ہے :-

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب ۔۔۔ ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب

وہ کلیم بے تجلی! وہ مسیحِ بے صلیب ۔۔۔ نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

مگر چوتھا مشیر اسے تسلی دیتا ہے کہتا ہے :-

توڑ اس کا رومتہ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ ۔۔۔ آلِ سیزر کو دکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب

پانچواں مشیر سردار سے ہدایت طلب کرتا ہے۔ کہتا ہے :-

اے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار ۔۔۔ تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار

تجھ سے بڑھ کر فطرتِ آدم کا وہ محرم نہیں ۔۔۔ سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار

گرچہ ہیں تیرے مرید افرنگ کے ساحر تمام ۔۔۔ اب مجھے ان کی فراست پر نہیں ہے اعتبار

وہ یہودی فتنہ گر وہ روحِ مزدک کا بروز ۔۔۔ ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے

جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

مگر ابلیس مطلقاً ہراساں نہیں۔ وہ انسان کی شورہ پشتیوں سے پوری طرح واقف ہے اس کا نظام بہت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ وہ مغرور یوں اپنے رفقا کو تسلی دیتا ہے :-

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو ۔۔۔ کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسمانِ تو بتو

دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا شرق و غرب ۔۔۔ میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو

کیا امامانِ سیاست کیا کلیسا کے شیوخ ۔۔۔ سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو

کیا ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد ۔۔۔ یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے ۔۔۔ جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

یہ اور ابلیس ہے یہ انسان کو کامل نہیں بنانا چاہتا۔ یہ اسے شوق کی مستی سے آگاہ نہیں کرتا یہ اسے خودی کی تیغ جوہر سے مسلح نہیں کرتا یہ انسان کو مردِ مومن نہیں دیکھنا چاہتا یہ بندہ کو خدائی صفات سے آراستہ نہیں کرتا یہ بندۂ مومن سے خائف ہے۔ وہ ابلیس روشنی کا پرتو تھا، یہ ابلیس ظلمت کا پیکر۔ وہ جستجو کا داعی تھا تو یہ شکست کا حامی، وہ روحِ کائنات تھا اور یہ دشمنِ زندگی۔ اس کا وجود انسان کے لئے مشعلِ ہدایت، اس کی ہستی انسان کے حق میں سمِ قاتل۔ کہتا ہے :-

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں ۔۔۔ ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف ۔۔۔ ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

اب ذرا ستم ظریفی بھی ملاحظہ ہو، دوسری رباعی میں کہتے ہیں:ـــ

جہاں تا از عدم بیرون کشیدند　　ضمیرش سرد و بے ہنگامہ دیدند
بغیر از جانِ ما سوزے کجا بود　　ترا از آتشِ ما آفریدند

اور پھر ذرا چھیڑ:ـــ جدائی شوق را روشن بصر کرد　　جدائی شوق را جوئندہ تر کرد
نمیدانم کہ احوالِ تو چون است　　مرا ایں آب و گل از من خبر کرد

اب جس وقت حضرتِ انسان نے ابلیس پر ثابت کر دیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں۔ تو ابلیس کے سامنے ایک تجویز پیش کی جاتی ہے۔ جیسے ایک دوست دوسرے دوست کے سامنے پیش کرتا ہے:ـــ

بیا تا نرد را شاہانہ بازیم　　جہانِ چار سو را درگدازیم
بافسونِ ہنر از برگِ کاہش　　بہشتے ایں سوئے گردوں بسازیم

خیر یہ تو دوست داری تھی۔ مُروت انسانی صفات میں بڑا رتبہ رکھتی ہے۔ اب ایک اور مشکل آن پڑی۔ ابلیس تو موجود تھا ہی اب اس کی ذریات بھی اس خاکدان میں سرگرم عمل نظر آتی ہے۔ حضرتِ اقبال اصل و نقل میں تمیز کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں سے ابلیس کا دوسرا پہلو نمایاں ہونے لگتا ہے۔ ابلیس اپنی شیطنت سے مجبور ہو کر انسان کو پرکھتا ہے۔ اسے امتحان میں ڈالتا ہے۔ اسے اُبھرنے کی رغبت دیتا ہے اگرچہ جو اُبھرتے نہیں انہیں جہنم کا ایندھن بنانے کے لئے اپنے دام میں جکڑ لیتا ہے۔ یہ تو ہے شیطان کی انسان سے ٹکر۔ مردِ مسلمان سے اس کا مقابلہ، مگر اس کا کیا علاج کہ شیاطینِ خاکی بھی کسی نہ کسی بھیس میں اس دنیا میں موجود ہیں۔ اور اکے دکے راہ گیر کو پھانس لیتے ہیں۔ عام طور پر کم ہمت اور کور ذوق بندوں کو۔ مگر ان کا وجود پھر بھی طبعِ غیور کے لئے ناگوار ہے۔ اس لئے اقبال مرحوم فرماتے ہیں:ـــ

بشر تا از مقامے خود فتاد است　　بقدرِ محکمی او را کشاد است
گنہ ہم می شود بے لذتِ و سرد　　اگر ابلیس تو خاکی نہاد است

پھر کہا ہے:ـــ مشو نخچیرِ ابلیسانِ ایں عصر　　خساں را غمزۂ شاں سازگار است
اصیلاں را ہماں ابلیس خوش تر　　کہ یزداں دیدہ و کامل عیار است

ابلیس کی قدر و قیمت فقط ایک مردِ مسلمان ہی جان سکتا ہے۔ وہ جس کے نعرہ سے کائنات میں زلزلہ پڑ جاتا تھا۔ پیرانہ سالی کے باوجود ابھی تک اپنی وضع داری پر قائم ہے۔ وہ شعلہ مزاج نہیں، اس میں ان خاکی شیطانوں کی سی بدی نہیں۔ وہ شاہیں ہے اسے زاغ سے زغن سے کوئی نسبت نہیں۔ اس کا مرتبہ ذیل کی رباعی سے ظاہر ہوتا ہے: کہتے ہیں:ـــ

حریفِ ضربِ او مردِ تمام است　　کہ آں آتش نسب والا مقام است
نہ ہر خاکی سزاوارِ نخِ اوست　　کہ صید لاغرے بروے حرام است

مگر ابلیس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اقبال کے تصور میں دو ابلیس ہیں۔ ایک جس کی وجہ سے کائنات میں سوز ہے، تڑپ ہے، زندگی ہے جو اصلِ حیات ہے۔ اور ایک وہ جو تاریکی اور جہالت، غلامی اور جمود کی علامت ہے۔

یہ دوسرا ابلیس ہی ہے جو فخریہ یہ کلمات کہہ سکتا ہے:ـــ

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب　　میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا　　میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

یہ اشعار میں "ابلیس کی مجلس شوریٰ" سے لے کر پڑھ رہا ہوں۔ ذرا ان اشعار کا مقابلہ اس ابلیس کی گفتار سے کیجئے جو خدا سے

اے خدا ایک زندہ مردِ حق پرست
لذّتے شاید کہ یابم در شکست

یہاں تک ابلیس وہی ابلیس ہے جو کائنات کا اصولِ حیات ہے۔ وہ حرکت کا عمل کا شوق کا جستجو کا نشان ہے۔ وہ اقبال مرحوم کے نظریۂ حیات کا ماحصل ہے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ابلیس بھی بوڑھا ہوگیا۔ قرآن مجید کی آیت بے شک صحیح ہے: کل من علیہا فان۔ یہی ابلیس جو اپنے انکار پر فخر کرتا تھا اور جس کی جواں ہمتی کا راز ہی خود اعتمادی، خود شناسی اور خودی میں تھا اقبال کی شاعری کے دورِ آخر میں ضعفِ دل کے عارضے میں مبتلا ہوگیا۔ آدم تو اس کی تعلیم سے مردِ مسلمان بن جاتا ہے اور خود ابلیس روز بروز مسلمان سے کافر ہوتا جاتا ہے۔ مسلمان میں تو آہستہ آہستہ تمام ابلیسی صفات موجود ہوتے جا رہے ہیں مثلاً مردِ مسلمان کی تعریف سنیئے:ــ

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:ــ

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!

مگر اسی کتاب یعنی ضربِ کلیم میں ایک نظم بہ عنوان تقدیر میں ابلیس اور یزداں کا مکالمہ ابلیس کے زوال پر کافی روشنی ڈالتا ہے: غور سے سنئے:ــ

ابلیس کہتا ہے:ــ اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ! وہ زندانیٔ نزدیک و دور و دیر و زود

یہاں تک ہم اس میں وہی پرانی خو بو دیکھتے ہیں مگر دیکھئے اس کے ساتھ ہی کیا کہتا ہے:ــ

حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

یزداں پوچھتا ہے:۔ کیا کھلا تجھ پر یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد؟

بوڑھا ابلیس جواب دیتا ہے۔ ذرا اس کی رجعت پسندی ملاحظہ ہو۔ کہتا ہے:۔

بعد! اے تیری تجلّی سے کمالاتِ وجود

یزداں فرشتوں کی طرف، ان جی حضوریوں کی طرف دیکھ کر افسوس کے ساتھ کہتا ہے:ــ

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجّت اسے
کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود'
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دُود

اب ایک اور دلچسپ بات کا ظہور ہوتا ہے وہ آدم جسے ابلیس نے درسِ آزادی دیا تھا جو ابلیس سے وہی نسبت رکھتا تھا جو مرید کو مرشدِ کامل سے ہوتی ہے اپنے عرفان اور اپنی تکمیل کے بعد ابلیسِ پیرانہ سال سے یوں ہمکلام ہوتا ہے جیسے ایک ہمسر دوسرے سے۔ ملاحظہ ہوں ارمغانِ حجاز سے یہ چند رباعیاں:ــ

بگو ابلیس را از من پیامے تپیدن تا کجا در زیرِ دامے
مرا ایں خاکدانے خوش نیاید کہ صبحش نیست جز تمہیدِ شامے

صاحبِ پرواز را افتاد نیست
صید اگر زیرک شود صیاد نیست!

یہاں انسان کے لئے ابلیس پہلی دفعہ صید کا لفظ استعمال کرتا ہے مگر یہ نہ بھولئے کہ اسی صید کو وہ غم گسارِ من بھی کہتا۔ ظاہر ہے اس کی حیثیت ایک عجیب قسم کے شکاری کی سی ہے۔ جو دشمنی کے پردے میں دوستی کرتا ہے۔ وہ ایک رہبر اور مخلص کی حیثیت سے آدم کو سوز و سازِ زندگی کی تعلیم دیتا رہا ہے۔ یہاں اقبال کے ابلیس میں اور F. Thompson کے OUND OF HEAVEN میں بہت کم فرق دکھائی دیتا ہے۔ اسی ابلیس نے آدم کو خودی کا درس دیا ہے وہی اسے جمود سے متنبہ کرتا۔ وہی عشق و فراق کی لگن سے آدم کے سینے میں نہ بجھنے والی آگ سلگاتا ہے۔ اس کی زندگی عبارت ہے کائنات کی پوشیدہ طاقتوں ظہور اور بروئے کار آنے سے۔ آدم کائنات کی ایک قوت ہے۔ اس قوت کے لئے لازمی تھا کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے اور پھر عشق کی بدولت جسے اقبال مرحوم: ؎ عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفٰے
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام کہتے ہیں۔

انسان اپنے ارتقا کے مراحل طے کرے۔ ابلیس کا کام دنیا میں اس وقت ختم ہوتا ہے جب آدم ابلیس کی مدد سے ہو جائے۔ اس وقت تک ابلیس کو آدم کی جستجو رہے گی جب تک آدم کمال تک نہیں پہنچتا۔ اس وقت تک آدم ابلیس کا شکا مگر انسان اپنے عشق اور خودی کے سرمایہ کے باوجود اس درجے تک جہاں اس کی نگاہ تلوار کا حکم رکھتی ہے بہت مشکل سے پہ ہے۔ عام طور پر وہ اپنی پست ہمتی اور بے ذوقی کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ ابلیس کے لطف اور اس کی توجہ کا مستحق ہو۔ وہ صـ ہے۔ ابلیس کے لئے ایسا حریف چاہئے جس میں انکار کرنے کی جرأت ہو جو خودی کے مدارجِ اعلیٰ سے گزر چکا ہو جو خود اپنی تقد یہ مدِ مقابل جو نہ ابلیس کی مدد کا محتاج ہے اور نہ اس سے خوف ہی کھاتا ہے اقبال کا مردِ مومن ہے۔ وہ جس میں ایمان کی حرار نے سب وسوسے جلا کر فنا کر دیئے ہیں اور جو ہمت میں بلند نظری میں بے مثل ہے۔ وہ جس کے متعلق اقبال مرحوم فرماتے

جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

ابلیس کو شکایت ہے تو اس بات کی ہے کہ باوجود اتنی کوشش کے آدم میں مردِ غازی کی سی جگر تابی نہیں پید خدا سے فریاد کرتا ہے: ؎

اے خداوندِ صواب و ناصواب — من شدم از صحبتِ آدم خراب
ہیچ گہ از حکمِ من سر بر نتافت — چشم از خود بست و خود را در نیافت
خاکش از ذوقِ 'ابا' بیگانۂ — از شرارِ کبریا بیگانۂ
صیدِ خود صیاد را گوید بگیر — الاماں از بندۂ فرماں پذیر
فطرتِ او خام و عزمِ او ضعیف — تابِ یک ضربم نیارد ایں حریف
بندۂ صاحب نظر باید مرا — یک حریفِ پختہ تر باید مرا
ابن آدم چیست؟ یک مشتِ خس است — مشتِ خس را یک شرار از من بس است
اندریں عالم اگر جز خس نبود — ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود؟
شیشہ را بگداختن عارے بود — سنگ را بگداختن کارے بود
منکرِ خود از تو می خواہم بدہ — سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ
بندۂ باید کہ پیچد گردنم — لرزہ اندازد نگاہش در تنم

الله

اطاعت و قبولیت کی مثال ہے ابلیس سے پوچھتا ہے: ؎

ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو

ابلیس جواب دیتا ہے: سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

جبرئیل جس کی حیثیت خدا کی سیکرٹریٹ میں فقط چیف سیکرٹری کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ پھر اس سے کہتا ہے۔ ؎

کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو؟

اور ملاحظہ ہو کہ جبرئیل کی ابلیس سے شکایت یہ ہے کہ اس نے جاہ و حشمت کی قدر نہ کی اور اسی کی وجہ سے فرشتوں کی شرافت پر حرف آگیا۔ گویا فرشتوں کا مطمحِ نظر بھی فقط عز و جاہ کی خواہش اور آبرو داری پر مشتمل ہے۔ مگر ابلیس کی بے غرضی اور بلند نظری ملاحظہ فرمائیے۔ کہتا ہے ؎

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پُو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تُو؟
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جُو بہ جُو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھُو اللہ ھُو اللہ ھُو!

خودی کا یہ مبلّغ اعظم انسان کے حق میں مسیحائی کرتا ہے۔ حضرت عیسٰی نے تو بمطابقِ انجیل اپنی جان دے کر عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا۔ ابلیس نے اپنے انکار ہی سے آدم کے دل کو درد سے آشنا کر دیا۔ اور اُسے فراق کا خوگر بنا دیا کیوں کہ بقولِ علامۂ مرحوم ؎

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو! ہجر میں لذّتِ طلب!

یہ سوز یہ فراق یہ شوق محض جستجوئے ناکام نہیں۔ اس میں ایک تعمیری پہلو بھی مُضمَر ہے۔ خدا خود آدم سے کہتا ہے: ؎

زندۂ اِشتاق شو خلّاق شو
ہمچو ما گیرندۂ آفاق شو

پھر کہتا ہے: ؎

ہر کہ را قوتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست

خودی کی منزلوں کو طے کرنے والے آدم میں ایک وثوق پیدا ہو جاتا ہے، اس کی باتوں میں اک وقار جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ اپنی صنعت گری سے واقف ہے ذرا علامۂ مرحوم کا محاورہ مابین خدا و انسان ملاحظہ فرمائیے: خدا کہتا ہے: ؎

جہاں را ز یک آب و گِل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم
تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان کا جواب خود اعتمادی سے مملو ہے۔ کہتا ہے: ؎

پیکرِ انجم نہ تو گردشِ انجم زِ من جاں بجہاں اندرم زندگیٔ مضمرم
تو بہ بدن جاں دہی شور بجاں من دہم تو بہ سکوں رہ زنی من بہ تپش رہبرم
آدمِ خاکی نہاد دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوشِ تو پیر شود در بَرم

اس کا ایمان ہے:ـ زندگی سوز و ساز بہ سکونِ دوام فاختہ شاہیں شود از تپشِ زیرِ دام
وہ آدم سے کہتا ہے:ـ تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل چیست حیاتِ دوام سوختنِ ناتمام

وہ زندگی کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کو متنوع اور رنگین بناتا ہے۔ ابلیس کی شخصیت میں تخریب کا کوئی بھی پہلو موجود نہیں۔ وہ تعمیر کا اصول ہے، اس کی موجودگی سے کائنات میں زندگی کی دمک اور جینے کا لطف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامۂ اقبال ابلیس کو جد و جہد کی علامت سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:ـ

مزی اندر جہانِ کور ذوقے کہ یزداں دارد و شیطاں نہ دارد

اس سے یہ مراد نہیں کہ شیطان خدائے تعالیٰ کا حریف ہے۔ بلکہ شیطان یہاں اُس بے اطمینانی کا نشان ہے جس کی وجہ سے زندگی میں خلش اور کائنات میں جوشِ نمو ہے۔ وہ یہاں اس طاقت سے مترادف ہے جو ہمیں کسی ایک حالت سے کلی طور پر مطمئن نہیں ہونے دیتی، جو ہمیں ہر وقت کسی اور حالت کی طرف اکساتی رہتی ہے جو ہمیں سکون کی برودت سے نکال کر زندگی کی شاہراہ پر لا کھڑا کرتی ہے ایسی شاہراہ جو ستاروں سے آگے نکل جاتی ہے اور خودی کی منزلوں کو طے کر کے انسان کو خدا کے قریب تر کر دیتی ہے۔ جو مخلوق کو خلاق بنا دیتی ہے۔

آدم نے برکاتِ الٰہیہ کو اپنا حق سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اس حالت میں نہ اس میں استفسار کی جرأت ہو سکتی تھی اور نہ جستجو کی لگن۔ وصال اس کے نزدیک ہر آرزو کا انجام اور ہر خواہش کا جواب تھا۔ مگر ایک جوہر اس میں ایسا موجود تھا جس کے صحیح استعمال سے جس کے درست اطلاق سے اس کے خصائص عالیہ چمک سکتے تھے۔ یہ لذتِ طلب یہ سوزِ عشق جس نے انسان میں بیدار کیا اس اشارہ کا نام ابلیس ہے۔

عشق ہی سے اس عالم کو بقا ہے یہ نہ ہو تو عالم راکھ کا ایک ڈھیر ہے۔ عشق ہی مذہب کی جان ہوتی ہے عشق ہی سے ایمان کی شان بڑھتی ہے۔ فرماتے ہیں:ـ

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات
ساتھ ہی کہتے ہیں:ـ صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اس عشق کو زندگی سے وہی نسبت ہے جو خودی کو عشق سے۔
کہا ہے:ـ جوہرِ زندگی ہے عشق جوہرِ عشق ہے خودی
اور خودی کے متعلق فرماتے ہیں:ـ

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات، خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

اگر خودی کو بیداریٔ کائنات سے تعبیر کیا جائے تو اس بیداری کا نشان یعنی SYMBOL ابلیس کی شخصیت ہے۔ وہ خود کہتا ہے:ـ

می تپد از سوزِ من خونِ رگِ کائنات من بہ دو صرصرم من بہ غو تُندرم

ابلیس کا انداز حضرتِ اقبال کے ان اشعار سے صریحی طور پر مترشح ہوتا ہے۔ جبریل جو تسلیم کا پیکر ہے اور کائنات میں

گزر کر قوتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے سامنے اب ساری کائنات ہے وہ اس عالم آب وگل سے گزر کر اب سببِ تخلیق، مدعائے زندگی، حیات، ممات، حقیقت ایسے فلسفیانہ مسائل کے سمجھنے سمجھانے میں منہمک نظر آتے ہیں۔
سب سے اول وہ زندگی کو حرکت سے، تپش سے، سوز سے تعبیر کرتے ہیں۔ قیام ان کے نزدیک موت سے مترادف ہے۔

فرماتے ہیں: ؎

دمادم نقش‌ہائے تازہ ریزد — بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است — بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

اس زندگی میں قرار انسان پر حرام ہے، اور اس کی منزل بہت دور ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

مگو از مدعائے زندگانی — ترا بر شیوہ‌ہائے او نگہ نیست
من از ذوقِ نظر آنگونہ مستم — کہ منزل پیشِ من جز سنگِ رہ نیست

مگر یہ لامتناہی سفر آسانی سے طے نہیں ہو سکتا: ؎

کسے کو دردِ پنہانے ندارد — تنے دارد و لے جانے نہ دارد
اگر جانے ہوس داری طلب کن — تب و تابے کہ پایانے نہ دارد

مگر فقط بے اندازہ تب و تاب ہی انسان کو آسانی سے منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ کیونکہ یہ راہ پُرخطر ہے۔ یہ منزل کٹھن ہے یہاں سینکڑوں قافلے راہ کی دشوار گزاری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے۔ حیاتِ جاوداں اندر ستیز است تو درست ہے مگر اس جنگ کے لئے جرأت اور بے خوفی اور ہمت کی اشد ضرورت ہے۔ یہاں کشمکش ہی زندگی کا جوہر ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کشمکش کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اور اگر خدائے قدوس ہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے تو کس چیز سے کشمکش ہے؟ یہ سعیٔ پیہم کیا شے ہے؟ یہ راہرو اور منزل کا جھگڑا کیوں ہے؟ انسان کیا تسلیم و رضا کا بندہ نہیں؟ اس خاکی میں یہ آگ کہاں سے آئی؟ اور اگر حضرت اقبال کا یہ قول صحیح ہے کہ: ؎ رازِ حیات جوئی جز در تپش نیابی — در قلزم آرمیدن ننگ است آبجو را
تو اس تپش سے کیا مراد ہے؟

اقبال کے نزدیک ان سب باتوں کا آغاز انکارِ ابلیس سے ہوا۔ لفظ ابلیس قرآن مجید میں کئی بار آیا ہے ابلیس 'ابلس' سے مشتق ہے۔ بلس کے معنی ہیں ناامیدی، ابلیس یعنی جسے رحمتِ الٰہی سے ناامیدی ہو۔ ابلیس کے لئے لفظِ شیطان بھی آیا ہے۔ شیطان نکلا ہے شطن سے جس کے معنی ہیں ورغلانے کے۔ شیطان یعنی ورغلانے والا۔ گمراہ کرنے والا۔ گویا ابلیس اور شیطان ایک ہی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ اقبال مرحوم نے بھی ابلیس کے دو پہلوؤں سے بحث کی ہے مگر ابلیس کی شیطنت کا رخ علامۂ اقبال کے آخری دور کے اشعار میں نمودار ہوا ہے۔ علامہ اپنے دورِ پختگی میں اس پہلو سے بہت کم بحث کرتے ہیں۔ بلکہ یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وسطی دور میں جو ابلیس کا تصور ہے اس میں ذم کا پہلو موجود نہیں۔ میں نے بھی اپنی بحث میں یہی ترتیب ملحوظ رکھی ہے۔ آدم کی تعمیر میں اگرچہ عشق جزوِ اعظم کی حیثیت سے موجود تھا مگر یہ عشق ابھی خدا آشنا نہ تھا۔ مضمر ضرور تھا مگر اپنی قوتِ تسخیر سے آگاہ نہ تھا۔ ابھی اس میں تڑپ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ابھی وہ اُس سطحِ آب کی طرح تھا جو ہموار ہے جس میں ابھی شکن نہیں پڑی جو لہروں کی شورش سے بے خبر ہے اور طوفان کی لذت سے ناآشنا۔ ابھی اس کی تخلیقی قوتیں سوئی پڑی تھیں، آدم میں روح ڈال دی گئی تھی مگر ابھی اس میں جان نہیں پڑی تھی۔ ابھی ہر طرف سکون تھا۔ آدم کے حق میں یہ سکون شاید جمود بن کر رہ جاتا اگر کائنات میں ابلیس کے انکار سے ہل چل نہ پڑ جاتی۔ ابلیس نے اقبال کے نزدیک تکبر سے انکار نہیں کیا اس کا انکار دراصل ایک قسم کا افہام ہے۔ اس کا انکار سلبی نہیں حقیقتاً ہے۔ وہ تپش کا خلش کا سوز کا مظہر ہے۔ خدا سے اس کا دعویٰ ہے: ؎

ظاہر ہے بہت کچھ خوش گمانی اور اُمید پرستی پر مبنی تھا۔ چنانچہ کچھ ہی سال بعد کہتے ہیں ؎

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا

میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آذری

مگر اقبال اپنی قوم سے مایوس نہیں ہوئے تھے۔ خضرِ راہ میں جو غالباً ۱۹۲۱ء میں لکھی گئی یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے دریوزہ گری کرکے بھی دیکھ لیا۔ مغرب پرستی بھی کر لی۔ مگر اس کورانہ تقلید سے نہ کچھ ان کی ذہنی ترقی ہوئی اور نہ وہ کچھ ایسی اخلاقی بلندی تک پہنچ سکے خودداری کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ؎

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست

مورِ بے پر حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

مگر اس قدر کہنے کے باوجود، اس قدر امید افزائی کرنے کے بعد بھی علامۂ مرحوم نے محسوس کیا ہوگا کہ وہ ایسی قوم سے مخاطب ہیں جس میں سننے کی خواہش موجود ہے۔ ہنگامی جوش بھی غائب نہیں ہوا، اپنے عظماء سے عقیدت بھی معدوم نہیں ہوئی مگر جس کے ذہن میں حرکت نہیں۔ عمل کی توفیق ابھی دوبارہ پیدا نہیں ہوئی جس کی روح ابھی بیدار نہیں ہوئی۔ شاید انہوں نے یہ بھی محسوس کیا ہو کہ ان کا پیغام ابھی لوگوں پر پوری طرح واضح نہیں ہوا۔ ابھی وہ کچھ غیر معیّن سا ہے۔ شاید ہم لوگوں کے لئے اس سے بھی صریح الفاظ اس سے بھی قطعی انداز کی ضرورت ہے۔ چنانچہ طلوعِ اسلام میں فرماتے ہیں: ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے

یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا

تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

یہاں مسلمان کو معمارِ جہاں بتایا ہے۔

پھر فرماتے ہیں: ؎

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم

جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یہاں زندگی کو ایک جہاد سے تعبیر کرتے ہوئے مسلماں کو پیہم عمل کی تلقین کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے: ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

عمل ہی زندہ رہنے کا راز ہے۔ سکون ہمیں جمود کی طرف لے جاتا ہے۔ اور اطمینان بے حرکتی کا پیش خیمہ ہے۔ میرے خیال میں حضرتِ اقبال ابھی تک مسلمان کو اجتماعی حیثیت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک جماعت کا فرد ہے اور ایک رشتہ میں منسلک ہے۔ اس کے لئے ربط و ضبط لازم ہے۔ اس کی ترقی جماعت کی ترقی ہے۔ یہاں تک اقبال کا تصور ملی ہے مسلمان بے شک رازِ کن فکاں ہے۔ مگر اقبال اسے خود شناسی کی طرف اس لئے راغب کرتے ہیں کہ وہ خودی کا راز داں بن کر خدا کے حکم کی ترجمانی کرے۔ مسلمان کی انفرادی اہمیت ابھی تک واضح نہیں ہوئی۔ بہ حیثیت انسان کے ابھی اس کی تکمیل باقی ہے۔ اب ان کا خطاب مسلمان کے بجائے آدم سے ہے۔ یہ نہیں کہ آدم کا تصور مسلمان کے تصور سے مختلف ہے۔ فرق یہ ہے کہ آدم اب بنی نوعِ انسان کے نمائندہ کی حیثیت سے ایک نشان کا کام دیتا ہے۔ اقبال نے اپنے تخیل کی دنیا میں افراد اور جماعتوں سے

اقبال کے کلام میں شیطان کا تصوّر

۱۸۵۷ کی شورش کے بعد جو حالت مسلمانوں کی ہوئی وہ کسی شخص سے پوشیدہ نہیں۔ سیاسی ادبار، اقتصادی اور اخلاقی پستی، تعلیمی کمزوری، رجعت پسندی اور تنگ نظری، غرض یہ کہ قومی اور ملی انحطاط کے جو جو اسباب ہو سکتے ہیں وہ سب ہم مسلمانوں میں بدرجۂ اتم پاتے ہیں۔ اور یہ حالت بہت دیر تک قائم رہی۔ مسدس حالی میں اسی حالت کا رونا ہے اور مسدس ۱۸۷۹ء میں لکھا گیا مگر قوم کچھ ایسی بے پروا ہوتی جا رہی تھی کہ علی گڑھ کی تحریک اور سرسید اور ان کے رفقائے کار جیسے جلیل القدر حضرات کی کوششوں کے باوجود ہم میں اتنی بیداری پیدا ہوئی نہ اتنی قابلیت کہ ہم اپنی پستی کو محسوس کر سکیں۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں جب اقبال مرحوم شمع و شاعر لکھتے ہیں تو انہیں جس چیز کی شکایت ہے وہ یہی بے حسی ہے: کہتے ہیں ؎

پھول بے پروا ہیں تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آوازِ درا ہو یا نہ ہو

اِسی بند کا آخری شعر ہے: ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دِل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اقبال مرحوم ابتدا میں اس بے حسی کی طرف بار بار توجہ دلاتے ہیں۔ انہیں خود مسلمانوں کی ذلت کا بہت احساس ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس قوم میں پھر سے زندگی پیدا ہو جائے۔ پہلی چیز جو وہ اس ملی احیاء کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں۔ جمعیت ہے۔ شمع و شاعر ہی میں اوّل اوّل جمعیت پر زور دیتے ہیں: ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ جمعیت بذاتِ خود اتنی فائدہ مند نہیں ہو سکتی، اگر مسلمان اپنی حقیقت سے ناآشنا رہا۔ خودی اور خود شناسی کی تعلیم بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ یہیں سے اقبال مردِ مومن کو انسانیت کی معراج بتانے لگتے ہیں۔ کہا ہے:

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایّام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

پھر فرماتے ہیں ؎

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

مگر ایک ایسی قوم میں جو اپنی ذلت سے بھی پورے طور پر آگاہ نہ ہو اور جس کے تصور میں عزتِ نفس کا مفہوم تقریباً چکا ہو جس نے پھر سے خود داری کے پہلے زینے پر بھی قدم نہ رکھا ہو اور جس میں شوق کی فراوانی کجا، کم نظری اور بے حضوری جو رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہو یہ توقع کہ ؎

تو اگر خود دار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

ایک امریکن اخبار نے لکھا ہے کہ ڈیٹرائٹ کے کارخانۂ موٹر سازی میں مستقبل کی موٹر کار کے متعلق تجویز ہو رہی ہے۔ یہ موٹر کاریں جنگ کے ایک سال بعد فروخت کے لئے تیار ہوں گی۔ ان کی صورت بیر بہٹی سے ملتی جلتی ہوگی۔ لوہے کے بجائے ان کی ساخت میں زیادہ تر ایلومینیم میگنیزیم اور دوسری ہلکی پھلکی دھاتیں استعمال کی جائیں گی اور ان کا زیادہ سے زیادہ وزن بارہ سو پاؤنڈ ہوگا۔ (آج کل کی موٹروں کا وزن ۲۷۰۰ سے لے کر ۴۲۰۰ پاؤنڈ تک ہوتا ہے) ان موٹر کاروں کے پچھلے حصے میں ہلکے وزن کے انجن لگے ہوں گے جو ہوائی جہازوں کے پٹرول سے چلیں گے پہیئے بھی موجودہ پہیوں کے مقابلے میں چھوٹے ہوں گے (۱۲ انچ یا اس سے کم) اس سے ربڑ بھی بچے گا اور موٹر کار کا مرکز ثقل بھی نیچے آجائے گا۔ ان موٹر کاروں کا ڈھانچ پلاسٹک کا ہوگا اور چھتیں شفاف پلاسٹک کی ہوں گی۔ ان سب باتوں کے باوجود لطف یہ ہے کہ قیمت بھی موجودہ موٹر کاروں کے مقابلے میں بہت کم ہوگی۔

خرابی صحت کے اسباب

ڈاکٹر ایچ۔ اے۔ کلیگ اپنی کتاب Brush up your Health میں لکھتے ہیں کہ خوش رہنا اچھی صحت کے لئے بے حد ضروری ہے۔ کوئی ڈاکٹر دن میں تین دفعہ خوشی کی خوراک پلانے پر قادر نہیں۔ وہ صرف یہ بتا سکتا ہے کہ اگر آپ غمگین، غیر مطمئن، ترش مزاج اور حاسد بنے رہیں گے تو صحت محض آپ کی خواہش سے آپ کے نزدیک بھی نہیں پھٹک سکتی کیوں کہ مذکورۂ بالا تمام خصائص بری صحت کو دعوت دیتے اور اس کی پرورش کرتے ہیں۔ ہر ایسا شخص جو اچھی صحت کی قدر کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذہنی اور جذباتی حالت کا جائزہ لے۔

حامد علی خاں

منشی دیا نرائن نگم کی رحلت

اُردو کے حلقوں میں یہ خبر انتہائی رنج واندوہ کے ساتھ سُنی گئی کہ منشی دیا نرائن صاحب نگم بی۔ اے مالک و مدیر رسالۂ "زمانہ" (کان پور) ۲ر نومبر کو اس جہانِ فانی سے رحلت کر گئے۔ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے موصوف نے رسالۂ 'زمانہ' جاری کیا جو یقیناً اُردو زبان کے بہترین رسائل میں شمار ہوتا ہے۔ اس رسالے کے ذریعے سے اُردو میں علمی و ادبی معلومات کا اس قدر اضافہ ہوا کہ شاید کوئی اور رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ رسالۂ 'زمانہ' کے علاوہ نگم صاحب نے چند سال سے ایک ہفتہ وار اخبار آزاد بھی شائع کرنا شروع کیا جو اپنی متانت اور طرزِ تحریر کے لحاظ سے لائق تحسین تھا۔ نگم صاحب ایک نہایت نیک نفس اور بے تعصب انسان تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ نگم صاحب کے لائق فرزند اُن کی یادگار میں رسالۂ زمانہ اور اخبار آزاد کو برابر جاری رکھیں گے۔

بشیر احمد

فہرست مضامین

بابت ماہ دسمبر ۱۹۴۲ء

ضروری اطلاع جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ ان کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کئے جائیں۔

چندہ سالانہ ؎ ششماہی ۔ (ربع محصول)

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

[illegible]

[illegible]

[illegible] - ١

[illegible] - ٢

[illegible] - ٣

[illegible] - ٤

[illegible] - ٥

[illegible] - ٦

[illegible]

[illegible]

مطبوعات

مضامینِ عالم جے۔ اے۔ ساقی صاحب نے مختلف دل چسپ مضامین کا یہ مجموعہ طلبہ کے فائدے کے لئے شائع کیا ہے۔ مضامین ساقی صاحب نے خود لکھے ہیں۔ زبان اور معیار اوسط درجے کا ہے۔ بعض مضامین یہ ہیں (۱) زبانِ اُردو کی تاریخ (۲) مولانا ابوالکلام آزاد (۳) ہندوستانی مسئلۂ نیابت کا واحد حل (۴) سر کرپس۔ قیمت ۱۲؍ پتا: اُردو بک سٹال ہال بازار امرتسر

متین کے سو شعر حضرت متین تلمیذ حضرت داغ دہلوی کے سو اشعار کا مجموعہ سید سعدی جعفری نے شائع کیا ہے۔ اشعار پرانے غزلیہ انداز کے ہیں۔ حضرت متین کی تصویر بھی سرورق پر دی گئی ہے۔ قیمت ۳؍ پتا: مکتبۂ ادب الٰہ آباد

حجاب یہ ایک زنانہ ادبی رسالہ ہے جس کی ایڈیٹر عذرا بیگم صاحبہ ہیں۔ اس رسالے میں افسانے، نظمیں اور عورتوں کی دلچسپی کے کچھ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ تصویریں بھی شائع کی جاتی ہیں۔ اوسط درجے کا رسالہ ہے۔ چندہ سالانہ [illegible]۔ قیمت فی پرچہ ۴؍ پتا: دفتر "حجاب" بمبئی ۱۶

قرآن اور سیرت سازی از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لندن) بیرسٹر ایٹ لا، پروفیسر فلسفہ جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد (دکن)۔ اس کتاب میں آیاتِ قرآنی کی روشنی میں دکھایا گیا ہے کہ اسلام نے سیرتِ انسانی کا کتنا بلند تصور پیش کیا ہے۔ قیمت ۸؍ مؤلف سے طلب کیجئے۔

سوزِ دروں یہ مولانا رشید اختر صاحب ندوی کا ایک دل چسپ ناول ہے جسے انہوں نے سر عبد القادر کے نام معنون کیا ہے۔ مولانا بہت اچھی زبان لکھتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ اپنی اس صلاحیت سے کوئی بہتر کام لیں۔ کاش وہ تاریخ و سیرت کی طرف متوجہ ہوں یا کسی اعلیٰ درجے کی عربی تصنیف کو اُردو کا جامہ پہنائیں۔ ناول کا حجم ۱۹۰ صفحات ہے، کاغذ نفیس ہے اور جلد اور گرد پوش خوش نما ہے۔ قیمت عہ پتا: اُردو بک سٹال لاہور۔

اثر کے ڈیڑھ سو نشتر قیمت ۴؍ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔ یہ خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر ہوم منسٹر کشمیر کے کلام کا انتخاب ہے۔ یقیناً پڑھنے کے قابل ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:-

(۱) شوق بے حد چاہئے اور جذب کامل چاہئے ÷ گو بہت پیچیدہ راہِ عشق ہے دل چاہئے ÷ (۲) اُن کو سمجھاتا ہے آئے ہیں جو سمجھانے کو ÷ کون دیوانہ کہے گا ترے دیوانے کو
(۳) چارہ حد دیگر جانے دو ÷ جو گزرتی ہے گزر جانے دو ÷ (۴) پھر سے آراستہ ہو انجمنِ شیفتگی ÷ لطفِ دیرینہ بہم شیخ و برہمن میں نہیں (۵) مٹ مٹ کے اُبھریں گے نقش وفا مرے ÷ کچھ رنگ بے ثباتیِ دنیا نہیں ہوں میں ÷ (۶) ہر اک منزل کو ٹھکراتا ہوا چل ÷ پیامِ ہمتِ مردانہ بن جا
(۷) کچھ اور نیک و بد کی حقیقت نہیں اثر ÷ انسان آئینہ ہے خود اپنے خیال کا ÷

اُردو سبھا یعنی مجموعہ مضامین مرتبہ پرتاب اُردو سبھا سری پرتاب کالج سری نگر کشمیر مطبوعہ ستمبر ۱۹۴۲ء قیمت ۱؍ علہ۔ اسری نگر کالج کے طلبہ کی یہ کوشش یقیناً قابلِ قدر ہے۔ اس میں سوا ڈاکٹر محمد دین تاثیر پرنسپل کالج کے پُرمغز مضامین کے اُردو کے بعض مشہور ادبا و شعرا کی نگارشیں ہیں مثلاً مرزا جعفر علی خاں ہوم منسٹر کشمیر، ابوالاثر حفیظ جالندھری، اثر صہبائی، روش صدیقی، میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں۔ ہندو مسلم طلبا اور ہندو مسلم پروفیسروں نے مل کر اس مجموعے کی ترتیب میں حصہ لیا ہے۔ کشمیر کے متعلق بعض تحقیقی مضامین بھی درج ہیں۔ اخیر میں "ہندوستان کی مشترکہ زبان" کے عنوان سے اُردو کی فوقیت اور ہر دل عزیزی کو دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔

سید عبد اللطیف پرنٹر پبلشر نے کنسٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۳۲۔ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔ صرف سرورق ہاف ٹون پریس رام نگر لاہور

نمبر۳- میں کمپنی سے پچاس ہزار روپے ماہوار پنشن لوں گا۔ زیادہ کا مطالبہ نہیں کروں گا۔

قصہ مختصر پورا ۱۸۵۶ء ولی عہدی کی بحث اور توڑ جوڑ میں گزرا اور کہا جاتا ہے کہ بہادر شاہ نے ۱۸۵۷ء شروع ہوتے ہی سمجھ لیا کہ ریذیڈنٹ جواں بخت کی ولی عہدی کو منظور نہیں کریں گے اس واسطے انہوں نے ایک حبشی غلام کو ایران بھیجا اور مرہٹوں اور اودھ کے رئیس کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی اور کمپنی کی فوجوں سے بھی سازش کا کام ایک بڑے پیمانہ پر شروع کر دیا۔

جہاں تک میں نے شمس العلماء منشی ذکاء اللہ صاحب کی تاریخ ہند اور دوسرے انگریزی کاغذات پر غور کر کے سمجھنے کی کوشش کی ہے مجھے اب تک اس کا یقین نہیں ہوا کہ بہادر شاہ نے کوئی سازش کی تھی۔ کم از کم کمپنی کی فوجوں سے سازش کرنے کا الزام بالکل غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اگر یہ ٹھیک ہوتا تو جب فوجیں میرٹھ سے باغی ہو کر دہلی میں آئیں اور لال قلعہ کی فصیل کے نیچے کھڑے ہو کر انہوں نے بادشاہ کی دہائی دی اور ریذیڈنسی کے ایک ملازم انگریز نے باغیوں سے کہا بادشاہ سلامت کے آرام میں خلل نہ ڈالو اور یہاں سے جاؤ تو بادشاہ نے اس انگریز کو حکم بھیجا کہ وہ باغیوں کے سامنے نہ جائے اور اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالے۔ اگر باغی فوجیں بہادر شاہ سے سازش کر کے آئی ہوتیں تو وہ گستاخانہ قلعہ کے اندر ڈیرے نہ لگاتیں اور کھلم کھلا یہ نہ کہتیں کہ یہ ہماری جوتی جس کے سر پر رکھی جائے گی وہی بادشاہ ہو جائے گا۔

بہادر شاہ کی غذا بہت کم تھی۔ چار شامی کباب کے چھلکے کھاتے تھے اور ایک بکرے کی یخنی پیتے تھے۔ البتہ معجونیں اور مقوی دوائیں ہمیشہ کھاتے رہتے تھے۔ ان کے روزنامچوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر سال دو چار نئے نکاح کر لیتے تھے۔ اکثر رات طوائفوں کا ناچ گانا اُن کے ہاں ہوتا تھا اور انہی میں سے کوئی نہ کوئی عورت محل کے لئے بھی منتخب ہو جاتی تھی۔ آخر زمانہ میں لال قلعہ میں اس کی احتیاط نہیں ہوتی تھی کہ اولاد کس کے بطن سے ہے۔ باپ کو دیکھا جاتا تھا کہ اولاد کس کے تخم سے ہے۔ اور یہ ایک بڑا سبب مغلوں کی کمزوری اور تباہی کا تھا۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد بہادر شاہ کو برما میں جلا وطن کیا گیا۔ جہاں وہ کئی سال زندہ رہے۔ بمبئی کے ایک ماہوار گجراتی رسالے نے پارلیمنٹ کے ایک ممبر کی تحریر شائع کی تھی کہ وہ سیاحت کے لئے آیا تو بہادر شاہ کو رنگون میں دیکھنے گیا۔ بہادر شاہ کھری چارپائی پر لیٹے تھے۔ حقہ اُن کے سامنے رکھا تھا۔ اور ایک موٹا ٹاٹ انہوں نے اپنے چہرے پر ڈال رکھا تھا۔ ممبر پارلیمنٹ لکھتا ہے کہ اپنے ترجمان کے ساتھ کچھ دیر اس بوڑھے قیدی کے پاس کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ اپنے بزرگوں کے جاہ وجلال کا خواب دیکھ رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد بہادر شاہ نے وہ ٹاٹ کا کپڑا اپنے چہرے سے ہٹا کر بہت خفگی کی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے ترجمان کے ذریعہ کہا: میں پارلیمنٹ کا ممبر ہوں۔ اگر تمہیں کوئی تکلیف ہو تو مجھ سے کہو تاکہ میں اس کا انتظام کرا دوں۔ بہادر شاہ نے ترجمان کی بات سُن کر اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جُھک کر دیکھا کہ اس میں زخم تھا اور اس سے بو آ رہی تھی اور شاید اس میں کیڑے بھی تھے۔ میں نے کہا کہ میں ابھی ڈاکٹر کا انتظام کرتا ہوں آپ اچھے ہو جائیں گے۔ بادشاہ نے پانی کے مٹکے کی طرف بھی اشارہ کیا۔ میں نے جا کر دیکھا۔ مٹکا بہت میلا تھا اور اس کا ڈھکنا بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے بہادر شاہ سے کہا میں صاف پانی کا انتظام بھی کرا دیتا ہوں۔ آپ کو کچھ اور بھی کہنا ہے؟ بہادر شاہ نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا اور ٹاٹ اپنے چہرے پر پھر ڈال لیا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ بمبئی کے مذکورہ رسالے نے پارلیمنٹ کے ممبر کی تحریر میں کوئی کمی بیشی کی تھی یا نہیں۔ میں نے ممبر مذکور کی انگریزی تحریر نہ خود دیکھی نہ کسی ایسے آدمی سے میری ملاقات ہوئی جس نے وہ تحریر دیکھی ہو۔ یہ مضمون بہادر شاہ کی پوری زندگی پر حاوی نہیں ہے اور میں نے جتنی کتابیں ۱۸۵۷ء کے غدر کی لکھی ہیں اُن سے بھی بہادر شاہ کی پوری زندگی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اگر دہلی کے اہلِ ادب مل جل کر اس کام کو پورا کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ اپنا وہ فرض ادا کریں گے جو اُن پر قدرتی طور سے عاید ہوتا ہے۔

(خواجہ حسن نظامی)

کے لہجہ میں زبانی کہا۔ بہت اچھا۔ میں اس فیصلہ کا اپیل کروں گا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد ہی بہادر شاہ نے لوگوں کو مرید کرنا شروع کیا اور کمپنی کی فوجوں کے بہت سے سردار اور سپاہی بھی مختلف مقامات سے اُن کے پاس آکر مرید ہونے لگے جن کو مرید کرنے کے بعد بہادر شاہ ایک لال رومال بطور تبرک دے دیا کرتے تھے مرید کرنے کی تصویر بھی لال قلعہ کے میوزیم میں موجود ہے۔ اور غدر کے بعد جب بہادر شاہ کے خلاف لال قلعہ میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اس وقت یہ معاملہ بھی عدالت میں پیش ہوا تھا کہ بادشاہ کا سپاہیوں اور سرداروں کو مرید کرنا اور لال رومال دینا کسی مرموز مطلب کے لئے تھا۔

بہرحال ولی عہدی کا قصہ سب سے زیادہ بہادر شاہ کے اشتعال کا باعث تھا اور مذکورہ واقعات جو بہت سی اقسام کے تھے محض کشمکش اور رنجش کو بڑھانے والے تھے۔ رنجش کی بنیاد نہ تھے۔ چنانچہ اسی قسم کا ایک اور واقعہ پیش آیا تھا کہ فریزر صاحب ریذیڈنٹ نے بہادر شاہ کو لکھا کہ جب آپ کی سواری قلعہ سے باہر جاتی ہے تو سب ہندو و مسلمان اپنی اپنی سواریوں سے تعظیماً نیچے اُتر کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا میں ادب کے ساتھ گذارش کرتا ہوں کہ یورپین لوگوں کو اس تعظیم سے آزاد رکھا جائے تو بہت عنایت ہوگی۔ بادشاہ نے جواب دیا ہاں ہاں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہمارے چوبداروں سے کہہ دیا جائے کہ وہ اگر کسی فرنگی کو سواری میں دیکھیں تو نیچے اُترنے کے لئے نہ کہیں۔ اس کے بعد ایک دن یہ ہوا کہ بادشاہ کی سواری قطب صاحب جا رہی تھی اور قطب سے ایک بگھی میں فریزر صاحب کے یورپین مہمان آ رہے تھے۔ سواری سے بہت آگے اردلی کے سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے جا رہے تھے۔ ان کو اس حکم کی خبر نہیں تھی۔ انھوں نے انگریزوں کی بگھی کو روکا اور اُن سے کہا کہ نیچے اُتر آؤ۔ جہاں پناہ کی سواری آ رہی ہے۔ انگریزوں نے انکار کیا تو سواروں نے گھوڑوں سے اُتر کر ان انگریزوں کے ہاتھ پکڑے اور زبردستی بگھی سے گھسیٹ لیا اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔ بگھی کے سامنے دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاؤ اور جب سواری سامنے آئے تو جھک کر آداب بجا لاؤ۔ انگریز مجبور تھے۔ وہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور انھوں نے بادشاہ کو سلام بھی کیا۔ مگر دہلی پہنچ کر ریذیڈنٹ سے شکایت کی۔ ریذیڈنٹ نے قطب صاحب کے قیام کے زمانہ میں بادشاہ کو تحریری شکایت لکھی۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ میں نے اپنے چوبداروں کو حکم دے دیا تھا اور وہ سب میرے ہوادار کے ساتھ تھے۔ مجھے معلوم نہیں کس نے اُن کو بگھی سے اُتارا۔ اس واسطے میں اس شکایت کو بالکل بے جا سمجھتا ہوں۔

الغرض اسی قسم کے قصے رات دن پیش آتے رہتے تھے۔

بادشاہ نے سب سے پہلے اپنے بڑے بیٹے مرزا دارا بخت کو ولی عہد بنایا تھا۔ ان کا انتقال ہو گیا تو مرزا شاہ رخ کو ولی عہدی دی گئی اور مرزا شاہ رخ دہلی کے ایک طبیب کے غلط علاج کی وجہ سے قبل از وقت مر گئے تو بہادر شاہ نے اپنے چھوٹے بیٹے جواں بخت کی ولی عہدی کے لئے کوشش کی۔ مگر ریذیڈنٹ نے اس کو نہ مانا اور بہادر شاہ کے ایک بیٹے مرزا فخر الدین فتح الملک عرف مرزا فخرو کو ولی عہد بنا دیا۔ جو مرزا الٰہی بخش کے داماد تھے اور یہ بہادر شاہ اور انگریز کمپنی کی کشیدگی کی بنیاد تھی۔

بعض انگریز افسروں کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے جن کو میں نے اپنی تصنیف تاریخ غدر میں شائع کیا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم چاہتے تھے کہ بادشاہی کا نام ختم کر دیا جائے چنانچہ لاہور سے ایک نامور انگریز افسر نے گورنر جنرل کو لکھا تھا کہ دہلی کے لال قلعہ پر سب سے بڑا دھبا ہوتا ہے کہ ملک کی ترقی میں یہ چیز ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ جب ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو یکایک مر گئے اور مرزا قویاش وغیرہ شہزادوں نے اپنے لئے ولی عہدی کی کوششیں شروع کیں۔ اور ملکہ زینت محل نے بھی اپنے بیٹے جواں بخت کے لئے کوشش کی تو مرزا قویاش سے ریذیڈنٹ نے ان تین شرائط پر سمجھوتا کیا تھا۔

نمبر ۱۔ میں اپنے آپ کو بادشاہ نہیں کہوں گا بلکہ پرنس کہوں گا

نمبر ۲۔ میں لال قلعہ میں نہیں رہوں گا بلکہ بہادر شاہ کے بنائے ہوئے ظفر محل میں رہوں گا۔ جو درگاہ قطب صاحب میں بہادر شاہ نے بنایا تھا۔

نمبر۳۔ میں کمپنی سے پچاس ہزار روپے ماہوار پنشن لوں گا۔ زیادہ کا مطالبہ نہیں کروں گا۔

قصہ مختصر پورا ۱۸۵۶ء ولی عہدی کی بحث اور توڑ جوڑ میں گزرا اور کہا جاتا ہے کہ بہادر شاہ نے ۱۸۵۷ء شروع ہوتے ہی سمجھ لیا کہ ریذیڈنٹ جواں بخت کی ولی عہدی کو منظور نہیں کریں گے اس واسطے انہوں نے ایک حبشی غلام کو ایران بھیجا اور مرہٹوں اور اودھ کے رئیس کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی اور کمپنی کی فوجوں سے بھی سازش کا کام ایک بڑے پیمانہ پر شروع کر دیا۔

جہاں تک میں نے شمس العلماء منشی ذکاء اللہ صاحب کی تاریخ ہند اور دوسرے انگریزی کاغذات پر غور کر کے سمجھنے کی کوشش کی ہے مجھے اب تک اس کا یقین نہیں ہوا کہ بہادر شاہ نے کوئی سازش کی تھی۔ کم از کم کمپنی کی فوجوں سے سازش کرنے کا الزام بالکل غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اگر یہ ٹھیک ہوتا تو جب فوجیں میرٹھ سے باغی ہو کر دہلی میں آئیں اور لال قلعہ کی فصیل کے نیچے کھڑے ہو کر انہوں نے بادشاہ کی دہائی دی اور ریذیڈنسی کے ایک ملازم انگریز نے باغیوں سے کہا بادشاہ سلامت کے آرام میں خلل نہ ڈالو اور یہاں سے جاؤ تو بادشاہ نے اس انگریز کو حکم بھیجا کہ وہ باغیوں کے سامنے نہ جائے اور اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالے۔ اگر باغی فوجیں بہادر شاہ سے سازش کر کے آئی ہوتیں تو وہ گستاخانہ قلعہ کے اندر ڈیرے نہ لگاتیں اور کھلم کھلا یہ نہ کہتیں کہ یہ ہماری جوتی جس کے سر پر رکھی جائے گی وہی بادشاہ ہو جائے گا۔

بہادر شاہ کی غذا بہت کم تھی۔ چار شامی کباب کے چھلکے کھاتے تھے اور ایک بکرے کی یخنی پیتے تھے۔ البتہ معجونیں اور مقوی دوائیں ہمیشہ کھاتے رہتے تھے۔ ان کے روزنامچوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر سال دو چار نئے نکاح کر لیتے تھے۔ اکثر رات طوائفوں کا ناچ گانا اُن کے ہاں ہوتا تھا اور انہی میں سے کوئی نہ کوئی عورت محل کے لئے بھی منتخب ہو جاتی تھی۔ آخر زمانہ میں لال قلعہ میں اس کی احتیاط نہیں ہوتی تھی کہ اولاد کس کے بطن سے ہے۔ باپ کو دیکھا جاتا تھا کہ اولاد کس کے تخم سے ہے۔ اور یہ ایک بڑا سبب مغلوں کی کمزوری اور تباہی کا تھا۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد بہادر شاہ کو برما میں جلا وطن کیا گیا۔ جہاں وہ کئی سال زندہ رہے۔ بمبئی کے ایک ماہوار گجراتی رسالے نے پارلیمنٹ کے ایک ممبر کی تحریر شائع کی تھی کہ وہ سیاحت کے لئے آیا تو بہادر شاہ کو رنگون میں دیکھنے گیا۔ بہادر شاہ کھری چارپائی پر لیٹے تھے۔ حقہ اُن کے سامنے رکھا تھا۔ اور ایک موٹا ٹاٹ اُنہوں نے اپنے چہرے پر ڈال رکھا تھا۔ ممبر پارلیمنٹ لکھتا ہے کہ اپنے ترجمان کے ساتھ کچھ دیر اس بوڑھے قیدی کے پاس کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ اپنے بزرگوں کے جاہ و جلال کا خواب دیکھ رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد بہادر شاہ نے وہ ٹاٹ کا کپڑا اپنے چہرے سے ہٹا کر بہت خفگی کی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے ترجمان کے ذریعہ کہا! میں پارلیمنٹ کا ممبر ہوں۔ اگر تمہیں کوئی تکلیف ہو تو مجھ سے کہو تاکہ میں اس کا انتظام کرا دوں۔ بہادر شاہ نے ترجمان کی بات سُن کر اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جھک کر دیکھا کہ اس میں زخم تھا اور اس سے بُو آ رہی تھی اور شاید اس میں کیڑے بھی تھے۔ میں نے کہا کہ میں ابھی ڈاکٹر کا انتظام کرتا ہوں آپ اچھے ہو جائیں گے۔ بادشاہ نے پانی کے مٹکے کی طرف بھی اشارہ کیا۔ میں نے جا کر دیکھا۔ مٹکا بہت میلا تھا اور اس کا ڈھکنا بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے بہادر شاہ سے کہا میں صاف پانی کا انتظام بھی کرا دیتا ہوں۔ آپ کو کچھ اور بھی کہنا ہے؟
بہادر شاہ نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا اور ٹاٹ اپنے چہرے پر پھر ڈال لیا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ بمبئی کے مذکورہ رسالے نے پارلیمنٹ کے ممبر کی تحریر میں کوئی کمی بیشی کی تھی یا نہیں۔ میں نے ممبر مذکور کی انگریزی تحریر نہ خود دیکھی نہ کسی ایسے آدمی سے میری ملاقات ہوئی جس نے وہ تحریر دیکھی ہو۔ یہ مضمون بہادر شاہ کی پوری زندگی پر حاوی نہیں ہے اور میں نے جتنی کتابیں ۱۸۵۷ء کے غدر کی لکھی ہیں اُن سے بھی بہادر شاہ کی پوری زندگی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اگر دہلی کے اہل ادب مل جل کر اس کام کو پورا کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ اپنا وہ فرض ادا کریں گے جو اُن پر قدرتی طور سے عاید ہوتا ہے۔

(خواجہ حسن نظامی)

کے لہجہ میں زبانی کہا۔ بہت اچھا۔ میں اس فیصلہ کا اپیل کروں گا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد ہی بہادرشاہ نے لوگوں کو مرید کرنا شروع کیا اور کمپنی کی فوجوں کے بہت سے سردار اور سپاہی بھی مختلف مقامات سے اُن کے پاس آکر مرید ہونے لگے جن کو مرید کرنے کے بعد بہادرشاہ ایک لال رومال بطور تبرک دے دیا کرتے تھے مرید کرنے کی تصویر بھی لال قلعہ کے میوزیم میں موجود ہے۔ اور غدر کے بعد جب بہادرشاہ کے خلاف لال قلعہ میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اس وقت یہ معاملہ بھی عدالت میں پیش ہوا تھا کہ بادشاہ کا سپاہیوں اور سرداروں کو مرید کرنا اور لال رومال دینا کسی مرموز مطلب کے لئے تھا۔

بہرحال ولی عہدی کا قصہ سب سے زیادہ بہادرشاہ کے اشتعال کا باعث تھا اور مذکورہ واقعات جو بہت سی اقسام کے تھے محض کش مکش اور رنجش کو بڑھانے والے تھے۔ رنجش کی بنیاد یہ تھے۔ چنانچہ اسی قسم کا ایک اور واقعہ پیش آیا تھا کہ فریزر صاحب ریذیڈنٹ نے بہادرشاہ کو لکھا کہ جب آپ کی سواری قلعہ سے باہر جاتی ہے تو سب ہندو مسلمان اپنی اپنی سواریوں سے تعظیماً نیچے اُتر کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لہذا میں ادب کے ساتھ گذارش کرتا ہوں کہ یورپین لوگوں کو اس تعظیم سے آزاد رکھا جائے تو بہت عنایت ہوگی۔ بادشاہ نے جواب دیا ہاں ہاں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہمارے چوب داروں سے کہہ دیا جائے کہ وہ اگر کسی فرنگی کو سواری میں دیکھیں تو نیچے اُترنے کے لئے نہ کہیں۔ اس کے بعد ایک دن یہ ہوا کہ بادشاہ کی سواری قطب صاحب جا رہی تھی اور قطب سے ایک بگھی میں فریزر صاحب کے یورپین مہمان آ رہے تھے۔ سواری سے بہت آگے اردلی کے سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے جا رہے تھے۔ ان کو اس حکم کی خبر نہیں تھی۔ اُنھوں نے انگریزوں کی بگھی کو روکا اور اُن سے کہا کہ نیچے اُتر آؤ۔ جہاں پناہ کی سواری آ رہی ہے۔ انگریزوں نے انکار کیا تو سواروں نے گھوڑوں سے اُتر کر ان انگریزوں کے ہاتھ پکڑے اور زبردستی بگھی سے گھسیٹ لیا اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔ بگھی کے سامنے دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاؤ اور جب سواری سامنے آئے تو جھک کر آداب بجا لاؤ۔ انگریز مجبور تھے۔ وہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور اُنھوں نے بادشاہ کو سلام بھی کیا۔ مگر دہلی پہنچ کر ریذیڈنٹ سے شکایت کی۔ ریذیڈنٹ نے قطب صاحب کے قیام کے زمانہ میں بادشاہ کو تحریری شکایت لکھی۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ میں نے اپنے چوب داروں کو حکم دے دیا تھا اور وہ سب میرے ہوادار کے ساتھ تھے۔ مجھے معلوم نہیں کس نے اُن کو بگھی سے اُتارا۔ اس واسطے میں اس شکایت کو بالکل بے جا سمجھتا ہوں۔

الغرض اسی قسم کے قصے رات دن پیش آتے رہتے تھے۔

بادشاہ نے سب سے پہلے اپنے بڑے بیٹے مرزا دارا بخت کو ولی عہد بنایا تھا۔ ان کا انتقال ہوگیا تو مرزا شاہ رخ کو ولی عہدی دی گئی اور مرزا شاہ رخ دہلی کے ایک طبیب کے غلط علاج کی وجہ سے قبل از وقت مر گئے تو بہادرشاہ نے اپنے چھوٹے بیٹے جواں بخت کی ولی عہدی کے لئے کوشش کی۔ مگر ریذیڈنٹ نے اس کو نہ مانا اور بہادرشاہ کے ایک بیٹے مرزا فخرالدین فتح الملک عرف مرزا فخرو کو ولی عہد بنا دیا۔ جو مرزا الٰہی بخش کے داماد تھے اور یہ بہادرشاہ اور انگریز کمپنی کی کشیدگی کی بنیاد تھی۔

بعض انگریز افسروں کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ جن کو میں نے اپنی تصنیف تاریخ غدر میں شائع کیا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم چاہتے تھے کہ بادشاہی کا نام ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ لاہور سے ایک نامور انگریز افسر نے گورنر جنرل کو لکھا تھا کہ دہلی کے لال قلعہ پر کب تک یہ ڈراما ہوتا رہے گا۔ ملک کی ترقی میں یہ چیز ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ جب ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو یکایک مر گئے اور مرزا قویاش وغیرہ شہزادوں نے اپنے لئے ولی عہدی کی کوششیں شروع کیں۔ اور ملکہ زینت محل نے بھی اپنے بیٹے جواں بخت کے لئے کوشش کی تو مرزا قویاش سے ریذیڈنٹ نے ان تین شرائط پر سمجھوتا کیا تھا۔

نمبر۱۔ میں اپنے آپ کو بادشاہ نہیں کہوں گا بلکہ پرنس کہوں گا۔

نمبر۲۔ میں لال قلعہ میں نہیں رہوں گا بلکہ بہادرشاہ کے بنائے ہوئے ظفر محل میں رہوں گا۔ جو درگاہ قطب صاحب میں بہادرشاہ نے بنایا تھا۔

اس واسطے انہوں نے بہت خوبصورت خطیرہ مرزا جہاں گیر کا بنوایا۔ جس میں سنگ مرمر کی ایک ڈال محراب ہے۔ اور سنگ مرمر کی جالیاں تو ایسی نفیس و نازک ہیں کہ شاید ہندوستان کی کسی عمارت میں ایسی جالیاں نہ ہوں گی۔ مشہور ہے کہ ایک خانہ کی کھدائی کی پانچ پانچ روپے اُجرت دی گئی تھی۔ اس خطیرے میں سنگ مرمر کے کواڑ بھی ہیں جو بہت خوبصورت ہیں۔ یہ کواڑ شاہ جہاں بادشاہ نے لال قلعہ کی موتی مسجد کے لئے بنوائے تھے اور اکبر ثانی کے وقت تک موتی مسجد کے دروازے میں لگے ہوئے تھے۔ اکبر ثانی نے یہ کواڑ اتروا کر بیٹے کے مجر میں لگا دیئے۔

بہادر شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد مرزا جہاں گیر کی اولاد اور مرزا بابر سے بدسلوکیاں شروع کیں۔ مرزا جہاں گیر تو مر چکے تھے مگر مرزا بابر زندہ تھے جو مرزا جہاں گیر کے بھائی تھے۔ مرزا بابر بھی مرزا جہاں گیر کی طرح شراب بہت پیتے تھے۔ ایک دفعہ شراب کے نشہ میں مدہوش ہو کر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں آئے اور مزار کے سرہانے بست دری کے چبوترے پر کرسی بچھا کر بیٹھے اور پیچوان منگا کر حقہ پینے لگے۔ کس کی مجال تھی جو بادشاہ کے بھائی کو اس بُری حرکت سے روکتا۔ تاہم میرے نانا شاہ غلام حسن صاحب مرحوم نے مرزا بابر کو سمجھایا کہ یہ جگہ حقہ پینے کی نہیں ہے۔ آپ کو ایسی حالت میں یہاں آنا مناسب نہ تھا۔ مرزا بابر نشہ میں تھے۔ اُنہوں نے نوکروں کو حکم دیا کوئی ہے۔ اس شخص کو دھکے دے کر ہمارے سامنے سے لے جاؤ۔ ابھی کوئی نوکر آگے بڑھنے نہ پایا تھا کہ شاہ غلام حسن نے مرزا بابر کے قریب جا کر کہا۔ فدوی حاضر ہے اور حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ یہ کہہ کر اس زور سے کرسی میں لات ماری کہ مرزا بابر کرسی سمیت چبوترے سے نیچے گر پڑے۔ مرزا بابر نے بادشاہ کے ہاں شاہ غلام حسن کے خلاف دعویٰ دائر کیا۔ کیوں کہ شاہی خاندان کے اندرونی مقدمات خود بادشاہ کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ بہادر شاہ نے واقعات سننے کے بعد کہا بھئی اماں (یہ بہادر شاہ کا تکیہ کلام تھا) تم نے بہت بُرا کیا جو شراب پی کر وہاں گئے۔ اور مزار کے پاس کرسی پر بیٹھے اور حقہ پیا۔ اگر شاہ غلام حسن تم کو مار ڈالتے تب بھی مجھے حق نہ تھا کہ میں اُن کے خلاف کوئی فیصلہ کرتا۔ اس سے مرزا بابر بہت بگڑے اور انہوں نے مرزا جہاں گیر کی بیوہ حسینی بیگم کو بہکایا کہ قدسیہ باغ اور روشن آرا باغ وغیرہ ابا حضرت (اکبر شاہ ثانی) نے جہاں گیر بھائی کو دے دیئے تھے۔ اور جہاں گیر بھائی کی وارث تم ہو۔ ان باغوں کی آمدنی وصول کرنے کا بادشاہی اہل کاروں کو کوئی حق نہیں ہے۔ حسینی بیگم پہلے ہی ناراض تھیں کیوں کہ بہادر شاہ نے اُن کی تنخواہ میں کچھ کمی کر دی تھی۔ اب مرزا بابر نے سہارا دیا تو اُن کی ہمت بڑھی اور اُنہوں نے فریزر صاحب ریذیڈنٹ کے ہاں دعویٰ دائر کر دیا۔ فریزر صاحب نے مقدمہ جج میں بھیج دیا۔ جج صاحب نے بادشاہ کے نام سمن جاری کئے۔ اس سے بہادر شاہ کو بہت اشتعال ہوا اور اُنہوں نے ریذیڈنٹ کو لکھا کہ میرے اندرونی معاملات میں کمپنی کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میرے دادا کا جو عہد نامہ بکسر کی لڑائی کے بعد لارڈ کلایو سے ہوا تھا اس میں یہ صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ بادشاہ کے خانگی معاملات میں کمپنی کے اہل کار دخل نہیں دیں گے اور خانگی مقدمات کے فیصلے بادشاہ کے اختیار میں رہیں گے۔ پھر تم نے حسینی بیگم کا دعویٰ کیوں قبول کیا۔ تم کو مناسب تھا کہ یہ دعویٰ میرے پاس بھیج دیتے اور میں اس کی تحقیقات کرتا۔ اور جیسا مناسب سمجھتا فیصلہ کر دیتا۔ تمہارے جج نے میرے نام سمن بھیج کر میری توہین کی۔ میں تم کو اور تمہارے گورنر جنرل کو کمپنی کا نوکر سمجھتا ہوں اور کمپنی کو اپنا نوکر سمجھتا ہوں۔ اس لئے تم سب میرے نوکر در نوکر ہو۔ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی حرکت نہ ہو۔ ورنہ میں لندن میں تمہاری ملکہ کو اس کی شکایت لکھوں گا۔

ریذیڈنٹ نے اس پیغام کا کوئی جواب نہیں دیا کیوں کہ مجھے اس خط و کتابت کا قلمی مجموعہ دستیاب ہو گیا ہے جو ریذیڈنسی سے بہادر شاہ کے پاس جایا کرتی تھی۔ اس مجموعہ میں مجھے بادشاہ کے اس پیغام کا جواب نہیں ملا۔ دوسرے مکتوبات سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اس مقدمہ کی دہلی کی عدالت میں کوئی پیروی نہیں کی اور جج نے بادشاہ کے خلاف ڈگری دے دی۔

تب ریذیڈنٹ نے بادشاہ کو لکھا کہ آپ اس کا اپیل آگرہ کی عدالت میں کر سکتے ہیں۔ بہادر شاہ نے نہایت بے معنی مگر خفگی

محفلِ ادب

بہادر شاہ بادشاہ

سانولی صورت۔ چھریرا بدن۔ لمبا قد۔ چہرے پر تیلی داڑھی۔ مونچھیں منڈی ہوئی۔ نام سراج الدین۔ کنیت ابوظفر۔ تخلص ظفر۔ محمد بہادر شاہ لقب۔ دلی کے آخری مغل بادشاہ تھے۔ ۱۸۳۷ء میں اپنے باپ معین الدین احمد اکبر شاہ ثانی کے مرنے کے بعد تخت نشین ہوئے تھے۔ باپ چونکہ بہت زیادہ زندہ رہے تھے۔ اس لئے بادشاہ کو بڑھاپا آجانے کے بعد تخت میسر آیا تھا۔

بہادر شاہ کے باپ اکبر ثانی کا قلمی روزنامچہ لال قلعہ دہلی کے میوزیم میں ہے۔ اس کی نقل میں نے حاصل کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر شاہ کی زندگی میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ اُن کے روزنامچے میں روزانہ لکھا جاتا تھا کہ آج فلاں وقت افیون نوش فرمائی اور فلاں وقت خاصا تناول فرمایا۔ ملکی مشاغل کی ایسی کوئی بات نہیں ہوتی تھی جس سے تاریخ پر روشنی پڑتی۔ مگر بہادر شاہ کے جتنے قلمی روزنامچے میں نے حاصل کئے اور احسن الاخبار بمبئی سے لال قلعہ کے سراج الاخبار کا اقتباس لیا تو اس سے ظاہر ہوا کہ بہادر شاہ کی زندگی اپنے باپ کے مقابلہ میں زیادہ سرگرم تھی۔ اگرچہ اختیارات محدود تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط اتنا بڑھ گیا تھا کہ بادشاہ کو ملکی معاملات میں کسی قسم کا دخل نہ تھا تاہم وہ رزیڈنٹ کو ایسے خطوط لکھتے رہتے تھے جن سے اُن کے اندرونی احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی ... بے اختیاری کو بہت زیادہ محسوس کرتے تھے اور اپنے اختیارات بڑھانے کے لئے جدوجہد کرتے رہتے تھے۔

ان کے دادا شاہ عالم کو اور ان کے باپ اکبر ثانی کو ایسٹ انڈیا کمپنی ایک لاکھ روپے ماہوار گزارے کے لئے دیا کرتی تھی۔ وہی لاکھ روپے بہادر شاہ کو بھی ملتے تھے۔ مگر روزنامچوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہادر شاہ بے ضرورت امرائے اور ساہوکاروں سے سودی قرض لیا کرتے تھے تاکہ کمپنی پر یہ ظاہر ہو کہ لاکھ روپے کی پنشن کم ہے اور بادشاہ کا اس میں گزارہ نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ وہ عوام پر بھی یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ انگریز کمپنی کا برتاؤ بہادر شاہ کے ساتھ اچھا نہیں ہے اور کمپنی ان کو اتنا کم گزارہ دیتی ہے کہ وہ مجبوراً سودی قرضے سے گزارہ کرتے ہیں۔ لہٰذا بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ ایک لاکھ روپے ماہوار بہت زیادہ تھے اور آج کل تو وہ لاکھ روپے پندرہ لاکھ کے برابر سمجھے جائیں گے۔ کیوں کہ بہادر شاہ کے زمانہ میں ارزانی کے سبب دو روپے ماہوار میں انسان گزارہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ میوزیم لال قلعہ میں جو گوشوارہ قلعہ کی تنخواہوں کا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی خاندان کے افراد کو کم سے کم چار روپے ماہوار تک گزارہ دیا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے لاکھ روپے کچھ کم نہ تھے۔ لیکن بہادر شاہ ہمیشہ ریذیڈنٹ کو شکایتیں لکھتے رہتے تھے کہ لاکھ روپے کم ہیں۔ کمپنی کو لکھو کہ اس میں اضافہ کیا جائے۔

لاکھ روپے کے علاوہ کمپنی نے کوٹ قاسم کا علاقہ بھی بادشاہ کے خرچ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اس کی آمدنی بھی بادشاہ کو دی جاتی تھی۔ اور دہلی کے چند بڑے بڑے باغوں کی آمدنی بھی شاہی کارندے وصول کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے اسباب میں ایک سبب یہ باغات بھی تھے۔ جس کا قصہ پہلی تحریروں میں اشارۃً لکھ چکا ہوں کہ بہادر شاہ کے چھوٹے بھائی مرزا جہاں گیر نے شراب کے نشہ میں سٹین صاحب ریذیڈنٹ کے گولی ماری تھی۔ نشانہ خطا ہوا۔ گولی سٹین صاحب کی ٹوپی میں لگی۔ تاہم ریذیڈنٹ نے مرزا جہاں گیر کو الٰہ آباد میں نظر بند کر دیا۔ اور مرزا جہاں گیر اسی نظر بندی کی حالت میں مر گئے اور ان کی لاش الٰہ آباد سے دہلی لائی گئی اور اس کو درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے گوشۂ شرقِ وجنوب میں دفن کیا گیا۔ اس وقت بہادر شاہ کے باپ اکبر ثانی زندہ تھے اور بہادر شاہ سے ناراض رہتے تھے۔ اور مرزا جہاں گیر کو بہت چاہتے تھے۔

اصغر کی یاد میں

ایک تصویر میرے سامنے ہے! کس کی؟ اُسے اِس دُنیا سے گئے دو برس ہو گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ وہ کہاں گیا؟ یہ مجھے معلوم نہ ہُوا۔ کہتے ہیں ایک اجنبی سرزمین میں اُس کا ٹھکانا ہے کہیں ایسی جگہ جو میں نے نہیں دیکھی۔ میں نے کہا اور بار بار کہا مجھے اُس...... جگہ کی تصویر ہی دکھا دو ـــــ سو یہ تصویر اُسی جگہ کی ہے، گویا ستائیس ماہ کے بعد میں اُس کے ٹھکانے کو دیکھ رہا ہوں۔

ایک سبزہ زار ہے، کنارے کنارے اونچے اونچے درخت ہیں ایسے جیسے سائیں سائیں کر رہے ہوں باہیں پھیلائے کسی کے انتظار میں کھڑے ہیں خدا جانے کب سے؟ سبزہ زار پر چند سنگ مرمر کے ٹکڑے ہیں کچھ پڑے کچھ کھڑے خوبصورتی سے ترتیب دیئے ہوئے۔ ایک کھڑے پتھر پر اُس کا نام ہے:

هُوَالکامل

اصغر بشیر راہ کامل ۔ سنہ ۱۹۴۰ء

اس کے بعد انگریزی میں کچھ الفاظ ہیں: اُس کا نام حسب نسب پھر تاریخ ومقام پیدائش ووفات جن کو یہاں دہرائے قلم کانپتا ہے، اور پھر اِنّا لِلّٰہ الخ ....

ہمارا "راہِ کامل" اُس "الکامل" سے جا ملا جس سے مل کر ہر کہہ و مہ کی صحیح تکمیل ہوتی ہے لیکن ہم ناقص اِس تکمیل سے کانپ جاتے ہیں! کیا کریں؟

سرہانے لکھا ہوا پتھر ہے، نیچے قدموں میں دائیں بائیں دو مرمریں گملوں میں گلاب کے دو ننھے پودے ہیں۔ گلاب کے پھول اُسے بہت عزیز تھے جو کبھی اِس خزاں دیدہ سے گلشن کا بلبلِ رنگیں نوا تھا۔ دنیا کے لئے پھول اب بھی کھلتے ہیں بلکہ اُف ہمارے لئے بھی؛ ہرے بھرے درخت اب بھی صبح وشام ہواؤں کا جھولا جھولتے ہیں اور پکھیرو اب بھی یہاں سے ہزاروں کوس دور ٹھاٹھیں مارنے والے سمندروں کے پار وہاں جہاں وہ ابدی نیند سوتا ہے اب بھی وہ اُس کی خواب گاہ کے اُوپر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اپنے پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے اور گاتے ہوئے اُڑ رہے ہیں اور یہاں میری نظروں کے سامنے جنتِ کشمیر میں بہار اب بھی اپنے جوبن پر ہے زندگی اب بھی دُنیا کی نعمتوں سے لُطف اُٹھا رہی ہے مگر دل ہے کہ کبھی کبھی بے اختیار پُکار اُٹھتا ہے "وہ کہاں؟"

یہ بے چینی کیوں ہے جب کہ ہم سبھی کے سب اِس "یہاں" سے اُسی "کہاں" کو جانے والے ہیں کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی دن ضرور ہی؟!

دُکھ صرف اتنا ہے کہ چودھویں کا چاند پُورا ہوتے ہی رات کی اتھاہ تاریکیوں میں وقت سے پہلے کیوں ڈوب گیا؟ آہ عقل کی اِس تماشا گاہ میں کسی "کیوں" کا کبھی جواب ملا؟ اور کیوں ملے؟ زندگی ایک مسلسل تلاش ہے حقیقت کی پُر اسرار خوبصورت راہ کی جو رہ رہ کر گُم ہوتی ہوئی خدا جانے کہاں سے کہاں چلی جاتی ہے ـــــ اسی راہ پر وہ ہم سے پہلے چلا گیا، ہمارا نوجوان رہنما!

بشیر احمد

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

شملہ

شملہ — ہمارے جنت نشان کا وہ قطعہ جس نے "ناہمواریت" کی قسم کھا رکھی ہے، جس کا چپہ چپہ اس قسم کو برقرار رکھنے کے لئے انتہائی وفاداری کا ثبوت دے رہا ہے۔ راہیں، انسانی قدموں نے اپنی شدید ضرورت کے ماتحت تیار کیں اور ان دم پھلا دینے والی چڑھائیوں کو دفع کرنے کے لئے جس قدر بھی قریب بل نظر آیا اُسے پختگی بخشی گئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مکان، مکین، راہ گزر، راہبر و غرض ہر اک کی یہی کوشش رہی کہ جہاں اور جس طرح بنے دھنس جاؤ۔ جدھر نگاہ اُٹھائیے، گہرائیاں اور پاتال کی خبر لانے والی کم بخت گہرائیاں، جنہیں اگر سبزہ اور درخت نہ ڈھانپیں تو نہ معلوم کیوں، شاید کوئی بہت بڑا اژدر پیٹ کے سخت درد کے مارے بے حد تڑپا، لوٹا اور جہاں جہاں اس کی لکیر نظر آئی، سرکار نے اسے پیٹ کر اک گرمائی صحت افزا مقام کی بنیاد ڈال دی۔ اک قابلِ اعتماد انگریز سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا: "ہندوستان میں شملے سے ہزار درجہ بہتر گل پوش و دل رُبا وادیاں موجود ہیں۔ آخر اس میں کون سی جاذبیت تھی جو اس کے انتخاب کا باعث ہوئی؟" جواب تھا: اس کی نیم انگلستانی آب و ہوا! — اللہ اکبر! اس ہنگامی لطف و حظ کی خاطر سینکڑوں جوان اور بڈھے منشیوں (کلرکوں) کو کہیں کا کہیں مصیبت کے گڑھوں میں لا پھینکا جاتا ہے۔ صبح سے شام تک دفتر کی چار دیواری میں محبوس اور رین بسیرے کے لئے سویرے اور دن ڈھلے، بغیر جرم قید با مشقت کی اذیت جسے چڑھائی اُترائی کا نام دیا جاتا ہے۔ کئی بیچارے گنگناتے سُنے گئے ہیں:

گھڑیاں تری طویل، ترے روز و شب دراز
موت آتی ہے پر نہیں آتی

مال روڈ اس کی مشہور تفریح گاہ سمجھئے جس پر شام کو غریبوں کے خون سے حاصل کی ہوئی دولت مصنوعی حسن کے اظہار کے لئے بیتاب ہوتی ہے۔ چُست ساریاں لیے جا اور بجا نخروں میں اک اک عضوِ بدن کی نمود کے لئے بے قرار اور اینٹھی ہوئی گردنیں، تنے ہوئے سینے، بھونڈے جسم بالعموم سوٹ میں لپٹے ہوئے۔ ریا کارانہ تفاخر کی نمائش کا مقصدِ وحید پیشِ نظر۔ ڈگ بھرتے نظر آتے ہیں۔ بعض انسانیت کے دشمن اظہارِ فخر و مباہات کے لئے اپنا تابوت بھی ساتھ ساتھ لئے ہوتے ہیں جسے عرفِ عام میں رکشا کہا جاتا ہے۔ ان کو کھینچنے کے لئے چند دھات کے کمینہ ٹکروں کے زور سے چار بھلے چنگے انسان حیوان کے طور پر استعمال میں لائے جاتے ہیں جن کے گرم تنفس کی آواز انصاف اور انسانیت کے کانوں پر آرے چلاتی ہے۔ مگر یہ نمرود، احساساتِ اخوت و آزادی سے کورے، شاید گندہ مٹی کے رذیل بُت ہیں۔ احساساتِ اخوت و آزادی سے بالکل کورے!۔

برسات اس میں کیف کی روح پھونک دیتی ہے جس میں بادلوں کی تُنک رو، بے خروش اور بے روک تھام دوڑ تمام شملے کو اک جھیل کا میدان تصور کئے ہوتی ہے۔ ابھی موسلا دھار بارش کے زوروں کے تھپیڑے ابھی ہلکی ہلکی پُر لطف پھوار اور ابھی دھوپ کے ٹکڑے کبھی یہاں کبھی وہاں، صاف ستھری گھاس سے پیار کرتے ہوئے!۔ ہریاول سے لدی ہوئی پہاڑیاں، اک دوسری کے پیچھے سے سر نکالتی ہوئی، اک نامعلوم آغاز سے نکل کر کسی نامعلوم اختتام میں غائب ہو جاتی ہیں۔ گھاس اور بہت سی بے نام نباتات مسلسل بارش سے نہائی دھوئی سُتھری اور نکھری نکھری معلوم ہوتی ہے۔ اور رات۔ اتھاہ بلندیوں اور پستیوں پر واقع مکانوں کی روشنیوں کی وجہ سے، دیپ مالا کا نظارہ پیش کرتی ہے۔ سکوت، ٹمٹماتی روشنیاں، اونچے نیچے مکان، لاتعداد گھرے ہوئے درخت۔ کچھ خواب کا سا عالم محسوس ہوتا ہے!۔ چاند کی وہ چودھویں رات جس پر چند آوارہ نرم رو بادلوں کے ٹکڑے فدا ہو رہے ہوں۔ تخیل آزما طلسم بن جاتی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے، نِتھرا نِتھرا نیلا آسمان، چاند کی خنک اور دلآویز زریں افشاں، تمام آس پاس خاموشی میں ملفوف اور ایسے میں بھولے بسرے ماضی کے دل گداز و لذیذ واقعات کلیجے میں ہوک نہ اٹھاویں تو کیسے۔ بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے ع:

"تم نہ ہوئے یاں ساجن! ہائے!"

رحیم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(۱)

[illegible]

تھیں۔ ایک لمحے تک اس نے نرگس کی آنکھوں میں۔ جو ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ پھر ہلکی سی میٹھی آواز میں بولا۔ وہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی پرندہ گا کر اپنی رفیقۂ حیات کو بلاتا ہے یا موسم بہار میں زمین سورج کو پکارتی ہے یا سمندر کی لہریں ساحل کو گلے لگانے کے لئے ہلکے ہلکے آواز دیتی ہیں۔

وہ نرگس کے حسن کی تعریف کر رہا تھا اور محبت کی کہانی کہہ رہا تھا۔ وہ محبت جس کا جواب محبت ہوتا ہے وہ مقناطیسی کشش جو پتھر جانے سے فولاد ایسی مضبوط چیز کو بھی مقناطیس بنا دیتی ہے۔ لیکن نرگس کے دل کی وہ حالت تھی جیسے کوئی برف کی انگلیوں سے اس کو بھینچ رہا ہو وہ خوف سے چیخ اٹھی۔ وہ خوف جس سے وہ آج سے واقف تک نہ تھی۔ اور پین کی آنکھوں میں بے رحمی کی جھلک تیز ہوگئی۔ لیکن اس کے الفاظ بدستور میٹھے تھے اور زبان پر محبت کی گفتگو جاری تھی۔ نرگس اس چڑیا کی طرح جو سانپ کی آنکھوں کے سامنے بے بس ہو جاتی ہے۔ سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ اور چہرہ رات میں اکیلے کنول کے پھول کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔

یکایک خوف گھبراہٹ سے بدل گیا۔ اور نرگس ایک چھلانگ مار کر اس تیزی سے بھاگی کہ شکار میں بھی کبھی نہ بھاگی تھی۔ پین موسم گرما کی آندھی کی طرح پیچھے ہو لیا۔ اور جب اس نے ایک قہقہہ لگایا تو نرگس کو معلوم ہوا کہ لڑکیاں اس کی نسبت جو کچھ کہا کرتی تھیں وہ سچ تھا۔ وہ مجسم خوف تھا۔ جانور بھی۔ انسان بھی۔ اور دیوتا بھی۔ جنگل کا اندھیرا بڑھتا چلا گیا۔ بیلوں اور درختوں کی ٹہنیوں نے نرگس کے پاؤں میں اُلجھ کر اسے کئی بار گرانے کی کوشش کی۔ بڑے بڑے درخت راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ اور چاروں طرف سے جو آوازیں آرہی تھیں ان سے معلوم ہونے لگا کہ تمام قدرت پین کے ساتھ مل کر اس کا مضحکہ اڑا رہی ہے۔ وہ نزدیک پہنچتا جا رہا تھا اور اس کی سانس نرگس کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے نرگس کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ——

نرگس خوف کے مارے اپنے ہوش و حواس تقریباً کھو چکی تھی کہ اسے اپنے سامنے ایک خاموش [illegible] دونوں کے سامنے ہی چپ چاپ بہتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اس میں کود گئی اور ندی کی دیویوں سے پناہ مانگی

پین دیوتا نے فتح مندی کے نعرے کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر نرگس کی کمر میں ڈال دیا [illegible] سکتے میں رہ گیا۔ کیوں کہ بجائے ایک خوبصورت جیتی جاگتی تڑپتی ہوئی ہستی کے اس کے ہاتھ میں گھاس [illegible] اور کچھ نہیں ——

ندی کی دیویوں نے رحم کھا کر نرگس کو اس کے قد کے موافق لمبی اور کمر کی طرح لچک دار گھاس میں تبدیل کر دیا تھا جو ندی کے کنارے آنا فانا اُگ آئی تھی۔

ان چند لمحوں میں دیوتا کو اپنی ناکامی کا احساس ہوا۔ اور اس کی ان آنکھوں میں سے وحشیانہ چمک جاتی رہی جن کی گہرائیوں کا پہاڑی ندی کی طرح جس پر سورج کی کرنیں کبھی نہیں پڑتیں اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور اس کی بجائے ان [illegible] اور غم کی وہ درد بھری جھلک پیدا ہو گئی جو انسان کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ ندی کے کنارے اس کی نگاہیں [illegible] جاتی معلوم ہوتی تھیں لیکن اُسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا —— اس کے ہونٹوں سے ایک لمبی ٹھنڈی سانس نکلی [illegible] ہی کے منہ سے نکل سکتی ہے جو انسانی غم سے آشنا ہو جائے اور جنگل کے درخت [illegible]

اس نے شکاری چاقو نکالا اور گھاس کے [illegible]

نرگس اب ہمیشہ [illegible]

علی منظور [illegible]

[illegible]

(1)

[illegible]

[illegible]

تھیں۔ ایک لمحے تک اس نے سرنکس کی آنکھوں میں۔ جو ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ پھر ہلکی سی میٹھی آواز میں بولا۔ وہ ایسی تھی جیسے کوئی پرندہ گا کر اپنی رفیقۂ حیات کو بلاتا ہے یا موسم بہار میں زمین سورج کو پکارتی ہے یا سمندر کی لہریں ساحل کو گلے لگانے کے لئے ہلکے ہلکے آواز دیتی ہیں۔

وہ سرنکس کے حسن کی تعریف کر رہا تھا اور محبت کی کہانی کہہ رہا تھا۔ وہ محبت جس کا جواب محبت ہوتا ہے وہ مقناطیسی کشش جو پتھر جانے سے فولاد ایسی مضبوط چیز کو بھی مقناطیس بنا دیتی ہے۔ لیکن سرنکس کے دل کی وہ حالت تھی جیسے کوئی برف کی انگلیوں سے اس کو بھینچ رہا ہو وہ خوف سے چیخ اُٹھی۔ وہ خوف جس سے وہ آج سے واقف تک نہ تھی۔ اور پَین کی آنکھوں میں بے رحمی کی جھلک تیز ہو گئی۔ لیکن اس کے الفاظ بدستور میٹھے تھے اور زبان پر محبت کی گفتگو جاری تھی۔ سرنکس اس چڑیا کی طرح جو سانپ کی آنکھوں کے سامنے بے بس ہو جاتی ہے۔ سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ اور چہرہ رات میں اکیلے کنول کے پھول کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔

یکایک خوف گھبراہٹ سے بدل گیا۔ اور سرنکس ایک چھلانگ مار کر اس تیزی سے بھاگی کہ شکار میں بھی کبھی نہ بھاگی تھی۔ پَین موسم گرما کی آندھی کی طرح پیچھے ہو لیا۔ اور جب اس نے ایک قہقہہ لگایا تو سرنکس کو معلوم ہوا کہ لڑکیاں اس کی نسبت جو کچھ کہا کرتی تھیں وہ سچ تھا۔ وہ مجسم خوف تھا۔ جانور بھی۔ انسان بھی۔ اور دیوتا بھی۔ جنگل کا اندھیرا بڑھتا چلا گیا۔ بیلوں اور درختوں کی ٹہنیوں نے سرنکس کے پاؤں میں اُلجھ کر اسے کئی بار گرانے کی کوشش کی۔ بڑے بڑے درخت راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ اور چاروں طرف سے جو آوازیں آ رہی تھیں ان سے معلوم ہونے لگا کہ تمام قدرت پَین کے ساتھ مل کر اس کا مضحکہ اڑا رہی ہے۔ وہ نزدیک پہنچتا جا رہا تھا اور اس کی سانس سرنکس کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے سرنکس کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ——

سرنکس خوف کے مارے اپنے ہوش وحواس تقریباً کھو چکی تھی کہ اسے اپنے سامنے ایک خاموش ندی دکھائی دی جو درختوں کے سائے میں چپ چاپ بہتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اس میں کود گئی اور ندی کی دیویوں سے پناہ مانگی ——

پَین دیوتا نے فتح مندی کے نعرے کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر سرنکس کی کمر میں ڈالا تاکہ اسے گرنے سے بچا لے۔ لیکن حیران ہو کر سکتے میں رہ گیا۔ کیوں کہ بجائے ایک خوبصورت جیتی جاگتی تڑپتی ہوئی ہستی کے اس کے ہاتھ میں گھاس کے چند تنکے تھے اور کچھ نہیں ——

ندی کی دیویوں نے رحم کھا کر سرنکس کو اس کے قد کے موافق لمبی اور کمر کی طرح لچک دار گھاس میں تبدیل کر دیا تھا جو ندی کے کنارے آناً فاناً اُگ آئی تھی۔

ان چند لمحوں میں دیوتا کو اپنی ناکامی کا احساس ہوا۔ اور اس کی اُن آنکھوں میں سے وحشیانہ چمک جاتی رہی جن کی گہرائیوں کا اُس پہاڑی ندی کی طرح جس پر سورج کی کرنیں کبھی نہیں پڑتیں اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور اس کی بجائے ان میں مایوسی اور غم کی وہ درد بھری جھلک پیدا ہو گئی جو انسان کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ ندی کے کنارے اس کی نگاہیں دور تک جاتی معلوم ہوتی تھیں لیکن اُسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا —— اس کے ہونٹوں سے ایک لمبی ٹھنڈی سانس نکلی جیسی ایک دیوی کے منہ سے نکل سکتی ہے جو انسانی غم سے آشنا ہو جائے اور جنگل کے درخت پتوں میں سے ہوا کے گزرنے سے سائیں سائیں کرنے لگے اس نے شکاری چاقو نکالا اور گھاس کے سات تنکے چُن کر چھوٹے بڑے کاٹ لئے۔ ان کو باندھ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور یہ کہہ کر کہ سرنکس اب بھی ہمیشہ میری ہی رہے گی اس ساز کی موسیقی کے ذریعے سے اپنے دل کی حالت کا اظہار کرنے لگا۔

اس طرح بنسری ایجاد ہوئی۔ خاموش جنگل میں غم انگیز نغمے سنائی دینے لگے۔ اور لمبی گھاس میں کسی مظلوم ہستی کی آہ کی سی آواز پیدا ہو گئی

عطاء الرحمن

"بَن سُری"

جب شام کے سائے لمبے ہو جاتے ہیں اور بادِ نسیم چپکے چپکے درختوں کے پتوں میں سے گزر کر خاموش جھیلوں کے شفاف پانی کی ہموار سطح پر ننھی ننھی لہریں بناتی ہوئی گزرتی ہے تو ایک لمبی —— نہایت لمبی —— اور حد سے زیادہ حسرت بھری۔ آہ! سنائی دیتی ہے۔ جنگل کی لاتعداد آوازوں میں اس سے زیادہ دل گیر اور غم انگیز کوئی آواز نہیں ہوتی کیوں کہ یہ اس لمبی گھاس کی آواز ہے جو ان جھیلوں کے کنارے اُگتی ہے۔ جس کے تنکے ہوا سے متاثر ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑ لیتے ہیں اور فرطِ غم میں جھومنے لگتے ہیں۔

یہ اس گھاس کی کہانی ہے اور قدیم یونانیوں کے شاعرانہ دماغ کی پیداوار ہے۔

سرنکس ایک لڑکی تھی جو جنگل کے کنارے رہتی تھی اور اتنی خوبصورت تھی کہ جب درختوں میں سے گزرتی تو جنگل کے جانور حیرت زدہ ہو کر رک جاتے اور دیکھتے رہ جاتے۔ لیکن اس نے کبھی اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ اسے محبت کی خواہش نہ تھی۔

وہ ڈائنا یعنی چاندنی کی دیوی کی پجارن تھی اور چاندنی کی دیوی چونکہ شکار کی بے حد شوقین تھی اور رات بھر ہرنوں اور بارہ سنگوں کے پیچھے بھاگ کر تیر سے اُن کا شکار کیا کرتی تھی، سرنکس بھی اس کے ساتھ ہوتی اور بعض دیکھنے والے تو یہ کہتے تھے کہ ایسی حالت میں دیوی اور پجارن میں تمیز نہ ہو سکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ دیوی کی کمان چاندی کی اور پجارن کی سینگ کی بنی ہوئی تھی۔

سرنکس بے خوف تھی۔ دلیر تھی۔ اُسے کوئی فکر یا غم نہ تھا۔ اس لئے اپنی اٹھتی جوانی کے دن نہایت اطمینان اور خوشی سے گزار رہی تھی۔ وہ ان لڑکیوں اور جنگل کی دیویوں کو بے پروائی اور نفرت سے دیکھتی تھی جو کسی انسان یا دیوتا کی محبت میں گھلی جاتی تھیں۔ وہ حد سے زیادہ خوبصورت تھی۔ خوش مزاج تھی۔ بے باک تھی۔ شریر تھی۔ اس کے قد کی لمبائی جسم کا تناسب اور کمر کی لچک جنگل کی دنیا میں دور دور مشہور تھی۔ شکار کا بھاگ کر پیچھا کرنا اس کا سب سے زیادہ مرغوب مشغلہ تھا۔ اور جب وہ کمان کھینچ کر تیر چلاتی تو چاندنی رات میں، سیاہ درختوں کے درمیان، اس کے سڈول بازو، نہایت متناسب اور نازک کلائی اور لمبی گاؤدم انگلیوں کی جھلک دیکھ کر جنگل میں رہنے والی مردہستیوں کی آنکھیں چندھیا جاتیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ بھولی تھی۔ اس کا دل بے لوث تھا اور رات کو جب سونے کے لئے پلنگ پر لیٹتی تو ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اور بند آنکھوں کی لمبی پلکوں پر وہ رونق ہوتی جو سوتے بچے کی آنکھوں پر ہوتی ہے۔

لیکن اسے قسمت کہئے یا اتفاق۔ ایک دفعہ جب چاندنی رات کی سایہ دار وادیوں میں شکار کھیل کر واپس آ رہی تھی تو وہ خوف میں سے وہ نا آشنا تھی، اس کے راستے میں کھڑا تھا۔ پین، جنگل کا دیوتا، وہ طاقت ور ہستی جس کے بے پناہ اقتدار سے جنگل کا بچہ بچہ واقف تھا، وہ مجسم ظلم اور خوشی، وہ مجسم محبت اور خوف، وہ مجسم جوانی اور تجربہ، وہ جانور جو انسان بھی تھا اور دیوتا بھی۔ سرنکس نے اس کے متعلق یہ باتیں دوسری لڑکیوں سے سنی تھیں۔ اسے دیکھا کبھی نہ تھا۔ اس وقت وہ راستہ روکے کھڑا تھا اور حیرت زدہ مسرت کے ساتھ سرنکس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ایک ایسی ہستی بھی جنگل میں موجود تھی اور اسے معلوم نہ تھا۔

پین کے سر پر چیڑ کے نوک دار پتوں کا تاج تھا۔ اس کا چہرہ جوان اور خوبصورت تھا لیکن عمر میں پہاڑوں اور سمندروں سے زیادہ، اس کی آنکھوں میں غم اور خوشی دونوں کی جھلک تھی اور ان میں سب سے زیادہ بے رحمی اور بے انداز محبت ایک ہی وقت میں دکھائی دیتی

Pan (جنگل کا دیوتا) – Diana (چاندنی کی دیوی) Syrinx (بن سری)

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

ترقی کی اور شعری پابندیوں سے انحراف ضروری نہ سمجھا۔

ایجادِ نظم کا سہرا آپ کے سر نہیں بندھتا اس لئے کہ اس کی بنیاد صدیوں پہلے پڑ چکی تھی۔ فارسی میں سکندر نامہ، یوسف زلیخا، شاہ نامہ وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں اور اس چیز میں گنجائشِ تاویل نہیں کہ اُردو شاعری فارسی شاعری کا عکس ہے۔ پھر اردو شاعری میں بھی نظم کی بنیاد سالہا سال پہلے پڑ چکی ہے اور اس نظم مروجہ کو برسوں سے قریب قریب ہر غزل گو شاعر اپنائے ہوئے ہے مشاعروں میں جہاں غزلیں پڑھی جاتی ہیں وہاں نظمیں بھی برابر پڑھی جاتی ہیں مگر وہ نظمیں عیاشانہ مضامین کی حامل نہیں ہوتیں۔ ان میں بیشتر اصلاحی ہوتی ہیں۔ ان میں معانی و مطالب بھی ہوتے ہیں۔ وہ ان پابندیوں میں بھی لکھی جاتی ہیں جو قانون سخن شعراء پر عائد کر چکا ہے اُن میں باہم ربط بھی ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ باوجود بحور اور ردیف و قوافی کی پابندی کے وہ جس عنوان کے ماتحت لکھی جاتی ہیں بے تکلف ان میں وہی مضامین لکھے جاتے ہیں جن کی ضرورت تھی اور ان دقیانوسی شاعروں کو اظہارِ خیال میں کوئی ایسی رکاوٹ ہی نہیں ہوتی جس کے حیلہ پر آپ نے اپنی مسجد علیحدہ بنانے کی زحمت گوارا فرمائی ہے۔ میں غزل گو شاعر ہوں اگر آپ کی نگاہ سے میری کوئی غزل یا نظم گذری ہو تو آپ مجھے یہ بتانے کا احسان فرمائیے کہ میری غزل میں کونسا شعر مخربِ اخلاق یا عریاں یا غیر قدرتی ہے اور نظم میں عنوان کے ماتحت کس جگہ ردیف و قوافی نیز بحر میرے اظہارِ خیال میں مانع ہوئے اسی صورت سے آپ ہر شاعر کو قیاس فرما لیجئے اور پھر اس حقیقت کی روشنی میں آپ اپنی جدید شاعری اور اس کی بے راہ روی پر بھی نظرِ ثانی فرمانے کی زحمت گوارا کیجئے۔ آپ کا ضمیر آپ کے اعتراضات کی اہمیت آپ پر خود واضح کر دے گا۔

ابر احسنی گنوری

کہتے ہیں مرے آگے وہ مجھ پہ عدو غش ہے
ہے ہے! مری اُلفت سے ہے بے خبری اتنی

تم اُٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا
سائے سے مرے وحشت اے رشکِ پری اتنی

حکیم مومن خاں دہلوی

ادب جدید کے پیغمبروں ہی کے اصول پر نظم کا مٹ جانا ثابت ہو چکا۔ مگر نظم فطرتِ انسانی بن گئی ہے نہیں مٹ سکتی اسنا جو چیز مٹ سکتی ہے وہ یہی بدعت ہو سکتی ہے اور باقی رہنے والی چیز ضرور باقی رہ جائے گی۔

ایک توجہ طلب بات یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ میں شاعری اور موسیقی لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کی بقا سے دوسری کی بقا ہے یا ایک کی تخلیق دوسری کے لئے ہوتی ہے اور دونوں کے قواعد و ضوابط منضبط ہیں اور ان قواعد میں بھی باہم ہم آہنگی ہے۔ آپ کے ادبِ جدید نے شاعری کے نظام کو توڑ کر درہم برہم کر دیا اور نئے اصول سے راگ الاپے جانے لگے۔ اب یا تو موسیقی کے نظام کو بھی بدل کر اپنی شاعری کا ہم آواز بنا لیجیے یا آپ اپنے ادبِ جدید کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کو موسیقی سے توڑ لیجیے۔ نظامِ موسیقی کو توڑ کر کنسٹرکر دینا آپ کے بس کی بات نہیں اور جب آپ موسیقی سے اپنی نظم کا تعلق قطع کرنے پر مجبور ہوں گے تو یہی چیز اس ادب کی موت کا باعث ہوگی۔ آج اسی ملک کا نہیں بلکہ ہر ملک کا ایک خاصہ گروہ موسیقی کو اپنا ذریعۂ معاش بنائے ہوئے ہے۔ اس ملک کی شاعری اور موسیقی میں ہم نوائی ہے۔ ہر ساز پر مختلف بحریں گائی جاتی ہیں اور یہ موسیقی و شاعری ہم آواز ہو کر ہر کسی کی روح کا سامانِ فرحت بنتی ہیں۔ جدید شاعری کے نمونے کا مندرجہ بالا شعر بتائیے کس ساز پر گایا جائے گا۔ اور مغنی اس کے گانے کے لئے کس مافوق الفطرت ہستی کا گلا عاریت لے گا اور اگر نہیں گایا گیا جو یقیناً نہیں گایا جا سکتا تو بتائیے یہ کاغذی پھول کے دن اپنی رنگینی (اگر اس میں کوئی رنگینی ہو) رکھ سکے گا اور پھر اس کو نظم کا خطاب دے کر آپ کی اس دماغ سوزی کا کیا حاصل ہوگا؟ یہ وجوہ ہیں کہ اس شاعری کا جلد مٹ جانا یقینی ہے۔ اس سے کہیں بہتر ہو کہ آپ نظم کو ترک کر کے سیدھی سادی نثر لکھ لیا کیجئے اس میں آپ کو اظہارِ خیال میں اور آسانی ہوگی۔

اب تک ایسا ہوتا رہا ہے کہ اگر کسی ناموزوں طبع متشاعر نے کوئی مصرعہ بھی سرِ مشاعرہ ایسا پڑھ دیا جس میں کوئی رکن یا لفظ حتیٰ کہ حرف بھی گھٹ بڑھ رہا ہو تو تمام مشاعرہ نے اس شاعر کو آلۂ تفریح سمجھ کر خوب خوب اڑایا ہے۔ کس قدر رقت و عبرت کا مقام ہے یہ انقلاب کہ آج وہی ارکان کی کمی بیشی کا عیب ہنر ہے اور ہنر بھی کس کا؟ تعلیم یافتہ طبقہ کا جس کی ذات سے زبان کو نہ معلوم کیا کیا امیدیں تھیں۔ ع

خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

رفتارِ زمانہ کے لحاظ سے ہر دور میں اس زمانہ کا ادب 'ادبِ جدید' کہلانے کا مستحق رہا ہے اس لئے کہ پچھلے ادب کے مقابلے میں اس میں کانٹ چھانٹ خراش کمی بیشی ہوتی رہی ہے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ آپ کو خدا نے قابلیت دی تھی۔ آپ صاحبِ علم تھے۔ اپنے زمانہ کے ادب میں آپ کو جو کمی نظر آتی تھی اس کو قواعد و قوانین کے دائرہ میں رہتے ہوئے پورا کرتے جو حسین اضافہ آپ کو مجوب تھا اس اضافہ کا آپ کو ادب میں اختیار تھا اگر آپ کے دعوے قوی ہوتے تو شعرائے ملک آپ کی بات کو ضرور تسلیم کرتے جیسا کہ وہ ہر معقول بات کو تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اب سے بیس برس پہلے کی اور آج کی ایک ہی شاعر کی دو غزلیں لیجئے اور دیکھئے کہ شاعر نے اپنے کلام میں زمانہ کے مطالبہ کے تحت کس قدر تبدیلیاں کر لیں۔ کل جو بات حسن تھی آج وہ اسی کو قبیح جانتا ہے۔ کل غزل کا دامن گل و بلبل، زلف و گیسو، دہن و کمر وغیرہ قسم کے مضامین سے لبریز تھا مگر آج یہ سب چیزیں مٹ کر اخلاق، فلسفہ، تصوف، وارداتِ زمانہ غرض ہر وہ چیز جو حیات اور ارواحِ انسانی سے متعلق ہے ان کی قائم مقام بن گئی۔ آپ بھی اسی ترقی اور تبدیلی میں حصہ لیتے مگر آپ نے غضب ہی کر دیا کہ جڑ پر قینچی رکھ دی۔

آج ادبِ جدید کا سب سے بڑا کارنامہ اور ادبِ قدیم و جدید کا فرق جدید تشابیہ بتایا جاتا ہے۔ تشبیہ ہمیشہ اسی چیز سے دی جاتی ہے جو انسان کی نظر میں ہو یا علم میں۔ پس آپ بھی اس دائرہ سے باہر نہیں گئے اور اگر انصاف کی نگاہ سے دیکھیں تو ہر دور میں ندرتِ تشابیہ پر ذہن شاعر متوجہ رہا ہے جو تشابیہ آپ کے پیشِ نظر ہیں آپ بھی قانونِ سخن کی حدود میں رہ کر ان تشابیہ کی ترویج فرماتے تو کیا چیز مانع ہو سکتی تھی۔ یہ سہرا بھی آپ کے سر بندھتا اور تخریبِ سخن کا الزام بھی نہ آتا۔ کیا آج جو شعرا اپنی غزل یا نظم میں ندرتِ تشبیہ سے کام لے رہے ہیں ہم اس کو ادبِ جدید نہیں کہہ سکتے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ کیا اس لئے کہ انہوں نے آپ کی طرح دامنِ سخن کو چاک چاک نہ کرتے ہوئے

بے اصولی اور طوائف الملوکی ہمیشہ نہیں رہتی۔ چونکہ ادبِ جدید بہر اصول۔ ہر قاعدے سے بے نیاز ہے۔ مطلق العنانی اس کا شیوہ ہے۔ ہر عیبِ سخن اس کے یہاں جائز اور روا ہے۔ محاسنِ سخن کی اس کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ بدترین لٹریچر پیش کر رہا ہے فضول اور نکمے عنوانات اس کا سرمایہ ہیں اور لطف یہ ہے کہ زبانِ اُردو ترقی کر رہی ہے۔ اس کے مصلحین اس کو صاف اور بے عیب بنانے میں قدرتی طریقہ پہ مصروف ہے۔ مصروف ہیں اور مصروف رہیں گے۔ ادبِ جدید کے خود ساختہ معزز رساں قوانین اس کسوٹی کو نہیں توڑ سکتے جو اردو زبان کی روح بن چکی ہے اور بات بات کو جس کسوٹی پر کسا جاتا ہے لہذا علمی اور اہلِ زبان طبقہ میں تو اس چیز کی رسائی ہو نہیں سکتی۔ اب ایک ایسی مختصر جماعت رہ جاتی ہے جس کا ذکر میں آغاز مضمون میں کر آیا ہوں۔ یعنی شاعر بننے کے شوقین اور اس کو باقاعدہ سیکھنے سے گریزاں وہ اس کو کچھ دن چلائے گی لیکن ایسا ایک وقت آجائے گا جب زمانے کی لتاڑ اس کو ان کارناموں کی طرف متوجہ کرے گی اور وہ سوچیں گے کہ معترضین کتنے تو سچ ہیں۔ وہی وقت اس کے نزع کا ہوگا۔

ادبِ جدید کا دوسرا قابلِ فخر کارنامہ بلینک ورس ہے۔ بلینک ورس انگریزی میں نظم ہے یا نثر کی کوئی قسم ہے اس کو تو ہندستانی انگریز یا انگریزی کے اُردو ادیب یا انگریزی اُردو کے ماہر جانیں مگر اتنا میں بھی جانتا ہوں کہ ہندوستانیوں نے دیگر شعبہ ہائے حیات کی نقالی کی طرح ادب میں بھی یہ انگریزی کی نقل کی ہے اور اس کی عظمت یہ کہہ کر ہمارے دلوں پر بٹھانے کی سعی کی ہے کہ صحیح خیالات وجذبات کا اظہار پابندیوں میں نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ادب کے جسم میں ردیف وقافیہ ایک بدگوشت ہے جو ہر موقع پر ہمارے اظہارِ جذبات میں سدِ راہ ہو جاتا ہے لہذا اس کی قید اڑا دینی چاہئے۔ چنانچہ ابتدائی حملہ میں ردیف وقافیہ کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ شاید آگرے کے کسی مشاعرہ میں سب سے پہلے میں نے جناب مانی جائسی کی زبانی ایک ایسی نظم سنی جس میں صرف ردیف و قوافی نہ تھے مگر وہ تمام محاسنِ سخن موجود تھے جو شعر کا جزو لاینفک ہیں۔ نظم کو سن کر بہت سے لوگ ہنس رہے تھے۔ میں بھی اس کو کچھ ایسا جانور سا سمجھ رہا تھا جس کے کان اور دم کاٹ کر لنڈورا کر دیا گیا ہو اور یہ غالباً اس وجہ سے کہ سخن کے جو نغمے میرے کانوں میں پڑے تھے یہ ان سب سے الگ راگ تھا۔ پھر تو یہ چیز عام سی ہو گئی اور کان آشنا ہو گئے۔

معترضین نے حامیانِ ادبِ جدید سے التماس کیا کہ حضور ردیف و قوافی تو آپ نے ذبح فرما دئے پھر بھی تو صحیح اظہارِ خیال میں رکاوٹ ہے۔ اس کا صحیح جواب ہمارے مجتہدینِ ادب نے تو نہیں دیا۔ مگر ہاں ماضی قریب میں ہمارے دو تین نوجوان شاعروں نے ایک عجیب قسم کا اجتہاد فرمایا۔ یعنی جس بحر میں انہیں نظم کہنی ہوتی اس کے مقررہ ارکان کی قید توڑ دی بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ بحر رمل مثمن محذوف میں تین بار فاعلاتن اور ایک بار فاعلن آتا تھا اور اسی کی تکرار سے ایک شعر بن جاتا تھا۔ ان حضرات نے ارکان بڑھانے گھٹانے شروع کر دئے اور اب ان کا شعر اس نمونے کا ہو گیا۔

تیری سانسیں وحشتِ افریقہ کے زہرآگیں درختوں کے وہ ہیں مسموم جھونکے جو گلوئے برگ وباراں کے لئے شمشیر ہیں (ایک مصرع)
کاش تیرا گھونٹ سکتا میں گلا (دوسرا مصرع)

اور اب اسی نمونے کی نظمیں ہمارے ادب میں ایک زریں باب کا اضافہ کر رہی ہیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ارکان کی پابندی اظہارِ خیال میں سدِ راہ نہیں ہوتی؟ اور جب آپ نے تمام پابندیوں توڑنے کا تہیہ کر لیا ہے تو اسے بھی کیوں نہ توڑا جائے۔ یہ بحر کا نام ہی کیوں رہے جو ہمارے خیالات کے اظہار میں مخل ہو۔ از روئے انصاف آپ کو یہ مطالبہ ماننا پڑے گا اور جس دن آپ نے یہ مطالبہ تسلیم کر لیا اسی روز آپ کی لغتِ ادب سے نظم کا لفظ حذف ہو جائے گا اور صرف نثر رہ جائے گی۔ لہذا سے

تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

غزل کے مخرب اخلاق ہونے کا سرٹیفکیٹ دینے والے کاش چشم ہوش وا کر کے دورِ حاضر کی نظم بھی ملاحظہ فرمالیں اور اپنے اِن ادبی کارناموں پر نظر بھی ڈالیں اور پھر خود ہی جج بن کر فیصلہ کریں کہ غزل مخرب اخلاق ہے یا یہ نظمیں۔ غزل میں عریانی ہوتی ہے یا آپ کی نظموں کی عریانی کو دیکھ کر شرافت۔ غیرت۔ حمیت۔ انسانیت سربگریباں ہو جاتی ہے۔ غزل بے کار چیز ہے کہ جس کا ہر شعر اپنے اندر ایک جداگانہ نظم پوشیدہ رکھتا ہے یا آپ کی یہ نظمیں دریا برد کر دینے کے قابل ہیں۔ معاف فرمائیں حامیانِ ادبِ جدید جو بے حیائی کے مظاہرے آپ کی اس چند دن کی چھوکری نظم نے پیش کر کے نظامِ شرافت درہم برہم کر دیا غزل صدیوں میں بھی نہ کر سکی وہاں تو اگر عشق کا اظہار بھی (جو ایک قدرتی جذبہ ہے) کیا گیا تو "عشق مرد با مرد" کا پردہ پہلے ڈال دیا گیا کہ کسی پردہ نشین خاتون کی رسوائی نہ ہو اور آپ نے تو ہر شریف زادی کو اس کی محل سرائے سے گھسیٹ گھسیٹ کر بازار کے بالاخانوں پر لا بٹھایا۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب آپ حضرات غزل پر اس قسم کے اعتراضات وارد فرماتے ہیں۔ خدا جانے آپ کا منہ کس طرح کھل جاتا ہے۔ میں جملہ حامیانِ جدید شاعری کو دعوتِ فکر و غور دیتا ہوں کہ وہ اپنی کل نظموں کو اٹھا کر دیکھیں کہ اُن میں بازاری مضمون کتنا ہے اور صلاحی کتنا۔ فضول چیزیں کس قدر ہیں اور کار آمد کتنی بر خلاف اس کے شعراء متغزلین میں وہ جس کسی کو بھی لغو گو اور عریاں نویس سمجھتے ہوں اس کے دیوان کا مطالعہ فرمائیں کہ اس میں اصلاحی۔ فطرتِ انسانی کے مطابق۔ نیز اچھے اسباق کے حامل کتنے اشعار ہیں اور بے کار کتنے۔ مجھے یقین ہے کہ غزل کے شعراء متقدمین میں بھی وہ اس قدر فضول گوئی اور بے راہ روی نہ پا سکیں گے جتنی اُن کی نظموں میں ہے اور حال کے شعراءِ غزل نے تو اپنے میدان ہی بدل لئے۔ جن چیزوں کی آڑ لے کر غزل کو مردود کیا جاتا ہے وہ آج قریب قریب غزل سے سب نکل چکی ہیں اور اس کا میدان بہت وسیع ہو چکا ہے۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

اس جدید شاعری کا دوسرا کارنامہ "لفظوں کا کھیل ہے" شاندار۔ چمک دار اور موٹے موٹے لفظ اس خوبی سے اشعار میں نظم فرمائے جاتے ہیں کہ معمولی پڑھا لکھا بیک نظر دیکھ کر مرعوب تو ہو جائے لیکن اس دریائے لفاظی میں لاکھ غواصی کرے گوہرِ معانی ہاتھ نہ آئے تراکیب بھی بہت شاندار ہوں گی۔ مگر سب اسی سانچے کی ڈھلی ہوئی۔ ایک جملہ سے اگر کافی دماغی ورزش کے بعد کوئی تک ملائی جا سکے تو اگلا فقرہ یا جملہ یا لفظ فوراً اس خیال میں سدِ راہ بن کر اعلان کر دیتا ہے کہ حضرت معاف فرمائیے۔ آپ جو کچھ معانی نکالنے کی سعی فرما رہے ہیں وہ میری موجودگی میں ممکن نہیں۔ ایسے مہمل الفاظ کا کافی ذخیرہ میں نے جمع کیا ہے اور آئے دن رسائل اس میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ مجھے اُن حضرات کی پردہ دری یا رسوائی منظور نہیں اس لئے میں اس کلام کا نمونہ مثال میں پیش کرنا نہیں چاہتا آپ یقین فرما لیجئے کہ میں نے بہت سی نظمیں ایسی پڑھی ہیں جن کے عنوان سے اُن کے اشعار کو دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اور نہ صرف عنوان و مضمون کی غیر آہنگی ہوتی ہے بلکہ از سرتا پا پوری نظم پڑھ جائیے اشعار میں نہ باہم ربط ہوتا ہے اور نہ باوجود کوشش بسیار یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے شاعر صاحب فرما کیا رہے ہیں اس نظم کا مقصد کیا ہے۔ بس غیر مسلسل بے ربط و بے تعلق الفاظ و جمل کا ایک جال بچھا ہوتا ہے جس کا مفہوم شاعر صاحب ہی سمجھتے ہوں۔ غزل کے مقابلے میں یہ معمّے بازی۔ کس قدر انصاف کا خون ہے کہ جس کا ایک ایک شعر ایک ایک مصرعہ بلکہ ایک ایک لفظ فن کی زنجیروں میں جکڑا ہوا۔ آزارِ اہمال سے پاک حشو و زوائد سے معرّا اور اپنی معنی آفرینیوں میں اپنا جواب خود ہی ہو مگر جس طرح روپئے کی آواز بلند ہونے پر سچائی خاموش ہو جاتی ہے اسی طرح اربابِ کمال جدید شاعری کی بلند بانگ صدائیں سن رہے ہیں اور چپ ہیں۔

یہ سیلاب بظاہر فی الحال اپنی پوری کف در دہانی اور غارت گری کے ساتھ صدیوں کا اساسۂ سخن بہائے لئے جاتا ہے مگر مستقبل قریب میں ہی یہ چڑھا دریا اترے گا اور اس کا یقیناً وہی حشر ہو گا جو ہر سیلاب کا ہوا کرتا ہے۔ میرا یہ دعویٰ بر بنائے تعصب نہیں بلکہ میں اس دعوے کی دلیل رکھتا ہوں کہ یہ عمارتِ ادبِ جدید ریت کی بنیادوں پر قائم کی گئی ہے اور اس کے معماروں نے اس کی نیو میں کافی سامانِ تباہی بھر دیا ہے جس سے اس کا ایک ہی ہوا کے جھونکے میں زمین پر آ رہنا یقینی ہے۔ سنئے۔

ہے لہٰذا اس طبقے نے بھی ایسی شکل نکالی جو شاعر بھی بنا دے اور حصول کی دشواریوں سے بھی بے نیاز رکھے۔

سب سے پہلے ان حضرات نے غزل کے خلاف جو بہت مشکل چیز ہے آواز بلند کرنا شروع کیا۔ مثلاً غزل بے کار چیز ہے۔ غزل مخرب اخلاق رجحانات پیدا کرتی ہے۔ غزل غیر فطری چیز ہے۔ غزل غیر مسلسل ہوتی ہے اور اس میں کوئی خیال وضاحت سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ غزل میں ردیف و قوافی کی پابندیاں آزادی سے اظہار خیال میں مانع ہوتی ہیں۔ غزل کے مضامین فرضی ہوتے ہیں جن کی بنیاد محض قافیے ردیف پر ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ پروپیگنڈے کا اصول ہے کہ کوئی سنے نہ سنے مانے نہ مانے کہے جاؤ۔ ابتدا میں لوگ مخالفت کریں گے پھر کچھ سننے لگیں گے پھر ہم خیال پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے اور انجام میں ایک اچھی خاصی جماعت تمہارے ساتھ ہوگی۔ میرے خیال سے ایسا ہی ہوا اور ہو رہا ہے۔

غزل دشمنی میں نظم کی ترویج بھی داخلِ دعویٰ ہے۔ معترضینِ غزل کہتے ہیں چونکہ گل و بلبل اور سرمہ مسی کے بے کار و فضول مضامین قوم کی اصلاح نہیں کر سکتے اس لئے نظم ہی ایسی چیز ہے جس میں جی بھر کر ایک خیال پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے اور ایک موضوع کے تحت وہ بہت کچھ کہا جا سکتا ہے جس سے انسان کے اصلاحی جذبات کو ابھارا جا سکے مگر یہ کوئی نئی چیز نہیں اس کی تخلیق بہت پہلے اردو میں ہو چکی تھی۔ حالی کا مسدس۔ اقبال کے متعدد نظم و مضامین۔ جوش کے ترانے لوگوں کے کانوں تک پہنچ چکے تھے اور جس وقت ادب جدید کے حامی اس کے لئے خم ٹھونک کر میدان کارزار میں آئے نظم اپنی بہت سی منازل طے کر چکی تھی اگرچہ غزل دوست حضرات کا دعویٰ اپنی جگہ اٹل ہے کہ غزل کا ایک شعر بسا اوقات پوری نظم کا خلاصہ ہوتا ہے اور جو اثر ایک لمبی نظم طلب معانی پر نہیں کر سکتی وہ ایک شعر کر جاتا ہے مگر پھر بھی قریب قریب سب غزل گو نے قسم کھا کر اپنانے میں عذر غم دل کا شبہ کیا۔ اور اصلاحی مقاصد کے لئے نظمیں لکھتے رہے مگر اسی قانون کے دائرے میں جو اساتذہ متقدمین نے اصنافِ سخن کے لئے مدون کیا تھا۔

اور چونکہ ادب جدید یا نئی شاعری کے دعوے دار جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس قانون پر چلنے سے معذور تھے لہٰذا ان کا علم بغاوت نہ صرف غزل کے خلاف بلند رہا بلکہ اس قسم کی نظمیں بھی دقیانوسی تخیل کی آئینہ دار ٹھہرائی گئیں۔ ایک ایسی چیز کی داغ بیل ڈالی جانے لگی جس کے معنی مجھ جیسے بے مایہ اور کم سواد غزل دوستوں کی سمجھ میں ہنوز نہیں آئے۔

نظم کے رواج کے حامی یہ دعویٰ لے کر اٹھے تھے کہ نظم سے اصلاح کا کام لیا جائے اور چونکہ غزل اس بات میں جسم شاعری پر عضوِ مفلوج ہے اس کو قطع کر دیا جائے اب دیکھنا یہ ہے کہ حامیانِ جدید شاعری کی نظمیں کس قدر اصلاحِ قومی فرما رہی ہیں اور غزل کے خراب کردہ اخلاق پر کس طرح غلاف کعبہ ڈال کر ان کو از سر تا پا تقدس۔ مردانگی۔ ہدایت کے سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے ——

آپ جس ادبی رسالے کو اٹھا کر دیکھئے آپ کو دو ایک ایسی نظمیں ضرور نظر آئیں گی۔ ان نظموں کی خصوصیات کیا ہوں گی ملاحظہ فرمائیے

(۱) نظم از سر تا پا (بالعموم) اغلاطِ فنی سے لبریز ہوگی اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ ایک ایسی اُردو کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے جس میں شاید عرشِ اعظم پر فرشتگانِ مقرب بارگاہ الٰہی شاعری کیا کریں گے۔

(۲) نظموں کے عنوانات ہوں گے۔ احساسات۔ نجمہ۔ عذرا۔ تمہاری یاد۔ گنگا کے کنارے وغیرہ وغیرہ۔ نظموں کے اندر کیا ہوگا؟ ایک شاعر کا ایک شریف زادی سے بازاری معاشقہ۔ جسم کے سڈول۔ اعضا کے متناسب۔ سرمہ کے دنبالہ دار ہونے اور لمس سے جسم شریف میں برقی لہر دوڑنے کا رقت خیز اور درد آمیز سانحہ۔ یا ایک شریف زادی کو ان کے ساتھ بھاگ چلنے کی تحریک۔ یا اپنے بیاہتا کو زہر دے کر ان عاشق وفادار کے ساتھ عقد ثانی فرما لینے کا مشورہ۔ یا پچھلی مجرمانہ محبت کے واسطوں سے دوبارہ رحم کھانے کی ترغیب یا خود زہر کھا کر تمام وفا ڈبو جانے کی دھونس۔ یا ساڑی۔ انگیا۔ کرتی۔ بوٹے دہن۔ جادوئے چشم سرمگیں کی رنگینی وغیرہ کا ... سے ہمارے شاعر ادب جدید کا بازار گرم ہے پر جادوں شالے چت غش کھا کر گرنا غرض مختلف ہیں خواب لیکن ایک ہی تعبیر ہے " کے تحت عنوان نظم کچھ ہو مگر نفس نظم میں یہی اصلاحی کارنامے ہوں گے۔ یا ان سے ملتے جلتے اور اس قسم کی نظمیں [illegible] سب ... ہوں گی۔

جدید شاعری

ہر دور میں دنیا کی ہر چیز ہم آغوشِ انقلاب رہی ہے اس انقلاب میں کبھی اُس چیز کی بقا کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں اور کبھی فنا
نظم کا وجود دنیا میں صدیوں سے پایا جاتا ہے ہمارے ہم وطن تو ویدوں کو (جو منظوم نہیں) ایشور کرت ... اور اُن کا
کے ساتھ پیدا ہونا بیان کرتے ہیں اس چیز کی ابتدا جس طرح بھی ہوئی یا ابتدا میں اس میں کیسی ہی بدنظمیاں رہی ہوں مگر انقلاباتِ زمانہ
آگے چل کر ان میں ایک نسق اور انتظام پیدا کر دیا ہے جس سے دنیا ایک حد تک مطمئن ہو گئی اور اس بنائے ہوئے راستے پر اپنی شاعر
منازل طے کرنے لگی۔ غالباً اسی وجہ سے اس کا نام نظم رکھا گیا ہے حالانکہ نظم کے معنی موتی کی لڑی کے بھی ہیں اور موتی کی لڑیاں بالعموم
اور برابر ہوتی ہیں میری مراد یہ نہیں کہ ہر قسم کے موتیوں کی لڑیاں برابر ہوتی ہیں بلکہ اپنی قسم کے موتیوں کے لچھے میں لڑیاں برابر ہوتی ہیں۔

ایشیائی شاعری میں اس کی ترقی یافتہ صورت غزل ہے بالخصوص ایران اور ہندوستان کے ادب سے اگر غزل کا سرمایہ مٹا دیا جائے ت
نامکمل اور برائے نام رہ جاتا ہے۔ اساتذۂ متقدمین نے غزل کے لئے ردیف و قوافی کو ضروری عنصر قرار دیا ہے اور بحر کی پابندی تو ہر نظم
کر دی ہے۔ (یہاں نظم سے میری مراد جملہ اصنافِ سخن ہے) اور عروض کے نام سے بحروں کا ایک مکمل قانون ہمارے لئے بنا دیا ہے
کے تحت ایشیائی شاعری اپنی منزلیں طے کر رہی ہے اور اس میں طرح طرح کی جدتیں رفعتیں بھی ہر دور میں ہوتی رہی ہیں۔ زمانہ جو
ترقی کرتا جائے گا زبان و کلام میں ترقیاں ہوتی رہیں گی۔ یہاں یہ بات کہہ دینے کی ہے کہ عروض کے علاوہ غزل پر نہ صرف غزل پر بلکہ ج
سخن پر کچھ اور بھی ایسی پابندیاں عاید ہوتی رہی ہیں جن پر عمل درآمد ذرا مشکل چیز ہے۔ مثلاً ہر صنفِ سخن کی مخصوص زبان۔ ندرتِ تخیل
بندش۔ مناسبتِ الفاظ۔ متروکات۔ صحتِ محاورات۔ تذکیر و تانیث کا صحیح استعمال۔ علم قافیہ۔ تراکیب عطفی و اضافی میں مخصوص قوا
وغیرہ وغیرہ۔ انہیں پابندیوں کے ماحول میں ہندی شاعر شعر کہنا شروع کرتا رہا اور انہیں پابندیوں میں اسے فن شعر اور شعر گوئی کی تکمیل کرنی پڑتا

ظاہر بات ہے کہ اتنی پابندیوں کو برداشت کرنا اور حصولِ فن کے لئے دس بارہ برس تک کسی استاد کا مطیع بنا رہنا اور اس شوق پر کسی نہ کس
نوعیت سے حسبِ حیثیت خرچ بھی کرنا معمولی کام نہیں پھر لطف یہ کہ اس محنتِ شاقہ کا حاصل سوائے پریشانی اور محسود ہو جانے کے کچھ نہیں
اور ملک کی فضا کچھ ایسی کہ جہاں کوئی خواندہ یا نیم خواندہ اپنے اندر بہت سی اعزازی خوبیاں دیکھنا چاہتا ہے وہاں شاعر ہو جانا بھی ضروری تصو
کرتا ہے پس یہ کس طرح ہو کہ چنے بھی کھائے جائیں اور ساتھ ہی ساتھ شہنائی بھی بجائی جائے یہاں ایک نکتہ اور بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ ہر ف
علم یا ہنر اپنے اصول کے لحاظ سے ایک الگ چیز ہوتا ہے اس کے حصول کے لئے ایک دیگر علوم کے ماہر کو بھی اُسی طرح ا۔ب۔ت سے کا
شروع کرنا پڑتا ہے جس طرح ایک مبتدی بچے کو۔ یہ بات دوسری ہے کہ شخصِ اول اپنے دیگر علوم کی وجہ سے اس بچے کے مقابلے میں ج
ترقی کرلے مگر ابتدائی طریقۂ کار اور دقتیں دونوں کو برابر لاحق ہوتی ہیں اور دونوں کو ایک ہی اسٹیج سے کام شروع کرنا ہوتا ہے۔ یہی حا
شاعری کا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا اور ایک فارسی اور عربی کا منتہی جب شاعری کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں تو دونو
کو یکساں دورے پڑتے ہیں یعنی ابتدائی اشعار دونوں کے ڈھیلے۔ بے ربط۔ متبذل قسم کے ہوتے ہیں حالانکہ بلحاظ علم دونوں میں بُعدالمشرقی
ہوتا ہے اب اگر صاحب علم مبتدی یہ خیال کرے کہ میں اتنا قابل ہوں لہٰذا میرے اشعار بھی روزِ اول سے ہی بلند اور بہتر ہونے چاہئیں۔
اس کی خام خیالی ہے۔ ہر نئے میدان میں قابل و جاہل ایک ہی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی زعمِ باطل کے فریب میں مبتلا ہو کر ہمارا گریجوایٹ طبقہ
اپنے کو شاعر کی حیثیت سے بھی ملک میں روشناس کرانا چاہتا ہے مگر شاعری کو سیکھنا اسے پسند نہ تھا کچھ اس لئے کہ اتنی پابندیاں کون برداشت
کرے اور کچھ اس لئے کہ ہم خود قابل ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں لہٰذا شاعری کیا مشکل ہے۔ ہماری شاعری کی تخریب کا سبب ہو گیا اور چونکہ
ایجاد کی ماں ہے پھر جب ایک قابل شخص یا گروہ کسی کام میں ہاتھ ڈالتا ہے تو اپنی قابلیت سے بہت سی مفید مطلب دلیلیں بھی سوچ

ہے لہٰذا اس طبقہ نے بھی ایسی صورت نکال ہی لی جو شاعر بھی بنا دے اور حصول کی دشواریوں سے بھی بے نیاز رکھے۔

سب سے پہلے اس جماعت نے غزل کے خلاف جو بہت مشکل چیز ہے آواز بلند کرنا شروع کیا۔ مثلاً غزل بے کار چیز ہے۔ غزل مخرب اخلاق رجحانات پیدا کرتی ہے۔ غزل غیر قدرتی چیز ہے۔ غزل غیر مسلسل ہوتی ہے اور اس میں کوئی خیال وضاحت سے بیان نہیں کیا جا سکتا غزل میں ردیف و قوافی کی پابندیاں آزادی سے اظہارِ خیال میں مانع ہوتی ہیں۔ غزل کے مضامین فرضی ہوتے ہیں جن کی بنیاد محض قافیئے ردیف پر ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ پروپیگنڈے کا اصول ہے کہ کوئی سنے نہ سنے مانے نہ مانے کہے جاؤ۔ ابتدا میں لوگ مخالفت کریں گے پھر کچھ سننے لگیں گے پھر ہم خیال پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے اور انجام میں ایک اچھی خاصی جماعت تمہارے ساتھ ہوگی۔ میرے خیال سے ایسا ہی ہوا اور ہو رہا ہے۔

غزل دشمنی میں نظم کی ترویج ہوئی دعویٰ یہ تھا کہ غزل میں چونکہ گل و بلبل اور سرمستی کے بے کار و فضول مضامین قوم کی اصلاح نہیں کر سکتے اس لئے نظم ہی ایسی چیز ہے جس میں جی بھر کر ایک خیال پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے اور ایک موضوع کے ماتحت وہ بہت کچھ کہا جا سکتا ہے جس سے انسان کے اصلاحی جذبات کو ابھارا جا سکے مگر یہ کوئی نئی چیز نہیں اس کی تخلیق بہت پہلے اُردو میں ہو چکی تھی۔ حالی کا مسدس۔ اقبال کے متعدد ضخیم دواوین۔ جوش کے ترانے لوگوں کے کانوں تک پہنچ چکے تھے اور جس وقت ادب جدید کے حامی غزل کے لئے خنجر بکف میدان کارزار میں آئے نظم اپنی بہت سی منازل طے کر چکی تھی اگرچہ غزل دوست حضرات کا دعویٰ اپنی جگہ اب بھی اٹل ہے کہ غزل کا ایک شعر بسا اوقات پوری نظم کا خلاصہ ہوتا ہے اور جو اثر ایک لمبی نظم قلب انسانی پر نہیں کر سکتی وہ ایک شعر کر جاتا ہے مگر پھر بھی قریب قریب ہر غزل گو نے نظم کو اپنانے میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ اور اصلاحی مقاصد کے لئے نظمیں لکھنے لگے مگر اسی قانون کے دائرے میں جو اساتذہ متقدمین نے اصناف سخن کے لئے مدون کیا تھا۔

اور چونکہ ادب جدید یا نئی شاعری کے دعوے دار جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس قانون پر چلنے سے معذور تھے لہٰذا ان کا علم بغاوت نہ صرف غزل کے خلاف بلند رہا بلکہ اس قسم کی نظمیں بھی دقیانوسی تخیل کی آئینہ دار ٹھہرائی گئیں۔ ایک ایسی چیز کی داغ بیل ڈالی جانے لگی جس کے معنی مجھ جیسے بے مایہ اور کم سواد غزل دوستوں کی سمجھ میں ہنوز نہیں آئے۔

نظم کے رواج کے حامی یہ دعویٰ لے کر اٹھے تھے کہ نظم سے اصلاح کا کام لیا جائے اور چونکہ غزل اس بات میں جسم شاعری پر عضوِ مفلوج ہے اس کو قطع کر دیا جائے اب دیکھنا یہ ہے کہ حامیانِ جدید شاعری کی نظمیں کس قدر اصلاحِ قومی فرما رہی ہیں اور غزل کے خراب کردہ اخلاق پر کس طرح غلاف کعبہ ڈال کر ان کو از سر تا پا تقدس۔ مردانگی۔ ہدایت کے سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے ——

آپ جس ادبی رسالے کو اٹھا کر دیکھئے آپ کو دو ایک ایسی نظمیں ضرور نظر آئیں گی۔ ان نظموں کی خصوصیات کیا ہوں گی ملاحظہ فرمائیے

(۱) نظم از سر تا پا (بالعموم) اغلاطِ فنی سے لبریز ہوگی اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ ایک ایسی اُردو کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے جس میں شاید عرش ِ اعظم پر فرشتگانِ مقرب بارگاہ الٰہی شاعری کیا کریں گے۔

(۲) نظموں کے عنوانات ہوں گے۔ احساسات۔ نجمہ۔ عذرا۔ تمہاری یاد۔ گنگا کے کنارے وغیرہ وغیرہ۔ نظموں کے اندر کیا ہوگا؟ ایک شاعر کا ایک شریف زادی سے بازاری معاشقہ۔ جسم کے سڈول۔ اعضا کے متناسب۔ سرمہ کے دنبالہ دار ہونے اور لمس سے جسم شریف میں برقی لہر دوڑنے کا رقت خیز اور درد آمیز سانحہ۔ یا ایک شریف زادی کو ان کے ساتھ بھاگ چلنے کی تحریک۔ یا اپنے بیاہتا کو زہر دے کر ان عاشق وفادار کے ساتھ عقد ثانی فرما لینے کا مشورہ۔ یا پچھلی مجرمانہ محبت کے واسطوں سے دوبارہ رحم کھانے کی ترغیب یا خود زہر کھا کر تمام وفا ڈبو جانے کی دھونس۔ یا ساڑی۔ انگیا۔ کرتی۔ بوٹے دہن۔ جادوئے چشم سرمگیں کی رنگینی و سحر کاری سے ہمارے شاعر بے چارے کا بار بار کے پھرا ہے پہ جا رہوں شانے چت غش کھا کر گرنا غرض مختلف ہیں خواب لیکن ایک ہی تعبیر ہے" کے تحت عنوان نظم کچھ ہو مگر نفس نظم [illegible] اصلاحی کارنامے ہوں گے جو ہاں سے [illegible] اور اس قسم کی نظمیں [illegible]

جدید شاعری

ہر دور میں دنیا کی ہر چیز ہم آغوشِ انقلاب رہی ہے اس انقلاب میں کبھی اُس چیز کی بقا کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں اور کبھی فنا کے ـــ نظم کا وجود دنیا میں صدیوں سے پایا جاتا ہے ہمارے ہم وطن تو ویدوں کو (جو منظوم نہیں) ایشور کرت [illegible] اور اُن کا دنیا کے ساتھ پیدا ہونا بیان کرتے ہیں اس چیز کی ابتدا جس طرح بھی ہوئی یا ابتدا میں اس میں کیسی ہی بدنظمیاں رہی ہوں مگر انقلاباتِ زمانہ نے آگے چل کر اِن میں ایک نسق و انتظام پیدا کر دیا ہے جس سے دنیا ایک حد تک مطمئن ہو گئی اور اس بنائے ہوئے راستے پر اپنی شاعرانہ منازل طے کرنے لگی۔ غالباً اسی وجہ سے اس کا نام نظم رکھا گیا ہے حالانکہ نظم کے معنی موتی کی لڑی کے بھی ہیں اور موتی کی لڑیاں بالعموم یکساں اور برابر ہوتی ہیں میری مراد یہ نہیں کہ ہر قسم کے موتیوں کی لڑیاں برابر ہوتی ہیں بلکہ اپنی قسم کے موتیوں کے لچھے میں لڑیاں برابر ہوتی ہیں۔

ایشیائی شاعری میں اس کی ترقی یافتہ صورت غزل ہے بالخصوص ایران اور ہندوستان کے ادب سے اگر غزل کا سرمایہ مٹا دیا جائے تو حصۂ منظوم نامکمل اور برائے نام رہ جاتا ہے۔ اساتذۂ متقدمین نے غزل کے لئے ردیف و قوافی کو ضروری عنصر قرار دیا ہے اور بحر کی پابندی تو ہر نظم کے لئے لازمی قرار دی ہے۔ (یہاں نظم سے میری مراد جملہ اصنافِ سخن ہے) اور عروض کے نام سے بحروں کا ایک مکمل قانون ہمارے لئے بنا دیا ہے۔ اسی قانون کے تحت ایشیائی شاعری اپنی منزلیں طے کر رہی ہے اور اس میں طرح طرح کی جدتیں رفعتیں بھی ہر دور میں ہوتی رہی ہیں۔ زمانہ جیسے جیسے ترقی کرتا جائے گا زبان و کلام میں ترقیاں ہوتی رہیں گی۔ یہاں یہ بات کہہ دینے کی ہے کہ عروض کے علاوہ غزل پر نہ صرف غزل پر بلکہ جملہ اصنافِ سخن پر کچھ اور بھی ایسی پابندیاں عاید ہوتی رہی ہیں جن پر عمل درآمد خود ادشکل چیز ہے۔ مثلاً ہر صنفِ سخن کی مخصوص زبان۔ نشستِ تخیل چستی بندش۔ مناسبتِ الفاظ۔ متروکات۔ صحتِ محاورات۔ تذکیر و تانیث کا صحیح استعمال۔ علم قافیہ۔ تراکیب عطفی و اضافی میں مخصوص قواعد۔ وغیرہ وغیرہ۔ انہیں پابندیوں کے ماحول میں ہندی شاعر شعر کہنا شروع کرتا رہا اور انہیں پابندیوں میں اسے فن شعر اور شعر گوئی کی تکمیل کرنی پڑی۔

ظاہر بات ہے کہ اتنی پابندیوں کو برداشت کرنا اور حصولِ فن کے لئے دس بارہ برس تک کسی استاد کا مطیع بنا رہنا اور اس شوق پر کسی نہ کسی نوعیت سے حسبِ حیثیت خرچ بھی کرنا معمولی کام نہیں پھر لطف یہ کہ اس محنتِ شاقہ کا حاصل سوائے پریشانی اور مسود ہو جانے کے کچھ نہیں اور ملک کی فضا کچھ ایسی کہ جہاں کوئی خواندہ یا نیم خواندہ اپنے اندر بہت سی اعزازی خوبیاں دیکھنا چاہتا ہے وہاں شاعر ہو جانا بھی ضروری تصور کرتا ہے پس یہ کس طرح ہو کہ چنے بھی کھائے جائیں اور ساتھ ہی ساتھ شہنائی بھی بجائی جائے یہاں ایک نکتہ اور بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ ہر فن علم یا ہنر اپنے اصول کے لحاظ سے ایک الگ چیز ہوتا ہے اس کے حصول کے لئے ایک دیگر علوم کے ماہر کو بھی اُسی طرح ا۔ب۔ت سے کام شروع کرنا پڑتا ہے جس طرح ایک مبتدی بچے کو۔ یہ بات دوسری ہے کہ شخصِ اول اپنے دیگر علوم کی وجہ سے اس بچے کے مقابلے میں جلد ترقی کرے مگر ابتدائی طریقۂ کار اور دقتیں دونوں کو برابر لاحق ہوتی ہیں اور دونوں کو ایک ہی اسٹیج سے کام شروع کرنا ہوتا ہے۔ یہی حال شاعری کا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا اور ایک فارسی اور عربی کا منتہی جب شاعری کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں تو دونوں کو یکساں دورے پڑتے ہیں یعنی ابتدائی اشعار دونوں کے ڈھیلے۔ بے ربط۔ مبتذل قسم کے ہوتے ہیں حالانکہ بلحاظ علم دونوں میں بُعد المشرقین ہوتا ہے اب اگر صاحب علم مبتدی یہ خیال کرے کہ میں اتنا قابل ہوں لہٰذا میرے اشعار بھی روزِ اول سے ہی بلند اور بہتر ہونے چاہئیں۔ یہ اس کی خام خیالی ہے۔ ہر نئے میدان میں قابل و جاہل ایک ہی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی زعم باطل کے فریب میں مبتلا ہو کر ہمارا گریجوایٹ طبقہ جو اپنے کو شاعر کی حیثیت سے بھی ملک میں روشناس کرانا چاہتا ہے مگر شاعری کو سیکھنا اسے پسند نہ تھا کچھ اس لئے کہ اتنی پابندیاں کون برداشت کرے اور کچھ اس لئے کہ ہم خود قابل ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں لہٰذا شاعری کیا مشکل ہے۔ ہماری شاعری کی تخریب کے درپے ہو گیا اور چونکہ فطرتاً انحطاط کی حالت ہے پھر جب ایک قابل شخص یا گروہ کسی کام میں ہاتھ ڈالتا ہے تو اپنی قابلیت سے بہت سی مفید مطلب دلیلیں بھی سوچ لیتا

ہے لہٰذا اس طبقہ نے بھی ایسی صورت نکال ہی لی جو شاعر بھی بنا دے اور حصول کی دشواریوں سے بھی بے نیاز رکھے۔

سب سے پہلے اس جماعت نے غزل کے خلاف جو بہت مشکل چیز ہے آواز بلند کرنا شروع کیا۔ مثلاً غزل بے کار چیز ہے۔ غزل مخرب اخلاق رجحانات پیدا کرتی ہے۔ غزل غیر قدرتی چیز ہے۔ غزل غیر مسلسل ہوتی ہے اور اس میں کوئی خیال وضاحت سے بیان نہیں کیا جا سکتا غزل میں ردیف و قوافی کی پابندیاں آزادی سے اظہار خیال میں مانع ہوتی ہیں۔ غزل کے مضامین فرضی ہوتے ہیں جن کی بنیاد محض قافیئے ردیف پر ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ پروپیگنڈے کا اصول ہے کہ کوئی سنے نہ سنے مانے نہ مانے کہے جاؤ۔ ابتدا میں لوگ مخالفت کریں گے پھر کچھ سننے لگیں گے پھر ہم خیال پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے اور انجام میں ایک اچھی خاصی جماعت تمہارے ساتھ ہوگی۔ میرے خیال سے ایسا ہی ہوا اور ہو رہا ہے۔

غزل دشمنی میں نظم کی ترویج ہوئی دعویٰ یہ تھا کہ غزل میں چونکہ گل و بلبل اور سرمہ مسی کے بے کار و فضول مضامین قوم کی اصلاح نہیں کر سکتے اس لئے نظم ہی ایسی چیز ہے جس میں جی بھر کر ایک خیال پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے اور ایک موضوع کے ماتحت وہ بہت کچھ کہا جا سکتا ہے جس سے انسان کے اصلاحی جذبات کو ابھارا جا سکے مگر یہ کوئی نئی چیز نہیں اس کی تخلیق بہت پہلے اُردو میں ہو چکی تھی۔ حالی کا مسدس۔ اقبال کے متعدد ضخیم دواوین۔ جوش کے ترانے لوگوں کے کانوں تک پہنچ چکے تھے اور جس وقت ادب جدید کے حامی غزل کے لئے خنجر بکف میدان کارزار میں آئے نظم اپنی بہت سی منازل طے کر چکی تھی اگرچہ غزل دوست حضرات کا دعویٰ اپنی جگہ اب بھی اٹل ہے کہ غزل کا ایک شعر بسا اوقات پوری نظم کا خلاصہ ہوتا ہے اور جو اثر ایک لمبی نظم قلب انسانی پر نہیں کر سکتی وہ ایک شعر کر جاتا ہے مگر پھر بھی قریب قریب ہر غزل گو نے نظم کو اپنانے میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ اور اصلاحی مقاصد کے لئے نظمیں لکھنے لگے مگر اسی قانون کے دائرے میں جو اساتذہ متقدمین نے اصناف سخن کے لئے مدون کیا تھا۔

اور چونکہ ادب جدید یا نئی شاعری کے دعوے دار جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس قانون پر چلنے سے معذور تھے لہٰذا ان کا علم بغاوت نہ صرف غزل کے خلاف بلند رہا بلکہ اس قسم کی نظمیں بھی دقیانوسی تخیل کی آئینہ دار ٹھہرائی گئیں۔ ایک ایسی چیز کی داغ بیل ڈالی جانے لگی جس کے معنی مجھ جیسے بے مایہ اور کم سواد غزل دوستوں کی سمجھ میں ہنوز نہیں آئے۔

نظم کے رواج کے حامی یہ دعویٰ لے کر اٹھے تھے کہ نظم سے اصلاح کا کام لیا جائے اور چونکہ غزل اس بات میں جسم شاعری پر عضو مفلوج ہے اس کو قطع کر دیا جائے اب دیکھنا یہ ہے کہ حامیانِ جدید شاعری کی نظمیں کس قدر اصلاحِ قومی فرما رہی ہیں اور غزل کے مخرب کردہ اخلاق پر کس طرح غلاف کعبہ ڈال کر ان کو ازسرتاپا لتقدس۔ مردانگی۔ ہدایت کے سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے ——
آپ جس ادبی رسالے کو اٹھا کر دیکھئے آپ کو دو ایک ایسی نظمیں ضرور نظر آئیں گی۔ ان نظموں کی خصوصیات کیا ہوں گی ملاحظہ فرمایئے

(۱) نظم ازسرتاپا (بالعموم) اغلاطِ فنی سے لبریز ہوگی اور اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ ایک ایسی اُردو کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے جس میں شاید عرش اعظم پر فرشتگانِ مقرب بارگاہ الٰہی شاعری کیا کریں گے۔

(۲) نظموں کے عنوانات ہوں گے۔ احساسات۔ نجمہ۔ عذرا۔ تمہاری یاد۔ گنگا کے کنارے وغیرہ وغیرہ۔ نظموں کے اندر کیا ہوگا؟ ایک شاعر کا ایک شریف زادی سے بازاری معاشقہ۔ جسم کے سڈول۔ اعضا کے متناسب۔ سرمہ کے دنبالہ دار ہونے اور لمس سے جسم شریف میں برقی لہر دوڑنے کا رقت خیز اور دردآمیز سانحہ۔ یا ایک شریف زادی کو ان کے ساتھ بھاگ چلنے کی تحریک۔ یا اپنے بیاہتا کو زہر دے کر ان عاشق وفادار کے ساتھ عقد ثانی فرما لینے کا مشورہ۔ یا پچھلی مجرمانہ محبت کے واسطوں سے دوبارہ رحم کھانے کی ترغیب یا خود زہر کھا کر تا ہفتہ ڈھا جانے کی دھونس۔ یا ساری۔ انگیا۔ کرتی۔ بوئے دہن۔ جادوئے چشم سرمگیں کی رنگینی و سحرکاری سے بھدے شاد [illegible] کا بار [illegible] کے چوراہے پر چاروں شانے چت غش کھا کر گرنا غرض مختلف ہیں خواب لیکن ایک [illegible] تعبیر ہے" کے تحت [illegible]
نظم گو ہوگا غرض نظم میں جو اصلاحی کارنامے ہوں گے وہ یا ان سے ملتے جلتے اور اس قسم کی نظمیں [illegible]

[illegible]

بے بسی

رات کی تیرہ و تاریک فضا میں تارے
جھلملاتے ہوئے جب سانس لیا کرتے ہیں
اِک خیال آنکھ مچولی کا مجھے آتا ہے ——
دِن کے ہنگامے میں ہستی کے پرائے لمحے
جن کو میں پیٹ کے دھندوں میں اُڑا دیتا ہُوں
ایک ایک آتے ہیں آنکھوں میں کہانی بن کر،
زندگی کم ہے —— مگر فرصتِ ہستی کب ہے ؟
آرزوئیں مری پھیکی ہیں کہ دِل کی باتیں
میرے سینے ہی میں گھٹ گھٹ کے رہی جاتی ہیں ——
سانس دو چار مسرت کے جو لینے تھے مجھے
پیٹ کے دھندوں پہ قربان ہوئے جاتے ہیں ——
میری دنیا کے پہاڑوں پہ بہاریں بھی تو ہیں،
گلستاں بھی ہیں، کھلے کھیتوں کے نظارے بھی
تُو بھی آغوش میں رہنے کے لئے ہے بیتاب، ——
سانس دو چار مسرت کے جو لے سکتا تھا
ایسے انداز میں بے کار لئے جاتا ہُوں
جیسے قیمت ہی نہیں اُن کی، مری نظروں میں ——
کس قدر تلخ حقیقت ہے، مگر کیا کیجے ؟ ——
اب تو بس رات کی تاریک فضا ہے جس میں
اِک خیال آنکھ مچولی کا مجھے آتا ہے
بے بسی اُس کو بھی بے کار بنا دیتی ہے

یوسف ظفر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

× × × × × × × × × ×

[illegible]

[illegible]

[illegible]

× × × × × × × × × ×

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بھائی مرزا یوسف اور صاحبِ خانہ بنسی دھر چوسر کھیلنے میں معروف ہیں۔

بنسی دھر:۔ رنگ تو آپ سب لے گئے۔ بد رنگ میں یہ جو دو گوٹیں آپ کی باقی ہیں اُن کے لئے ساری اپنی گوٹیں، کھڑا ہو جاؤں گا اور اُن کو منزلِ مقصود تک پہونچنے نہ دوں گا۔

اسد اللہ:۔ یہ گوٹ تو پاؤ بارہ یا سات چھ تیرہ سے اِس گھر میں پہونچتی ہے۔ رہی دوسری وہ کچے بارہ سے گھر جاتی ہے۔ لو دیکھو پھینکتا ہوں۔

بنسی دھر:۔ پانسہ بنا کر نہ پھینکئے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں آپ تلے اُوپر پانسے رکھ رہے ہیں۔

مرزا صاحب:۔ اب روتے ہو (پانسہ پھینک کر) لو، یہ پاؤ بارہ .... وہ مارا پاؤ بارہ۔ لو کچے بارہ بھی لو (پانسہ پھینکتے ہوئے) لو یہ کچے بارہ .... دیکھا۔ دیکھ لو۔ یہ کچے بارہ دھرے پڑے ہیں۔ یوں پانسہ پھینکتے ہیں۔

مرزا یوسف:۔ بھائی جان۔ آپ کی پشت پر جوگنی ہے جوگنی۔

اسد اللہ:۔ (بنسی دھر سے) کہو چھ تین نو پھینکوں۔

بنسی دھر:۔ چھ تین نو کہیں آئے نہ ہوں۔

(مرزا پانسہ پھینکتے ہیں پر چھ تین نو نہیں آتے۔ اِسی پانسے پر اُن کی بازی رُکی پڑی ہے کہ اتنے میں اُن کے نانا خواجہ غلام حسین خان کا خدمت گار آتا ہے، گھبرایا ہوا)

خدمتگار:۔ (اسد اللہ سے) حضور آپ کے نانا جان کی بُری حالت ہے۔ دِل بیٹھے کراہ رہے ہیں۔

اسد اللہ:۔ ارے بھئی ابھی ابھی تو میں اُن کو اچھا بھلا چھوڑ آیا ہوں (زچ بچ ہوتے ہوئے) اور یہاں بازی چھ تین نو پر رُکی ہوئی ہے۔

بنسی دھر:۔ اب دو ہاتھ میں میری ساری گوٹیں پونگ جاتی ہیں۔ یا چھ تین نو پھینکتے جائیے یا ہار مان لیجئے۔

مرزا اسد اللہ:۔ (پانسہ ہاتھ میں لے کر) لو یہ چھ تین نو۔

بنسی دھر:۔ تین کانے۔

مرزا اسد اللہ:۔ بھئی نانا جان کو دیکھ آؤں۔ یوں ہی بازی بچھی رہنے دو۔

(مرزا اسد اللہ، خدمت گار کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتے ہیں)

× × × × × × × × × ×

چوتھا منظر

خواجہ غلام حسین خان کمیدان کا مکان ـــــ دیوانخانہ۔ پُر تکلف طور پر سجا ہوا۔ خواجہ غلام حسین خان بے ہوش پڑے ہیں۔ پاس حکیم صاحب، اور ملا عبد الصمد بیٹھے ہیں۔

عبد الصمد:۔ حکیم صاحب۔ ابھی ابھی بھلے چنگے مجھ سے باتیں کر رہے تھے کہ دِل پکڑ لیا اور فرمانے لگے، میں چلا۔ دل میں درد ہو رہا ہے اور ایک منٹ کے اندر غشی طاری ہو گئی۔

حکیم صاحب:۔ دل کی بیماری دفعتہً ہی اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ غشی بھی لازمی چیز ہے۔ دیکھئے میں نبض دیکھتا ہوں۔

عبد الصمد:۔ کہئے نبض کیا کہ رہی ہے (اضطراب کی حالت میں اٹھ کر) دیکھئے اسد اللہ خان کو بلوا بھیجئے کہ جلد آ

اڑانے کے سوا اور کچھ نہیں رہا........ دولت برباد کر رہے ہو۔ بھئی ہوش میں آؤ۔ کوئی کمال حاصل کرو۔ نام پیدا کرو۔
اپنے بڑوں کی جائداد میں اضافہ کرو۔

(سامنے سے مرزا غالب کے استاد ملا عبدالصمد پارسی ایرانی آتے دکھائی دیتے ہیں)

مرزا اسد اللہ:۔ (ذرا آگے بڑھ کر) اسلام وعلیکم۔

عبدالصمد:۔ زندہ باش۔

خواجہ:۔ میں بھی تسلیم عرض کرتا ہوں۔

عبدالصمد:۔ کورنش بجالاتا ہوں۔ مزاج مبارک۔

خواجہ صاحب:۔ الحمد للہ۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔ خوب وقت پر آگئے۔ میں آپ کے شاگرد کو کچھ نصیحت کر رہا تھا۔

(عبدالصمد غالب کی طرف دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے)

خواجہ:۔ میں اس سے کہہ رہا تھا کہ بھئی اب تم سولہ سترہ برس کے ہوگئے ہو۔ ایک بچے کے باپ ہونے والے ہو۔ ذرا لہو لعب کھیل کود میں کمی کرو۔ کچھ دنیا میں نام پیدا کرو۔ کوئی کمال حاصل کرو۔

ملا عبدالصمد:۔ (غالب سے) جاؤ بابا جاؤ۔ تمہیں جہاں جانا ہے جاؤ۔ میں خواجہ صاحب سے مل کر تمہارے پاس آؤں گا۔

(غالب چلے جاتے ہیں)

خواجہ صاحب:۔ اچھا جو آپ کی مصلحت۔

عبدالصمد:۔ جناب خواجہ صاحب، بُرا نہ مانئے تو ایک بات عرض کروں۔

خواجہ صاحب:۔ نہیں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ آپ فرمائیے، کیا ارشاد ہے۔

عبدالصمد:۔ اگر مرزا نوشہ آپ کی طرح کمیدان یا باپ دادا کی طرح رسالدار یا اُن سے بھی زیادہ مثلاً عہدۂ چار ہزاری تک پہونچ کر سپہ سالار بھی ہوگیا تو کیا۔ ایسوں کے نام اُن کے ساتھ ہی مٹ جاتے ہیں لیکن اسے تو ادب اور شعر کا افراسیاب بننا ہے۔

خواجہ صاحب:۔ آپ کی اس تقریر سے میں کچھ نہ سمجھا آپ کا مطلب کیا ہے؟

عبدالصمد:۔ مطلب یہ ہے کہ اسد اللہ خاں بہت بڑا شاعر ہوگا۔ اُس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور آپ کا ہمارا نام بھی اُسی کی بدولت روشن ہوگا۔ اُس کو اپنے حال پر چھوڑ دیجئے۔

خواجہ صاحب:۔ میں تو سپاہی ہوں اور آپ علم جاننے والے ہیں، باقی اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ مرزا نوشہ فنِ شاعری میں نام پیدا کرے گا اور اُس کا کلام قیامت تک باقی رہے گا تو یوں ہی سہی۔ خدا ایسا ہی کرے...... آپ کے منہ میں گھی شکر...... پر فضول خرچی سے تو اُسے باز آنا چاہئے۔

(دونوں دیوانخانے کی طرف بڑھتے ہیں)

× × × × × × × × × ×

تیسرا منظر

بنسی دھر کا مکان۔ ان کے متعلق غالب منشی شیو نرائن کے نام ایک خط لکھتے ہوئے کہتے ہیں "میں اور منشی بنسی دھر ہم عمر تھے منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں، انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی باہم شطرنج اور اختلاط اور صحبت۔ آدھی آدھی رات گذر جاتی تھی۔ چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے"۔ بنسی دھر کے مکان کی بیٹھک۔ گاؤ تکیے لگے ہیں سفید بے داغ چاندنی بچھی ہوئی ہے۔ مرزا غالب ان کے

بھائی مرزا یوسف اور صاحبِ خانہ بنسی دھر چوسر کھیلنے میں معروف ہیں۔

بنسی دھر:— رنگ تو آپ سب لے گئے۔ بدرنگ میں یہ جو دو گوٹیں آپ کی باقی ہیں اُن کے لئے ساری اپنی گوٹیں، کھڑا ہو جاؤں گا اور اُن کو منزلِ مقصود تک پہونچنے نہ دوں گا۔

اسداللہ:— یہ گوٹ تو پاؤ بارہ یا سات چھ تیرہ سے اِس گھر میں پہونچتی ہے۔ رہی دوسری وہ کچے بارہ سے گھر جاتی ہے۔ لو دیکھو پھینکتا ہوں۔

بنسی دھر:— پانسہ بنا کر نہ پھینکئے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں آپ تلے اُوپر پانسے رکھ رہے ہیں۔

مرزا صاحب:— اب روتے ہو (پانسہ پھینک کر) لو، یہ پاؤ بارہ .... وہ مارا پاؤ بارہ۔ لو کچے بارہ بھی لو (پانسہ پھینکتے ہوئے) لو یہ کچے بارہ .... دیکھا۔ دیکھ لو۔ یہ کچے بارہ دھرے پڑے ہیں۔ یوں پانسہ پھینکتے ہیں۔

مرزا یوسف:— بھائی جان۔ آپ کی پشت پر جو گنی ہے جو گنی۔

اسداللہ:— (بنسی دھر سے) کہو چھ تین نو پھینکوں۔

بنسی دھر:— چھ تین نو کہیں آئے نہ ہوں۔

(مرزا پانسہ پھینکتے ہیں پر چھ تین نو نہیں آتے۔ اِسی پانسے پر اُن کی بازی رُکی پڑی ہے کہ اتنے میں اُن کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کا خدمت گار آتا ہے، گھبرایا ہوا)

خدمتگار:— (اسداللہ سے) حضور آپ کے نانا جان کی بُری حالت ہے۔ دِل بِگڑے گراہ رہے ہیں۔

اسداللہ:— ارے بھئی ابھی ابھی تو میں اُن کو اچھا بھلا چھوڑ آیا ہوں (زِچ نِچ ہوتے ہوئے) اور یہاں بازی چھ تین نو پر رُکی ہوئی ہے۔

بنسی دھر:— اب دو ہاتھ میں میری ساری گوٹیں پونگ جاتی ہیں۔ یا چھ تین نو پھینکتے جائیے یا ہار مان لیجئے۔

مرزا اسداللہ:— (پانسہ ہاتھ میں لے کر) لو یہ چھ تین نو۔

بنسی دھر:— تین کانے۔

مرزا اسداللہ:— بھئی نانا جان کو دیکھ آؤں۔ یوں ہی بازی بچھی رہنے دو۔

(مرزا اسداللہ، خدمت گار کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتے ہیں)

× × × × × × × × × ×

چوتھا منظر

خواجہ غلام حسین خان کمیدان کا مکان —— دیوانخانہ۔ پر تکلف طور پر سجا ہوا۔ خواجہ غلام حسین خان بے ہوش پڑے ہیں۔ پاس حکیم صاحب، اور ملا عبدالصمد بیٹھے ہیں۔

عبدالصمد:— حکیم صاحب۔ ابھی ابھی بھلے چنگے مجھ سے باتیں کر رہے تھے کہ دِل پکڑ لیا اور فرمانے لگے، میں چلا۔ دل میں درد ہو رہا اور ایک منٹ کے اندر غشی طاری ہو گئی۔

حکیم صاحب:— دِل کی بیماری دفعتہً ہی اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ غشی بھی لازمی چیز ہے۔ دیکھئے میں نبض دیکھتا ہوں۔

عبدالصمد:— کہئے نبض کیا کہہ رہی ہے (اضطراب کی حالت میں اٹھ کر) دیکھئے اسداللہ خان کو بلوا بھیجو جلد

[illegible]

* * * * * * * * * *

[illegible]

بنسی دھر: — چھوٹے مرزا سچ کہہ رہے ہیں۔

مرزا: — تم دونوں پتنگ بازی سے ناواقف ہی فقط نہیں بلکہ نرے کھرے بیوقوف بھی ہو۔ اُلو کی دم فاختہ۔

بنسی دھر: — خیر اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ آپ نے سیکڑوں پیچ کاٹے ہیں۔ آج بلوان سنگھ نے دھاندلی کر کے ایک پیچ کاٹ دیا تو کیا ہوا —— چلو آؤ مرزا نوشہ، چوسر کی ایک بازی رہے۔

(سب کوٹھے پر سے نیچے اُترتے ہیں)

× × × × × × × × × ×

دوسرا منظر

مرزا اسداللہ خاں کے نانا خواجہ غلام حسین خان کا گھر۔ (اس کے متعلق غالب اپنے دوست منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں "ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اس کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی") —— اس حویلی کا زنانخانہ — خواجہ غلام حسین خان کمیدان۔ سفید ریش بزرگ زنانخانے سے باہر نکلتے ہیں کہ اندر سے آواز آتی ہے)

امراؤ بیگم: — (غالب کی بیوی) .... آپ سے ایک بات کہنی تو بھول ہی گئی۔

(خواجہ صاحب زنانخانے کی طرف پردہ اُٹھا کر بولے)

خواجہ صاحب: — کیوں امراؤ بیگم، خیر تو ہے؟ —— کیا بات ہے؟

امراؤ بیگم: — (دروازے کی آڑ سے) ناناجان۔ آپ اُن کو منع نہیں کرتے۔ دن بھر چوسر کھیلتے رہتے ہیں اور شام کو کنور بلوان سنگھ کے ساتھ روزانہ پتنگ بازی ہوتی ہے۔ پیسہ اُڑ رہا ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی۔ کہتے ہیں اللہ کرے تیری دولت اُڑ جائے اور اُن کے مزاج سے تو آپ واقف ہی ہیں، میری مجال ہے جو میں اشارے کنائے میں بھی اس بات کو اُن پر جتاؤں۔

خواجہ صاحب: — ہاں بیٹی، میں بھی کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ اس کو مناسب طور سے سمجھاؤں، سو تم نے آج یاد دلا دیا۔ میں ضرور کہوں گا۔ تم خاطر جمع رکھو۔

امراؤ بیگم: — حضور آپ ہی خیال کریں کہ اس طرح قارون کا خزانہ بھی ہو تو خالی ہو جائے۔ ذرا نہیں سمجھتے کہ آج (خدانخواستہ ہم دو ہیں کل تین ہو جائیں۔ اپنے فضل و کرم سے کوئی ننھا بندہ اللہ بھیج دے تو اُس کی پرورش تعلیم سب ہی تو ہے۔

خواجہ صاحب: — خدا تیری زبان مبارک کرے۔

امراؤ بیگم: — جب ہی تو میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ اُن کو نصیحت کیجئے۔ آپ نے پالا پرورش کیا ہے۔ مگر سُنیں گے تو وہ آپ ہی کی سنیں گے اور مجھے تو وہ خطرے ہی میں نہیں لاتے۔

خواجہ صاحب: — اچھا بیٹی۔ لو میں آج ہی کہتا ہوں۔

(خواجہ غلام حسین یہ کہہ کر باہر ڈیوڑھی کا رخ کرتے ہیں کہ سامنے سے غالب اور اس کے احباب پتنگ اُڑا کر آتے ہیں)

خواجہ صاحب: — (غالب سے) صاحبزادے۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ ذرا اِدھر آؤ (بنسی دھر اور مرزا یوسف سے) آپ دیوان خانے میں چل کر بیٹھئے۔ یہ تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔

خواجہ: — (بنسی دھر اور یوسف کے چلے جانے کے بعد) میرے سوال کا جواب دو۔ مجھے اپنا بہی خواہ سمجھتے ہو یا دشمن بدخواہ۔

مرزا: — ناناجان آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ نے مجھے پالا پرورش کیا۔ آپ میرے بہی خواہ کیا معنی ولی نعمت ہیں۔

خواجہ: — مرزا نوشہ اب تمہاری عمر ماشاء اللہ سولہ سترہ کے لگ بھگ ہوگی۔ تمہارا مشغلہ اب تک یہ ہے کہ دن بھر چوسر کھیلنے، شام کو پتنگ

× × × × × × × × × ×

(دوسرے کوٹھے پر کنور بلوان سنگھ اور اُن کے ساتھی)

شمشیر سنگھ:۔ (کنور بلوان سنگھ سے) تو کنّے میں باندھ لوں یا آپ باندھ دیجئے گا۔

بلوان سنگھ:۔ تمہیں باندھ لو۔ پتنگ زوردار ہے۔ دُہرے کنّے ہوں اور سُنا تم نے۔ اُوپر سات اور نیچے پانچ گرہیں لگانا ہوا ذرا تیز ہے اور پتنگ بھی زوردار ہے۔

شمشیر سنگھ:۔ (پتنگ بڑھا کر) بلوان سنگھ میں تو کھینچ کے پیچ لڑاؤں گا۔ تو سہی اِس دوباز پتنگ سے مرزا نوشہ کی بتّی بلوا دوں۔

کنور بلوان سنگھ:۔ (مرزا اسد اللہ کے گھر کی طرف دیکھ کر زور سے) کیوں مرزا نوشہ۔ یہ مانگ پاٹی پتنگ سے تو مرزا چھیلا کے ہاتھ کی ساخت ٹپک رہی ہے۔ اور سجاوٹ بھی اُنہی کے ہاتھ کی ہے۔ بڑا ہی زوردار ہے۔ خوب اُڑ اُسٹے لے رہا ہے۔ مگر بھئی سُنا۔ تم جانتے ہو میں کھینچ گھسیٹ کے پیچ نہیں لڑاتا۔ تم ٹھیرے سپاہی۔ مار دھاڑ کی سوجھتی ہے۔ میں ڈھیل کے پیچ لڑاؤں گا۔ کم از کم چھیٹی دو چھیٹی نخ پر پتنگ ہو تو وہاں ملانے کا مزا آتا ہے۔

× × × × × × × × × ×

(اسد اللہ خاں اپنے کوٹھے کی چھت سے۔ ذرا زور دار لہجے میں) آپ دو نہیں تین چھیٹی پر پتنگ ملائیے پر آج اِس پتنگ سے نو پیچ کاٹوں گا۔ نوشیرواں بنا کے چھوڑوں گا۔

بنسی دھر:۔ (ذرا آگے بڑھ کر) کنور صاحب سنتے ہیں۔ نو پیچ تو مرزا نوشہ آپ کے سر چڑھائیں گے اور دسواں گیارھواں میرے آپ کے پیچ لڑے گا۔ میں اِس اپنے دوباز سے آپ کا ایک پیٹا کاٹوں گا اور ایک کے کنّے لوں گا۔ کیوں رہی؟

× × × × × × × × × ×

بلوان سنگھ:۔ تمہارے تو پچھیا رنڈی کنّے لے گی۔ تم مجھ سے کیا پیچ لڑا سکتے ہو۔ اچھا رہی —— تم سے بھی آخر کے دو پیچ لڑائیں گے تمہارے دوباز کو تو بڑھاتے ہی ہاتھ پر سے کاٹوں۔ تو سہی قلابازی کھاتا ہوا قلعہ تک جائے۔ وہاں کے تلنگے تمہارا دوباز لوٹیں اور تمہارا گُن گائیں۔

× × × × × × × × × ×

اسد اللہ:۔ بلوان سنگھ۔ ہوا کا رُخ بُرا معلوم ہوتا ہے۔ پتنگ ایک ہی چھیٹی پر جا کر بنڈول جانے لگا .... اچھا ملاؤ۔ (اتفاق سے ہوا اکھڑ رہی تھی۔ ڈھیل کے پیچ بل گئے۔ بلوان سنگھ نے ذرا اپنا پتنگ روک ایک آڑا ہاتھ جو مارا تو مرزا کٹ گئے)

× × × × × × × × × ×

(بلوان سنگھ والوں نے "آ وہ کاٹا —— وہ کاٹا —— مرزا نوشہ کٹ گئے" کا شور مچا دیا۔

× × × × × × × × × ×

اسد اللہ خاں:۔ (بگڑ جاتے ہیں) بنسی دھر، تمہاری جو بات ہے وہ بے عقلی سے خالی نہیں۔ گدھے —— نہیں گدھوں کے سردار ہو تم نے بہت ہی کھُردرا مانجھا رکھوایا ورنہ یہ پیچ کٹنے والا نہ تھا (مرزا یوسف سے) یوسف، تم نے بھی مجھ پر زور دیا کہ اس نخ پر پتنگ نہ بڑھائیے۔

مرزا یوسف:۔ بھائی جان میں نے تو عرض کیا تھا کہ مانجھا بہت کھُردرا ہے اور اس پر ڈھیل کے پیچ لڑیں گے۔ آپ کے ساتھ بلوان سنگھ نے دھوکا کیا۔ پہلے کہا کہ پیچ چھیٹی دو چھیٹی پر لڑیں گے اور کھینچ کر پیٹا کاٹ لیا۔

مرزا غالب

افسانے کی تعمیر و تاسیس میں مندرجۂ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

(۱) اُردوئے معلی .... از غالب مرحوم
(۲) عودِ ہندی .... از غالب مرحوم
(۳) کلیاتِ نثر فارسی .... از غالب مرحوم
(۴) دستنبو .... از غالب مرحوم
(۵) یادگارِ غالب .... مولانا حالی مرحوم
(۶) آبِ حیات .... مولانا محمد حسین آزاد مرحوم
(۷) گلشنِ بے خار .... نواب شیفتہ مرحوم
(۸) غالب .... مولانا غلام رسول مہر
(۹) ذکرِ غالب .... مسٹر مالک رام - ایم - اے
(۱۰) رُوحِ غالب .... سید محی الدین قادری زور
(۱۱) غالب نامہ .... مسٹر اکرام
(۱۲) لال قلعہ کی ایک جھلک .... سید ناصر نذیر فراق مرحوم
(۱۳) دلی کا ایک یادگار مشاعرہ .... مرزا فرحت اللہ بیگ

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ مرحوم المتخلص بہ غالب دہلوی کی زندگی کی ایک جھلک آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہے۔ کوشش یہی کی گئی ہے کہ اُن کی زندگی کے مستند واقعات پیش کئے جائیں مگر زیبِ داستان کی خاطر کہیں کہیں تصرف بھی کرنا پڑا ہے، کیوں کہ بقول مرزا غالب ــــ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

پہلا ایکٹ

پہلا منظر

کشمیرن والا کٹڑہ ـــــ دو کوٹھے۔ ایک پہ مرزا غالب اور اُن کے ساتھی۔ دوسرے پر کنور بلوان سنگھ اور اُن کے ساتھی ـــــ پتنگ بازی کے متعلق مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں " ایک کٹڑہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے " ــــ مرزا غالب کی عمر سولہ سترہ برس کے درمیان ہے۔ خوش شکل۔ قد اُونچا۔ ہاڑ بہت چوڑا چکلا۔ موٹا موٹا نقشہ۔ سرخ و سپید رنگ ہے۔ اِس میں کچھ زردی بھی جھلکتی ہے اہلِ ذوق ایسے رنگ کو چمپئی کہتے ہیں

مرزا اسد اللہ خاں :- (اپنے بھائی مرزا یوسف سے) یوسف ذرا وہ لال جدھر بڑھانا ــــ لیکن نہیں ...... اِس ماگ پل[illegible] پتنگ کی چلت پھرت اچھی رہے گی ــــ مرزا چھیلا کے ہاتھ کے کانپ کنڈے چلے ہوئے ہیں ــــ بڑا ہی زور[illegible] پتنگ ہے ــــ اور سُنا تم نے! وہ دو بلی نخ والی چرخی جو چھوٹی تپائی پر دھری ہے وہ لے لو اور اس پر یہ پتنگ بڑھاؤ۔

مرزا یوسف :- (دو بلی نخ کی چرخی اٹھا کر۔ پتنگ بڑھانے سے پہلے) بھائی جان۔ اِس نخ کا بہت کھرُدرا مانجھا ہے (نخ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) یہ تو ڈھیل پر لڑانے کی نخ ہے۔

اسد اللہ :- بھئی بلوان سنگھ زیادہ ڈھیل ہی کے پیچ لڑاتے ہیں۔ کھینچ کے پیچ سے وہ بھاگتے ہیں۔ میں نے خود بھی [illegible] اچھا کھرُدرا کروایا ہے۔

کلامِ امجد

رباعی

اِس پھول کا رنگ اُڑ کے بُورہ جائے سر جائے تو جائے، آبرُو رہ جائے
ثابت ہو مری نفی سے تیرا اثبات میں اتنا مٹوں کہ صرف تُو رہ جائے

غزل

اِس مکاں کا کہیں مکیں نہ ملا
نہ ملا، آہ وہ کہیں نہ ملا

اُونچے اُونچے محل بھی دیکھ لئے
گوشۂ عافیت کہیں نہ ملا

شک ہی شک میں تمام عمر کٹی
خاک میں مل کے بھی یقیں نہ ملا

عالمِ پاک ہے مقام اپنا
خاک میں ہم کو اے زمیں نہ ملا

ہم نشیں تو بہت ملے امجدؔ
لیکن افسوس دِل نشیں نہ ملا

سید احمد حسین امجد [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ان حالات میں حکومتِ انگلستان نے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری سمجھا۔ ۱۹۰۷ء میں جنوبی افریقہ کو خود اختیاری حکومت دی گئی تھی سو ہندوستان
میں بھی جہاں شورش برپا تھی ۱۹۰۹ء میں مارلے منٹو اصلاحات نافذ ہوئیں۔ اعتدال پسندوں نے اِن کا خیر مقدم کیا۔ اِن کی اصلاحات کی رُو
سے کونسلوں میں پہلی بار انتخاب کا طریقہ رائج کیا گیا گو ابھی ساتھ ہی ساتھ گورنمنٹ کی طرف سے نامزدگی بھی جاری رہی۔ تمام کونسلوں کے
ممبروں کی تعداد ۱۴۲ سے بڑھ کر ۳۳۱ ہو گئی اور سارے ہندوستان میں صرف ۳۹ ممبر منتخب ہوتے تھے اب اس کی جگہ ۱۳۶ ممبر منتخب ہو کر
آنے لگے۔ علاوہ بریں وائسرائے کی مجلسِ عاملہ (ایگزیکٹو کونسل) میں ایک ہندوستانی نامزد کیا گیا اور انگلستان میں سکرٹری آف ......
سٹیٹ کی کونسل میں بھی دو ہندوستانی مقرر ہوئے۔ ایک نئی اور قابلِ غور اصلاح جو اِن اصلاحات کے ذریعے سے رُوبکار آئی مسلمانوں کی
فرقہ وار نیابت تھی۔

۱۹۰۶ء تک **مسلمان بحیثیت قوم** سیاست سے علیحدہ رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد گورنمنٹ اُن کو عتاب کی نظروں سے دیکھنے
لگی۔ ملازمتوں میں اُنھیں بہت کم حصہ دیا گیا اور انھیں ہر طرح دبائے رکھنے کی کوشش ہوتی رہی۔ ۱۸۷۰ء میں گورنمنٹ نے اپنی پالیسی کی
بے انصافی سمجھی اور تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کی ضروریات کی طرف توجہ کرنی شروع کی۔ ۱۸۷۵ء میں سرسید نے علی گڈھ کالج کی اور ۱۸۸۶ء
میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی اور اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں واضح کر دیا کہ مسلمانوں کو فی الحال اپنی تعلیم پر اپنی تمام توجہ مبذول
کرنی چاہئے اور کانگرس سے علیحدہ رہنا چاہئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں اُس وقت کے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس پالیسی
کی داد دی ہے۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیمِ بنگال سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا۔ اس پر جب بنگالیوں نے اس کے خلاف شورش برپا کی تو مسلمانوں
نے دیکھا کہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے اُن کے واسطے سیاسی تنظیم لازم ہو گئی ہے۔ لہذا اُنہوں نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ میں ایک وفد کی صورت میں
گورنمنٹ کے سامنے اپنے سیاسی مطالبات پیش کئے جن میں ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو جداگانہ نیابت کا حق دیا جائے۔ اسی سال دسمبر میں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی گئی۔
ہر چند کہ منٹو مارلے اصلاحات سے ہندوستانیوں کو کچھ نہ کچھ ملا لیکن تسلی نہ ہوئی۔ انتخابات کچھ اصلی تھے کچھ نقلی۔ صوبوں پر بہت کچھ
مرکزی حکومت کا دباؤ تھا۔ کونسلوں کو بہت کم اختیارات حاصل تھے جن سے وہ ملک کو ترقی دے سکتیں۔ انتہا پسندوں کا دعویٰ تھا کہ کونسلیں فقط اک بک جھک جھک
کا سامان ہیں اور کچھ بھی نہیں۔

۱۹۱۱ء میں شاہ جارج ہندوستان آئے اور ایک دربار منعقد کیا جہاں بنگال کی تقسیم کی ترمیم کی گئی اور بجائے کلکتہ کے
دہلی کو دار السلطنت قرار دیا گیا۔ تقسیم کی ترمیم سے مسلمانوں میں مایوسی پھیلی۔ اُدھر ۱۹۱۲ء میں بلقان کی جنگ اور بعد میں طرابلس کی
جنگ میں ترکی کی طرف انگلستان کی معاندانہ روش دیکھ کر اُن میں خاصی ناراضگی پھیل گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو لیگ نے ۱۹۱۳ء
میں سلف گورنمنٹ کو اپنا مقصد قرار دیا اور دوسرے مسٹر جناح کی قیادت میں کانگرس کی طرف میلان ہوتا گیا یہاں تک کہ ۱۹۱۶ء
میں لکھنؤ میں جہاں کانگرس اور لیگ دونوں کے اجلاس بیک وقت منعقد ہوئے کانگرس اور لیگ میں سمجھوتا ہو گیا جو میثاقِ لکھنؤ
کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی رُو سے بعض شرائط پر مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کیا گیا۔ اقلیت والے صوبوں میں انہیں اپنے
حق سے کچھ زیادہ نشستیں دی گئیں لیکن پنجاب اور بنگال میں اکثریت نہ دی گئی اور مرکزی اسمبلی میں منتخب شدہ نشستوں میں ۱/۳ نشستیں
اُن کو ملیں۔

۱۹۱۴ء میں یورپ میں جنگِ عظیم چھڑ چکی تھی۔ ہندوستان ہر طرح انگلستان کا ساتھ دینے کا ثبوت دے رہا تھا۔ لیکن اس کے
ساتھ اس بات کا خواہش مند تھا کہ اس وفاداری کے عوض میں اُسے سیاسی حقوق دیئے جائیں۔ ۱۹۱۶ء میں مسز بیسنٹ نے اپنی
ہوم رول لیگ بنائی اور اسی سال کے اخیر میں مسلم لیگ اور کانگرس کا سمجھوتا ہو گیا۔ لڑائی ابھی زوروں پر تھی کہ مارچ ۱۹۱۷ء میں
روس میں بالشویکی انقلاب برپا ہو گیا۔ ان ملکی و غیر ملکی حالات سے متاثر ہو کر برطانوی حکومت نے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء
کو ... اعلان کیا کہ برطانوی حکومت کے سامنے ہندوستان کے متعلق یہ نصب العین ہے کہ

نے ملکی نظم و نسق میں ہندوستانیوں کو حصہ ملنے پر زیادہ زور دیا۔ غور کیا کہ کون سی تعلیم ہندوستانیوں کو افلاس سے بچانے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ نیز جنگلات کے قوانین مال گذاری کا انتظام قانونِ اسلحہ انسدادِ قحط وغیرہ کے متعلق قراردادیں منظور کیں جن کا مفاد ملکی بہتری تھا۔ یہ زیادہ **کانگرس کی کوششوں کا نتیجہ** تھا کہ ڈفرن کے وقت میں لوکل سلف گورنمنٹ کا دائرہ وسیع کیا گیا، لٹن کا پریس ایکٹ منسوخ کیا گیا اور سنہ ۱۸۹۲ء میں ایک اور انڈین کونسلز ایکٹ منظور ہوا جس سے ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں کی کونسلوں کے لئے ممبر نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا اور ممبرانِ کونسل کو سوال پوچھنے اور وائسرائے کی کونسل میں مالی حالات پر مباحثہ کرنے کا حق دے دیا گیا۔ براہِ راست انتخاب کا اصول ابھی تسلیم نہ کیا گیا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ کونسلیں محض مشورہ دینے والی جماعتیں تھیں ان کا اختیار اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔

لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے جس طرح بیرونی دُنیا کی حالت بدلنی شروع ہوئی اُسی طرح ہندوستان میں بھی ایک نئے دَور کا آغاز ہوا۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں اطالیہ نے ابی سینیا میں حبشیوں کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ اس سے یورپی طاقت کے نیچے دبی ہوئی قوتوں کے دل میں ذرا سی اُمید پیدا ہوئی اس کے بعد جنوبی افریقہ میں بوئر قوم نے برطانوی حکومت کو شکستیں دیں لیکن سنہ ۱۹۰۴ء کی جنگ رُوس و جاپان نے زمانۂ حال کی تاریخ میں ایک بالکل نئے باب کا آغاز کیا۔ گرے ہوئے مشرق نے دفعتہً اٹھ کر مغرب کی ایک زبردست طاقت کو پچھاڑ دیا، سارے ایشیا میں ایک برقی رَو دوڑ گئی اور یاس اور غم پسندی اُمید اور جوش اور ولولے میں تبدیل ہو گئی۔ ہندوستان میں بھی بیداری پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ لارڈ کرزن کی رعونت اور کوتاہ بینی نے سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ لگایا۔ کرزن نے ہندوستانیوں کو جھوٹے لوگ پکارا اور بیسیوں اور طریقوں سے اُن کی ہتک کی۔ اس کے بعد ۱۶ اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ء کو **بنگال کی تقسیم** کا اعلان کیا گیا۔ اس واقعے نے بنگال کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیدار کر دیا۔ بنگالی مغربی خیالات سے دوسرے ہندوستانیوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو چکے تھے وہ صدیوں سے ایک بزدلانہ ذہنیت کے ملک بن چکے تھے لیکن اس تحریک نے اُن میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ مجنونوں پر بم پھینکے گئے سودیشی مال خریدنے اور انگریزی مال کے بائیکاٹ کرنے کا آوازہ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بلند کیا گیا۔ **تقسیمِ بنگال کی تحریک** دراصل ہندوستان کی پہلی منظم سیاسی تحریک تھی۔ اس سے پہلے عرضداشتیں تھیں، مایوسی تھی، ناراضگی تھی لیکن تقسیمِ بنگال کے بعد عرضداشتیں احتجاج میں مایوسی اُمید میں اور پوشیدہ ناراضگی علانیہ قومی جدوجہد میں تبدیل ہو گئی۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آزادی پسند قوم کی حکومت آخر اپنا رنگ لائی اور یہاں بھی آزادی کے خیالات ہر کہ ومہ کے دل میں ایک طوفان اٹھانے لگے۔

سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک کانگرس کا دوسرا دَور دستوری شورش کا دور تھا۔ اکیسویں کانگرس (سنہ ۱۹۰۵ء) میں گوکھلے نے کرزن کی پالیسی پر اظہارِ نفرت کیا۔ آئندہ سال کانگرس میں بیس ہزار کا مجمع تھا۔ اس کے ساتھ ایک سودیشی نمائش بھی ہوئی اور دادا بھائی نوروجی صدرِ کانگرس نے جو کئی سال تک برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رُکن بھی رہے اپنے تجربے کی بنا پر سیاسی شورش کے متعلق کہا کہ "سیاسی شورش انگلستان کی ساری سیاسی معاشری اور صنعتی تاریخ کی روح و رواں ہے۔" سیاسی شورش اخلاقی قوت کا مُہذب پُر امن ہتھیار ہے۔ بنو تم شورش کرو۔ شورش کرنے کے معنی ہیں آگاہ کرنا۔ سو تم آگاہ کرو ہندوستانیوں کو آگاہ کرو انہیں ان کے حقوق سے کہ اُنہیں کیسے اور کیوں اپنے حقوق لینے چاہئیں اور آگاہ کرو انگریز قوم کو ہندوستانیوں کے حقوق سے کہ کیوں اُنہیں یہ حقوق تسلیم کرنے اور دینے چاہئیں۔" یہ شورش ملک میں دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتی گئی یہاں تک انتہا پسندوں کا ایک خاصا گروہ بنگال مہاراشٹر اور دوسرے علاقوں میں پیدا ہو گیا۔ اس سے سنہ ۱۹۰۷ء کی کانگرس میں جو سورت میں منعقد ہوئی پھوٹ پڑ گئی۔ تلک اور دوسرے **انتہا پسند** ایک طرف تھے مالویہ گوکھلے اور باقی اعتدال پسند دوسری طرف۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فریق الگ الگ ہو گئے اور اس کے بعد سنہ ۱۹۱۶ء تک انتہا پسند جماعت کانگرس سے علیحدہ رہی۔ کانگرس کا مقصد اب برطانوی سلطنت کی "خود اختیاری" نوآبادیوں کی طرح نظامِ حکومت کا حاصل کرنا اور اُن کے ساتھ برابری کا درجہ لینا قرار پایا۔

مساوی اختیارات دینا تجویز کیا گیا لیکن انگریزوں اور اینگلو انڈین اصحاب نے اس پر وہ اُودھم مچایا کہ بل کو تقریباً چھوڑ دینا پڑا۔ بل تو ہندوستانیوں کی مرضی کے مطابق پاس نہ ہوا لیکن اس سے انہوں نے ایک نہایت اہم سبق سیکھا کہ آج کل کی دنیا میں شورش ایک زبردست آلۂ کار ہے چنانچہ اس سبق پر انہوں نے بھی بہت جلد عمل کرنا شروع کر دیا۔ ۱۸۸۴ء میں مدراس میں ایک مہاجن سبھا بنائی گئی لیکن یہ عزت اور ہمت فقط ایک انگریز کے حصے میں آئی کہ وہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی مجلس کی بنیاد ڈالے۔ اور اُس کے اُکیس اجلاسوں میں سکرٹری کے فرائض انجام دے۔ یہ ہمدرد باہمت انسان مسٹر ہیوم تھا جس نے یکم مارچ ۱۸۸۳ء کو کلکتہ کے گریجوایٹ طلبہ کے نام ایک کھلی چٹھی لکھی کہ ملک کی ترقی کے لئے ایک باقاعدہ سیاسی جماعت کے قیام کی اشد ضرورت ہے اور پھر اپیل کی کہ کیا صرف پچاس پُر ایثار اور پُر خلوص نوجوان اس بات کے لئے تیار نہیں ہو سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو ہندوستان کی خدمت کے لئے وقف کر دیں؟ اس اپیل کا فوری اثر ہوا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۸۴ء میں انڈین نیشنل یونین اور کئی شہروں میں اُس کی مقامی کمیٹیاں بن گئیں اسی سلسلے میں آئندہ سال ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو **انڈین نیشنل کانگرس** کا پہلا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔

اگر کہا جائے کہ اس وقت سے لے کر تقریباً پچاس سال تک ہندوستان کی سیاسی تاریخ انڈین نیشنل کانگرس کی تاریخ ہے تو یہ حقیقت سے بعید نہ ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ شروع شروع میں کانگرس ایک وفادار جماعت بنی رہی۔ پھر پہلے پہل جب سے اُس نے شورش کا طریقہ اختیار کیا تو وہ شورش آئینی تھی اور بعد میں جب وہ سول نافرمانی اور عوامی ملاپ کا جھنڈا لے کر اُٹھی تو اُس وقت بعض باثر جماعتیں وقتاً فوقتاً اُس سے اپنی علیحدگی اور بیزاری کا احساس کرتی رہیں اور آج بھی باوجود اپنی مسلمہ طاقت کے وہ سارے ہندوستان کی پوری نمائندہ مجلس نہیں بن سکی لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ کانگرس ہی تھی جو پہلے پہل اس ملک میں ایک باقاعدہ منظم جماعت کی صورت میں ظاہر ہوئی اور جس نے اپنے کام کو مسلسل جاری رکھتے ہوئے ہندوستان کے لئے بہت سے سیاسی حقوق و مراعات حاصل کئے۔

کانگرس کی تاریخ کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا زمانہ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۵ء تک پارلیمنٹری طریق کار کا ہے۔ دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۹ء تک قانونی یا دستوری شورش کا ہے۔ اور تیسرا دور ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۶ء تک عوامی تحریک کا ہے۔ چوتھا دور ۱۹۳۷ء سے شروع ہوتا ہے جب کانگرس سات صوبوں میں حکومت کرنے لگی۔

کانگرس کے پہلے اجلاس میں بونرجی صدر کانگرس نے کانگرس کے اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اُس کا مقصد ملک کے مختلف کارکنوں میں دوستی بڑھانا، مذہبی و نسلی منافرت کا دور کرنا، قومی اتحاد کے خیالات کو ترقی دینا، سوشل اصلاحات کے متعلق ملک کے قابل ترین افراد کی آرا حاصل کرنا اور اُن طریقوں پر غور کرنا ہے جن سے دیسی سیاست دان مفاد عامہ کے لئے کام کریں۔

شروع شروع میں گورمنٹ نے کانگرس کو ہمدردی کی نظروں سے دیکھا لیکن تین سال بعد لارڈ ڈفرن نے مخالفت کا رویہ اختیار کیا۔ کانگرس نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور بڑی سرگرمی سے کام کرنا شروع کر دیا جس سے اور لوگوں کی دلچسپی اور جوش یہاں تک بڑھا کہ پانچویں کانگرس میں جس میں بریڈلا کو ایڈریس پیش کیا گیا ۶۴۰۰۰ روپیہ چندہ ہوا اور کئی خواتین نے اپنی گھڑیاں اور زیور تک اُتار کر دے دیئے۔ آہستہ آہستہ کانگرس کی طرز گفتگو دلیر ہوتی گئی۔ مدت سے ہندوستانی دیکھ رہے تھے کہ انگریز بات بات میں اپنی نسلی برتری اور حاکمانہ رعب جتاتے ہیں جس طرح ریل گاڑیوں میں بعض ڈبے "صرف یورپینوں کے لئے" وقف تھے اسی طرح سینکڑوں باتوں میں سفید لوگوں کی دنیا ہند میں اور تھی ہندوستانیوں کی اور۔ یہ خلیج بتدریج بجائے گھٹنے کے بڑھتی گئی یہاں تک کہ بیسویں صدی کے شروع سے پہلے ہی کانگرسی حلقوں میں "شاہنشاہیت کی دیوانگی" کا ذکر ہونے لگا۔ تاہم پہلے دور میں کانگرس کا رویہ برطانوی حکومت کے متعلق پارلیمنٹری طریق کا تھا۔

کانگرس نے معاشری اصلاح کا جو بیڑا اُٹھایا تھا اُسے دوسرے ہی سال چھوڑ دیا اور خالص سیاسیات کی طرف توجہ کی [illegible]

کرنا منظور کر لیا تھا۔ نیز یہ بھی یقین دلایا تھا کہ کوئی ہندوستانی بوجہ اپنے مذہب یا رنگ یا نسل کے کسی ملازمت کے حق سے محروم نہ رکھا جائے گا۔ ۱۸۵۳ء میں پھر دیسیوں کو اعلیٰ ملازمتیں دینے کا ارادہ کیا گیا اور ۱۸۸۶ء میں ایک کمیشن بھی بٹھایا گیا۔ لیکن نہ مدت تک تعلیم کے لئے مخصوص رقم کو استعمال کیا گیا اور نہ بجز چند در چند اشخاص کے کوئی ہندوستانی اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا گیا۔ ۱۸۵۴ء میں وڈ کا مراسلہ ہندوستانی تعلیم کی تاریخ میں ایک نہایت اہم یادداشت ثابت ہوئی اور حکومت نے بار بار قحط پڑ جانے پر قحط کے انسداد کے لئے مختلف ذریعے اختیار کئے۔ ان کے علاوہ رعایا کی آسائش کے لئے اور بیسیوں امور کی طرف توجہ کی۔ ہندوستان دنیا کی عام صنعتی ترقی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اُس کی اپنی صنعتیں برباد ہو گئیں۔ اُس کی اپنی تعلیم اور اُس کا اپنا تمدن بڑی حد تک تباہ ہو گیا۔ لیکن انگلستان سے اس طرح وابستہ ہونے سے اُس کا رشتہ بیرونی مہذب دنیا سے از سرِ نو قائم ہو گیا اور اس کی رگوں میں وہ خون آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن حرکت کرنے لگا جس کی وجہ سے صدیوں کی نیند سے بیدار ہو جانا اس کی قسمت میں لکھا تھا۔

۱۸۵۷ء کے غدر سے برسوں پہلے ہی گو ہندوستان کے باشندے برطانوی حکومت کے امن و امان سے لُطف اٹھا رہے تھے لیکن اُن کے کم از کم بعض طبقوں میں بے چینی اور بے اطمینانی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ ۱۸۲۴ء میں مدراس کے گورنر منرو نے اپنی ایک یادداشت میں ہند میں برطانوی حکومت کا یہ نصب العین پیش کیا تھا کہ وہ بتدریج ہندوستانیوں کو اپنے ملک کو آپ سنبھالنے کے قابل بنائے۔ ۱۸۳۳ء میں مکالے نے اپنی مشہور یادداشت پیش کی۔

اور جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے سرسید پہلے وہ ہندوستانی تھے جنھوں نے بڑی دلیری اور صفائی سے اپنی کتاب اسباب بغاوتِ ہند میں حکومت اور دُنیا کے سامنے اعلان کر دیا کہ برطانوی حکومت کے کیا نقائص ہیں اور ہندوستانیوں کی جائز خواہشات کیا ہیں۔ سرسید کا یہ بیان بلاشبہ برطانوی عہد میں ہندوستان کا پہلا سیاسی مطالبہ تھا۔

اِس کے دو سال بعد اُسی لارڈ الگن کے عہد میں جس نے ۱۸۴۸ء میں کینیڈا میں خود اختیاری حکومت جاری کی ۱۸۶۱ء میں انڈین کونسلز ایکٹ پاس ہوا۔ اِس سے پہلے پانچ صوبوں میں کونسلیں تو قائم تھیں لیکن اُن میں کوئی غیر سرکاری رُکن شامل نہ ہوتا تھا۔ ۱۸۶۱ء میں چند غیر سرکاری ارکان کو شامل کر لیا گیا۔ سرسید اس سلسلے میں کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔ ۱۸۷۱ء سے ۱۸۷۴ء تک چند میونسپل ایکٹ پاس کئے گئے اور لارڈ رپن نے جو ہندوستانیوں کے نزدیک ہندوستان کا ایک بڑا محسن تھا ۱۸۸۲ء میں ایک قرارداد منظور کی جس کی رُو سے برطانوی ہند میں لوکل سلف گورمنٹ رائج کرنے کے لئے متعدد ایکٹ پاس ہو کر جا بجا ڈسٹرکٹ بورڈ قائم ہوئے جن کے ذریعے سے ہندوستانیوں نے پہلی بار مغربی وضع کی خود اختیاری حکومت کی اک ذرا سی جھلک دیکھی اور وہ شہروں اور اضلاع میں رفاہِ عام کے بعض کاموں کی طرف خود توجہ کرنے کے مجاز سمجھے گئے۔ پنچایتوں کا نظام ہندوستان میں ہندوؤں اور مغلوں کے زمانے میں ہزاروں سال تک جاری رہ کر معدوم یا کالعدم ہو گیا تھا اور مدتوں سے طوائف الملوکی اور مسلسل افراتفری کی وجہ سے ہندوستانی اپنے چھوٹے سے چھوٹے معاملات طے کرنے سے محروم ہو چکے تھے۔ اب وہ ایک اجنبی حکومت کے زیرِ اثر ایک نئی طرح کی خود اختیاری حکومت کی ابجد پڑھنے لگے۔

غدر کے بعد ایک سیاسی نیم مجلس جو انگلستان کی انڈین ایسوسی ایشن کی ایک شاخ تھی برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے ہندوستان میں قائم ہو چکی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں سرسید نے اُس کی ایک شاخ علی گڑھ میں قائم کی۔ ۱۸۷۶ء میں بنگال میں بھی اُس کی ایک شاخ قائم ہوئی۔ اس کے ذریعے سے زمینداروں اور ہندوستانیوں کی عام تکالیف براہِ راست پارلیمنٹ تک پہنچائی جاتی تھیں۔ مغربی تعلیم کی وجہ سے ہندوستانیوں کو سیاسی معاملات سے دلچسپی شروع ہوئی اور اُن کے انگریزی اور دیسی اخبارات نے خود داری کے نئے خیالات کی باقاعدہ اشاعت شروع کی جو ہندوستانیوں کے دل میں جاگزیں تھے۔ غدر کے بعد انگریزوں اور ہندوستانیوں میں علیحدگی بلکہ منافرت پیدا ہو گئی تھی۔ اس پر ہندوستانی اخبارات میں رنجیدگی کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر لارڈ لٹن نے اخبارات پر بندشیں عائد کیں لیکن لارڈ رپن نے انھیں دُور کر دیا۔ لارڈ رپن نے کونسل میں البرٹ بل کو پیش کیا جس کا مقصد انگریز اور ہندوستانی ججوں کو

سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی کوئی ملک فتح کرتی تھی تو ہندستان اور رسم و رواج میں مداخلت کرنا چاہتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "میں سچ کہتا ہوں کہ جب سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی کوئی ملک فتح کرتی تھی تو ہندستان کی رعایا کو کمال رنج ہوتا تھا۔" بعض ضلعوں میں رواج نکلا کہ پادریوں کے ساتھ تھانے کا ایک چپراسی جاتا تھا۔ مسلمانوں کو اس مذہبی مداخلت سے زیادہ رنج تھا۔ دوسرے اجرائے ضوابط و آئینِ نامناسب۔ اونے سے بہانوں پر لوگوں کی جاگیریں اور معافیاں چھن گئیں۔ زمینیں نیلام ہوئیں اور مال گذاری میں غرق ہونے لگیں۔ اسٹامپ کی وجہ سے عدالت گستری سے رعایا باز رہنے لگی۔ تیسرے ناواقفیت گورمنٹ حال رعایا سے۔ مسلمان حکمرانوں نے محبت سے ہندوؤں کا دل موہ لیا تھا اور ہند کو اپنا وطن بنا لیا تھا لیکن انگریز حاکم اب محض رعب و داب سے کام لیتے تھے۔ بڑھتی ہوئی مفلسی کی وجہ سے بھی لوگ انگریزوں کی حکومت سے بیزار ہو رہے تھے۔ سر سید لکھتے ہیں کہ ہم سچ کہتے ہیں اور پھر ہم کہتے ہیں کہ ہم بہت سچ کہتے ہیں جب افغانستان سرکار نے فتح کیا لوگوں کو بڑا غم ہوا۔ کیا سبب تھا صرف یہ تھا کہ اب مذہب پر علانیہ دست اندازی ہوگئی۔ جب گوالیار فتح ہوا اور لیا گیا لوگوں کو کمال رنج ہوا کیوں ہوا اس لئے ہوا کہ ان پاس کی ہندوستانی عملداریوں سے ہندوستانیوں کو بہت آسودگی تھی۔" سرکار انگریزی میں امن اور آسائش اور ایک طرح کی آزادی ضرور تھی اور اسی لئے عورتیں اور مہاجن اور تجارت پیشہ اس سے خوش تھے۔ چوتھے نہ کرنا اُن باتوں کا جن کا کرنا گورمنٹ پر واجب تھا۔ حکامِ اضلاع کی سخت مزاجی اور بدزبانی ناقابلِ برداشت تھی۔ اشراف اہلکار انگریز حاکموں کا غرور و تکبر اور سختی دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کہا کرتے کہ "اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے"۔ پانچویں بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج۔

غدر کے بعد برطانوی حکومت نے ۱۸۵۸ء کا ایکٹ پاس کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے حکومت لے کر انگلستان کے فرماں روا نے ایک سیکرٹری آف سٹیٹ کے ذریعے سے ہندوستان پر خود حکومت کرنی شروع کی۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو جو ملکہ وکٹوریا کا اعلان ہوا اس میں یہ یقین دلایا گیا کہ آئندہ ہندوستانیوں کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے گی اور یہی ۵۷ء کے غدر کا اچھا نتیجہ نکلا کہ آئندہ حکومت نے اشاعتِ مذہب کے معاملے میں غیر جانبداری اختیار کر لی۔ ملکہ نے یہ بھی یقین دلایا کہ آئندہ ہندوستانیوں کی خوش حالی سے ہمیں طاقت حاصل ہوگی اُن کے اطمینان سے ہمارا تحفظ ہوگا اور اُن کی احسان مندیوں میں ہمارا بہترین صلہ مضمر ہوگا۔" آئندہ جب کبھی ہندوستانیوں پر تشدد کیا اُن سے بے اعتنائی برتی گئی تو اُنھوں نے اپنے حکمرانوں کو مہربان ملکہ کا اعلان بار بار یاد دلایا۔

غدر کا ایک خراب نتیجہ یہ نکلا کہ حکمرانوں اور رعایا میں وسیع خلیج قائم ہوگئی اور نسلی منافرت روز بروز زیادہ ہوتی گئی۔ غدر کے بعد کی نصف صدی ایک امن و امان کا زمانہ تھا لیکن اس امن و امان میں انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہو کر روٹھے رہے۔

غدر کے بعد انگریزی علاقے میں بہت کم توسیع ہوئی۔ غدر کے بعد تین لڑائیاں افغانستان سے لڑی گئیں۔ ایک برما سے اور ایک تبت سے۔ افغانستان اور تبت جوں کے توں قائم رہے اور برما پر قبضہ کر لیا گیا لیکن برما بھی پچاس سال تک ہندوستان میں شامل رہ کر ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے بموجب ہندوستان سے علیحدہ کر لیا گیا۔

ہندوستان میں غدر کے بعد امن تو قائم ہوگیا اور ایک عرصہ تک ملک پر خاموشی بھی طاری رہی لیکن انیسویں صدی کا نصف آخر کچھ ایسا زمانہ نہ تھا کہ یہ خاموشی دیر تک قائم رہ سکتی۔ دنیا اب وہ پہلے کی سی علیحدہ علیحدہ ملکوں کی دنیا نہ تھی۔ تار اور ریل اور دوسری ایجادیں، اخبارات و رسائل، یورپ میں صنعتی اور معاشرتی اور سیاسی انقلابات ان سب کا بتدریج خاموش و مطمئن ہندوستان پر بھی اثر ہونے لگا اور غیر ذمہ دار اجنبی حکومت نے آہستہ آہستہ یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ رعایا کی فلاح و بہبود ضروری ہے اور بہتر ہے کہ کبھی کبھی رعایا سے بعض امور کے متعلق مشورہ کر لیا جایا کرے۔

غدر سے پہلے ۱۸۳۳ء کے ایکٹ کی رُو سے حکومت انگریزی نے ازراہِ عنایت ایک لاکھ روپیہ رعایا کی تعلیم کے لئے

نکلے۔ جدھر نظر کی کامیابی نے قدم لئے بس پھر کیا تھا بڑھتے چلے گئے اور ایک عظیم الشان سلطنت کے مالک بن گئے۔

۱۷۷۳ء میں انگلستان کی حکومت نے دیکھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی جو کبھی محض تاجروں کی جماعت تھی ہندوستان میں ایک خاصے علاقے پر قابض ہو چکی ہے جو جا بجا بکھرا ہوا ہے۔ اس پر برٹش پارلیمنٹ نے ۱۷۷۳ء کا ریگولیٹنگ ایکٹ منظور کیا جس کی رو سے بمبئی اور مدراس کی حکومتوں کو بنگال کی مرکزی حکومت کے ماتحت کر دیا گیا۔ بنگال میں ایک گورنر جنرل اور اس کے ساتھ اس کی ایک کونسل مقرر کی گئی۔ اور بجائے صدر دیوانی عدالت اور صدر نظامت عدالت کے کلکتہ میں ایک سپریم کورٹ بنایا گیا اس قانون سے وارن ہیسٹنگز (۱۷۷۴ء تا ۱۷۸۵ء) پہلا گورنر جنرل بنا۔ پٹ ۱۷۸۴ء کے ایکٹ کے مطابق کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز (یعنی مجلس مالکان) کے اُوپر برطانوی حکومت کی طرف سے ایک بورڈ آف کنٹرول (مجلس مختار) قائم ہوئی۔ ہیسٹنگز کے وقت میں مرہٹوں سے پہلی اور میسور سے دوسری لڑائی ہوئی اور روہیلوں پر حملہ کیا گیا۔ کارنوالس (۱۷۸۶ء تا ۱۷۹۳ء) کے وقت بنگال کا دوامی بندوبست ہوا جس کی رُو سے حکومت نے مال گذاری کی رقم ہمیشہ کے لئے مقرر کر دی۔ اور جس سے بنگال کے زمینداروں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ ولزلی (۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء) برطانوی سلطنت کی توسیع پر تُلا ہوا تھا۔ اُس نے میسور کو فتح کیا بہت سی دیسی ریاستوں کو برطانوی علاقے میں شامل کر لیا اور نظام، پیشوا، سندھیا، بھونسلا اور نواب اودھ کو مجبور کیا کہ وہ برطانوی حکومت کے (Subsidiary) سسٹم کے حلقے میں داخل ہو کر اس حکومت کے زیر سایہ آجائیں۔ لارڈ منٹو (۱۸۰۷ء تا ۱۸۱۳ء) نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ۱۸۰۹ء کا سمجھوتا کیا۔ ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاوہ دوسرے انگریز تاجروں کو بھی ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کا خون چوسنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا' ہندوستان کی صنعت و حرفت بتدریج برباد ہوتی گئی اور پیشہ ور لوگوں میں ناراضگی اور مایوسی پھیلتی گئی۔

مارکوئس آف ہیسٹنگز (۱۸۱۳ء تا ۱۸۲۳ء) کے عہد میں نیپال سے جنگ ہوئی اور پنڈاروں کا قلع قمع کیا گیا۔ بنٹنگ (۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۵ء) نے ستی اور ٹھگی کا انسداد کیا۔ اس عہد میں (۱۸۳۵ء میں) ایک نہایت اہم فیصلہ کیا گیا جس کا ہندوستان کے مستقبل پر بڑا گہرا اثر ہونے والا تھا۔ یہ مکالے کی یادداشت تھی جس کے مطابق یہ فیصلہ ہوا کہ آئندہ ہندوستانیوں کو انگریزی کے ذریعے سے تعلیم دی جائے۔ اس سے ایک تو مشرقی علوم اور شائستگی کو بڑا دھکا لگا اور دوسرے بتدریج ہندوستان میں انگریزی تمدن اور مغربی سیاسی خیالات کی روز افزوں اشاعت ہوئی۔ مکالے نے لکھا کہ اگر اس تبدیلی کی وجہ سے انگریزی زبان سیکھ کر کسی دن ہندوستانی لوگ انگریزی سیاسی اداروں کا بھی مطالبہ کرنے لگیں تو انگلستان کے لئے وہ ایک بڑے فخر کا دن ہوگا۔ اس شریف انگریز کے اِس قول کے پورے ایک سو سال بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ منظور ہوا۔

لارڈ ڈلہوزی (۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۶ء) نے برطانوی سلطنت کو اور توسیع دی۔ کئی دیسی ریاستوں کو انگریزی علاقے سے ملحق کر لیا۔ برما والوں اور سندھیا اور سکھوں سے پے درپے لڑائیاں کیں اور پنجاب کو ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو سلطنتِ ہند کا جزو بنا لیا۔

غرض ایک سو سال کے عرصے میں انگریز سوداگروں کی کمپنی نے ایک خاصی سلطنت قائم کر لی۔ اٹھارھویں صدی میں کرناٹک اور پلاسی اور بکسر کی لڑائیاں ہوئیں ان کے بعد چار لڑائیاں میسور سے تین مرہٹوں سے ایک نیپالیوں سے ایک افغانوں اور دو سکھوں سے لڑی گئیں اور ان میں سے اکثروں کے علاقے کو برطانوی قلمرو بنا لیا گیا۔ علاوہ بریں مختلف عجیب طریقوں اور ترکیبوں سے کئی اور ریاستوں کو بھی اس سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ یہاں تک ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے تقریباً سارا ہندوستان برطانیہ کے زیر نگیں آگیا۔ اس توسیع سلطنت کے ساتھ ساتھ ملک کی ترقی کے بعض سامان بہم پہنچائے گئے۔ ریل تار نہریں سڑکیں بنیں اور تعلیم کی طرف بھی کچھ توجہ کی گئی۔

۱۸۵۷ء میں فوج میں غدر ہوا۔ سر سید نے ۱۸۵۹ء میں باوجود سرکاری ملازم ہونے کے بڑی دلیری سے اپنی کتاب "اسباب بغاوت ہند" میں اس شورش کی وجہ بیان کی پہلے یہ صاف ظاہر کر کے کہ ۱۸۵۷ء کی سرکشی کا اصلی سبب ہندوستانیوں کا لیجسلیٹو کونسل میں شریک نہ کیا جانا ہے انہوں نے کل پانچ اسباب گنوائے۔ ایک غلط فہمی رعایا بابت تجاویز گورنمنٹ کہ گورنمنٹ ہندوستانیوں کے مذہب

انگریزوں نے بھی ہندوستانی معاشرت اختیار کرلی یہاں تک کہ وہ مشاعروں میں شریک ہوکر ہندوستانی زبان میں غزلیں پڑھتے تھے۔ لیکن بتدریج انگریز تاجروں نے اپنے پاؤں پھیلانے شروع کئے اور جوں جوں اُنہیں ملک کے مختلف حصوں میں اقتدار حاصل ہوتا گیا وہ ہندوستان کی دولت کو سینکڑوں طریقوں سے جمع کر کرکے انگلستان لے جانے لگے۔ برک نے ہیسٹنگز کے مقدمے کے دوران میں اس کل رقم کا جو اُس وقت ۱۶۹۰ء تک یہاں سے انگلستان پہنچ چکی تھی چالیس کروڑ کے قریب اندازہ کیا تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اُس وقت روپے کی قیمت آج کل کے روپے سے سات گنا تھی۔ شروع شروع میں کمپنی کے معمولی ملازموں کی تنخواہیں آٹھ روپیہ ماہوار اور کھانا سے لے کر ۳۳ روپیہ ماہوار تک تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کے نکمے اور شریر لوگ ہندوستان میں ٹوٹ پڑے اور کمپنی کی فیکٹریاں بداعمالیوں کے اڈے بن گئے جس پر خود بعض نیک دل انگریزوں نے احتجاج کی آواز بلند کی۔ بنگال کی دیوانی مل جانے پر کمپنی نے بنگال کی تمام زمینوں کو نیلام کرنا شروع کردیا جس سے قدیم مستاجر بے دخل ہوگئے اور اُن کی جگہ نئے ٹھیکیداروں نے لے لی اور رعایا کی وہ لوٹ کھسوٹ شروع ہوئی کہ لوگ گاؤں چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ جیسا برک نے بعد میں کہا کہ ان نئے بنیوں نے بڑے بڑے گھرانے اُلٹ دیئے۔ وارن ہیسٹنگز کے دیوان رام چندر کی نسبت بیان کیا گیا تھا کہ وہ ساٹھ روپے ماہوار کا ملازم تھا مگر اس نے ساڑھے بارہ کروڑ کے قریب ترکہ چھوڑا۔ کمپنی کے ایک ایجنٹ رُوپ کشن کے پاس اتنی دولت تھی کہ اُس نے ماں کے مرنے پر نوے لاکھ صرف کیا۔ قدیم شریفوں اور سیٹھوں کے گھرانے برباد ہوگئے اور غریب کسانوں پر طرح طرح کے ظلم ہونے لگے۔

سترھویں صدی میں کمپنی نے سورت مدراس بمبئی اور کلکتے وغیرہ میں اپنی تجارتی کوٹھیاں بنائیں۔ اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے صوبہ دار نے اُنہیں وہاں سے نکال دیا جس پر انگریزوں نے بحیرۂ عرب میں حاجیوں کے جہازوں پر چھاپے مارنے شروع کئے۔ اس پر اورنگ زیب نے اپنے صوبے دار کے نام انگریزوں کے حق میں فرمان جاری کیا اور وہ دوبارہ ۱۶۹۰ء میں کلکتے میں متمکن ہوگئے۔ ہندوستان کے افق پر ایک نئی قسم کی طاقت یعنی بحری طاقت نمودار ہوئی جس کا اثر ایک روز کشمیر سے راس کماری تک پھیلنا تھا۔

اورنگ زیب کے بعد جہاں دیسی ریاستیں خود مختار ہونے لگیں وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی بھی طاقت حاصل کرنے لگی۔ پہلے پہل انگریزوں نے ساحلی مقامات پر اپنا قدم جمایا اور مدراس بمبئی اور کلکتہ کے مضافات میں اپنا علاقہ بڑھانا شروع کیا۔ پندرھویں صدی میں یورپی لوگوں میں پرتگیز ہندوستان میں سب سے زیادہ طاقت ور تھے، بتدریج ہندوستانی اس لئے بھی اُن کو ناپسند کرنے لگے کہ وہ دیسیوں کو زبردستی عیسائی بنا لیتے تھے۔ ۱۶۰۲ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی بنی۔ انگریزوں نے یہ دیکھ کر کہ مشرقی جزائر میں ڈچ انہیں گھسنے نہیں دیتے ہندوستان کے ساحل کی طرف زیادہ توجہ کی۔ یہاں بھی سولھویں صدی کے نصفِ اوّل میں ڈچ لوگوں کا بول بالا رہا چنانچہ انگریزوں کا ڈچ بحری طاقت سے مقابلہ ہوا اور جب وہ اسے پچھاڑ چکے تو فرانسیسی طاقت سے واسطہ پڑا۔ ۱۶۷۴ء میں فرانسیسیوں نے پانڈی چری کی بنیاد رکھی۔ دونوں قومیں یورپ میں مدت سے ایک دوسری کی مدِمقابل تھیں۔ اسی سلسلے میں یہاں بھی اُن میں جنگ شروع ہوگئی۔ ان دونوں نے موقع ڈھونڈ کر ہندوستان کے اندرونی معاملات میں دخل دینا شروع کیا۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے وسط میں کرناٹک اور حیدرآباد میں ایک فریق کا فرانسیسیوں نے اور دوسرے کا انگریزوں نے ساتھ دیا۔ اسی طرح انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ۱۷۴۴ء اور ۱۷۶۰ء کے درمیان تین لڑائیاں ہوئیں جن کا نتیجہ انگریزوں کی فتح ہوا۔ ۱۷۵۷ء میں کلایو نے بنگال کے نواب سراج الدولہ پر پلاسی کے مقام پر حملہ کرکے ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی بنیاد رکھی اور ۱۷۶۴ء میں شاہنشاہ شاہ عالم کو بکسر پر شکست دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۶۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو شاہِ دہلی کی طرف سے بنگالے کی دیوانی عطا کی گئی گویا بنگال کی اصل حکمران کمپنی ہوگئی۔

اس کے بعد انگریزی تاریخ ہند کا دوسرا یعنی فتوحات کا دور شروع ہوتا ہے۔ انگریزوں نے جابجا اپنے پاؤں پھیلانے [illegible] مقامی حکمران عیش و عشرت میں مبتلا تھے لوگ غافل اور بے بس تھے۔ انگریز ہوشیار [illegible]

ہندوستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر

(۳) انگریزوں کا عہد (۱۹۱۹ء تک)

ہندوستان میں انگریزوں کا داخلہ آریاؤں اور مسلمانوں سے بالکل مختلف تھا۔ آریا اور مسلمان تو دونوں ہتھیار باندھے اور تلوار کھینچے یہاں آئے وہ کھُلم کھُلا حملہ آور ہوئے اور کھُلم کھُلا حاکم بنے لیکن انگریزوں پر پنجابی کی وہ مثل خوب صادق آتی ہے کہ آگ لینے آئی اور گھروالی بن بیٹھی۔ لین دین کرنے آئے اور تعلقات کا ایسا جال پھیلایا کہ پھر کوئی اس جال سے چھُوٹ نہ سکا۔

لیکن سچ یہ ہے کہ شروع سے اِن سفید لوگوں کا نہ دل سیاہ تھا نہ نیت ہی بُری تھی گو ایک انگریز مورخ کا یہ کہنا بھی کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت محض ایک حادثہ کی طرح وقوع میں آئی واقعات سے بعید ہے۔ یہ لوگ تاجر بن کر آئے مگر جب انہوں نے مرکزی سلطنت کو کمزور ہوتے پایا اور یہاں کے لوگوں کو دن رات آپس میں لڑتے بھڑتے دیکھا تو انہوں نے لگائی بجھائی شروع کر دی اور اپنا مطلب نکالنے اور اثر پھیلانے کے لئے وہ سب جتن کئے جو کم از کم امن پسند اور بھلے مانس سوداگروں کی شان کے شایاں نہ تھے۔

ہاں بے انصافی ہوگی اگر ہم کسی قوم کے کسی غیر ملک پر قابض ہونے کے سلسلے میں مذہبی نیکی اور ایثار اور انصاف کا مطالبہ کریں۔ انسانی قوت کا طوفان جہاں اپنے سامنے نشیب پاتا ہے وہیں بہ نکلتا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں گرم مزاج ہندوستان کی قومیں اپنی عیش و عشرت اور سُستی اور خانہ جنگی کے باعث مضمحل اور ذلیل ہو رہی تھیں۔ وسط ایشیا بھی ضعیف ہو رہا تھا لیکن اُدھر دور سمندر پار کے شمالی ملکوں کی ٹھٹھرنے والی قومیں اپنے اندر ایک نئی زندگی کی پُر لطف حرارت محسوس کر رہی تھیں۔ جب کہ ہم ابھی لیٹے لیٹے انگڑائیاں لے رہے تھے یہ من چلے آپس کے مقابلے کی بھاگ دوڑ میں ایک سے ایک آگے نکل جانے کی اُمنگ میں پھلانگتے ہوئے ہم تک پہنچ گئے۔

برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدا بھی ایک لطیفہ ہے۔ ڈچ تاجروں نے جو ایشیائی مرچ مسالوں کی تجارت کے تنہا اجارہ دار تھے لندن میں مرچوں کا بھاؤ حد سے زیادہ بڑھا دیا۔ اِس پر لندن کے تاجروں نے ارادہ کیا کہ آئندہ ہم خود ہندوستان سے تجارت کریں اور اس غرض سے ملکہ الزبتھ نے اکبر کی طرف اپنا ایک سفیر بھیجا۔ اس سے سولہ سترہ سال پہلے بھی ۱۵۸۵ء میں ملکہ نے تین انگریزی سیاحوں کو اکبر کے نام ایک خط دیا تھا جس میں اُس نے شاہنشاہ اکبر کو "نصرت پناہ وجلالت مآب شہزادہ، لارڈ زیلاب دِم ایکیبار شاہ کیمبیہ" کہہ کر خطاب کیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ملکۂ انگلستان کی طرف سے پہلی سند سولھویں صدی کے آخری دن ۳۱۔ دسمبر ۱۶۰۰ء کو عطا کی گئی۔

ہندوستان میں انگریزوں کی تاریخ کے چار دور ہیں۔ پہلا ۱۶۰۰ء سے ۱۷۵۷ء تک تجارت کا دور۔ دوسرا ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۸ء تک فتوحات کا دور۔ تیسرا ۱۸۵۸ء سے ۱۹۲۰ء تک مادی ترقی اور سیاسی بیداری کا دور۔ اور چوتھا ۱۹۲۰ء سے تا حال ذمہ دار حکومت اور مطالبۂ آزادی کا دور۔

اوّل اوّل انگریز ہندوستان میں تاجر بن کر آئے اِس لئے اُن کا سب سے بڑا مقصد اپنی تجارت سے نفع اٹھانا تھا۔ بہت [illegible] کے [illegible] مسلمان بادشاہوں نے فیاضی سے کام لے کر انہیں ہر طرح کی سہولتیں دیں اور ہندوستانیوں نے اپنی [illegible] میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ کبھی انگریز کو مکان نہ ملتا تو ہندوستانی تاجر اپنا مکان خالی کر دیتا [illegible]

امریکہ

۱۹۴۱ء میں امریکی کتابوں کی اشاعت :—

۱۹۴۱ء میں امریکہ میں شائع شدہ نئی کتابوں اور نئے ایڈیشنوں کی کل تعداد ۱۱۱۱۲ تھی۔ اس عدد میں بہ مقابلہ ۱۹۴۰ء ۱۹۱۳ کتابوں کی کمی ہے جن کتابوں کی اشاعت میں اضافہ ہوا اُن کی تفصیل یہ ہے :—

کتب متعلقۂ فنونِ مختلفہ (۱۳۰+) شعر اور ڈراما (۸۵+) خانہ داری (۳۲+) فنونِ لطیفہ (۳۲+)

جن کتابوں کی اشاعت میں کمی ہوئی اُن کی تفصیل یہ ہے :—

مذہبی کتابیں (۱۷۹-) تاریخ (۱۰۰-) سوانح عمریاں (۴۸-)

نئے ایڈیشنوں کی کل میزان ۱۹۴۱ء میں ۱۷۷۵ اور ۱۹۴۰ء میں ۱۸۱۳ تھی۔

برطانیہ میں روسی کتابوں کی تبلیغ واشاعت

موجودہ جنگ نے دشمنوں کو دوست اور دوستوں کو دشمن بنا دیا ہے۔ جب تک جرمنی اور روس کی جنگ نہیں چھڑی تھی برطانیہ میں روس کے خلاف سخت نفرت پھیلی ہوئی تھی۔ حکومت کے پروپیگنڈا کی کل بھی پوری طرح روس کے سیاسی عقائد کے خلاف تبلیغ واشاعت میں مصروف تھی۔

جرمنی کے خلاف روس کے اعلانِ جنگ سے حالات نے ایسا حیرت انگیز پلٹا کھایا کہ اب انگلستان نے نہ صرف روس کو مع اُس کے تمام سیاسی عقائد کے برداشت کر لیا ہے بلکہ وہ اُس کی حمایت کے لئے سینہ سپر ہے اور ہر طرح سے اُس کی تالیفِ قلب کی کوشش کر رہا ہے۔

اسی تالیفِ قلب کے سلسلے میں لندن سے یہ تعجب انگیز اطلاع آئی ہے کہ انگلستان کے بورڈ آف ایجوکیشن نے سوویٹ یونین کے متعلق چالیس کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے جو انگلستان کے مدارس میں اس غرض سے پڑھائی جائیں گی کہ اُس ملک میں سوویٹ روس کے حالات کے متعلق علم و واقفیت پیدا ہو جائے۔

بورڈ آف ایجوکیشن نے اساتذہ کی امداد کے لئے سوویٹ روس کے متعلق ایک نصابِ تعلیم بھی مقرر کر دیا ہے۔ اس نصاب کا مقصد یہ ہے کہ انگلستان کے طلبہ مختلف شعبوں میں روس کی ترقیوں کا مطالعہ کر سکیں اور دونوں قوموں کو یہ موقع ملے کہ وہ ایک دوسری کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

بورڈ آف ایجوکیشن کی مرتبہ فہرست کے آغاز میں روسی سفیر ایڈمیسکی کی ایک تقریر دیباچے کے طور پر درج کی گئی ہے۔

بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا

روسی اخبارات

سوویٹ یونین میں کل نو ہزار اخبارات، ستر مختلف زبانوں میں چھپتے ہیں۔ ہٹلر کے حملے سے پہلے ان اخبارات کی مجموعی اشاعت تین کروڑ اسی لاکھ تھی۔ زار کے زمانے میں ۱۹۱۳ء میں روسی اخبارات کی کل تعداد آٹھ سو انسٹھ تھی اور ان کی روزانہ اشاعت کل ستائیس لاکھ تھی۔

اخبارات کی اشاعت کے متعلق یہ اعداد بہت نتیجہ خیز ہیں۔ علاوہ دوسری باتوں کے ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ روس نے سرمایہ دارانہ نظام کا قلع قمع کرنے کے بعد تعلیم میں کتنی حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ بعض روسی اخبارات کی اشاعت حسبِ ذیل ہے :—

ازویستیا	۱۵ لاکھ
(کمیونسٹ پارٹی) پراودا	۲۲ لاکھ
(نوجوانوں کا اخبار) کامسومالسکایا پراودا	۷ لاکھ
[illegible] پراودا	[illegible] لاکھ

اُور شکار کھیلنا اُن کی بڑی بڑی تفریحات تھیں۔ پارٹیاں دینے کی رسم عام تھی۔ کبھی کبھی نٹ اُور مداری آکر تفریح کا سامان پیدا کر دیتے تھے۔ سکنر اُور ہندو اور ڈیورونین لوگوں کی معاشری سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے تھے اُور دونوں بہت پیش پیش تھے۔

دوسرا اخبار "نورِ مشرقی" چار صفحوں پر چھپتا تھا۔ اس پر دبیز بادامی کاغذ استعمال ہوتا تھا اور ہر صفحہ دو کالموں میں منقسم تھا۔ اِس کی قیمت ایک آنہ فی پرچہ تھی اُور اشتہارات کی اُجرت ایک آنہ فی سطر فی بار مقرر تھی۔ اشتہارات بہت کم درج ہوتے تھے۔ یہ اخبار جمعہ کے دن شائع ہوتا تھا اور جلد ۱ کا نمبر ۲۷ بتاریخ ۴ ۱۲ فروری ۱۸۴۴ء چھپا۔

اِس اخبار میں مقامی خبروں کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ دربار کی سازشوں اُور بازار کی لڑائیوں کے حالات سے اِس کے کالم بھرے ہوتے تھے۔ بیرونی خبروں میں صرف ٹرکی، ایران اور حیدرآباد کے واقعات کو اہمیت دی جاتی تھی۔ دوسرے ممالک کے حالات کے اندراج میں بہت اختصار سے کام لیا جاتا تھا۔ البتہ بعد کے پرچوں میں جن میں سے ڈاکٹر قریشی کے پاس ستمبر اُور اکتوبر ۱۸۵۴ء کے پرچے موجود ہیں بیرونی خبروں کی طرف کچھ توجہ دی جانے لگی۔ چنانچہ وسطِ ایشیا اُور مشرقِ ادنیٰ میں روس کی سرگرمیوں کے علاوہ افغانی سیاسیات اُور ہندوستان کی سرحد کے واقعات کا خاص طور پر جائزہ لیا جاتا تھا۔

اِس اخبار کی زبان بھی اچھی مگر کسی قدر پرانی تھی۔ اس میں جگہ جگہ اُردو اُور فارسی کے اشعار کے حوالے دیئے جاتے تھے اور جابجا انگریزی کے الفاظ کا استعمال بھی کیا جاتا تھا۔ اس کے بہت سے پرچوں میں اپنے ایک ہمعصر حریف "نورِ مغربی" پر حملے کئے گئے ہیں۔ چونکہ ان دونوں اخبارات میں سے ایک کا نام "نورِ مشرقی" اُور دوسرے کا نام "نورِ مغربی" ہے اس لئے ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی ایک محض دوسرے کے جواب میں شائع کیا گیا ہو۔

اشاعتِ کتب پر جنگ کا اثر

ذیل کے نقشۂ اعداد و شمار سے معلوم ہو گا کہ جنگ نے دنیا کے دو بڑے ممالک انگلستان اُور ممالکِ متحدہ امریکہ میں کتابوں کی اشاعت پر کیا اثر ڈالا ہے۔ نقشۂ متعلقہ انگلستان سے ۱۹۳۷ء-۱۹۴۱ء تک پانچ برس کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے نقشے سے جو امریکہ کے متعلق ہے صرف ۱۹۴۱ء کا حال معلوم ہوتا ہے۔

انگلستان

	۱۹۳۷ء	۱۹۳۸ء	۱۹۳۹ء	۱۹۴۰ء	۱۹۴۱ء
کل شائع شدہ کتابیں	۱۷۱۳۷	۱۶۲۱۹	۱۴۹۰۴	۱۱۰۵۳	۷۵۸۱
نئے ایڈیشن اور اشاعتِ ثانی	۵۸۱۰	۵۳۰۷	۴۴۹۳	۳۵۳۰	۲۳۲۶
ترجمے	۴۳۴	۳۶۵	۳۰۵	۱۶۸	۱۳۱
اعلیٰ ایڈیشن	۷۱	۱۱۷	۳۸	۳۲	۳۸
سوانح عمریاں	۷۸۹	۸۵۵	۶۸۹	۴۴۴	۳۵۹
تعلیمی کتابیں	۱۳۲۷	۱۳۴۱	۱۳۵۰	۶۵۸	۳۴۰
مضامین اُور ادبِ لطیف	۴۶۲	۳۶۳	۲۹۸	۲۵۲	۱۱۲
ناول اُور افسانے	۵۰۹۷	۴۶۸۷	۴۲۲۲	۳۷۹۱	۲۳۴۲
شعر اُور ڈراما	۵۴۹	۵۲۹	۵۳۵	۳۱۰	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	۵۵۱	[illegible]

جہاں نما

ایک صدی قبل کے دہلوی اخبارات

ڈاکٹر آئی۔ ایچ قریشی نے "انڈین ہسٹاریکل ریکرڈز کمیشن" کے سامنے ایک مضمون پڑھا جس میں انہوں نے بتایا کہ اب سے سو سال پہلے دہلی سے دو ہفتہ وار اخبارات شائع ہوتے تھے۔ اِن اخبارات کی ہر اشاعت میں مغل شہنشاہ بہادر شاہ کی غزلیں تقریباً مسلسل چھپتی تھیں۔ اِس کے علاوہ اِن میں بادشاہ کے روزمرہ کے مشاغل کی تفصیل بھی درج ہوتی تھی۔ اِن اخبارات کے مطالعے سے اُس زمانے کے معاشرتی حالات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ قلعۂ معلّیٰ سے بادشاہ کی صحت اور روزانہ مصروفیات کے متعلق ہر ہفتے ایک اطلاع نامہ شائع کیا جاتا تھا۔ دونوں اخبارات میں اس کی اشاعت کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ اطلاعات بہت نتیجہ خیز ہیں۔ اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلیہ دربار جس کے شکوہ و شان کی کبھی دنیا میں مثال موجود نہ تھی اگرچہ روبہ زوال ہو رہا تھا، مگر بہادر شاہ ناسازگار حالات کے باوجود اس دربار کی قدیم عظمت و شوکت کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اخبارِ دہلی" بہت قابلیت سے مرتب کیا جاتا تھا۔ اس کی غیر جانب دارانہ تنقید کا معیار بہت بلند تھا۔ زبان سلیس اور بامحاورہ تھی جیسی اُس زمانے میں دہلی میں بولی جاتی تھی۔ یہ اخبار بہت اچھے کاغذ پر چھپتا تھا۔

ڈاکٹر قریشی نے سر جان ٹامسن سابق چیف کمشنر دہلی سے اس اخبار کے بعض پرانے پرچے لے کر پڑھے۔ یہ پرچے جون ۱۸۳۷ء سے لے کر فروری ۱۸۳۸ء تک کی تاریخوں کے تھے۔ اِن اشاعتوں میں جو بڑے بڑے واقعات درج ہیں اُن میں شہنشاہ اکبر ثانی کے انتقال، بہادر شاہ کی تخت نشینی، انگریزی کمانڈر اِن چیف اور گورنر جنرل کی آمد کی اطلاعات خاص طور پر اہم ہیں۔ اِن واقعات اور اِن کی متعلقہ تقریبات کی نہایت جزوی تفصیلات اِن پرچوں میں درج کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر قریشی کا بیان ہے کہ چیف کمشنر کے مجموعے کے جو پرچے میں نے دیکھے اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہادر شاہ کی تخت نشینی کے بعد "اخبارِ دہلی" کے ہر پرچے میں شہنشاہ کی ایک غزل ضرور شائع ہوتی تھی۔ شہنشاہ اعلےٰ درجے کا شاعر تھا۔ اس کے پُر درد اشعار میں دنیا کی بے حاصلی و بے ثباتی کی تصویریں نظر آتی ہیں جو اُس عہد کی دہلی کے حالات سے پوری مطابقت رکھتی ہیں۔ کبھی کبھی اس اخبار میں ذوق کی غزلیں بھی چھپتی تھیں جو ملک الشعراء اور استادِ شاہ تھا لیکن اُردو کے سب سے بڑے شاعر غالب کی غزلوں سے بے توجہی برتی جاتی تھی۔ اس اخبار میں بے اختیار اور برائے نام شہنشاہ کا ذکر جس محبت اور عزت سے لیا جاتا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے لوگ اُسے اپنی گزشتہ عظمت و شوکت کا نشان سمجھتے تھے۔

"اخبارِ دہلی" بہت باخبر اخبار تھا۔ ہندوستانی اور غیر ملکی معاملات کے متعلق اس کی آراء صائب معلوم ہوتی ہیں۔ یہ اخبار ہندوستانی ریاستوں کے معاملات میں بھی بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے بیگم سمرو کی حکومت پر غریبوں کا خون چوسنے اور جبر و تعدی روا رکھنے کا الزام لگایا اور اس الزام کو اعداد و شمار اور واقعات سے ثابت کیا۔

اس اخبار نے انگریزی حکومت کی بعض کارروائیوں پر بھی بہت متین انداز میں نکتہ چینی کی اور حکومت کو بعض ایسے احساساتِ بے اطمینانی کی طرف توجہ دلائی جو بالآخر ۱۸۵۷ء میں بہت جلی ہو کر نظروں کے سامنے آئے۔

اسی اخبار سے دہلی میں انگریزوں کی معاشرتی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ شام کے وقت بگھیوں میں سیر کشتی چلانا

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]		[illegible]
[illegible]	[illegible]		[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہندی کے رستے میں بڑی رکاوٹیں

اِس عنوان سے ڈاکٹر دھریندر ورما نے ایک مفصل مضمون جولائی کے ہنس میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف الہ آباد یونیورسٹی میں
شعبۂ ہندی کے صدر ہیں۔ جو حالت انہوں نے ہندی سے متعلق اپنے صوبے کی اور عام لوگوں کی دیکھی اسی بنا پر انہوں نے یہ مضمون لکھا۔ ان
کے مضمون کا تجزیہ یوں ہوتا ہے :—

(۱) "انگریزیہ ہندی" (۲) "اُردو وال ہندی" (۳) وہ لوگ جو دوسرے صوبوں سے ہندی صوبے میں آکر بس گئے مگر ہندی سے ہمدردی
نہیں رکھتے (۴) ہندی بولنے والا صوبہ غیر معین ہے (۵) حقیقی ضروریات اور ممکنات کا احساس نہ ہونا۔ وغیرہ

۱۔ شکایت ہے کہ تعلیم کا ذریعہ انگریزی ہے جو نفسیات اور فطرت کے خلاف ہے اس بارے میں گاندھی جی نے جو ابھی بنارس کی ہندو
یونیورسٹی میں فرمایا۔ یاد رکھنے کے قابل ہے۔

۲۔ ڈاکٹر صاحب کو ایک شکایت یہ بھی ہے کہ ہندی کے صوبے میں عدالت کی زبان اُردو کیوں ہے اور فرماتے ہیں "کچھ ہندوؤں کی
ساہتیک (ادبی) بھاشا بھی ابھی تک اُردو ہے پچھمی یو۔ پی میں اور دلّی میں اونچی سوسائٹی میں اُردو کا ہی چلن ہے۔ ہندی علاقے کے بڑے
آدمیوں میں ایسے لوگ ہندوؤں میں بھی ابھی بہت ملتے ہیں جن کی تعلیم الف۔ بے سے شروع ہوئی تھی۔ دیوناگری سے نہیں۔ یہ لوگ دلّی
اور یو۔ پی کے پچھمی علاقوں میں بے شمار پائے جاتے ہیں۔ ان کی ہمدردی کا میلان قدرتی طور پر اُردو کی طرف ہو جاتا ہے۔

۳۔ پھر ان لوگوں کو ہندی کے رستے میں رکاوٹ بتایا گیا ہے جو دوسرے صوبوں سے آکر بس گئے مگر انہوں نے ہندی سے واسطہ نہ رکھا اور
اپنی ہی زبان مثلاً مرہٹی۔ بنگالی۔ تامل وغیرہ رکھی۔

۴۔ ایک اور شکایت ان کو یہ ہے کہ: "ہندی پرانت کی سیما کا نشچت نہ ہونا" یعنی تحقیقی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ہندی کس صوبے کی زبان ہے۔

۵۔ پھر وہ شاکی ہیں کہ اہل نقاد اور خرابیاں پیدا کرتے ہیں اور یہ کہ حقیقی ضروریات و ممکنات کا احساس نہ ہونا بھی ہندی کے راستے میں بڑی رکاوٹ ہے

آپ نے دیکھا کہ جہاں تک صورت حال کا تعلق ہے ڈاکٹر دھریندر صاحب کا مشاہدہ کتنا صحیح ہے۔ اب یہ معامرِ ہندی اور دوسرے فل
چلانے والوں کا فرض ہے کہ یا تو اُن باتوں کی تردید کریں جو زیر نظر مضمون میں لکھی گئی ہیں۔ یا راشٹر بھاشا اور سنسکرتی ہندی کے جنونی جذبات اپنے
سر سے نکال کر وہ کام کریں جو سب امور پر نظر رکھ کر انہیں کرنا چاہئے۔

جب کل ہند و ہندی کے حامی نہیں تو ہندی راشٹر بھاشا کیوں کر ہو سکتی ہے جب ہندی پرانت کی حدیں ہی قائم نہیں ہو سکی ہیں تو ہندستان کا کوئی
صوبہ بھی ہندی کا صوبہ نہیں کہا جا سکتا جب آدھا یوپی یا اس کا بڑا حصہ اُردو میں تعلیم شروع کرتا ہے۔ اُردو وکیل اور عدالتیں اُردو کے ساتھ ترجیحی سلوک کرتی
ہیں مختصر یہ کہ ان صورتوں میں اردو کو غیر ملکی اور مسلمانی چیز بتانا ظاہر ہے کہ معقولیت سے کس قدر دور ہے جگ ہنسائی کی بات سے بچنے دیکھنے والوں کو
معقولیت اور ذمہ داری کا کچھ خیال اور احساس ہونا چاہئے سخت کلامی اور ہٹ دھرمی سے اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

"ہماری زبان"

سید عبد اللطیف پرنٹر پبلشر نے [illegible] پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ [illegible] سے شائع کیا [illegible]

کسی کو اُردو کو توڑ مروڑ کر بولتے سنتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ اس کا گلا گھونٹ دوں۔ دو تین دن تک تو میں ایسے جملے سنتی رہی اور برداشت کرتی رہی :۔ "آپ کو ٹیلی فون پر منگتا" "چائے آپ کے بجے لے گا" "بابا لوگ کا سپر میز پر ہے" "فلاں نے آپ کو سلام دیا ہے" لیکن تیسرے دن تو میں نے ٹوک ہی دیا۔ "بہرا تم مراد آباد کے رہنے والے ہو کر ایسی زبان بولتے ہو۔ تمہاری بیوی تو بہت صاف اردو بولتی ہے تم کیوں نہیں ویسی باتیں کرتے؟" "ہم چھوٹا وقت سے صاب لوگ کے ہاں کام کیا اس لئے ایسا بولتا" میں نے کہا "انگریز کے ہاں کام کرنے کی وجہ سے زبان خراب ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں بہرحال اب تو ہندوستانی کے یہاں ہو اس لئے ہم سے تو ایسی بولی مت بولا کرو" بے چارے نے خون کے گھونٹ کی طرح اس حکم کو پی لیا اور ایک آدھ دفعہ کوشش بھی کی کہ سیدھی طرح بولے لیکن اس کی گھٹی میں انگریزیت پڑی ہوئی تھی وہ کہاں سے جاتی۔ "چائے لے گا" کے بدلے اس نے دو ایک دفعہ ہمت کر کے "آپ چائے کس وقت پئیں گی" تو کہہ لیا اس کے علاوہ اس کی مغرب زدہ طبیعت اور کوئی ترمیم اپنے طرزِ گفتگو میں برداشت نہ کر سکی۔

کھانا کھلاتے وقت بے چارے کو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ اگر انگریزی کھانا ہوتا تو وہ بڑی خوشی سے کھلاتا تھا لیکن ہندوستانی کھانا ہوتا تو اس کو سخت تکلیف ہوتی تھی اوّل تو اُسے یہ طریقہ ہی معلوم نہ تھا یا کم از کم اس بات کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ جانتا ہے کہ ہندوستانی کھانا کس طرح کھایا جاتا ہے۔ اس لئے وہ روٹی۔ سالن ہر چیز کے بعد لایا کرتا۔ اور جہاں ہم نے دو نوالے کھائے کہ پلیٹ غائب! اور نوالہ ہاتھ کا ہاتھ میں!! بھلا آپ غور فرمائیے وہ بغیر پلیٹ بدلے کھانا کھلانا کس طرح گوارا کر سکتا تھا۔ اس کو سب سے زیادہ رنج ہمارے فنگر بول میں ہاتھ نہ ڈالنے سے ہوتا تھا۔ وہ روزانہ ڈیوٹی لگا لگا کر فنگر بول میز پر لاتا اور ہم کہتے نہیں آفتابہ چلمچی اٹھا لاؤ۔ آفتابہ چلمچی جیسی چیزوں کا چھونا بھی اس کے لئے کسرِ شان تھا اور آفتابہ سے پانی ڈالنا تو اس کو دو مہینے میں آیا ہی نہیں۔

لیکن اس کی زندگی کا شاید سب سے تاریک دن وہ تھا جب میں نے اس کی توجہ پاندان کی صفائی کی طرف کروائی اور جس وقت لوگ ملنے آتے اور وہ نہایت مؤدبانہ طریقے سے پوچھتا "پینے کے واسطے کیا لائے گا حضور" اور میں اس سے پاندان منگواتی تو اس کا دل بیٹھ جاتا۔ اُف نئی دہلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پان کھایا جائے "بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب" کا معاملہ نہیں تو کیا ہے۔

اور جس دن اُس نے ایک کرنل کی وردی میں ملبوس دوست کو اپنے ہاتھوں سے پان لگا کر کھاتے دیکھا۔ شاید اس روز اس کو قربِ قیامت کا یقین آ گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے یا خواب دیکھ رہا ہے ہمیں تو اس نے شاید عجیب الخلقت سمجھ کر صبر کر لیا تھا۔ لیکن ہمارے ہاں کے مہمان بھی ایسے ہی نکلے اور نہ صرف یہ بلکہ جو بھی ہمارے یہاں ملنے آتا تھا وہ اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا اور ہمارے یہاں ڈنر پارٹیز بھی اس کے لئے رنج دہ ہوتی تھیں آنے والوں میں ایک بھی ڈنر جیکٹ میں نہ ہوتا تھا۔ ایک یہی نہیں! انگریز تک بغیر ڈنر جیکٹ کے ہوتے تھے اور ہندوستانی کھانا شوق سے مانگ مانگ کر کھاتے تھے اور ہائے غضب ان انگریزوں کے آگے بھی ہم اپنی نیٹو پن سے شرمایا نہیں کرتے تھے اور جیسے ہی ہندوستانی کھانا پیش ہوتا۔ ہاتھ سے کھانا شروع کر دیتے تھے اور کھانے کے بعد پان کھاتے۔ ہمارے نیٹو پن سے اُسے ندامت سے عرق عرق ہونا پڑتا تھا۔ اور ہمارے یہاں کیسے کیسے نیٹوؤں کی اس کو خاطر کرنی پڑتی! برقع پوش عورتیں۔ مولوی منشی بزرگ۔ کھدر پوش حضرات! اور مزہ تو یہ ہے کہ نئے فیشن کے لوگوں کی نسبت ان کی دگنی خاطر تواضع ہوتی تھی دروازے تک جا کر ان کا خیر مقدم کیا جاتا تھا اور گاڑی تک جا کر ان کو سوار کرایا جاتا تھا اس بے خبر کو کیا معلوم کہ سیدھے سادے لباس میں ہندوستان کی کیسی کیسی مقتدر ہستیاں ہوتی تھیں۔

غرض اس کی انگریزیت سے ہم بیزار اور ہمارے نیٹو پن سے وہ نالاں جتنی دفعہ وہ "آپ کو ٹیلی فون پر مانگتا" کہتا میرا خون کھول جاتا اور جتنی دفعہ اُسے پاندان اٹھا کر لانا پڑتا اس کے دل پر سانپ لوٹ جاتا بھلا دیکھئے تو سہی جو ہاتھ نفیس کاک ٹیلز کے ٹرے اٹھائے ہوں شیری کے گلاس دھوئے ہوں وہ پاندان اٹھائیں اور چلمچی ڈھوئیں!! آخر ایک روز میرے صبر کا پیمانہ چھلک ہی گیا اور بیس طرح کہ ان بہرا صاحب نے ایک دھوبی کی سفارش ہم سے ان لفظوں میں کی "حضور بہت اچھا کپڑا دھوتا ہے۔ بڑا بڑا لوگ کے کام کیا کبھی کالے آدمی کے کام نہیں کیا" میں نے کہا بہت اچھا اس کو اب بھی اس شرف کے کھونے کی ضرورت نہیں تم ہی یہ ذلت کیوں اٹھاؤ۔ اس سے آج ہی کے دن تمہارا حساب کرو۔ ایک ہی تو پلٹن بے چارے بہرے کی غلطی فضول ہے ان کا مشغلہ اڑانا بے جا ہے ان کا کیا قصور۔ قصور اس ماحول کا ہے جو غلام قوم کے ملک میں پیدا ہو جاتا ہے اور جس کا اثر لازمی طور پر ایسی ذہنیت کی تخلیق کرتا ہے۔

ثاقبہ فاطمہ زہرا سہروردی

"عصمت"

ہمارا بہرہ

کانگرسیوں کو انگریزوں سے شکایت ہے کہ ہندوستان کو آزادی سے محروم کر دیا۔ مسلم لیگ شاکی ہے کہ ہماری حکومت چھین لی۔ گاندھی جی الزام لگاتے ہیں کہ ہندوستان کی صنعت کو برباد کر دیا۔ کمیونسٹ کہتے ہیں کہ مزدور کو لوٹ لیا۔ لیکن انگریزی حکومت کے سب سے بڑے ظلم کا کوئی بھی ملکی نہیں! یعنی اس نے ہندوستان میں دو ایسی مکروہ چیزیں پیدا کیں جو دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں۔ یعنی آیا اور بہرا۔ مشرق کی تہذیب کو مغرب کے تصادم سے جو نقصان پہنچا ہے ان کی زندہ مثالیں ہیں۔ ان کی ذہنیت ان کی زبان ان کی طرز معاشرت۔ ان کا نقطۂ نگاہ پکار پکار کر اس بات کی فریاد کر رہا ہے کہ دیکھو مغرب نے مشرق کے ساتھ کیا کیا۔ آپ کہیں گی میں مبالغہ کر رہی ہوں نہیں جناب! آپ نے شاید کبھی اس مضحکہ خیز ہستی یعنی بیرا کی ذہنیت اور گفتگو کے نقطۂ نگاہ پر غور نہیں فرمایا میں آپ کی خدمت میں اس طبقے کے ایک فرد کی تصویر پیش کرتی ہوں اس کو پڑھئے اور فیصلہ کیجئے کہ میرا یہ کہنا صحیح ہے یا غلط کہ سب سے بڑا ظلم ہندوستان پر ان ہستیوں کی تخلیق ہے۔

کچھ روز ہوئے مجھ کو ایک اصل نسل بہرا دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے اس سے قبل بھی اس قسم کی مخلوق کو دیکھا ہے مگر چند روز بعد ہی مغرب کی تہذیب کی یہ پیداوار میرے گھر کے مشرقی ماحول میں نہ پنپ سکنے کی وجہ سے رخصت کر دی جاتی تھی لیکن آج کل دہلی میں نوکروں کی قلت کی وجہ سے مجھے اس دفعہ اُسے پورے دو مہینے رکھنا پڑا۔

ہمارا بہرہ "بہریت" کی مکمل تصویر تھا مغربیت اس کی رگ رگ میں پیوست ہو چکی تھی۔ اس نے بڑی کوششوں سے صاحبوں کے رہنے کے طور طریقے سیکھے تھے اور مجھے یقین ہے کہ میرے یہاں کے نیٹو پن سے بے چارے کے جذبات سخت مجروح ہوئے ہوں گے اور دنیا کی نیرنگی پر اپنے دل میں حیران ہوگا کہ نئی دہلی میں رہنے والے آئی سی ایس کہلانے والے لوگ اور ایسے نیٹو؟ محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔

پہلا دھچکا جو اس بے چارے کی مغرب پسند طبیعت کو میرے یہاں لگا وہ یہ تھا کہ جب اس نے رات کے کھانے کے بعد نہایت ادب سے جھک کر اپنے سر کو میرے صاحب کے کانوں کے قریب لا کر پوچھا "بلنگ چائے کے بجے مانگتا ہے" اور اس کا جواب اسے یہ ملا کہ ہم لوگ "بلنگ چا" سرے سے پیتے ہی نہیں تو اس کو یقین نہ آتا تھا کہ اُس نے صحیح سُنا۔ "کچھ فروٹ لیکٹ مانگتا" اُس نے پھر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں پوچھا "نہیں کچھ بھی نہیں" جواب سُن کر اس نے ذرا دیر بعد اپنے دل کو قابو میں لا کر پھر پوچھا "چھوٹا حاضری کے بجے مانگتا؟" ہم نے جواب دیا "ہم لوگ ناشتہ صبح ۸ بجے کیا کرتے ہیں" اس نیٹو جواب کو سُن کر اس بیچارے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہمیں سلام کیا اور یہ سوچتا ہوا کہ میں کیسے جنگلیوں میں آ پھنسا کمرے سے چلا گیا۔

لیکن یہ اس کی ناکامیوں کی ابتدا تھی۔ دو مہینے اس نے ہمارے گھر میں وہ وہ رنج اٹھائے کہ اس کا دل چھلنی ہو گیا ہوگا۔ دوسرے ہی دن صبح کو اس نے چائے دانی میز پر رکھتے ہوئے اُن سے پیر کا نا پوسی کی "انڈا کیسا مانگتا صاب؟" انہوں نے اخبار پڑھتے ہوئے سرسری طور سے کہا "خاگینہ" بیچارا سوچتا ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "خاگینہ نہیں جانتے؟ انڈے کو توڑ کر پیاز کتر کتر ...." ابھی میں جملہ ختم بھی نہ کرنے پائی تھی کہ اس نے کہا "ہم ہندوستانی برتن نہیں جانتا۔ انگریزی برتن بنا سکتا" میں نے کہا اچھا انڈا تل لاؤ وہ ہنوز کھڑا تھا، میں نے دوبارہ کہا "انڈے تل لاؤ" میں نے دیکھا وہ اپنے دماغ پر بہت زور دے رہا ہے کہ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے چڑ کر کہا "جاؤ انڈا فرائی کر لاؤ" انگریزی لفظ سنتے ہی اُس کے جان میں جان آگئی وہ مسرت کے ساتھ کھانے کے کمرے سے باہر چلا گیا۔

معاملہ یہی تماشا ہوتا تھا اور ہمارے نیٹو پن سے بچارے کو رنج پر رنج پہنچتا رہتا تھا اُدھر ہم اس کی انگریزیت سے جل جل کر کوئلہ ہو ہو جاتے تھے۔ جتنے دن رہا گھر کی فضا ویسی ہی تھی جیسے یورپ کی فضا "کرائسس" کے زمانے میں۔

میری کمزوریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں اُردو کو قتل ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ میں کسی کو دہلی کی کوثر سے دُھلی ہوئی صاف ستھری اردو ... دا ... ملیت ... سے کہ گھنٹوں سنتی رہوں چاہے گفتگو کا مقصد کچھ ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح

[illegible]

ڈاک خانے کے ہے مندر آج اُف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اُف آدمی۔
اِن میں ہر اک کی تمنا ہے کہ وہ۔
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل۔
بھاگ کر دیکھے کہ اُس کی سائیکل
ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر گئے
ڈاک خانے میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے۔
جا رہے ہیں خط چہار اطراف کو۔
بمبئی کو۔ مصر کو۔ لندن کو کوہ قاف کو۔
دیکھنا آئی ہے۔ اک عورت لفافہ ڈالنے۔
کون کہتا ہے کہ اک عورت ہے یہ۔
یہ تو لڑکا ہے۔ کسی کالج کا کہ
جس کے بال۔
خدوخال
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم۔
اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل۔
اُف ہماری لغزشیں۔
ہے مگر کسی شخص کا یہ سب قصور۔
کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام۔
جھٹپٹا سا ہو گیا ہے شام کا۔
یا ہمارے ہے تمدن کا قصور
کہ ہمارے نوجوان
ڈاک خانے میں ہیں جب آتے لفافہ ڈالنے
اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں۔
کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں!

(سامعین کی طرف سے داد دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے مرحبا۔ بھئی کمال کر دیا کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کی سراسیمگی بڑھتی جا رہی ہے)

م۔ن۔ راشد۔ اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غیظ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غیظ۔ میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

میرا جی۔ تو پھر وہی نظم سنا دیجئے جو پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی۔

پروفیسر غیظ۔ آپ کی مرضی تو وہی سن لیجئے۔

عنوان ہے۔ لگائی

فون پھر آیا دلِ زار! نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلّا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامنِ افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمہ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

(نظم کے دوران میں اکثر مصرعے وہ دو دو چار چار بار پڑھاتے جاتے ہیں اور پروفیسر غیظ بار بار مرزا غالب کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب مبہوت ہیں)

م۔ن۔ ارشد۔ حضرت میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے ملک کے اینٹی فاشسٹ جذبے کو خوب نبھایا ہے۔

رفیق احمد۔ (سرگوشی کے انداز میں میرا جی سے) بکواس ہے!

م۔ن۔ راشد۔ اب میرا جی اپنا کلام پڑھیں گے۔

میرا جی۔ میری نظم کا عنوان ہے "بینگن"۔

غالب۔ بینگن؟

میرا جی۔ بینگن۔ اگر آپ آم کی صفت میں قصیدہ لکھ سکتے ہیں تو کیا بندہ بینگن پر نظم لکھنے کا بھی حقدار نہیں۔

غالب۔ معاف کیجئے گا۔ نظم پڑھئے۔

میرا جی۔ عرض کیا ہے۔

چنچل بینگن کی چھب نیاری
ننگ ہی تم ہو کشن مراری

میں نے اک عاشق سے پوچھا
اُس نے یوں رو کر کہا
عشق اک طوفان ہے
عشق اک سیلاب ہے
عشق ہے اک زلزلہ
شعلۂ جوالہ ـــ عشق
عشق ہے پیغامِ موت

غالب ۔ بھئی یہ کیا مذاق ہے۔ نظم پڑھئے مشاعرے میں نثر کا کیا کام؟

ڈاکٹر خالص ۔ (جھنجلا کر) تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے؟ یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم اور فرمایا تھا آپ نے ۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

غالب ۔ میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے۔ نہ ترنم نہ قافیہ۔ نہ ردیف ۔

ڈاکٹر خالص ۔ مرزا صاحب۔ یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا تھا ہم نے اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا ہے اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کئے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ میری مراد رفعتِ تخیل ۔ تازگیٔ افکار اور ندرتِ فکر سے ہے ۔

غالب ۔ رفعتِ تخیل۔ کیا خوب۔ کیا پرواز ہے ؎

میں نے اک عاشق سے پوچھا اس نے یوں رو کر کہا

ڈاکٹر خالص ۔ (چڑ کر) عاشق رو کر نہیں کہے گا تو کیا قہقہہ لگا کر کہے گا؟ مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے ۔

غالب ۔ مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

رفیق احمد خوگر ۔ اس کی وجہ مغربی شعرا کا تتبع نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے۔ جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی آزادی کا جویا ہے۔ اس کے علاوہ دورِ جدید کی روح ہے انقلاب۔ کش مکش۔ تحقیق، تجسس۔ تعقل پرستی اور جدوجہد ہے ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر بھی ہوا ہے اور میرے اس نکتے کو میتھو آرنلڈ نے بھی اپنی کتاب ''دینٹی فیر'' میں تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اسی لئے ہم نے محسوس کیا کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ روح میں وہ لطیف کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جو مثال کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے۔ قدیم شعراء اور جدید شعراء کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم شعراء بقول مولانا آزاد حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے۔ اور ہم جن میدانوں میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں نہ اُن کی وسعت کی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب و لطائف کا شمار۔

غالب ۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م۔ن۔ ارشد ۔ خوگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو۔ ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والے بموں کی دنیا ہے۔ یہ بھوک۔ بے کاری۔ انقلاب اور آزادی کی دنیا ہے اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن و عشق، گل و بلبل شیریں و فرہاد کے افسانوں میں ضائع نہیں کر سکتے۔ شاعری کے لئے اور بھی موضوعِ سخن ہیں۔ جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے ؎

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پر کیا گذری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی ۔ اجداد پہ کیا گزری ہے۔
یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں۔
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے ۔

راجہ مہدی علی خاں ۔ بہت خوب ؎ یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے۔ ایسے ہی مضامین میں سے ایک مضمون ''ڈاک خانہ'' ہے۔ جو میری اس نظم کا جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا۔ موضوع ہے۔

غالب ۔ ڈاک خانہ؟

راجہ مہدی علی خاں ۔ مرزا اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے سنئے۔ عرض کیا ہے۔

لیکن تمہارے عشق نے

مجھ کو نکما کر دیا

غالب۔ واللہ۔ کمال ہی تو کر دیا بھئی۔ اب آپ لوگ اپنا اپنا کلام سنائیں

م۔ ن۔ ارشد۔ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص جو جدید شاعری کے امام ہیں۔ اپنا کلام سنائیں۔

ڈاکٹر خالص۔ ابی ارشد صاحب میں کیا کہوں۔ اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں۔ آپ جدید شاعری کی منزل ہیں اور میں سنگ میل اس لئے آپ اپنا کلام پہلے پڑھئے۔

م۔ ن۔ ارشد۔ توبہ توبہ! اتنی کسر نفسی۔ اچھا اگر آپ مصر ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے "بدلہ" عرض کیا ہے۔

آمری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
جس کی آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے
جس طرح دور کسی دشت کی پہنائی میں
رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرمِ شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہیں
ایسی تشبیہ کی لذت سے مگر دور ہے تو
تو کہ اک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا
اپنے بے کار خدا کے مانند

دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خود کشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں پکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اور چپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں

آمری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
تاکہ میں چوم ہی لوں عارضِ گلفام ترا
اور ارباب وطن کو یہ اشارہ کر دوں
اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر

اور شبِ عیش گزر جانے پر
بہر جمعِ درم و دام نکل جاتا ہے
ایک بوڑھے سے فلاکت زدہ بیمار کے پاس
چھوڑ کر بسترِ سنجاب و سمور

(نظم سن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ ہیلی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ یہ نظم اس صدی کی بہترین نظم ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس میں انگیٹھی، بھوت اور دفتر تہذیب و تمدن کی مخصوص الجھنوں کی حامل ہیں)

(حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہیں)

غالب۔ ارشد صاحب معاف کیجئے آپ کی یہ نظم کم از کم میرے فہم سے تو بالاتر ہے۔

غیظ احمد غیظ۔ یہ صرف ارشد پر ہی کیا منحصر ہے۔ مشرق کی جدید شاعری ایک بہت بڑی حد تک مبہم اور ادراک سے بالاتر ہے۔

م۔ ن۔ ارشد۔ مثلاً میرے ایک دوست کے اس شعر کو لیجئے۔

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

اب فرمائیے۔ اس شعر کا کیا مطلب ہے؟

غالب۔ (شعر کو دہرا کر)

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

صاحب سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں مگر باوجود اس کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م۔ ن۔ ارشد۔ ابی چھوڑیئے اس حرف گیری کو۔ آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں۔ مگر خیر اس بحث میں کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خالص۔ میری نظم کا عنوان ہے "عشق" عرض کیا ہے
عشق کیا ہے؟

ہیراجی۔ دیکھیے نا مرزا صاحب آپ فرماتے ہیں سے خط لکھیں گے گرچہ
مطلب کچھ نہ ہو۔ اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا۔
اور اگر آپ صرف معشوق کے نام کے ہی عاشق ہیں تو تین پیسے کا
خط برباد کرنا ہی کیا فرور، سادہ کاغذ پر اس کا نام لکھ لیجیے۔
ڈاکٹر قربان حسین خالص۔ میرے خیال میں اگر یہ شعر اس طرح لکھا
جائے تو زیادہ موزوں ہے۔
خط لکھیں گے کیوں کہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی۔
پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو۔
جس طرح سے میری اک اک نظم کا
کچھ بھی تو مطلب نہیں۔
خط لکھیں گے کیوں کہ الفت ہے ہمیں۔
میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں۔
یعنی عاشق ہیں تمہارے نام کے۔
غالب۔ یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے آپ میرے اس شعر کی
ترجمانی کر رہے ہیں۔
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
ہیراجی۔ جنوں! جنوں کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے اگر
اجازت ہو تو کہوں۔
غالب۔ ہاں۔ ہاں بڑے شوق سے۔
ہیراجی۔ جنوں ہوا۔ جنوں ہوا
مگر کہاں جنوں ہوا
کہاں ہوا۔ وہ کب ہوا
ابھی ہوا یا اب ہوا
نہیں ہوا میں جانتا
مگر جدید شاعری
ہیں کہنے کا جو شوق ہے
تو میں بھی سوچ کر

دماغ میرا چل گیا
یہی سبب ہے جو مجھے
جنوں ہوا جنوں ہوا
غالب۔ (ہنسی کو روکتے ہوئے) سبحان اللہ۔ کیا برجستہ اشعار ہیں۔
م حل۔ ارشد۔ اب مرزا غزل کا دوسرا شعر فرمائیے۔
غالب۔ میں اب مقطع ہی عرض کروں گا۔ کہا ہے سے
عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
عبدالحی نگاہ۔ گستاخی معاف مرزا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح
لکھا جاتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی۔
غالب۔ کس طرح؟
عبدالحی نگاہ۔ عشق نے۔ ہاں ہاں تمہارے عشق نے
عشق نے مجھے، تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا۔
اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں
اور چل تو سکتا ہی نہیں
جانے کیا بکتا ہوں میں
یعنی نکما کر دیا۔
اتنا تمہارے عشق نے
گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں
اٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں
یعنی تمہارے عشق نے
اتنا نکما کر دیا
غالب۔ (طنزاً) بہت خوب۔ بھئی غضب کر دیا۔
غیظ احمد غیظ۔ اور دوسرا مصرع اس طرح لکھا جا سکتا تھا۔
جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک مجھے کچھ ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں
اور دل میں میرے جوش تھا
اس وقت تھا میں آدمی
اور آدمی تھا کام کا

[illegible]

کے لئے مسندِ شاہانہ سمجھتی ہے۔ قلبِ محزوں پوچھتا ہے ؎

یہ کیا اندھیر ہے اے دشمنِ اہلِ وفا تجھ سے — ہوس نے کامِ جاں پایا محبت شرمسار آئی

آپ نے زندگی کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا وہ تصویر کا ایک رُخ ہے اور ذوقِ تماشا کا ایک کرشمہ۔ دراصل زندگی کی تصویر بہت حد تک اپنے خد وخال ناظر کی ذہنی کیفیت اور اُس کے پس منظر سے حاصل کرتی ہے جس نگاہ سے آپ دنیا کو دیکھتے ہیں یا جو نگاہ آپ کی دنیا کی تخلیق کرتی ہے اس نگاہ کے پیچھے ایک لمبی تاریخ ہے وراثت اور ماحول کی۔ آپ میاں محمد شاہ دین مرحوم کے گھر پیدا ہوئے۔ مرفّہ الحالی میں پرورش پائی تمام خوشیاں دیکھیں ایک غم کا پہاڑ آپ پر ٹوٹا لیکن ۴۸ سال کی عمر ہیں۔ اب بھی آپ کو معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے وہ سب کچھ نصیب ہے جو اس دنیا کو رہنے والے کے لئے جنت بنا دیتا ہے۔ لازم ہے کہ آپ کا ذہن اسی ماحول کے سانچے میں ڈھلے اور آپ دنیا کو اس مخصوص زاویۂ نگاہ سے دیکھیں۔ زندگی میں آپ کا لائحہ عمل بھی اسی کینڈے پر ہو اور آپ کے فلسفۂ زندگی کا طول وعرض بھی انہیں تاثرات کے حصار میں محصور۔ چونکہ آپ نے یہ ذکر چھیڑ دیا ہے مجبوراً میں اس خط میں آپ کو تصویر کا دوسرا رُخ دکھاتا ہوں"...... پھر اپنی عبرت انگیز داستان بیان کرتے ہیں جس کی تفصیلات یہاں دہرائی نہیں جا سکتیں۔ او ریچ پیچ مدوجزر طوفان بجلیاں سکون تنہائی ــــ بھلے اور گرد ہی سینکڑوں ہزاروں انسان ہیں جن کی زندگیاں افسانے ہیں لیکن ان میں بہت کم ہیں جو بے نقاب ہوتی ہیں اور ہوتی ہیں تو ان کے دیکھنے والے کم ہوتے ہیں اور اگر پھر دیکھنے والے ہوتے ہیں تو ان میں سمجھنے والے اور محسوس کرنے والے اور بھی کتنے کم!

پھر لکھتے ہیں: "اب بتایئے میری ذہنی کیفیت کیا ہوگی؟ میں دنیا کو کس نظر سے دیکھوں گا اور پھر اس سلسلۂ مصائب وآلام پر یہ مستزاد کہ مجھے کہ سیاسی زندگی کی رفاقت میں: اپنی بے غرض دیانت اور خلوص کے مقابلے میں خود غرضی بد دیانتی اور ریاکاری کے وہ مناظر دیکھے ہیں کہ الاماں۔ ذرا اس منظر کو اپنی چشمِ تصور کے سامنے لایئے کہ گھر بار یوں گیا اور پھر جس مقصد کو دیانت داری سے لے کر اٹھے تھے اس کا یہ حشر اور رفقائے راہ کا یہ حال...... میری اہلیہ جس نے ...... سال میری خود اختیار کردہ مصائب میں بخندہ پیشانی میرا ساتھ دیا اس نے اس دنیا میں کیا دیکھا (اپنے تین بچوں کی موت کے بعد اس نے بھی) اپنی حسرت بھری آنکھ ہمیشہ کے لئے بند کر لی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کیا اس غیر منقطع سلسلۂ آلام وبے حاصلی کے بعد بھی آپ سمجھتے ہیں کہ میرا نقطۂ نظر وہی ہو سکتا ہے جو آپ کا ہے۔ بشیر بھائی! ذرا اس پس منظر کو سامنے رکھئے اور میری عینک سے دنیا کو دیکھئے۔ سوائے ایک نفرتِ اجتناب اور بے تعلقی کے اور کون سی تحریک ہے جو آپ کی طبیعت میں موج زن ہو اور سوائے ایک خلا کے کون سا منظر ہے جو آپ کی حسرت آگیں آنکھ کو نظر آئے... (اب میرا ایک بیٹا ہے اور میں ہوں)...... میری اپنی زندگی کے حصول قدم قدم پر دامن گیر ہیں اور دو لفظوں میں میری زندگی کا معمّا یہ ہے کہ دنیوی ساز وسامان اور اس کے حصول کے ذرائع سے انتہائی نفرت اور اجتناب ایک طرف اور (اپنے بیٹے) کی طرف ذمہ داری کا یہ تقاضا کہ انہیں وسائل کو اختیار کیا جائے دوسری طرف۔ اس کش مکش میں بسر کر رہا ہوں۔ کیا کروں کیا نہ کروں...... ڈیڑھ سال سے ایک ہی جگہ بیٹھا ہوں۔ اپنی مرضی سے نہیں۔ بس اس دنیا سے جس نے مجھ سے ہر رنگ میں اتنی بے وفائی کی ہے۔ بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے!...... یہ ہے میرا معمّا اور یہ ہے میری تمہید اُس گفتگو کی جو انشاء اللہ........"

اس کا جواب کوئی کیا دے؟ ہاں ایک غم زدہ باپ کے ان سوالوں کا جواب خود اُس کا رہا سہا لخت جگر بیٹا ہوگا اور ضرور ہوگا۔ لیکن کتنی زندگیاں ہوں گی جہاں ایسے کمزور سہارے بھی موجود نہیں۔ آہ! اسی دنیا میں کیا کیا ہے لیکن ایک امیر زادے کو اُس کا حال کیا معلوم؟

بشیر احمد

اصغر کی یادیں

خوشی میں تو سبھی مل بیٹھتے ہیں لیکن غم بھی تنہا نہیں رہتا خوشی میں اگر سینکڑوں یا دس بیس اکٹھے ہو کر شور و غل مچاتے ہیں تو کبھی کبھی غم میں بھی دو دل باہمی ربط پا لیتے ہیں۔

تھوڑا عرصہ ہوا مجھے ایک خط آیا "بشیر بھائی معذرت خواہ ہوں کہ بغیر کسی تعارف کے آپ کو اس بے تکلفی سے مخاطب کر رہا ہوں لیکن ایک قلبی اور روحانی رشتہ آپ کے ساتھ ایسا استوار ہو گیا ہے کہ میں تو ایک طرف شاید آپ کو بھی یہ گوہر یک رنگی میرے خرابۂ دل کے سوا اور کہیں سے نہ مل سکے۔

"اصغر کی یاد کے عنوان سے جو کچھ آپ "ہمایوں" میں لکھتے ہیں میں اُسے بار بار پڑھتا ہوں اور اپنی حالت پر منطبق کر کے روتا ہوں۔ اب کے ماہ مئی کے ہمایوں میں جس انداز سے آپ نے لکھا ہے اُس نے مجھے تڑپا ہی تو دیا اور میں مضطرب ہو کر یہ سطور آپ کو لکھ رہا ہوں۔ یہ سطور نہیں پارہ ہائے دل و جگر ہیں جنہیں ایک غم زدہ بھائی کی نذر کر رہا ہوں ؎

دلم باز لف جاناں می نشیند　　　پریشاں با پریشاں نشیند

مجھے اُمید ہے کہ یہ سطور اور اُن کا مضمون قطعی طور پر آپ تک محدود رہیں گے۔"

پھر لکھتے ہیں کہ کس طرح اُن کی زندگی پر گزشتہ سال غموں کا طوفان ٹوٹا۔ "ہم گھر میں صرف پانچ افراد تھے جن میں سے تین اس طرح تین ماہ کے اندر ختم ہو گئے۔ تمام گھر میں تالے پڑ گئے اور میں اور میرا بیٹا...... ایک اُجڑے گلستان کا ماتم کرنے کے لئے رہ گئے...... اس پُر درد منظر کا پس منظر اس سے بھی زیادہ حسرت ناک اور الم انگیز ہے کہ کس طرح میں نے خدمت وطن و ملت کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دیا اور دنیا کے اصرار کے باوجود دنیوی وجاہت سے منہ موڑ کر فقر اختیار کیا۔ یہ ایک دوسری داستان ہے۔ میری وحشت میری تنہائی کی حقیقی غمگسار کا نہ ہونا اپنے بچے کی افسردگی غرض کیا لکھوں کہ ڈیڑھ سال سے میری کیا حالت ہے ز کام کاج سب کو خیرباد۔ دفتر کا کمرہ یا پائیں باغ ہے اور میں ہوں یا قرآن اور قبرستان۔ دنیا اور دنیا کے ساز و سامان سے نہایت نفرت اور بیزاری ہو گئی ہے۔ ڈیڑھ سال سے "ہمایوں" برابر پڑھتا ہوں (میرا مرحوم بیٹا)...... اصغر بشیر کی ذہانت اور دل آویزی کی تصویر بن کر ہمیشہ میرے سامنے آتا ہے...... میری ایک تمنا ہے کہ کسی دن آپ کے پاس بیٹھوں اور دل کھول کر آپ سے باتیں کروں...... ملک میرے احباب و رفقا سے بھرا پڑا ہے لیکن کچھ تلخ تجربے اور کچھ ویسے ہی...... ایک کشش اضافا بل مقاومت کشش ڈیڑھ سال سے مجھے آپ کی طرف کھینچ رہی تھی آج اس کا اظہار آپ پر کر رہا ہوں کہ اپنی داستانِ حیات کے بعض مستور حصے جو خود میرے لئے تعجب خیز ہیں مرنے سے پہلے آپ پر بے نقاب کر دوں......"

میں نے اس "غم نامے" کو ایک نظر دیکھا اور بغیر پڑھے علیحدہ رکھ دیا۔ کچھ دن یونہی گزر گئے۔ آخر شروع کیا اور ختم کیا اور پھر رکھ دیا۔ چند ہفتے پھر یونہی گزر گئے۔ اپنی کم تیری وغیرہ کا واسطہ دے کر دیر میں جواب دیا اور قرآن اور قبرستان کی جگہ "قرآن اور انسان" کی طرف توجہ دلائی۔ اس کا پھر جواب آیا اور سچ یہ ہے کہ ان کی زندگی کی تفصیلات نے مجھے لاجواب کر دیا۔ عملی زندگی اور جد و جہد کے ایک پُرخلوص کارکن کی ہمت و شجاعت اور بس زمانے کی بے اعتنائی اور حوادث کے پے در پے حملے! کوئی کہاں تک برداشت کرے۔ "آپ بے حد خوش قسمت ہیں کہ آپ کو پھر بھی چند دوست نصیب ہیں اپنا تو یہ حال ہے ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد　　　ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اسی سلسلے میں میری سب سے بڑی مصیبت میری تیز فہمی رہی ہے اور میں اس "روشنئ طبع" کے ہاتھوں بے حد تنگ ہوں...... میں اس معاملہ میں اپنے نقدِ نظر کی صحت کا اس قدر قائل ہوں کہ اس ذہنی کوفت کو بھی نظامِ عالم کے اُن لاینحل مسائل میں شامل کئے ہوئے ہوں جن کی قدر [illegible] اچھی ہے اور بہادر ہوں فریب کاری اور منافقت

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تصور بھی کر سکتا ہے کہ خدا پر غالب آجائے گا۔

شیطان۔ یہ زمانہ عقل کی حکومت کا ہے۔ جہالت اور توہمات کو اب کوئی پرکاہ برابر وقعت نہیں دیتا۔ تم جانتے ہو ہر عاقل و دانا جمہوریت کو پسند کرتا ہے۔ دنیا آہستہ آہستہ میری جانب رجوع کرتی چلی جا رہی ہے اور اب میں تمہارے خدا کو ووٹوں کی اکثریت سے شکست دے سکتا ہوں۔ اس پر بھی وہ حکومت مجھے نہ سونپ دے تو وہ غاصب ہے۔ اُسے خدائی کے تخت سے اُتار دینا چاہئے۔

مرد۔ (غصے سے آگ بگولا ہوکر) مردود لعین زبان بند کر۔ تو جو کچھ کہہ رہا ہے میں جانتا ہوں کہ خود تجھے اس کا یقین نہیں۔

شیطان۔ (ہنستے ہوئے) خیر میں جانتا ہوں کہ اس باب میں تم کچھ نہیں جانتے (عورت سے مخاطب ہوکر) آ! اے حسین مخلوق آ کہ میری جنت کے عیش و لذت کے دروازے تجھ پر کھلے ہوئے ہیں جن کی مدہوشیوں میں تجھ پر عجیب عجیب اسرار و رموز کا انکشاف ہوگا۔

(ہاتھ اٹھاتا ہے اور اپنی مہیب آنکھیں عورت کی آنکھوں میں گاڑ دیتا ہے عورت چند لمحوں تک بغیر آنکھ جھپکائے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہتی ہے۔ اور پھر ایک مسحور کی طرح دونوں ہاتھ پھیلا کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے۔ مرد انتہائے خوف و ہراس میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے مگر عقل کام نہیں کرتی کہ کیا کرے۔ دفعتہً وہ گھٹنوں کے بل گر کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا دیتا ہے)

مرد (گڑگڑا کر) میرے پروردگار میں بہت گنہگار ہوں۔ مگر یہ سزا مجھے نہ دے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔

(سربسجود ہو جاتا ہے۔ دفعتہً ایک سخت کڑک سنائی دیتی ہے۔ جو کسی طرح بادلوں کی گرج سے مشابہ نہیں۔ شیطان کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے اور جس طرح پھونک مار کر چراغ گل کر دیا جائے، وہ یک بیک اپنی جگہ سے غائب ہو جاتا ہے۔ عورت جو بڑھتے بڑھتے اس کے قریب پہنچ کر اس پر گرا ہی چاہتی تھی۔ دھڑام سے فرش پر گر پڑتی ہے۔ دھماکے کی آواز سن کر مرد سجدے سے اٹھتا ہے اور آگے بڑھ کر عورت کو اٹھا لیتا ہے جس کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ مرد کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلک رہے ہیں بجلی چمک کر زمین و زماں کو منور کر دیتی ہے)

غزل

ایوب سرور

اے مرے دل کس لئے مغموم ہے — حسن تو معصوم تھا معصوم ہے

واں تبسم اور یاں آنسو بہے — کیا اُمیدوں سے بھی دل محروم ہے

کچھ تو ہے اِس شیوۂ اضداد میں — دل نہیں آگاہ کیا مفہوم ہے

روٹھنے کا آپ نے پہلو لیا — ہم کو خوش کرنے کا ڈھب معلوم ہے

ڈوبتے ہی تھا عدم سے ہمکنار — دل بھی کوئی جذبۂ موہوم ہے

عیب تھا گر دل نہ ہوتا وقفِ غم — آپ کے قدموں سے بھی محروم ہے

یوں بھلایا آپ نے مقبول کو — جس طرح پاسِ وفا معدوم ہے

جس طرح خدا ہماری نظروں سے اوجھل ہے اُسی طرح صداقت
بھی گم ہوگئی ہے۔ اور اب یہ ناممکن ہے کہ اُس کا کہیں پتا چلے۔ ہمارے
سامنے جو کچھ رہ گیا ہے وہ شیطان کا وجود ہے اور جھوٹ ہے۔

عورت۔ کتنا بھیانک سچ ہے —— کتنا بھیانک —— خدا
کی خدائی پر شیطان کا تسلط ایک ایسا سچ ہے جس میں دنیا بھر
کی خباثتیں اور ہولناکیاں بھری ہوئی ہیں۔

[بادل کی گھڑگھڑاہٹ اور ہوا کا شور اس قدر بڑھ
جاتا ہے کہ عناصر آپس میں ٹکراتے معلوم ہوتے
ہیں۔ اور پھر دفعتہً ان دونوں کے قریب ایک
تنومند جوان نمودار ہوتا ہے۔ اس کے چہرے
سے ہیبت ٹپک رہی ہے۔ لباس کچھ عجیب
وضع قطع کا ہے۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی ہیں
مگر اُن میں ستاروں کی سی تابانی نہیں۔ بلکہ وہ
جہنم کے غاروں سے اُبلتے ہوئے شعلوں کی مانند
دہکتی ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ شیطان ہے]

مرد۔ (خوف اور حیرت کی ملی جلی آواز میں) تم کون ہو؟

شیطان۔ میرے دوست دنیا میں ایک تم ہی تو میری طاقتوں
سے خوب واقف ہو۔ مگر افسوس ہے کہ تم مجھے نہیں جانتے۔

مرد۔ میں تمہیں نہیں جانتا۔

شیطان۔ میں وہی تو ہوں جس کی عظمت اور بزرگی ابھی ابھی تم اس
عورت پر ظاہر کر رہے تھے۔

مرد۔ تو تم شیطان ہو۔

شیطان۔ (ہنس کر) ہاں دنیا والے مجھے اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔

مرد۔ لیکن تم یہاں کیوں آئے۔

شیطان۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ تم نے آج ایک بڑی
پاکیزہ اور مقدس روح میری نذر کی ہے۔ میری کارگذاریوں
کے دفتر ایسی روحوں کے ذکر سے جلنے لگتے تھے۔ میرے دوست
میں کسی طرح تمہارا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔

مرد۔ ('میرے دوست' پر چونک کر حیرت سے) مگر وہ کون سی روح
ہے؟

شیطان۔ تم نہیں جانتے۔ تمہاری بیوی۔

مرد۔ میری بیوی .... میری بیوی .... نہیں
نہیں (عورت کے معصوم چہرے پر نظریں گاڑ دیتا ہے۔ جو
جذبات سے بالکل معرّا ہے) یہ نہیں ہو سکتا۔

شیطان۔ کیا —— کیا نہیں ہو سکتا۔

مرد۔ میری بیوی کی روح اور ...... اور (عورت سے مخاطب
ہو کر) کیا یہ سچ کہہ رہا ہے۔

عورت۔ (انتہائی سنجیدگی سے) ہاں جب مصیبتوں کے ہلاکت
آفریں چکر نے ہمیں پیسنا شروع کر دیا اور رات رات بھر جاگ کر
میری عبادتیں اور رو رو کر مانگی ہوئی دعائیں کوئی نتیجہ نہ پیدا
کر سکیں۔ جب خدا نے ہمیں چھوڑ دیا اور ہم شیطان کے رحم و کرم
پر آ پڑے تو کیوں نہ ہم اُسے تسلیم کر لیں۔ تم ہی تو کہتے تھے
کہ اب پانسہ شیطان کے ہاتھ ہے۔

مرد۔ تم غلطی کر رہی ہو۔ خدا نے کبھی ہمیں نہیں چھوڑا۔ یہ ہم ہیں جو
اُسے چھوڑ کر بھٹک جاتے ہیں اور یہ شیطان کبھی دنیا پر حکمران
ہونے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی حیثیت تو ایک ڈاکو
کی سی ہے جو چھپ چھپ کر اِدھر اُدھر چھاپے مارتا رہتا ہے

شیطان۔ (قہقہہ لگا کر) خوب خوب یہاں تو معاملہ الٹا ہو گیا۔ مگر
بھئی تم تو شکست و فتح سے بے نیاز ہو کر محض داؤں لگا
دینے ہی کو جرأت و بہادری سمجھتے ہو۔ پھر ڈاکو ڈاکو ہی سہی
مگر اس کی جسارت کی داد نہیں دیتے۔ یہ تو ظلم ہے۔

مرد۔ بکو مت میں تم سے بات نہیں کرتا۔

عورت۔ میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے زورِ بیان نے تمہارا ساتھ چھوڑ
دیا ہے۔ اور خدا کی حمایت میں تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں
حالانکہ چند لمحے بیشتر اس کے خلاف تمہاری زبان قینچی کی طرح
چل رہی تھی۔ کیا اس سے تمہاری بحث کا کھوکھلا پن نہیں
ثابت ہوتا۔

مرد۔ کم عقل عورت خدا کا وجود دلیل اور حجت سے بالاتر ہے۔
دلیل اور حجت کی محتاج تو (انگلی سے شیطان کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے) یہ ہستیاں ہیں۔ خدا اسی سے پوچھو کیا کبھی

ہوتی ہے کیوں کہ میں تیری روح کی انتہائی گہرائیوں سے بھی واقف ہوں۔ تیرا وجود میرے سامنے آئینے کی مانند ہے جس میں کوئی بھید نہ ہو۔ اگر ظاہراً تو نے ہر ایک کو جُوا کھیلتے نہیں دیکھا، تو یہ تیرا قصور نہیں کیوں کہ ایسے لوگ اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھ کر دُنیا کو دھوکا دیتے ہیں۔ مگر ہیں سب کے سب جُواری۔ انھوں نے آڑ کے لئے مذہب، اخلاق، قانون، انسانیت اور بہت سے نام گھڑ رکھے ہیں۔ سرمائے کا آہنی خول اُنہیں ہر حملے سے محفوظ کئے ہوئے ہوتا ہے اور وہ اطمینان سے اپنا شیطانی کھیل کھیلتے رہتے ہیں

عورت۔ نہیں معلوم کیا کہہ رہے ہو اور تو سب لوگ اپنے اپنے کام کاج میں مشغول ہیں۔ جوئے کا کسی کے ہاں نام نہیں آتا۔

مرد۔ ہاں ہاں وہ بڑے لوگ ہیں۔ ہم ان کے کھیل کو جُوا نہیں کہہ سکتے اُسے تو تجارت تعلیم اور جنگ وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اُن میں سے بعض بہت زیادہ چالاک ہیں۔ وہ تجارت کے نام پر دُنیا بھر سے روپیہ بٹورتے ہیں اور اُسے داؤں پر لگا دیتے ہیں۔ ہار جانے پر بھی اُن کے گھر میں نفع ہی نفع ہوتا ہے اور دنیا اُن کے گُن گاتی ہے۔ اگر مجھ جیسا غریب اپنی گرہ کے دام لگا کر ہار جائے تو اس سے زیادہ احمق اور کون ہو سکتا ہے۔ کیوں ہے نا؟

عورت۔ تمہیں تو جب سوجھے گی اوٹ پٹانگ ہی سوجھے گی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خُدا نے تجارت سے منع نہیں کیا مگر جوئے کو گناہ........

مرد۔ (زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے) خُدا!!!!!! خدا جس نے خود دنیا بنا کر بہت بڑا داؤں لگایا مگر اب پانسہ شیطان کے ہاتھ میں ہے۔

عورت۔ چھی چھی چپ رہو۔ ایسی باتیں نہ کیا کرو۔

مرد۔ دیوتا تو ہنس رہا ہے، مگر لوگ کہتے ہیں کہ خُدا بڑا زبردست جواری ہے اور شیطان آخر کار اُس سے ہار جائے گا۔

عورت۔ ہاں شیطان ضرور ہار جائے گا۔ جس طرح تم سب کچھ ہار چکے ہو۔ وہ بھی سب کچھ ہار دے گا اور مفلس و قلاش ہو کر رہ جائے گا۔

مرد۔ (بگڑ کر) تو مجھے طعنہ دیتی ہے اے عورت۔ مگر تو نہیں جانتی کہ قمار باز شکست یا فتح سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا ثبوت یہی ہے کہ وہ کھیلتا رہے کھیلتا رہے اور کھیلتا چلا جائے۔ ہار جیت سے بے پروا ہو کر (بپھرتا ہے) ابھی تو شیطان کے لئے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ اُس نے دنیا کی بساط پر خُدا سے بازی لگا دی۔

عورت۔ اُونہہ کیا بے سر پیر کی باتیں کر رہے ہو۔ اچھا مان لیا کہ تم ہار جیت سے بے نیاز ہو مگر یہ کیا ضرور ہے کہ ہمیشہ ہارتے ہی رہو۔ ان کئی سالوں کے اندر تم نے ہارنے کے سوا کچھ کیا بھی ہے؟ کیا شانِ بے نیازی ہے۔ میں تو ایسی بے نیازی پر لعنت بھیجتی ہوں۔

مرد۔ ایک نو آموز کی طرح تیری باتوں میں خلوص کی شدت ہے۔ مگر حقائق تک تیری نگاہ نہیں پہنچتی۔ اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کا انجام شکست نہ ہو۔ ہمارے نام نہاد مُدعیانِ اخلاق جو عجیب و غریب ناموں سے جُوا کھیلتے ہیں آخر کار شکست کھاتے ہیں۔ اُن کی لاکھوں روپے کے سرمایہ سے جاری کردہ تجارت ایک دن ٹوٹ کر رہ جاتی ہے۔ وہ نئے نئے ذرائع دولت تلاش کرنے کے لئے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مگر نہ اُن کی پریشانیوں میں اضافہ کئے چلی جاتی ہے۔ وہ دباؤ ڈال کر منفعت حاصل کرنے کے لئے فوج کشی کرتے ہیں۔ مگر عارضی فتح پا لینے پر بھی ایک نہ ایک دن اُن کی مملکت پارہ پارہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ نتائج خوش آئند ہوں تو ہوں مگر دوامی نہیں ہو سکتے۔ اور جب مآل کار شکست ہی ہوتی ہے تو عارضی فتح کے لئے اتنی بے تابی کیوں؟

[تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ باہر سے بادلوں کی گرج کے ساتھ مینہ کی بوچھاڑ بھی سنائی دیتی ہے۔ ہوا کے جھونکے دیوانہ وار کھڑکیوں سے سر ٹکرا رہے ہیں اور بار بار ناکام ہونے پر بھی اپنی سعیٔ لاحاصل سے باز آتے نہیں معلوم ہوتے۔ عورت خاموشی سے مرد کو دیکھ رہی ہے جو ایک شانِ بے نیازی سے اکڑا ہوا کھڑا ہے۔ مگر]

عورت۔ تمہاری باتیں کتنی ہی مکروہ کیوں نہ معلوم ہوں۔ مگر ان میں صداقت کی جھلک ضرور ملتی ہے۔

مرد۔ اے عورت صداقت کا لفظ صرف کتابوں میں رہ گیا ہے۔

جوا

کردار:—

عورت　　　مرد　　　شیطان

—:منظر:—

[اندھیری رات ہے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بجلی رہ رہ کر چمکتی ہے۔ بادل زوروں سے گرج رہا ہے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں عورت چپ چاپ لیٹی ہوئی ہے۔ کمرے کے ایک گوشے میں چراغ جل رہا ہے۔ جس کی روشنی عورت کے چہرے پر پڑ رہی ہے۔ عورت جوان اور قبول صورت ہے۔ مگر اُس کے چہرے پر غم والم برس رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں کے پپوٹے نیند کے مارے بوجھل ہو رہے ہیں]

[دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز]

عورت۔ کون ہے؟

مرد کی آواز۔ دروازہ کھولو۔ میں ہوں۔

[عورت اُٹھ کر دروازہ کھولتی ہے۔ ہوا کے سرد جھونکے کے ساتھ جو اُسے کپکپا دیتا ہے۔ مرد اندر داخل ہوتا ہے۔]

عورت۔ خُدا کا شکر ہے کہ تم آج جلد آ گئے۔ اس اندھیری رات میں مجھے اکیلے ڈر لگ رہا تھا۔

مرد۔ بس یہی تمہاری عادت مجھے ناپسند ہے۔

عورت۔ کیا! کیا ہوا؟

مرد۔ ہوتا کیا تھا۔ یہ تمہارا خُدا اور اس کا شکر۔ میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ خُدا کیا ہے اور اس کا شکر کیوں ادا کیا جاتا ہے۔

عورت۔ (مسکرا کر) معلوم ہوتا ہے آج پھر ہار آئے ہو۔

مرد۔ (برافروختہ ہوکر) اچھا بس چپ رہو۔ میرا سر نہ کھاؤ۔

عورت۔ خیر میں چپ رہتی ہوں۔ مگر ایسی بُری بُری باتیں نہ کہا کرو۔

مرد۔ (زہرخند ہوکر) بُری —— دنیا کی بیشتر چیزیں بُری ہیں اور ان سب میں بدترین عورت کا وجود ہے۔

عورت۔ ہاں مجھ سے تو تم تنگ آ چکے ہو۔

[تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ عورت آہستہ آہستہ اس کے قریب جاتی ہے اور اُس کا بازو تھام کر اپنے لگاوٹ آمیز لہجے میں کہتی

عورت۔ آخر تم اس جوئے سے باز کیوں نہیں آ جاتے۔ جب تمہیں یہ عادت نہ تھی تو ہم کتنے خوش حال تھے۔ میں فخر سے محلے بھر میں پھرتی تھی۔ میرے برابر زیورات محلے بھر میں کسی کے پاس نہ تھے۔ ہمارا گھر برتنوں اور کپڑوں سے بھرا ہوا تھا اور پھر نہ جانے وہ کیسی منحوس گھڑی تھی جب تمہیں اس جوئے کا چسکا پڑا کہ گھر کا گھر وا ہو گیا۔ زیور ایک ایک کر کے بک گئے۔ برتن اور کپڑے تک اس شوق سے نہ بچے اور اب تو روٹیوں کو محتاج ہیں۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ نہیں۔ مگر تمہیں کیا پروا تم اپنے جوئے میں مگن ہو۔

مرد۔ سچ کہہ رہی ہو۔ سچ کہہ رہی ہو۔

عورت۔ (تنک کر) کیا خاک سچ کہہ رہی ہوں۔ اگر سچ ہوتا تو تم باز نہ آ جاتے۔ یہ تو سب جھوٹ ہے۔ تم سچے اور تمہارا جُوا سچا۔

مرد۔ تو نہیں جانتی اے عورت کہ جُوا کیا ہے اور کیوں کھیلا جاتا ہے اس دنیا میں کوئی متنفس ایسا نہیں جو جُوا نہ کھیلتا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اُسے جوا نہ کہا جائے۔ بلکہ کسی اور نام سے پکارا جائے۔ میں بھی کسی سہانی شئے کا ایک ادنیٰ رکن ہوں۔ مگر میں برملا کہتا ہوں اور کھلم کھلا ڈنکے کی چوٹ کرتا ہوں۔ بس فرق [illegible]

عورت۔ نہیں نہیں۔ بھلا کہیں یہ بھی سُنا ہے کہ ساری دنیا جُوا کھیلتی ہے۔ جواریوں کا تو ایک [illegible]

مرد۔ جب میں کہتا ہوں [illegible]

اِنّی اعلم مالا تعلمون

بیروں از حدِ خویش رفتن ندہند
در وادیٔ ہولناک خفتن ندہند
چیزے کہ بجہد ہم نیاید در دست
شمعیت، کہ طفل را گرفتن ندہند

عبدیّت

بر ہر قدمے، برائے من صد بند ست
در ہر شکنِ قبائے من صد بند ست
از خود، قدمے نمی توانم رفتن
من بندہ ام و بپائے من صد بند ست

سید احمد حسین امجد

برسات

بزمِ گردوں میں ساغروں کی کھنک
سازِ باراں کے جھنجھناتے تار
ناچتی بوندیوں کی نرم جھنک

رنگ و بُو کی سنورتی تقدیریں
ابر کے کارواں سبک رفتار
لمحہ لمحہ بدلتی تصویریں

برق، اُمیدوں کا پرتو جیسے
سینۂ گُل پہ جھلملاتے گہر
رقص میں پارہ ہائے بلوریں

زخمہ زن سازِ بےخودی پہ ہوا
شاہ خاورنہاں لحافوں میں
زندگی خواب بھیگی راتوں کا

ہر طرف مستیاں برستی ہیں
دل میں آیا ہوا ہے چپکے کوئی
آرزوئیں مگر ترستی ہیں

گرتی ہیں ذہن کے دھندلکوں سے
یادِ ماضی کی بجلیاں دل پر
مینہ برستا ہے گرم پلکوں سے

سید ضیا جالندھری

یعنی "دیوتاؤں کی عنایات سے بنی ہوئی" نام رکھا۔ اور زمین پر بھیج دیا تاکہ دیوتاؤں کی طرف سے پرامی تھیس کو تحفتہً دے دی جائے۔

پرامی تھیس نے جب اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جن میں دنیا کے ہر رنگ کی جھلک موجود تھی لیکن اس قدر بھولی اور بے لوث معلوم ہوتی تھیں جس طرح دو نرگس کے پھولوں پر شبنم کے قطرے۔ تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اور خیال آیا کہ دیوتاؤں کی طرف سے تحفہ آیا ہے اس میں ضرور کچھ بات ہے۔ اس نے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اپنے بھائی ایپی می تھس سے بھی کہا کہ ہوشیار رہنا۔ لیکن اس کی نگاہ پڑنا تھی کہ ہوش اڑ گئے۔ دنیا کی تمام خوشیاں اور عیش و آرام صرف اس نئی ہستی کے حاصل کر لینے میں دکھائی دینے لگے۔ اس کے آنے سے پھولوں میں خوشبو زیادہ معلوم ہونے لگی۔ فضا کا رنگ بدل گیا اور پرندوں کی آواز میں گویا مٹھاس بڑھ گئی۔ اس نے اپنے بھائی کی بے عقلی پر حیران ہوتے ہوئے تحفہ قبول کر لیا۔

جب دیوتاؤں نے دونوں جنات بھائیوں کو دنیا بنانے اور اس میں مخلوقات پیدا کر کے خوبیاں تقسیم کرنے کا حکم دیا تھا اُس وقت بڑی احتیاط سے چند ایسی چیزوں کو روک لیا تھا جن سے تکلیف پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا یعنی دُکھ، بیماری، فکر، پچھتاوا، خوف، بدگمانی، غصہ، حسد، دردِ دل وغیرہ۔ اب یہ تمام چیزیں ایک جواہر نگار بکس میں بند کر کے پینڈورا کے جہیز کے طور پر اس کے ساتھ زمین پر بھیج دی گئیں اور بکس کی چابی ایپی می تھس کے حوالے کر دی گئی۔

پینڈورا کے لئے زمین پر ہر ایک چیز نئی تھی۔ ہر منٹ کسی نئی دریافت اور نئی خوشی کا سامان بنتا تھا۔ ہر طرف اسرار تھے جنہیں کھولنے میں نئی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ لیکن سب سے بڑا راز وہ تھا جس کی سنہری چابی اس کے سادہ دل محافظ ایپی می تھس کے قبضے میں تھی۔ جب بھی وہ اس صندوقچے کی طرف دیکھتی وہ ایپی می تھس سے پوچھتی کہ اس میں کیا ہے؟ لیکن وہ کچھ جواب نہ دے سکتا کیوں کہ یہ تو صرف دیوتاؤں ہی کو معلوم تھا۔ روز بروز پینڈورا کے دل میں اس کو کھول کر دیکھنے کی خواہش بڑھتی چلی جاتی تھی۔ دیوتاؤں نے اس پر عنایات کی بارش کر دی تھی اور کوئی چیز ایسی نہ دی تھی جس میں کوئی خوبی نہ ہو۔ اس بکس میں جو خاص طور پر دیا گیا تھا معلوم نہیں کیا کیا کچھ محفوظ ہوگا۔ شاید دیوتا یہ چاہتے ہوں کہ زمین کے رہنے والوں کو راحت اور دلی مسرت حاصل کرنے کے لئے سب قیمتی سامان پینڈورا ہی کے ہاتھ سے ملے ——!

آخرکار پینڈورا نہ رہ سکی اور اسے دنیا اور انسان سے بھلا کرنے کی زبردست خواہش کہئے یا دانا دیوتاؤں کی دور اندیش نظر کے سامنے بھولے انسان کی نادانی۔ کہ اس نے ایپی می تھس کی غیر موجودگی میں چپکے چپکے صندوقچے کو کھول کر دیکھنا چاہا۔ اس کا ڈھکنا اٹھتے ہی مدت سے بند کئے ہوئے قیدی بوکھلا کر نکلے اور فضا میں چاروں طرف پھیل گئے۔ ہوا کی صفائی کثافت میں بدل گئی۔ روشنی دھندلی پڑ گئی۔ پانی کا رنگ جو شفاف تھا نیلا ہو گیا۔ اور عیش اور راحت کے لئے بنی ہوئی زمین "گناہ" سے روشناس ہو گئی۔

پینڈورا نے گھبرا کر جلدی سے بکس کا ڈھکنا بند کر دیا تاکہ اس طوفانِ بےتمیزی کو روک دے لیکن جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا۔ ایپی می تھس غصے میں آگ بگولا ہو کر دوڑا ہوا آیا اور ہاتھ اٹھا کر چاہتا تھا کہ پینڈورا کو قتل کر دے کہ پینڈورا خوفزدہ ہو گئی اور بکس اس کے ہاتھ سے زمین پر گر کر کھل گیا۔

اب جہاں دیوتاؤں نے اس بکس میں ہر قسم کا عیب بھر دیا تھا وہاں ایک اور صرف ایک چیز اچھی بھی تھی جو بکس کے ایک کونے میں سمٹی ہوئی پڑی تھی اور اب اس کے کھلنے سے باہر نکل کر گر گئی تھی۔ پہلے جب تک زمین پر امن ہی امن کا دور دورہ تھا اس کی ضرورت نہ تھی، اور یہ بھی دیوتاؤں کی دُوربینی کا گویا ایک ثبوت تھا۔ یہ اُمید تھی۔

اس پر نظر پڑنا تھی کہ ایپی می تھس کا ہاتھ جو پینڈورا کو قتل کرنے کے لئے اٹھا ہوا تھا رک گیا اور پینڈورا کا خوف آہستہ آہستہ کم ہونے لگا.........دن گزرتے گئے۔ ایپی می تھس اور پینڈورا کی اولاد انسانوں میں گھل مل گئی اور دنیا اپنے تئیں سنگ بستہ ہو کر ...

بنی نوع انسان سے تو زیوس نے دیوتاؤں کی طاقت حاصل کر لینے کا اس طرح بدلہ لیا اور پرامی تھیس جس نے ... کو یہ سزا دی کہ تیس ہزار برس کے لئے کوہ قاف کے پہاڑوں میں ایک بہت بڑی چٹان کے ساتھ زنجیروں سے باندھ دیا۔

عطاء الرحمٰن

کی۔ اب حکم ہوا کہ ایک ایسی ہستی ایجاد کرو جو دماغی قابلیت اور علم حاصل کرنے میں ان سب سے بڑھ کر ہو۔ دونوں بھائیوں کو یہ حکم سن کر پریشانی سی ہوئی کیوں کہ وہ قدرتی طور پر فیاض طبع واقع ہوئے تھے اور جتنی خوبیاں خیال میں لا سکتے تھے حیوانات پرندوں اور مچھلیوں وغیرہ میں تقسیم کر چکے تھے۔ کچھ باقی نہ تھا۔ لیکن حکم بجا لانا بھی ضروری تھا۔ اس لئے پرامی تھیس نے زمین سے تھوڑی سی مٹی لی۔ اسے پانی سے تر کیا اور ایک بت بنایا جس کی صورت دیوتاؤں سے ملتی جلتی تھی۔ اس کے نتھنوں میں محبت کے دیوتا نے زندگی کا احساس پھونک دیا۔ پیلاس ایتھینی[1] یعنی دستکاری کی دیوی نے روح عطا کی اور سب سے پہلے انسان نے اٹھ کر اپنے چاروں طرف اس دنیا پر نظر دوڑائی جو اس کے رہنے کی جگہ قرار دی جانے والی تھی۔

لیکن یہ انسان کمزور، ننگا اور دوسرے حیوانات کے مقابلے میں بالکل بے چارہ تھا اور چونکہ روح اور احساس بھی رکھتا تھا اس کی حالت سب سے زیادہ قابل رحم تھی۔ پرامی تھیس نے سوچا کہ ذیوس[2] یعنی دیوتاؤں کے باپ اور ان کی سلطنت کے بادشاہ سے انسان کے لئے کچھ طلب کرے۔ لیکن وہاں باوجود بہت کوشش کے شنوائی نہ ہوئی۔

بہت غور و فکر کے بعد پرامی تھیس کو ایک تجویز سوجھی جس سے اس کے بھائی اپی میتھس کو اتفاق نہ تھا۔ لیکن پرامی تھیس بہت صاحب ہمت تھا۔ وہ چوری چوری نظر بچا کر اولمپس[3] یعنی دیوتاؤں کے رہنے کے پہاڑ پر گیا اور جھاڑیوں میں چھپ رہا۔ جب اپالو[4] یعنی سورج دیوتا کا رتھ اس طرف سے گذرا تو اس نے اس کے پہیوں میں سے نکلتے ہوئے شعلوں سے ایک مشعل روشن کی اور زمین پر واپس آ کر یہ مشعل یعنی "آگ" انسان کو دے دی۔

اب انسان کا خوف جاتا رہا۔ جن غاروں میں رہتا تھا ان کا اندھیرا دور ہو گیا۔ سردی سے نجات مل گئی۔ لوہے کے ہتھیار اور اوزار بنا لئے گئے۔ حیوانات اس کے غلام ہو گئے۔ کھیتی باڑی اور دستکاری شروع ہوئی گویا انسان دیوتاؤں کی طرح مارنے اور پیدا کرنے کے قابل ہو گیا۔

ایک روز ذیوس دیوتا کی نگاہ زمین پر پڑی تو دیکھا کہ جا بجا دھواں اٹھ رہا ہے اور کہیں کہیں زرد اور سرخ شعلے ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ شعلے انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس نے غصے سے گرج کر دریافت کیا کہ آگ جیسی مقدس چیز جو دیوتاؤں کے لئے مخصوص تھی انسان کو کس نے دے دی؟ فوراً دیوتاؤں کی کونسل طلب کی گئی اور اس امر پر غور کیا جانے لگا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ بعض دیوتا آگ کے بغیر انسان کی کمزوری اور بے چارگی کی وجہ سے اس کے طرفدار بھی تھے۔ آخر بہت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے ہوا کہ آگ انسان کے پاس رہنے دی جائے لیکن ایک اور شے ایسی پیدا کر دی جائے جو حد درجہ دل فریب بھی ہو اور ہمیشہ کے لئے اس کی تباہی و بربادی کا سامان بھی بن جائے۔

چنانچہ لنگڑے آگ دیوتا ولکن[5] کے نام احکام جاری ہو گئے جس کی حکومت پر گویا انسان نے ڈاکا ڈالا تھا۔ اس نے زمین سے مٹی اور پانی لے کر ایک نہایت خوبصورت بھولی بھالی لڑکی کی شکل بنائی۔ دستکاری کی دیوی نے اسے بے داغ سفید لباس پہنایا اور ایک نہایت باریک جالی دار نقاب اڑھا دیا۔ پیشانی پر تازہ کھلے ہوئے پھولوں کے حلقے سجا دئے گئے۔ اور ولکن نے ایک سنہری تاج بنا کر سر پر رکھ دیا جس میں تمام دنیا کے جانوروں کی تصویریں اس خوبی سے کھودی گئی تھیں کہ وہ زندہ معلوم ہوتے تھے۔ اس بت کو ولکن اٹھا کر دیوتاؤں کی مجلس میں لے گیا۔

وہاں مختلف دیویوں اور دیوتاؤں نے اسے اپنی اپنی طرف سے تحفے دئے۔ حسن کی دیوی نے حسن عطا کیا۔ اپالو دیوتا نے موسیقی۔ ہرمیز[6] نے جو دیوتاؤں کا نامہ بر تھا میٹھی زبان۔ اور جب سب اپنے اپنے تحفے دے چکے تو اس کی ناک میں روح پھونک کر پینڈورا[7]

[1] پیلاس ایتھینی (PALLAS ATHENE) [2] ذیوس (ZEUS) [3] اولمپس (OLYMPUS) [4] اپالو (APOLLO)
[5] ولکن (VULCAN) [6] ہرمیز (HERMES) [7] پینڈورا (PANDORA)

دیوتاؤں کی چوری

(قدیم یونان کے افسانوں کا افسانہ)

ذیل کے مضمون کے ساتھ میجر عطاء الرحمٰن صاحب کا یہ خط موصول ہوا تھا جو بجائے خود ایک دل چسپ مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم قارئینِ ہمایوں کو اس کے مطالعے کے لطف میں شریک کرتے ہیں:۔

مجتبی و مکرمی۔ آداب۔

ایک اور لیجئے ---! قدیم یونانی میتھالوجی سے ہمارے اُردو دان ہندوستانی بہت کم واقف ہیں اور انہیں یورپ کے ہر قسم کے آرٹ کی اس بنیاد سے روشناس کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس میتھالوجی کا یورپ کے شعر، مصوری اور بت تراشی پر کتنا اثر ہے اور اس میں دل چسپ افسانوں کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جو برسوں تک اردو میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اب تک شاید سوائے کیوپڈ اور سائکی کے افسانے کے جسے نیاز فتح پوری کے جادو نگار قلم نے اُردو میں لکھا ہے اور بہت کم افسانے لکھے گئے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ اگر حالات سازگار رہے تو کم از کم دو چار افسانے اس سلسلے میں ضرور پیش کروں گا۔ کاش ہمایوں کی لمبی داڑھی والی مولویت مجھے اجازت دیتی اور میں ہر افسانے کے ساتھ یورپ کی مصوری کا ایک شاہکار اشاعت کے لئے بھیج سکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یونانی میتھالوجی محض مناظرِ قدرت ہیں اور قدرت فطرۃً عریاں۔ صبح کی دیوی کی اگر تصویر بنائی جائے تو وہ پنجابی شلوار اور انگریزی کاٹ کی لیڈیز قمیض پہنے ہوئے اچھی معلوم نہ ہوگی۔ جہاں تک انسانی جذبات کا تعلق ہے وہ تو ذرا ذرا سی بات پر برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے ؂ بدلی کو دیکھ کر مری نیت بدل گئی۔

اب کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ چونکہ بدلی کو دیکھ کر کسی شخص کی نیت بگڑ جاتی ہے اس لئے بدلی کی طرف دیکھنا ہی ممنوع قرار دے دیا جائے؟ یا کالی گھٹا آنے لگے تو اسے فوراً SMOKE-SCREEN سے چھپا دیا جائے تاکہ کوئی انسان اسے دیکھ کر شراب نہ پینے لگے۔؟

مبادا اس قسم کی گفتگو سے یہ سمجھا جائے کہ میں ایڈیٹر صاحب ہمایوں کو گناہ کی طرف راغب کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اس بحث کو یہیں ختم کرتا ہوں۔

آپ نے میرے پہلے افسانوں کو پسند فرمایا۔ قدر دانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مشقی کو داد ملتی رہے تو آغاز میں خود بخود مشاس بڑھتی جاتی ہے --- زیادہ نیاز ------ نیاز کیش عطاء الرحمٰن

بچہ جب ہوش سنبھالتا ہے اور باتیں کرنے کے قابل ہوتا ہے تو اپنے اردگرد کی چیزوں سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش میں سب سے پہلا سوال کرتا ہے "یہ کیا ہے ---؟" تھوڑے عرصے کے بعد اس سوال کی شکل بدل جاتی ہے۔ "یہ کیوں ہے ---؟" "کس لئے ہے ---؟"

یہی صورت بنی نوعِ انسان کی ہے۔ جب سے انسان دنیا میں آیا ہے ہر قوم نے خواہ وہ برفانی ملک میں پیدا ہوئی یا افریقہ کے جنگل میں سب سے پہلے ان سوالوں کے جوابات کی تلاش کی۔ "کیوں ---؟ کس طرح ---؟ کس لئے ---؟" اس کے بعد۔ "کائنات کا بنانے والا کون ہے ---؟" --- "آگ، پانی، ہوا۔ کیا ہیں ---؟" --- "میں کیوں ہوں ---؟" وغیرہ۔

ہر پرانی قوم نے اپنے حالات اور گرد و نواح کے مطابق زندگی کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی۔ ان میں قدیم یونانیوں کا نظامِ کائنات ایک خاص قسم کی دل چسپی لئے ہوئے ہے اور اسی پر مغربی ممالک کے شعر، مصوری اور بت تراشی کا بڑی حد تک انحصار ہے۔

قدیم یونانیوں کے نزدیک پہلے دنیا سنسان تھی۔ سورج یا چاند کا نام و نشان تک نہ تھا۔ دیوتا کے آس[1] یعنی اندھیرے کی حکومت تھی۔ جس کی ملکہ رات کی دیوی اور لڑکا اندھیرے کا دیوتا کہلاتا تھا۔ اس لڑکے کے گھر میں اولاد ہوئی تو لڑکی کا نام روشنی اور لڑکے کا دن رکھا گیا۔ ان دونوں کے حسن سے دنیا میں رونق پیدا ہوگئی اور محبت کے دیوتا سے یارانہ ہو جانے پر ان تینوں نے مل کر زمین، سمندر اور آسمان کا نظام قائم کیا۔

وقت پا کر اس میں جنات کی ایک نسل پیدا کی گئی جن کے ذریعے سے دنیا کو آباد کرانے کا بندوبست شروع ہوا۔ یہ لوگ بڑے قد آور، طاقت ور اور سمجھ دار تھے۔ ان کے افسر دو بھائی تھے۔ ایک پرامی تھی اس[2] جس کے معنی ہیں "پیش بینی" اور دوسرا ایپی تھیس[3] یعنی "پس نظری"۔ ان دونوں نے مل کر حیوانات، پرندے اور مچھلیاں وغیرہ بنائیں۔ دریا بہائے۔ پھل اور درختوں کی ابتدا

[1] کے آس (CHAOS) [2] پرامی تھی اس (PROMETHEUS) [3] ایپی تھیس (EPIMETHEUS)

گرد کی تہ میں ہے لیکن اک بشاشت کی چمک
ابر کے پردے سے جیسے ماہِ تاباں کی جھلک

جلوہ گر ہے منہ پہ ایسا ایک روحانی سکوں
پھونک دے جو دیکھنے والے پہ راحت کا فسوں

بند آنکھیں جیسے مصروفِ خیالِ یار ہے
دل کے آئینے میں محوِ لذتِ دیدار ہے

بانسری منہ سے لگی ہے اور بجانے میں ہے مست
دل کی باتیں مونسِ دل کو سنانے میں ہے مست

جیسے آیا ہو یہاں بنسی بجانے کے لئے
انجمن ایک اپنی خلوت میں بنانے کے لئے

نغمۂ شیریں کا ہے اک چشمہ نغمہ سا رواں
فیض سے جس کے بیاباں میں کھلا ہے گلستاں

چھا رہی تھی جو طبیعت پر مری پژمردگی
جسم کی درماندگی اور قلب کی آزردگی

وہ یکایک ایک احساسِ مسرت بن گئی!
زندگی لگتی تھی جو دوزخ وہ جنت بن گئی۔

مجھ کو دامن گیر تھی جس کام کی فکرِ مآل
میرے دل سے یک قلم جاتا رہا اُس کا خیال

جو سے موسیقی کی موجوں میں وہ گویا بہ گیا
عہدِ ماضی کی مٹی سی یاد دھو کر رہ گیا

کون تھا اللہ جانے یہ اکیلا نے نواز؟
کوئی بھی ہو، اُس نے ظاہر کر دیا مجھ پر یہ راز۔

کاروانِ زندگی کی کوئی منزل ہو نہ ہو،
کوئی اپنی دشت پیمائی کا حاصل ہو نہ ہو،

یہ کنارِ راہ پر آرام لینے کے مزے
دل کو ٹھنڈی چھاؤں میں تسکین دینے کے مزے

یہ بجائے خود ہیں اس قابل کہ محض ان کے لئے
زحمتیں برداشت ہستی کے سفر کی کیجئے

محمد ہادی حسین

یہ کنارِ راہ پر آرام لینے کے مزے

موسمِ گرما کی تھی اک دوپہر آتش فشاں، تھا زمیں پر دھوپ کی صورت میں جوشِ آسماں
کاروبارِ زیست کے ہاتھوں سے مجبورِ سفر، جا رہا تھا میں اک انگاروں سی تپتی راہ پر،
زندگی کی سخت گیری کا گلہ کرتا ہوا، اور طلب قسمت سے محنت کا صلہ کرتا ہوا
اس سفر میں مجھ کو درپیش ایک ایسا کام تھا، معرکہ بیم و رجا کا جس کا سر انجام تھا
سوچتا تھا میں کہیں محنت نہ جائے رائگاں کیا خبر کیا رنگ لائے انقلابِ آسماں؟
یہ سفر کرنا پڑا اگر مجھ کو بے نیلِ مرام، وائے میری قسمت! اے میرے دلِ ناشاد کام!—
زندگی لگتی تھی مجھ کو ایک دشتِ بیکراں، جس میں ہیں آوارہ انساں کارواں در کارواں،
ایک نامعلوم منزل کی طرف گرمِ سفر، ایک نامعلوم مقصد کو لئے پیشِ نظر
بن کے اک غولِ بیاباں اُن کا ذوقِ جستجو، ہے لئے جاتا اُنہیں سوئے سرابِ آرزو
کوئی اس وسعت میں رستے کا نہیں ملتا سُراغ، ہے پرے حدِ افق سے خواہشوں کا سبز باغ
جب نشاں ہی منزلِ مقصود کا نابود ہے، کس لئے یہ بادیہ پیمائی بے سُود ہے؟—
جا رہا تھا محوِ ان افکارِ یاس انگیز میں، اس جہنم کی سی گرمیٔ مصیبت خیز میں
اتنے میں دیکھا کہ اک تنہا درختِ سایہ دار ہے کنارِ رہ پہ مثلِ رحمتِ پروردگار،
اور اس کے سائے میں ہے ایک مجھ سا رہ نورد، جس کے چہرے پر مرے چہرے سی ہے کلفت کی گرد

کیا آپ نے اپنی بلا کو کبھی دیکھا بھی تھا ؟

احسان اٹھانے سے ہر شاعر بھاگتا ہے۔ مرزا غالب دس قدم اور آگے نکل گئے۔ آپ ایک لفظ پر ایسے مرنے لگے کہ اسے بھی احسان اٹھانے کی بلا سے بچا گئے۔ فرماتے ہیں ؎

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

جہاں تک زبان کا لطف ہے یہ شعر بھی اس قابل ہے کہ انسان اسے جھوم جھوم کر پڑھے، بار بار پڑھے، محفلوں میں دہرائے، واد دے اور دنیا پر ثابت کر دے کہ وفا شناس، یا شعر کہنے والا تھا یا شعر پڑھنے والا۔ یہ شعر پڑھا ہی اسی نیت سے جاتا ہے کہ شعر کی بھی قدر ہو اور شعر پڑھنے والے کی نسبت بھی یہ گمان ہو کہ وفا کے علم کے ماہر ہیں۔

مرزا غالب مرحوم نے نقش کے لفظ کو اکثر تصویر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو اُن کا یہ مصرع

نقشِ نازِ بُتِ طناز بآغوشِ رقیب

اسی طرح ایک اور مشہور مصرع ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

اس شعر کے پہلے مصرع کے متعلق گمان یہ ہوتا ہے کہ وفا کی تصویر حضرت نے دیکھی پسند نہ آئی۔ بالکل ممکن ہے کہ مرزا مرحوم نے وفا کی تصویروں کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ تصویریں اچھی نہیں۔ اس سے کلیہ بنا لیا کہ زمانے بھر میں (یعنی اُن کے وقت تک) وفا کی کوئی تصویر ایسی نہیں بنی جس سے دل کو تسلی ہو یعنے زلیخا نے یوسف سے نہ کی قیس نے لیلیٰ سے نہ کی، محمود و ایاز کا قصہ غلط، شاہ جہان کا روضۂ ممتاز محل بے معنی۔ یہاں تک تو ان کو اپنی رائے پر اختیار تھا۔ دوسرے مصرع میں مرزا مرحوم تصویر کا مضمون تو ہڑپ کر جاتے ہیں محض لفظ وفا کی نسبت ایک اور کلیہ قائم کر دکھاتے ہیں۔ اگر کسی لفظ کے معنی ہوں تو اس لفظ کو معانی کا احسان اٹھانا پڑتا ہے۔ جو احسان اٹھاتا ہے وہ شرمندہ ہوتا ہے۔ چونکہ وفا شرمندۂ معنی نہیں یعنی بے معنی ہے۔ اسی لئے یکتا ہے۔ جس دنیا میں اکثر انسان بے معنی ہیں اگر وہاں ایک لفظ بے معنی ہو گیا تو چنداں مضائقہ نہیں مگر حیرت ہوتی ہے تو اس بات پر کہ احسان اٹھانے کو بُرا تصور کر کے ایک بھولے بھالے لفظ کو مجبور کیا جاتا ہے کہ خود داری کے زعم میں وہ اس دعوے پر فخر کرے کہ میں بے معنی ہوں۔

یہ تو ہے شاعروں کی لفظوں کو مسحور کرنے کی طاقت۔ جس لفظ کو چاہیں اسے مجبور کر کے سفید کو سیاہ کر دکھائیں۔ شاعروں کا نثر لکھنے والوں پر بڑا احسان یہ ہے کہ محنت وہ کرتے ہیں۔ نثر لکھنے والوں کو مضمون سوجھ جاتا ہے۔

جتنی شاعروں کو احسان اُٹھانے سے نفرت ہے اتنی ہی مجھے احسان اٹھانے سے محبت ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ، بہت زیادہ۔

چاند، سورج، تاروں کے، مرغزاروں، کہساروں، آبشاروں کے احسان بہت ہیں مگر انسانوں کے احسان جو انسانوں پر ہیں ان قدرتی نعمتوں سے بہت بالاتر ہیں۔

ماں دودھ نہ دے تو دنیا ختم ہو جائے۔ بچے نہ ہوں تو بھی دنیا ختم ہو جائے۔

زندگی کا دوسرا نام، اسلام کا روحانی نام احسان ہے۔ جو احسان اٹھانے سے بھاگا وہ شہید بنتا پھرے۔ انسان نہیں ہو سکتا اللہ تڑتا پھرے کہیں پہنچ نہیں سکتا، باتیں بناتا رہے، بامعنی کبھی نہیں ہوگا۔

دوست سے احسان کی توقع کا نام بہشت ہے۔ اس توقع کے اٹھ جانے کا نام دوزخ ہے۔

"فلک پیما"

احسان

شاعر کے ہاتھ میں یہ ایک کرتب ہے کہ جس لفظ کو چاہے مسحور (sympathy) کر کے اس سے کچھ کا کچھ کہلوا دے۔ حنظل کو شہد، مالک کو سرمہ۔ شاعر ہر اَن ہونی چیز کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ شاعر کو جب یہ طاقت ہے کہ کم از کم لفظوں لفظوں میں نگاہوں سے تقدیریں بدل دیتا ہے تو باقی کیا رہ گیا۔

لفظوں پر کیا منحصر ہے شاعر کا جادو بعض مقبول انسانی عادتوں کو ردی قرار دے دیتا ہے۔ عرفی خودداری کی دُھن میں یہاں تک لکھ گئے ہے

گر مردِ ہمتی ز مروت نشاں مخواہ　　　　صد جا شہید شو دیت از دشمناں مخواہ

یہ شعر برسوں وردِ زبان رہا اور چونکہ عرفی کے خاص پرستاروں میں سے ہوں مجھے اب بھی کافی ندامت ہوگی کہ اس شعر کے غلط تخیل پر اعتراض ہو تو میرے قلم سے ہو۔ مبالغہ کی کوئی حد ہوتی ہے۔ خلافِ واقعہ دعاوی کی کوئی انتہا ہوتی ہے مگر عرفی صاحب اپنی بات کہہ گئے۔ کوئی حضرت سے پوچھے کہ خون بہا تو مقتول کے وارث مانگا کرتے ہیں خود مقتول کب قبر سے اٹھ کر دیت مانگنے آتا ہے؟ مگر عرفی صاحب نے اُلٹی گنگا بہا دی۔ طرفہ یہ کہ شہید کا لفظ استعمال کر گئے۔ اچھے شہید ہوئے جن کے گذرنے پر خون بہا کا سوال پیدا ہوا۔ شہید تو خوشی سے جان دیتا ہے، بہت بڑا رتبہ پاتا ہے۔ کہاں شہید کہاں خون بہا۔ ایسے وارث کون ہیں جو شہیدوں کی ہڈیاں بیچ کھائیں؟ مگر شاعر کو واقعات اور زندگی سے کیا تعلق؟ نصیحت کرنے پر آتے ہیں تو عقل کے زمین آسمان کو ایک کر کے بے تکی سی ہانک لگا جاتے ہیں۔ اتنا بھی نہ سوچا کہ شہید ہونا صرف ایک جگہ ممکن ہے۔ ایک ہی شخص کے لئے بار بار شہید ہونا قطعی ناممکن ہے مگر عرفی صاحب سو جگہ شہید ہونے کی تلقین فرماتے ہیں۔ کیا وہ مانگنی میں لہو لگا کر شہید کہلوانے کے شائقین کے قائل تھے؟ اگر حضرت عرفی کے فرمان کے مطابق ہر شخص مردِ ہمت ہو (اور ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ واقعی ہر ذی روح مردِ ہمت ہو) تو دنیا میں کوئی مروت کر ہی نہ سکے۔ یعنے مروت کا نام و نشان مٹ جائے۔ نہ کوئی احسان کر سکے نہ کوئی احسان اُٹھا سکے۔

ذوق صاحب آزادی کی ترنگ میں فرماتے ہیں۔

احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا　　　　کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

احسان اٹھانے کے اتنے دشمن تھے کہ لنگر توڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ قیاس اور غالباً صحیح قیاس ہے کہ جو کشتیاں ذوق صاحب نے جمنا پر دیکھی ہوں گی وہ تو لنگر کی محتاج نہ تھیں ملاح کنارے پر بانس سے ایک مضبوط رسّا باندھ کر تاہیں کر لیتے تھے۔ بہت احتیاط ہوئی تو آدھی کشتی کو کنارے کی ریت پر کھینچ لیا۔ لنگر جو اصل لنگر ہوتے ہیں چاہے وہ ہلکے ہی ہوں، وہ تو ذوق صاحب نے برسوں میں نہ توٹتے کبھی لنگر ملاحظہ سے گذرتا تو شاید اتنی سی بات سوجھ جاتی کہ لنگر کو توڑنے کا دعویٰ محض خیالی پلاؤ ہے۔ بات کو بڑھانا مقصود نہیں حضرت ذوق نے کشتی کو خدا پر چھوڑا اہم لنگر کو خدا پر چھوڑتے ہیں مگر اتنا ضرور پوچھنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ جناب والا ناخدا سے آپ کو کد سہی مگر آپ چلے کدھر تھے؟ اگر محض جمنا کے اس پار جانا تھا تو آپ کے زمانے میں معمولی بات تھی کہ شکیزوں پر بیٹھ کر پار نکل گئے۔ کشتی کا احسان آپ نے کیوں اٹھایا اور کیا وہ کشتی خود ساختہ تھی یا یہ کہ بڑھئی آپ کا دوست تھا اور کشتی بطور پیشکش آپ نے قبول فرمالی۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ حضرت اگر آپ نے کشتی چھوڑی تو پانی پر چھوڑی ریت پر نہیں چھوڑی۔ محض ناخدا کی ضد سے خدا کو آپ بیچ میں لے آئے۔ کہنے کو جو آپ کے جی میں آئے کہیئے مگر پانی آپ کی کشتی کو بہا لے گیا۔ اچھا تو یہ ہوتا کہ آپ لنگر کو اٹھا کر کشتی میں رکھ لیتے۔ بڑے کنارے سے کام آتا اب آپ جانیں آپ کی کشتی اور پانی کی لہریں۔ ناخدا غریب کو خدا رزق دے دے گا آپ کے چار پیسے بچ گئے اچھا ہوا مگر احسان کو اپنی بلا کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

ہندی غلام

اک زمیں کا بوجھ، ننگِ زیست، بے نام و نمود   بھیس میں انسان کے مایوس و ناکارہ وجود
ہر قدم پر ایک لغزش ہر نفس موجِ سموم   سینہ کینے کا دفینہ دِل میں فِکروں کا ہجوم
ایک مسجودِ ملائک جو زوال اندر زوال   بِک چکے جس کے ارادے لُٹ چکے جس کے خیال
باغ کا وہ پھول جس میں کچھ نہیں باقی مہک   آسماں کا وہ ستارہ جس کی چِھن جائے چمک
ایک پیغامِ حقیقت یاس ہیز و رنج زا   ایک نغمہ جو سراپا درد میں ڈوبا ہوا
تھی ازل کے دن سے قائم علم کی جس کے اساس   جبر نے پہنا دیا ہے جہل کا جس کو لباس
یہ وہ اک مجبور ہے دنیا میں وہ ناکام ہے   صبح جس کی ہے زمانے میں نہ جس کی شام ہے
جس کے لب پر مُہر، نالوں میں اثر کچھ بھی نہیں   ایک وہ ہستی جو سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

جوہرِ رشد و ہدایت اس سے سب نابود ہیں   عیب ہو سکتے ہیں جتنے وہ سبھی موجود ہیں
زندگی کا اس کی ہر لمحہ پریشانی میں ہے   آج یہ انسان ہو کر شکلِ حیوانی میں ہے
دِل کی کمزوری کچھ اتنی آئی اِس کے بانٹ میں   کہنے لگتا ہے یہ دن کو رات صرف اک ڈانٹ میں
بے شعور و کم خرد، کج رو، ذلیل و بے وقار   پردۂ دنیا سے اِس کا اٹھ چکا ہے اعتبار
نامِ میدانِ وغا سے تنگ آتی ہے اِسے   ہاں، فقط اپنوں سے کرنی جنگ آتی ہے اِسے

لعنتوں سے اہلِ دنیا کی یہ شرماتا نہیں   جی حضوری کے سوا کچھ کام اسے آتا نہیں
کس قدر خودداریوں کے راستے سے دُور ہے   تین دن کا گھر میں فاقہ ہے مگر مسرور ہے
اف یہ اس کی بے حسی افسوس یہ بے عزتی   دل میں سو ناسور پنہاں اور ہونٹوں پر ہنسی

میں زمان شاہ نے اپنی طرف سے رنجیت سنگھ کو لاہور کا گورنر بنادیا۔ رنجیت سنگھ تھوڑے ہی عرصے میں خود مختار ہوگیا اور یوں پنجاب میں سکھ سلطنت کی بنیاد پڑی۔

سکھ گرونانک (۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۹ء) کے پیرو تھے۔ گرونانک ایک نہایت بلند نظر صلح کل انسان تھے۔ ہندو مسلمانوں کی تفرقی دیکھ کر اور دونوں مذہبوں کے بہترین اصولوں سے متاثر ہوکر انہوں نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جس کا عقیدہ وحدت الوجود اور جس کا مسلک صلح کل تھا۔ ادی گرنتھ سکھوں کی مذہبی کتاب نانک کبیر اور راما نند کی تصنیف ہے۔ وہ خاص حصہ جو گرونانک کا لکھا ہوا ہے جپ جی کہلاتا ہے۔ سکھ مت کے نزدیک ترک دنیا مزوری ہے اور تمام ذاتیں برابر ہیں: خدا انسان سے یہ نہ پوچھے گا کہ تو کس کے گھر پیدا ہوا بلکہ یہ کہ تو نے دنیا میں کیسے کام کئے"۔ نانک کا مقصد ہندو مسلمانوں کو ملانا تھا۔ وہ اپنا کوئی علیحدہ فرقہ بنالے کے قطعی مخالف تھے۔ لیکن اُن کے بعد یہ صلح پسند لوگ آہستہ آہستہ ایک جنگجو فرقہ بن گئے جس سے ان کی مغل بادشاہوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ گرو گوبند سنگھ (۱۶۶۶ء تا ۱۷۰۸ء) نے سکھوں کو پہلے پہل ایک علیحدہ سیاسی جماعت کا رنگ دیا۔ خالصہ جماعت قائم کی اور ہر سکھ کے لئے کیس کڑا کرپان اور کنگھا پہننے کی شرط لگادی تاکہ وہ خوب منظم و متحد ہو جائیں۔

۱۷۶۳ء میں سکھوں نے اکٹھے ہوکر احمد شاہ ابدالی کے سرہند کے گورنر کو شکست دی۔ اور ۱۷۹۸ء میں جب رنجیت سنگھ لاہور کا گورنر مقرر ہوا تو اُس نے سکھوں کے اکثر "مسلوں" یا فرقوں کا جتھا بنا کر ایک زبردست فوج تیار کرلی اور ۱۸۰۱ء کے بعد خود مختار ہوکر اپنے علاقے کو پھیلانا شروع کیا یہاں تک کہ ستلج پار کے علاقے پر ہاتھ صاف کرنا چاہا۔ اس پر لارڈ منٹو نے ۱۸۰۹ء میں گورنمنٹ سے ایک معاہدہ کیا اور رنجیت سنگھ کو پنجاب کا خود مختار حاکم تسلیم کرلیا۔ رنجیت سنگھ کے بعد سکھوں میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکی اور بدامنی پھیلی۔ یہاں تک کہ خالصہ فوج نے ۱۸۴۵ء میں ستلج پار کرکے انگریزی علاقہ پر حملہ کردیا۔ سکھوں کو شکستیں ہوئیں اور ۱۸۴۶ء میں لاہور کا معاہدہ ہوا جس کی رو سے جالندھر کا دوآبہ انگریزی علاقے میں شامل کرلیا گیا اور سکھ فوج کم کردی گئی۔ ۱۸۴۹ء میں مول راج حاکم ملتان کی بغاوت کے بعد سکھوں کے ساتھ دوسری لڑائی ہوئی سکھوں نے شکست کھائی اور اس کے بعد ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو پنجاب قلمرو انگریزی میں شامل کرلیا گیا۔

پنجاب کو فتح کرنے کے بعد سارا ہندوستان انگریزوں کے ماتحت آگیا۔ برائے نام ایک مغل شاہنشاہ دہلی میں موجود تھا وہ بھی ۱۸۵۷ء کے غدر میں سازش کے الزام پر ملک بدر کردیا گیا۔

(باقی)

بشیر احمد

دوپہر

موسم گرما کی تنہا دوپہر ———
جون، جولائی کے سورج کا اثر،
لُو کے محشر خیز جھونکوں کی لپک،
سینۂ کون و مکاں میں برق و آتش کا نزول۔
بھول کر باہر میں آیا گر کبھی
جسم و جاں مرجھا گئے۔

ہر طرف شعلے اگلتی تھی ہوا،
ہر طرف جھلسانے والی آگ تھی،
یعنی دوزخ بن گئی ساری فضا،
ایسی دوزخ میں بھی میں نے بارہا
دل کی گہرائی میں پایا ہے، ندیم!
جنت الفردوس کی اک سرد زود کار تعاش!

رحمٰن مذنب

نا شناس قوم کو ہندوستان کے ساحل کی طرف لے آئی!

اورنگ زیب کے جانشین اس کی وسیع سلطنت کو سنبھالنے کے قابل ثابت نہ ہوئے۔ اصل یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے مختلف اسباب پیدا ہو چکے تھے۔ مغل شہزادے عیش و عشرت کا شکار ہو رہے تھے۔ اُمرا میں بھی عیاشی خود غرضی اور نا اتفاقی کا مرض روز بروز بڑھ رہا تھا۔ کئی بڑے بڑے سپہ سالار تہ تیغ ہو چکے تھے۔ فوج کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ سیرت کی مضبوطی اور قوم و ملک کی خدمت کا جذبہ مفقود ہو رہا تھا۔ شیعہ اور سنی ایرانی اور ترک ولایتی اور ہندی کے سوال پیدا ہو گئے تھے۔ اسلامی خوبیاں گم ہو رہی تھیں۔ ہندوؤں کے بعض طبقوں میں بیداری اور ہندوانی تنظیم کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اورنگ زیب کا آنکھیں بند کرنا تھا کہ ہر طرف سے یہ سوئے ہوئے فتنے بیدار ہو گئے۔

جس طرح تیمور کے حملے نے ۱۳۹۸ء میں دہلی کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا اور شمالی اور جنوبی ہند میں متعدد خود مختار ریاستیں بن گئیں بعینہٖ اسی طرح ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اور بعد میں احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے مغلیہ سلطنت کی رہی سہی قوت کو سلب کر لیا جس کی وجہ سے مختلف اطرافِ ملک میں خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔

۱۷۱۳ء میں سیواجی کے بیٹے ساہو کا وزیر بالاجی وشوا ناتھ ایک خود مختار پیشوا بن بیٹھا۔ اُس نے فرخ سیر سے ایک فرمان حاصل کر لیا جس کے ذریعے سے مرہٹے بعض علاقوں میں چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے اور پونا اور پندرہ اور اضلاع میں اپنا سوراج قائم کرنے کے حق دار ہو گئے۔ دوسرے پیشوا باجی راؤ (۱۷۲۰ء تا ۱۷۴۰ء) نے فتوحات سے اپنے علاقے کو اور وسعت دی اور سندھیا اور ہلکر کو اپنے سپہ سالار مقرر کیا۔ تیسرے پیشوا بالاجی باجی راؤ (۱۷۴۰ء تا ۱۷۶۱ء) کے عہد میں گائکواڑ اور بھونسلا کی ریاستیں شروع ہوئیں۔ ۱۷۴۹ء میں ساہو راجہ نے پیشوا کو ساری مرہٹہ سلطنت پر حکمرانی کا اختیار دے دیا۔ اس کے بعد پیشوا کا دار السلطنت پونا قرار پایا۔ مرہٹوں نے نظام سے اس کا کچھ علاقہ چھینا تنجور اور ترچناپلی پر قبضہ کر لیا اُڑیسہ فتح کیا بنگال سے چوتھ وصول کی اور پھر ۱۷۵۸ء میں پنجاب پر دھاوا بول دیا۔ پنجاب احمد شاہ درّانی کا علاقہ تھا۔ مرہٹوں کی بے باکی دیکھ کر اُس نے روہیلوں سے گفت و شنید کی اور پھر پانی پت کی وہ سب سے بڑی تیسری لڑائی لڑی جس کے فیصلہ پر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ مرہٹوں کے خلاف ہو گیا۔ یہ درست ہے کہ اس کے نو سال بعد مرہٹے پھر دہلی میں آ دھمکے اور (۱۷۷۱ء میں) شاہ عالم مادھاجی سندھیا کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی بن گیا اور مادھاجی سندھیا ۱۷۹۴ء تک ایک زبردست طاقت کا مالک بنا رہا لیکن مرہٹہ سلطنت کا قلب کمزور ہو چکا تھا۔ ۱۷۷۳ء میں سلطنت کی جانشینی کے متعلق ایک جھگڑا شروع ہوا جس میں انگریز بھی آ دھمکے۔ ۱۸۰۲ء میں پھر مرہٹوں کی خانہ جنگی کے باعث انگریزوں کو پیشوا کی حکومت میں پورا اقتدار حاصل ہو گیا۔ بھونسلا اور سندھیا اور ہلکر کو پے در پے شکستیں ہوئیں اور آخر ۱۸۱۸ء میں پیشوا کا بیشتر علاقہ انگریزی مملکت میں شامل کر لیا گیا۔

اودھ اور حیدر آباد ۱۷۲۴ء کے بعد دہلی کی سلطنت سے آزاد ہو گئے۔ بنگال میں علی وردی خاں (۱۷۳۹ء) میں خود مختار بن بیٹھا۔ روہیل کھنڈ میں روہیلوں نے اپنی الگ ریاست قائم کر لی۔ اودھ اور حیدر آباد کمزور ریاستیں تھیں ہمیشہ یا یہ کسی نہ کسی کا دامن پکڑے رہتیں یا کوئی نہ کوئی ان پر حملہ آور ہو جاتا اور کچھ لے لوا کر پھر انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیتا۔ لیکن جنوب میں ایک اور مسلمان حکمران تھا جس نے چند سالوں تک سارے جنوبی ہند پر اور مرہٹوں اور انگریزوں تک اپنا رعب جمائے رکھا۔ یہ حیدر علی تھا جو ۱۷۶۱ء میں ہندو راجہ کا علاقہ چھین کر اس پر قابض ہو بیٹھا۔ اُس نے متعدد بار مرہٹوں اور انگریزوں کو شکستیں دیں۔ اس کا بیٹا ٹیپو سلطان بھی بہادر رہا تاہم لیکن وہ اپنے باپ کی طرح ایک زبردست مدبر نہ تھا۔ میسور اور انگریزوں کے درمیان چار لڑائیاں ہوئیں۔ چوتھی لڑائی میں (۱۷۹۹ء میں) ٹیپو مارا گیا اور اس کے علاقے کو انگریزوں نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے تقریباً سارے ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا اور ستمبر ۱۸۰۳ء میں دہلی میں داخل ہوئے۔ البتہ ابھی ایک طاقت باقی تھی، یہ پنجاب کے سکھ تھے۔

دیسی زبانوں کی مغلیہ زمانے میں بڑی ترقی ہوئی۔ ملک محمد جائسی نے ہندی میں پدماوت تصنیف کی اور تلسی داس نے رامائن۔ شاہی دربار ہندی شعرا کی سرپرستی کرتا تھا۔

اُردو کی نشوونما بھی اسی زمانے میں ہوئی۔ ولی دکنی (المتوفی سنہ ۱۷۴۴ء) اُردو کا پہلا مشہور شاعر ہے۔ بعد کے مغلیہ بادشاہ خود اُردو میں شعر کہتے تھے۔ محمد شاہ رنگیلے کا شعر ہے :-

پیری میں نہ کیوں کریں کریں سیر جہاں کی — دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گذری کا

اب یہ مغل بادشاہ صرف سیر کرنے اور سر بامعنی و بےمعنی دفتر کو غرق مے ناب کرنے کے قابل ہی رہ گئے تھے۔

مغل بادشاہت کی آخری زمانے میں جو گت بنی اس کی ایک مثال یہ ہے کہ غلام قادر روہیلے نے ۱۹ شہزادوں کو بُلا کر کہا کہ اُس کے سامنے گائیں اور ناچیں۔ شہزادوں کے انکار پر انہیں دھمکی دی گئی کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو ان کی ناک کاٹ دی جائے گی۔ مجبوراً اُنہوں نے ظالم کا حکم مانا جس پر اُن کے بھوکے عزیزوں کے لئے اُنہیں پانی اور خوراک بطور انعام کے دی گئی۔ ایک دفعہ یہی بد خصال جابر شہزادۂ اکبر کے گھٹنے پر سر رکھ کر سو گیا اور سو کر اٹھا تو اس نے اُس کی گردن پر ایک چپت رسید کی اور کہا کہ کیا بزدل نفوس حکومت کا خیال بھی دل میں لاسکتے ہیں۔ اگر تم میں کچھ جان ہوتی تو تم میرے ہی خنجر سے میرا گلا کاٹ کر رکھ دیتے۔

جیسا بادشاہ ویسے امرا۔ اورنگ زیب کے بعد اگر کوئی اور اورنگ زیب پیدا ہوجاتا تو سلطنت کا یہ بُرا حال نہ ہوتا جو ہوا۔ سلطنت بہت وسیع ہوگئی تھی، کوئی قابل فرماں روا نہ تھا۔ اس زمانے میں اتنی بڑی سلطنت کا انتظام کوئی آسان کام نہ تھا۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہ جہان اور اورنگ زیب اِن چھ اور شیر شاہ سمیت سات عظیم الشان شخصیتوں نے ہندوستان میں ایک ایسی مسلسل منظم حکومت قائم کی جس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں زیادہ نہیں مل سکتیں۔ ایک اتنی بڑی اور ایسی باقاعدہ حکومت کا چلانا صرف ایسے ہی بڑے اور بلند نظر حکمرانوں کا کام تھا۔ اُس زمانے میں نہ ریل تھی نہ تار، ملک میں مختلف قومیں تھیں اور مختلف مذہب، کئی زبانیں، طرح طرح کی رسوم، عوام بعض نیم مہذب بعض مہذب، خواص بعض متعصب بعض بزدل بعض عیش پرست۔ ایسے زمانے میں ایسے ملک اور ایسے لوگوں کو منظم کرنا اور مجتمع رکھنا انتہا درجے کا دشوار کام تھا۔ ہندوستان کی خوش قسمتی تھی کہ اُس کے بند پانیوں میں ایک نئی رَو کا سیلاب آیا۔ اُسے مغلیہ بادشاہوں سے حکمران ملے جنہوں نے اسے اپنا گھر بنایا اور اُس کی بہتری کے لئے اپنی بہترین مساعی وقف کردیں۔ کس قدر بلند تھے اُن کے خیال اور کس قدر شاندار تھا اُن کا رویہ۔ اکبر نے کہا کہ انسان کی عظمت عقل کے جوہر پر مبنی ہے۔ اورنگ زیب کو جب ایک بار ایک عرضی دی گئی کہ تنخواہ تقسیم کرنے والے دونوں افسر آتش پرست پارسی ہیں اُنہیں برخاست کردیا جائے تو اُس نے جواب دیا کہ سلطنت کے کاروبار میں مذہب کو دخل نہ دینا چاہئے۔ اگر سائل کی بات پر عمل کیا جائے تو تمام راجاؤں اور اُن کی رعایا کا اماں ٹھکانا ہو۔ شاہی نوکریاں لوگوں کو اُن کی لیاقت اور قابلیت کے موافق ملنی چاہئیں۔ جس شاہی خاندان میں نور جہان اور ممتاز محل اور جہاں آرا بیگم اور زیب النسا سی فہیم و روشن خیال شہزادیاں شامل تھیں اُس کی جتنی تعریف بھی کی جائے کم ہے۔

مغلیہ سلطنت اور نظم و نسق کی شان دار تعمیر اس قدر مضبوط تھی اور مغلیہ حکومت لوگوں کے دل میں اتنا گھر کر چکی تھی کہ باوجودیکہ اورنگ زیب کے بعد ایک صدی تک ایک بھی قابل بادشاہ یا اور کوئی بھی ہمدرد اور دور اندیش وزیر پیدا نہ ہوا تاہم اس سلطنت کے زوال اور تباہی میں کم از کم ایک سو سال کا عرصہ لگ گیا۔

لیکن زمانہ دنیا کا "سلطانِ عادل" دیرگیر ہو لیکن بڑا سخت گیر فرماں روا ہے۔ جب کوئی قوم گر جائے جب کسی تہذیب میں گھن لگ جائے تو زمانہ جسے نوعِ انسان کی بہبود مدِنظر ہے اور محض کسی ایک فرد یا جماعت کی بہتری مقصود نہیں انسان کی ترقی کے نئے اسباب پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک نیا انقلاب برپا کر دیتا ہے خواہ اس انقلاب کی تبدیلیاں کس قدر دل شکن بلکہ زلزلہ خیز ہی کیوں نہ ہوں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت اپنا کام کرچکی تھی۔ اب مسلمان نکمے ہوچکے تھے اور ہندو ابھی بیدار نہ ہوئے تھے یہ حال تھا کہ قسمت انگریزوں کی

ہند و مسلمانوں نے مل کر حصہ لیا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگوں کو جوتا پہننا انہوں نے سکھایا، کپڑا پہننا انہوں نے بتایا، فرش بچھانا مختلف طرح کے کھانوں کا پکانا، مکانات کی آراستگی، علم مجلس اور ہزاروں چیزیں تہذیب وشائستگی کی انہیں کی بدولت ہندوؤں میں پھیلیں۔[1] ڈاکٹر عبدالمجید لکھتے ہیں کہ موسیقی میں ہندو بہت ماہر تھے مگر مسلمانوں نے ان سے سیکھ کر کمال پیدا کیا۔ آج یہ موسیقی مشترک ہے۔ ہندو موسیقی سوز و الم اور جذبات کی گہرائی کی مظہر ہے۔ مسلمانوں نے ہندوستانی موسیقی میں جوش وشدت بے ساختہ پن اور صفائی پیدا کی۔ اس کا اظہار قوالی میں ہوتا ہے جسے خسرو نے ہند میں رائج کیا۔ چنگ ورباب ایران سے آئے۔ ستار خسرو کی ایجاد ہے۔ سارنگی جو انسانی آواز کا سب سے زیادہ ساتھ دینے والا ساز ہے مغلوں ہی کے زمانے کی اختراع ہے۔ اس کے علاوہ برتن سازی، پارچہ بافی، نجاری، کپڑوں کی رنگائی، لکڑی کی نقاشی وغیرہ دونوں ملتوں کے مشترک تمدن کا اظہار ہے۔ سیاستِ مدن کا تصور اور انتظام سلطنت کس قدر مکمل ہوگا کہ اس زمانے میں جب کہ نہ ہوائی جہاز نہ تار نہ ریل نہ موٹر کچھ بھی نہ تھا۔ دُور و دراز علاقوں میں پورا امن قائم رہتا تھا۔ میجر باسو نے لکھا ہے کہ "دولت، آرام اور چین کا جو نقشہ شاہ جہاں کے وقت میں دیکھنے میں آتا ہے بلا شبہ بے مثل و بے نظیر تھا۔" ایک انگریز سیاح نے لکھا ہے کہ اُس زمانے میں شہر آگرہ شہر لندن سے بڑا تسلیم کیا جاتا تھا۔[2]

مغل آرٹ کے بڑے قدردان تھے۔ بلکہ بعض نے خود بھی اس میں مہارت پیدا کی۔ اکبر نے فتح پور سیکری کے محل میں دیواروں پر تصویریں بنانے کے لئے ایرانیوں کے علاوہ بہت سے ہندوؤں کو بھی ملازم رکھا اس طرح ایک نئے طرزِ مصوری کی بنیاد پڑ گئی۔ جہاں گیر کے زمانے میں یہ راجپوت یا مغلیہ طرز کی، بالخصوص شبیہوں کی مصوری اپنے اوج کمال پر پہنچ گئی۔ یہ تقریباً سب مغل بادشاہوں اور ان کے امرا کی قدردانی کا نتیجہ تھا۔ داراشکوہ کو بھی مصوری سے بڑی دلچسپی تھی۔

مغلوں کی عظمت کی سب سے بڑی یادگار اُن کی خوبصورت وشاندار عمارات ہیں جن کو آج تک دنیا حیرت کی نظروں سے دیکھتی ہے اکبر نے آگرے کا لال قلعہ اور فتح پور سیکری کے محلات اور سکندرہ میں اپنا مقبرہ بنوایا۔ محلات میں ہندو اثرات کا پتہ چلتا ہے اور مقبرے کا نقشہ بدھ مت کے "وہار" سے لیا گیا ہے۔ فتح پور کی مسجد کا بلند دروازہ ایک عجیب شان رکھتا ہے۔

شاہ جہاں کا نام اپنی شاندار تعمیرات کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد اور پھر تاج محل یہ عمارتیں سادگی تناسب، وقتِ نظر، رفعتِ تخیل، آرائش اور حسنِ نزاکت میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ صرف اک تاج محل اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ مغلیہ تہذیب دنیا کی عظیم ترین تہذیبوں میں شمار ہونے کے قابل ہے!

مغل شاہنشاہ علم وادب کے دلی قدردان تھے۔ اُن کے زمانے میں عربی فارسی اور دیسی زبانوں کے ادب نے بڑی ترقی کی۔ بابر جہاں ایک بڑا فاتح گزرا ہے وہیں ایک شاعر اور مورخ بھی ہوا ہے۔ ہمایوں جہاں جاتا تھا اپنی کتابیں ساتھ لئے جاتا تھا وہ اپنے کتب خانے ہی کی سیڑھیوں سے گر کر مرا۔ اکبر اگرچہ خود اَن پڑھ تھا لیکن اُس کے عہد میں فارسی ادب کو بہت ترقی ہوئی۔ ابوالفضل کی آئینِ اکبری اور اکبر نامہ مشہور ہیں۔ سنسکرت کی کئی مشہور کتابوں رامائن مہابھارت وغیرہ کے ترجمے کئے گئے۔ جہاں گیر نے بھی بابر کی طرح اپنی توزک لکھی۔ عرفی کی ایک نظم پر اُسے ایک لاکھ روپیہ انعام ملا۔ داراشکوہ نے مجمع البحرین میں اسلامی تصوف اور ہندوؤں کے علم باطن کے خیالات کو جمع کیا۔ اورنگ زیب کے رقعات کے علاوہ اس کے فتاویٰ مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی بیش بہا تصنیفات تھیں۔ بعد کے مغل بادشاہ بھی جن کے زمانے میں سلطنت زوال پر تھی اکثر علم و ادب کے قدردان ثابت ہوئے۔ مردوں کے علاوہ عورتوں نے بھی علم و ادب کی خدمت میں حصہ لیا۔ گلبدن بیگم کی تاریخ ہمایوں نامہ اور زیب النسا کا دیوان مخفی اس کی روشن مثالیں ہیں۔

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد اول صفحہ ۲۸۔
[2] مسلمانوں کا روشن مستقبل (از سید طفیل احمد) صفحہ ۱۱

سامنے پیش ہوکر اپنی اپنی شکایات بڑی دلیری اور بعض دفعہ گستاخی سے بیان کرتے تھے لیکن اورنگ زیب کی پیشانی پر کبھی بل تک نہ پڑتا تھا۔ کریری اطالوی سیاح نے جب دکن کی لڑائیوں کے دوران میں اس سے ملاقات کی تو دیکھا کہ عالمگیر جس کی عمر اُس وقت اسی سال کے لگ بھگ تھی اپنے امرا کے حلقے میں بیٹھا ہوا پیش کیے ہوئے سائلوں کی عرضیاں خود پڑھتا تھا اور اُن پر دستخط کرتا جاتا تھا۔

عدل وانصاف بغیر پولیس کے ناممکن تھا۔ چنانچہ مغلوں نے اس کا خوب انتظام کیا تھا۔ بڑے شہروں میں کوتوال اور اُس کا عملہ اور دیہات میں فوجدار پولیس کی خدمات انجام دیتا تھا۔ اور زمیندار اپنے اپنے حلقے میں جرائم کی تفتیش کے ذمہ دار تھے۔

خفیہ محکمے کا ذکر ہو چکا ہے۔ ڈاک کا باقاعدہ انتظام تھا۔ ہر شاہی سڑک پر چھ چھ میل کے فاصلے پر ایک چوکی ہوتی تھی جہاں سے ہرکارہ دن ہو کہ رات تیزی کے ساتھ اگلی چوکی تک شاہی ڈاک لئے چلا جاتا تھا۔

ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے بے شمار مسجدیں، خانقاہیں، پاٹ شالے، مکتب اور مدرسے تھے۔ ہندو مسلمان مل کر مدارس میں تعلیم پاتے تھے کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ لڑکیوں کے مکتب مدرسے الگ تھے لیکن عموماً وہ اپنے گھر پر یا اپنے اُستادوں کے گھروں پر تعلیم پاتی تھیں۔ اورنگ زیب کے زمانے میں بقول ہملٹن صرف ٹھٹھہ (سندھ) میں ۴۰۰ مدرسے تھے جہاں دینیات لسانیات اور سیاسیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ میجر باسو نے میکس مولر کے حوالے سے لکھا ہے کہ بنگال میں انگریزوں کی آمد کے وقت اسی ہزار (۸۰۰۰۰) مدرسے تھے[1]۔ ان مدارس میں تاریخ جغرافیہ فنِ جنگ وجدل مذاہب سیاسیات مقامی زبانوں وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔

مغلوں نے زراعت کی طرف خاص توجہ دی۔ کسانوں کی حفاظت کی۔ نہریں کھدوائیں کوئیں بنوائے۔ تالاب بنوائے۔ جا بجا سڑکیں بنوائیں۔ ملک میں قسم قسم کی صنعتیں تھیں یہاں کا سوتی اور ریشمی کپڑا، برتن، چاقو، بندوقیں، کاغذ، موتی، مسالے، تمباکو، چمڑا اور بالخصوص کشمیر کی شالیں لاہور اور آگرے کے قالین۔ ڈھاکہ کی آبِ رواں ساری دنیا میں مشہور تھی۔ ہندوستان میں جہاز سازی ہوتی تھی یہاں تک کہ انگریز اور ڈچ لوگوں نے اپنے کچھ جہاز یہاں بنوائے۔ سورت کا ایک تاجر عبدالصمد کئی سو تجارتی جہازوں کا مالک تھا[2]۔ انڈسٹریل کمیشن کے خیال کے مطابق اس وقت ہندوستان کی صنعتی ترقی کی حالت یورپ کے کسی ملک سے کم نہ تھی۔ مغلوں کا سکہ اُس وقت کے تمام یورپی ممالک کے سکوں پر فوقیت رکھتا تھا۔

پروفیسر برج نرائن نے اپنی کتاب "ہندوستان کی معاشی زندگی" میں اندازہ لگایا ہے کہ اُس زمانے کا مزدور اوسطاً آج کل کے مزدور سے زیادہ خوش حال تھا۔ اس وقت روپے کی قیمت آج کل کے مقابلے میں تیرہ گنا زیادہ تھی اور یومیہ مزدوری اوسطاً ڈھائی آنے کے قریب تھی۔ کوریٹ (CORYAT) ایک انگریزی سیاح کا بیان ہے کہ ۲ روپیہ میں وہ خوب آسانی سے ہندوستان میں اپنے گوشت اور کھانے پینے اور کپڑے کا خرچ چلا سکتا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایک مزدور ۲۰ روپیہ میں کس قدر فراغت سے زندگی گزارتا ہوگا۔

عام لوگوں کی حالت اچھی تھی۔ وہ امن وامان میں زندگی بسر کرتے تھے اور خوش اور مطمئن تھے۔ امیروں کے مکانوں میں عیش و عشرت کا سامان مہیا تھا۔ ہر شہر میں مکتب اور مدرسے علمی وادبی انجمنیں اقامت خانے شفاخانے حمام اور کنوئیں اور رفاہِ عام کی اور بہت سی چیزیں مہیا تھیں۔ بازاروں کی ہر روز باقاعدہ صفائی ہوتی تھی۔

اسی زمانے میں اُس مشترک ہندو مسلم تمدن کی بنیاد پڑی جس کے کارناموں پر ہندوستان بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ مغلِ اعظم کا شہرہ مشرق سے مغرب تک جا پہنچا۔ عہدِ مغلیہ کے مادی وعلمی کارنامے آج تک ہندوستان کی معاشری زندگی کا جزو بنے ہوئے ہیں۔ ہندوستانی خوراک، لباس، طرزِ بودوباش، گفتگو، آدابِ مجلس یہ جو کچھ آج ہیں ایک حد تک مغلیہ وقتوں ہی کی یادگار ہیں۔ پھر فنونِ لطیفہ میں مغلیہ نقاشی مغلیہ فنِ تعمیر اور علم ادب اور شاعری اور موسیقی کا مذاق یہ سب مغلوں ہی کے زمانے کی تخلیق ہے اور اس تخلیق میں کم وبیش

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل از سید طفیل احمد صفحہ ۱۲۷۔ [2] مختصر تاریخ ہند از سید ابوظفر ندوی صفحہ ۱۹۱

تھا کا انسداد اور امداد، تعلیم و تدریس، فنون و علم ادب ان میں سے ایک ایک کی طرف انہوں نے توجہ دی اور ان کو فروغ دیا۔

نظم و نسق کے لئے ملک کو پندرہ اور بعد میں اٹھارہ صوبوں میں منقسم کیا گیا۔ ہر صوبے کا حاکم اعلیٰ ایک صوبہ دار ہوتا تھا، فوج بھی اسی کے ماتحت ہوتی تھی اور مالیات کا دیوان بھی اُسی کے تحت میں اپنا کام کرتا تھا۔ ان کو مقررہ اوقات پر اپنی کارگزاری کی رپورٹ مرکزی حکومت کو بھیجنی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ بادشاہ کی طرف سے ہر صوبے میں واقعہ نویس اور خفیہ نویس مقرر کئے جاتے تھے جو بادشاہ کو علانیہ اور خفیہ طور پر ہر صوبے کے حالات سے مطلع رکھتے تھے جس سے صوبہ دار بادشاہ کے قابو میں رہتے تھے۔ صوبے دار کے ماتحت ہر ضلع میں ایک فوج دار اور فوج دار کے ماتحت ہر پرگنہ میں قانون گو اور پرگنے کے ہر گاؤں میں ایک مقدم یا پٹواری ہوتا تھا۔ دیہات میں ہر گاؤں میں اپنی اپنی پنچائتیں بدستور قائم تھیں۔

سلطنت کی آمدنی کے ذرائع خالصہ اراضی، مال گزاری، محصولات، خراج، پیشکش وغیرہ تھے۔

عدل و انصاف کا حق جیسے مغلوں نے ادا کیا دنیا میں بہت کم حکمرانوں نے کیا ہوگا۔ اکبر کا قول تھا کہ بادشاہت کا ربانی عنصر عدل ہے۔ ملک کا ادنٰے سے ادنٰے آدمی بادشاہ تک رسائی پا سکتا تھا۔ عہدہ داروں کے لئے کوئی الگ قانون نہ تھا۔ حکومت کی نظر میں سب یکساں تھے۔ مسلمانوں نے دنیا میں جہاں جہاں بھی ایک منظم حکومت قائم کی عدل و انصاف کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ شیر شاہ سوری کا بیٹا عادل خاں ہاتھی پر سوار ہو کر آگرے کے ایک کوچے میں سے گزرا اور اس نے ایک ہندو کی بیوی پر جو اپنے مکان کے صحن میں برہنہ نہا رہی تھی ایک پان کا بیڑا پھینکا اور اُسے گھورتا ہوا چلا گیا۔ اس پر اس ہندو بقال نے بادشاہ کے پاس پہنچ کر شکایت کی۔ بادشاہ نے معذرت کی اور کہا کہ میری عدالت میں فرزند اور رعایا برابر ہیں اور حکم دیا کہ عادل خان کی بیوی کے ساتھ بقال بھی ایسا ہی سلوک کرنے کا حق دار ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادے نے بقال سے معافی مانگ لی۔

عدل و انصاف کے محکمے کا افسر اعلیٰ خود شاہنشاہ تھا۔ اُس کے نیچے دارالسلطنت میں قاضی القضاۃ کی عدالت تھی جو علاوہ اور کاموں کے تمام بڑے بڑے شہروں میں دیوان کے ساتھ مل کر قاضی اور محتسب مقرر کرتا تھا۔ ہر کچہری میں ایک قاضی اور ایک میر عدل ہوتا تھا۔ قاضی مسلمانوں کے اور ہندو افسر ہندوؤں کے دیوانی مقدمات فیصل کرتے تھے۔ چھوٹی عدالت سے صوبے کے قاضی یا صوبے دار کے پاس اور اس سے خود شاہنشاہ کے پاس اپیل ہو سکتی تھی۔

جہانگیر نے اپنے محل کے باہر زنجیر عدل لٹکا کر ہر کہ ومہ کو شاہنشاہ تک آسانی سے پہنچ سکنے کا رستہ کھول دیا۔ ایک دفعہ ایک ہندو محرر نے شاہ جہان کے پاس شکایت کی کہ ایک مسلمان سپاہی اس کی باندی کو زبردستی بھگا کر لے گیا ہے اور نہیں چھوڑتا۔ مقدمہ بادشاہ کے پاس منتقل ہوا بادشاہ کچھ لکھتا جاتا تھا اور لڑکی کو دوات میں پانی ڈالنے کے لئے کہے جاتا تھا۔ لڑکی ایسی صفائی سے پانی ڈالتی تھی کہ بادشاہ نے یہ کہہ کر اپنا فیصلہ صادر کیا کہ یہ لڑکی ضرور کسی محرر کے ہاں رہی ہے جب ہی یہ کام ایسی صفائی سے کر سکتی ہے۔ اس لئے لڑکی کو ہندو محرر کے حوالے کر دیا گیا۔

رائے بھارا مل لب التواریخ ہند کا مصنف لکھتا ہے کہ شاہ جہان نے ایک دفعہ میرے سامنے داروغہ عدالت کو بُرا بھلا کہا کہ میرے پاس ہفتے میں ایک ہی بار اور وہ بھی کم مقدمات کیوں آتے ہیں۔ اُس نے عرض کی کہ اس کمی کی سوائے اس کے کوئی وجہ نہیں کہ ملک میں اکثر لوگوں کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے اور انہیں شکایت باقی نہیں رہتی پھر کہا کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کسی مستغیث کو بادشاہ کی بارگاہ تک لانے میں کوتاہی کی ہے تو وہ یقیناً سزا کا مستوجب ہوگا۔

مسٹر کوسبلہ کا قول ہے کہ عدل میں اورنگ زیب ان سب بزرگوں سے سبقت لے گیا۔ ایک رقعے میں وہ خود لکھتا ہے کہ معاملات انصاف میں شہزادوں کو میں عام آدمیوں کے برابر سمجھتا ہوں۔ دن میں وہ تین بار دربار عام میں مسکراتا ہوا آتا تھا اور [illegible] کے

جاری کیا اتنا محتاط تھا کہ اس سے پہلے ۱۵۷۹ء میں اُس نے کامل اختیارات کی بنیاد رکھنے کے طور پر تمام علما سے ایک نہایت اہم دستاویز پر دستخط کرا کے اعلان کرایا کہ اکبر سلطانِ عادل ہے اور سلطانِ عادل کا مرتبہ ہر مجتہد سے بڑا ہے وہ جو کرے ہمیں منظور ہے کیوں کہ اس کا ہر کام فی الحقیقت اسلام کی ترقی کے لئے وقف ہوگا۔

جہان گیر کے بارہ فرمان مشہور ہیں۔ مسٹر کموسلہ لکھتے ہیں کہ انگلستان میں ۱۲۱۵ء کا منشورِ اعظم شاہ جون سے بڑی دقتوں کے بعد حاصل کیا گیا یہاں یہ منشور جہانگیر نے برضائے خود رعایا کی تشفی کے لئے جاری کر دیا جس میں اُن سب کی جائداد و مکانات اور غریب کسانوں کی اراضیات کے پورے تحفظ کی شاہی ضمانت موجود تھی اور اس کے علاوہ سراؤں مسجدوں شفاخانوں وغیرہ کے تعمیر و انتظام کے متعلق احکام موجود تھے۔

دستورِ حکومت کا کوئی خاص قانون نہ تھا۔ لیکن قوانین کا انحصار قرآن حدیث کے بعد زیادہ تر قیاس اور فتووں اور ملکی رسم و رواج پر اور صرف خاص ضرورت کے وقت شاہی فرامین پر ہوتا تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ ملک میں صرف ایک شاہنشاہ کی اندھا دھند حکومت ہرگز نہ تھی بلکہ شاہی اختیارات پر کئی قسم کی پابندیاں اور رعایا کی آزادی کے لئے کئی قسم کی ضمانتیں تھیں۔ اور ان حدوں سے تجاوز کرنے والے ظالم حکمران کا تخت دیر تک سلامت نہ رہ سکتا تھا۔

جانشینی کا جھگڑا اکثر بادشاہ کے مرنے پر اور بعض دفعہ اس سے پہلے ہی چھڑ جاتا تھا۔ اسلامی حکومتوں میں سب سے بڑا بیٹا تاج کا حقدار نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ خاندان کا سب سے لائق رکن۔ اس لیاقت کا فیصلہ مغلوں کے ہاں عموماً تلوار سے ہوتا تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ اکثر وہی حکمران تخت نشین ہوتا تھا جو سب سے زیادہ قابل ہو۔

غسل خانے کی مجلسِ شوریٰ کا ذکر ہو چکا ہے۔ بادشاہ عام طور پر اپنے وزیروں سے مشورہ کیا کرتا تھا جن میں چار وزیر زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ وکیل یعنی نائبِ سلطنت یا مشیرِ اعلیٰ دیوان یعنی وزیرِ مالیات، بخشی یعنی فوجی وزیر اور صدر یا صدر الصدور یعنی امورِ مذہبی کا وزیر۔

بادشاہ کے بعض خاص ذاتی اختیارات تھے مثلاً نوبت بجنا، جھروکے میں درشن دینا، جامع مسجد میں نماز کی امامت۔ بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا جانا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بادشاہ تحفے تحائف قبول کرتا اور انعامات اور خلعتیں تقسیم کرتا جس سے اس کے اور اُمرا کے درمیان یگانگت کا رشتہ قائم رہتا تھا۔ اُمرائے مغلیہ حکومت کے اعیانِ سلطنت تھے۔ اُنہیں سے نظم و نسق تھا۔ مسلمان اُمرا ایرانی تورانی اور افغان تھے لیکن ان کے علاوہ ہندو اُمرا بھی تھے۔ ہر مغل امیر ایک فوجی افسر ہوتا تھا۔ اکبر نے منصب داری نظام جاری کیا یعنی سرکاری ملازموں کے مختلف درجے مقرر کئے گئے جو دہ باشی یعنی دس سپاہیوں کی سرداری سے شروع ہو کر دہ ہزاری تک پہنچتے تھے۔ ان میں ہفت سے دہ ہزاری تک کے منصب عموماً شاہی خاندان کے لئے وقف ہوتے تھے۔ ضرورت کے وقت سب منصب دار اور اُمرا اپنی اپنی فوجوں سے بادشاہ کی مدد کرتے تھے۔ فوج کے الگ الگ شعبے قائم تھے سب سے مقدم سواروں کی فوج تھی اس کے بعد توپ خانے اور پیادوں کی باری آتی تھی۔ اکبر خود اپنی نگرانی میں توپیں ڈھلوایا کرتا تھا۔ اُمرا کو جاگیریں دی جاتی تھیں لیکن یہ جاگیریں موروثی نہ ہوتی تھیں۔ کوئی مغل امیر وراثتاً اپنے باپ کے منصب پر فائز نہ ہو سکتا تھا بلکہ اُسے گویا اپنے پسینے سے عزت اور مرتبہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا ایک نتیجہ نکلا کہ مغلیہ عظمت کے زمانے میں مغلیہ اُمرا میں ہمت و شجاعت کے اوصاف پائے جاتے تھے اور وہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بڑے بڑے کام کر دکھاتے تھے۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ اُمرا ہمیشہ بادشاہ کے دست نگر رہے اور یورپ کے اُمرا کی طرح اس کے مقابل میں ایک خاص جماعت نہ بنا سکے۔ بعد کے مغلیہ امرا عیش و عشرت میں پڑ کر ذلیل ہو گئے۔ وہ خود بھی ڈوبے اور سلطنت کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے۔

مغلوں نے ہندوستان کا خاطر خواہ انتظام کیا۔ اُنہوں نے ملک کو بیرونی حملوں سے بچایا بیرونی ممالک سے تعلقات بڑھائے امن و امان قائم رکھا جرائم کا انسداد کیا اخلاقِ عامہ کو جلا دی۔ جان و مال کی حفاظت کا بندوبست کیا عدل و انصاف کا سکہ جاری کیا [illegible]
[illegible] تجارت، صنعت، ذرائع آمد و رفت [illegible]

کا مفت علاج ہوتا تھا۔ ۰۰۰،۲ مسجدیں تھیں اور خانقاہوں اور حماموں کا کوئی شمار نہ تھا۔[1]

سڑکوں کے بننے اور نہروں کے کھُدنے سے تجارت اور زراعت کو ترقی ہوئی۔ ہندوؤں کو آہستہ آہستہ معزز عہدے ملنے لگے اور حاکمی محکومی کے امتیاز میں وہ سختی نہ رہی۔

فنِ تعمیر نے ترقی اور وسعت حاصل کی اور "پٹھان" طرزِ تعمیر میں عرب طرز اور ہندو طرز کی خوش نما آمیزش نظر آنے لگی۔ قطب مینار قصر ہزار ستون علائی دروازہ اس کے نمونے ہیں۔ تغلقوں کے وقت میں آرائش کی جگہ سادگی اور عظمت پر زور دیا جانے لگا جیسا کہ تغلق آباد کے کھنڈروں سے ظاہر ہے۔ چھوٹی ریاستوں میں جون پور کی اٹالا مسجد بنگال کے بارہ سونا مسجد بیجاپور کے کتب خانے گول کنڈہ کا قلعہ اودھیاں گیر کا وٹھل مندر اس زمانے کی خوبصورت یادگاریں ہیں۔ نقاشی کی ترقی اس زمانے میں مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی وجہ سے رُکی رہی۔ علم و ادب کا مسلمانوں کو شوق تھا۔ اُنہوں نے تاریخیں لکھیں۔ سنسکرت سیکھی اور دیسی زبانوں کی نشو و نما میں بڑا حصہ لیا۔ ہندی، بنگالی، مرہٹی، تامل، پنجابی نے ترقی پائی اور ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان اُردو کی بنیاد پڑی اور وہ ہندوستان میں جگہ جگہ پھیلنے لگی۔

اسلام اور ہندو مت کا ایک دوسرے پر اثر ہوا۔ باوجود اس کے کہ اسلام مساوات کا مذہب تھا مسلمانوں کی بھی نسل کے اعتبار سے شیخ، سید، مغل، پٹھان چار مختلف ذاتیں بن گئیں اور مذہبی عقیدے کے لحاظ سے وہ سنی شیعہ میں تقسیم ہو گئے۔ اولیاؤں کے مزاروں پر چڑھاوے چڑھانے اور منتیں ماننے کا رواج ہو گیا بعض مسلمان بادشاہوں اور امرا نے جو ہندو عورتوں سے شادیاں کیں اس سے مسلمانوں میں بعض ہندوانہ رسوم کا رواج ہونے لگا۔ اس زمانے میں اِدھر مسلمانوں میں صوفیوں اور دوسرے مذہبی پیشواؤں نے اپنے سلسلے قائم کئے اور ہندوستان کے کونے کونے میں اسلام پھیلایا اور اُدھر ہندوؤں میں زیادہ تر اسلام کے اثر سے کئی مذہبی مصلح پیدا ہوئے جنہوں نے ہندو مت میں فضول رسمیں دُور کر کے سادگی پیدا کرنے انسانوں کی ایک عام برادری قائم کرنے اور خدا کا عقیدہ رائج کرنے کی کوشش کی وہ رام یا کرشن کو خدا کا اوتار سمجھتے تھے۔ اُن کا اعتقاد تھا کہ انسان کو صرف خدا کے فضل و کرم سے نجات مل سکتی ہے۔ یہ بھکتی کی تحریک تھی۔ رامانج رامانند اور چیتنیہ ان خیالات کے نام لیوا تھے۔ نام دیو کبیر اور نانک وغیرہ کی تعلیم میں اسلام کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

ایسی تھی مغلوں سے پہلے مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں ہندوستان کی حالت۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زمانہ اتنا تاریک نہ تھا جتنا بعض لوگوں نے اسے ظاہر کیا ہے۔ ایک باقاعدہ منظم حکومت تھی جس کے زیر سایہ دو قطعاً مختلف تہذیبیں نشو و نما پا رہی تھیں اور ایک دوسری پر اپنا اثر ڈال رہی تھیں۔ حکمرانوں میں اکثر تبدیلیاں ہوتی تھیں لیکن ان کا اثر لوگوں پر بہت کم ہوتا تھا کیوں کہ ہر حکمران خاندان میں کوئی نہ کوئی زبردست دُور اندیش حاکم نکل آتا تھا جو امن و امان قائم کر کے رفاہِ عام کے امور میں دل چسپی لیتا تھا۔ بیرونی حملہ آوروں سے ملک محفوظ تھا۔ تجارت، زراعت، تعمیر، علوم و فنون وغیرہ زندگی کے وہ شعبے تھے جن میں ہندو و مسلمان مل کر کام کرتے تھے اور اس سے بتدریج **ایک مشترک تمدن کی بنیادیں** قائم ہو رہی تھیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں نے اپنی کتاب تاریخ ہند میں لکھا ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دہلی سلطنت کے کارناموں نے مغلوں کے شان دار عہد کے لئے راستہ صاف کر دیا۔

مغلوں کے ہندوستان میں آنے سے اس ملک کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلاطینِ دہلی نے وہ بنیادیں کھودیں جن پر **مغلیہ تہذیب** کا عظیم الشان محل تعمیر ہوا۔

مغل کم و بیش تین سو سال تک ہندوستان پر حکومت کرتے رہے اور اس عرصے میں اُنہوں نے ہندوستان کے تمدن کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیا وہ رنگ جو ابھی تک کم از کم شمالی ہندوستان کے باشندوں کے دل و دماغ پر چڑھا ہوا ہے۔ لباس، زبان، گفتگو، طرزِ معاشرت، ان سب باتوں میں گو ہماری زندگی مغربی تہذیب سے متاثر ہوئی ہے لیکن اِن کی بنیاد ابھی تک مغلئی تہذیب میں قائم ہے اور یہی وہ بنیاد ہے

---

[1] اسلامی ہند (رسالہ نگار لکھنؤ جون تا اکتوبر ۱۹۳۸ء)

ہندوستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر

(۲)

(مسلمانوں کا تمدّن)

(گذشتہ سے پیوستہ)

اب ہم ہندوستان میں مسلمانوں کے تمدن پر ایک نظر دوڑاتے ہیں۔

پہلے نام نہاد پٹھان بادشاہوں کا زمانہ آتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے ہندوستان کی کایا پلٹ گئی۔ شمالی ہند کی ہندو حکومتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ راجپوتوں کی طاقت ٹوٹ جانے سے برہمنوں کے قدیم علمی مرکز اُجڑ گئے۔ وہ شمال سے جنوبی ہند کی طرف چل دیئے جہاں آریائی اور غیر آریائی تمدن میں ملاپ ہوکر ہندو تہذیب نے فروغ پایا۔ اُدھر مفتوحہ علاقے کے باشندے حملہ آوروں سے منہ پھیر کر ایک عرصہ اُن سے الگ تھلگ رہے۔ ذاتوں کی بندشیں اور زیادہ سخت ہوگئیں عورتوں کے لئے پردے کا دستور عام ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ اسلام کے اثر سے ہندومت میں اصلاح ہونے لگی اور باوجود محکومی کے ہندوؤں کی معاشرتی حالت سدھرنے لگی۔ دونوں تہذیبوں نے ایک دوسرے پر اثر پیدا کیا اور ایک مشترک تہذیب کی ابتدا کے آثار نظر آنے لگے۔

جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں سلاطین دہلی کے اُن پانچ مسلمان خاندانوں میں جنہوں نے ۱۱۹۳ء سے ۱۵۲۶ء تک سوا تین سو سال تک ہند میں حکومت کی نیز اُن چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں جو وسطی و جنوبی ہند میں قائم ہوگئی تھیں بعض نکتہ رس اور روشن خیال حکمران پیدا ہوئے جنہوں نے علاوہ امن و امان قائم کرنے کے ملک میں ایک عمدہ نظم و نسق جاری کیا اور رفاہِ عام کے بڑے بڑے کام سرانجام دیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض سلاطین ظالم اور بے رحم تھے، کئی بار خانہ جنگی کا بازار بھی گرم ہوا مگر بہت سے حکمران حکمرانی کے اہل اور رعایا کے سچے بہی خواہ بھی تھے۔

عام طور پر دہلی کی حکومت ایک فوجی سی مطلق العنان حکومت تھی لیکن جس طرح ہندو ریاستوں میں اکثر برہمنوں کے اثر سے بادشاہ کے استبداد کی روک تھام ہوتی رہی اسی طرح اِن مسلمان حکومتوں میں بھی اُمرا اور علما کا اثر عموماً نمایاں ہوتا تھا اور بعض صورتوں میں یہ اثر بہت مفید ثابت ہوا۔ سلطنت کے انتظام کا یہ سلسلہ تھا کہ چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں تقسیم تھی ہر جاگیردار اس کی حالت میں اپنے علاقے میں وسیع اختیارات رکھتا تھا اور ضرورت کے وقت بادشاہ کو اپنی فوج سے مدد دیتا تھا۔ جاگیری نظام ایک مضبوط بادشاہ کے وقت میں مفید اور کمزور بادشاہوں کے زمانے میں ملک میں خانہ جنگی اور سرکشی کا ذریعہ بن جاتا تھا۔ دیہات میں گو پنچایتیں کمزور پڑ گئیں پھر بھی وہاں کی زندگی پر حکومتوں کے بننے اور بگڑنے کا چنداں اثر نہ ہوتا تھا۔ اور وہ اپنے ہزاروں سال کے پرانے طریقوں پر بدستور چلتی رہی۔

عدل و انصاف کے سلسلے میں بادشاہ اعلیٰ ترین عدالت کا کام دیتا تھا اور اس کے نیچے قاضیوں اور مفتیوں کی عدالتیں تھیں۔ فوجداری کا قانون سخت تھا لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوؤں کے مقابل میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جاتی تھی۔ محمد تغلق کی بابت ابن بطوطہ نے بیان کیا ہے کہ ایک بار کسی ہندو امیر نے قاضی کے ہاں نالش کی کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بے سبب قتل کرڈالا ہے۔ قاضی نے سلطان کو طلب کیا چنانچہ وہ گیا اور قاضی کو سلام کرکے کھڑا ہوگیا۔ جب قاضی نے بیٹھنے کی اجازت دی تو بیٹھا اور اس وقت تک عدالت سے باہر نہ گیا جب تک مدعی راضی نہیں ہوگیا۔

[illegible] بادشاہ [illegible] میں دہلی کا یہ حال تھا کہ یہاں چھوٹے بڑے مدارس ایک ہزار کے قریب [illegible] تھے [illegible]

"سٹیٹسمین" کے نامہ نگار نے ایک ایسے قلی کا ذکر بھی کیا ہے جو تنہا بارہ سے پندرہ میل تک ٹرالی کو بہ آسانی دھکیل سکتا تھا۔

شہد کے طبّی خواص

آیورویدک اور یونانی نقطۂ نظر سے شہد کا استعمال بہت سی بیماریوں میں مفید ہے۔ شہد زکام اور کھانسی سے بچاتا ہے۔ اس کا استعمال کرنے والے بخار میں مبتلا نہیں ہوتے۔ دکھتی آنکھوں کے لئے بھی شہد مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے سیسے یا شیشے کی سلائی شہد میں ڈبو کر اُسے سرمے کی طرح آنکھوں میں لگانا چاہئے۔ شہد ملیّن معدہ اور مصفّی خون ہے۔ یوروپین ڈاکٹروں نے بھی شہد کو مختلف بیماریوں میں بہت مفید بتایا ہے۔ ایک ڈاکٹر اسے خرابیٔ غذا کے بدترین مریضوں کے لئے جو دل کی کمزوری میں بھی مبتلا ہوں اپنے تجربے کی بنا پر مفید بتاتا ہے۔ اسی ڈاکٹر نے نمونیا کے ایک مریض پر شہد کا تجربہ کر کے اسے مفید پایا۔ یہی ڈاکٹر کہتا ہے کہ جب جسم میں سے شکر کا ذخیرہ دفعۃً ختم ہو جائے تو عام جسمانی قوت کو بحال کرنے کے لئے اور بالخصوص دل کو تقویت دینے کے لئے شہد کا استعمال کرنا چاہئے۔ دوسرے ڈاکٹروں نے ان باتوں کی تصدیق کی ہے۔ بعض اور ڈاکٹروں نے شہد کو ہاضمے کی خرابی کے لئے مفید بتایا ہے۔ ایک ڈاکٹر کا قول ہے کہ شہد معدے اور آنتوں کے بہ ظاہر ناقابلِ علاج زخموں کے لئے بھی مفید ہے۔

شہد کے متعلق ایک اور بات قابلِ لحاظ ہے۔ اس میں اگر ٹائیفائیڈ بخار اور پیچش وغیرہ کے جراثیم داخل کئے جائیں تو وہ فوراً مر جاتے ہیں۔ گویا شہد کو ہم طبّی نقطۂ نظر سے محفوظ ترین غذا سمجھ سکتے ہیں۔

ایک ڈاکٹر کے اندازے کے مطابق سات آؤنس شہد میں اتنی ہی غذائیت ہوتی ہے جتنی :—

۲½ پاؤنڈ	دودھ میں
۵، ۶ آؤنس	بالائی کے پنیر میں
۱۲ آؤنس	گائے کے گوشت میں
۱۵ آؤنس	کوڈ مچھلی میں
۸ عدد	نارنگیوں میں
۱۰ عدد	انڈوں میں

ہندوستان کے باشندے جنگی رقبوں میں

"سدرن انڈیا کامرس" کے ایک مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ہندوستانی مختلف جنگی رقبوں میں گھر گئے ہیں ان کی تعداد کچھ کم نہیں۔ ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوگا کہ کس سال کے تخمینے کے مطابق کس علاقے میں کتنی آبادی تھی۔

سال	علاقہ	ہندوستانی آبادی	سال	علاقہ	ہندوستانی آبادی
سنہ ۱۹۳۱ء	ہانگ کانگ	۴۷۴۵	سنہ ۱۹۳۲ء	سلطنت متحدہ	۷۱۲۸
سنہ ۱۹۳۶ء	برطانی ملایا	۷۵۴۸۴۹	سنہ ۱۹۳۳ء	مالٹا	۴۱
سنہ ۱۹۳۶ء	جزائر فجی	۸۹۳۳۳	سنہ ۱۹۳۰ء	شرق الہند ولندیزی	۲۷۶۳۸
سنہ ۱۹۳۳ء	آسٹریلیا	۲۴۰۴	سنہ ۱۹۳۱ء	تھائی لینڈ	۵۰۰۰
سنہ ۱۹۳۲ء	نیوزی لینڈ	۱۱۶۱	سنہ ۱۹۳۱ء	ہند چینی	[illegible]
سنہ ۱۹۳۱ء	برطانی شمالی بورنیو	۱۲۹۸	سنہ ۱۹۳۱ء	جاپان	۳۰۰
سنہ ۱۹۳۶ء	عدن	۸۱۶۸	سنہ ۱۹۳۲ء	عراق	۲۵۹۴
سنہ ۱۹۳۱ء	برطانی صومالی لینڈ	۵۲۰			

برما کے ۱۴ لاکھ ہندوستانی اوپر کے نقشے میں شامل [illegible]

[illegible]

سٹیٹسمین کے نامہ نگار نے ایک ایسے قلی کا ذکر بھی کیا ہے جو تنہا بارہ سے پندرہ میل تک ٹرالی کو بہ آسانی دھکیل سکتا تھا۔

شہد کے طبّی خواص

آیورویدک اور یونانی نقطۂ نظر سے شہد کا استعمال بہت سی بیماریوں میں مفید ہے۔ شہد زکام اور کھانسی سے بچاتا ہے۔ اس کا استعمال کرنے والے بخار میں مبتلا نہیں ہوتے۔ دکھتی آنکھوں کے لئے بھی شہد مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے سیسے یا شیشے کی سلائی شہد میں ڈبو کر اُسے سرمے کی طرح آنکھوں میں لگانا چاہئے۔ شہد ملیّن معدہ اور مصفّیٔ خون ہے۔ یوروپین ڈاکٹروں نے بھی شہد کو مختلف بیماریوں میں بہت مفید بتایا ہے۔ ایک ڈاکٹر اسے خرابیٔ غذا کے بدترین مریضوں کے لئے جو دل کی کمزوری میں بھی مبتلا ہوں اپنے تجربے کی بنا پر مفید بتاتا ہے۔ اسی ڈاکٹر نے نمونیا کے ایک مریض پر شہد کا تجربہ کر کے اسے مفید پایا۔ یہی ڈاکٹر کہتا ہے کہ جب جسم میں سے شکر کا ذخیرہ دفعتہً ختم ہو جائے تو عام جسمانی قوت کو بحال کرنے کے لئے اور بالخصوص دل کو تقویت دینے کے لئے شہد کا استعمال کرنا چاہئے۔ دوسرے ڈاکٹروں نے ان باتوں کی تصدیق کی ہے۔ بعض اور ڈاکٹروں نے شہد کو ہاضمے کی خرابی کے لئے مفید بتایا ہے۔ ایک ڈاکٹر کا قول ہے کہ شہد معدے اور آنتوں کے بہ ظاہر ناقابلِ علاج زخموں کے لئے بھی مفید ہے۔

شہد کے متعلق ایک اور بات قابلِ لحاظ ہے۔ اس میں اگر ٹائیفائڈ بخار اور پیچش وغیرہ کے جراثیم داخل کئے جائیں تو وہ فوراً مر جاتے ہیں۔ گویا شہد کو ہم طبی نقطۂ نظر سے محفوظ ترین غذا سمجھ سکتے ہیں۔

ایک ڈاکٹر کے اندازے کے مطابق سات آونس شہد میں اتنی ہی غذائیت ہوتی ہے جتنی :—

۲ ½ پاؤنڈ	دودھ میں
۶، ۵ آونس	بالائی کے پنیر میں
۱۲ آونس	گائے کے گوشت میں
۱۵ آونس	کوڈ مچھلی میں
۸ عدد	نارنگیوں میں
۱۰ عدد	انڈوں میں

ہندوستان کے باشندے جنگی رقبوں میں

"سن انڈیا کامرس" کے ایک مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ہندوستانی مختلف جنگی رقبوں میں گھر گئے ہیں اُن کی تعداد کچھ کم نہیں۔ ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوگا کہ کس سال کے تخمینے کے مطابق کس علاقے میں کتنی آبادی تھی۔

سال	علاقہ	ہندوستانی آبادی
۱۹۳۱ء	ہانگ کانگ	۴۷۴۵
۱۹۳۶ء	برطانی ملایا	۷۵۴۸۴۹
۱۹۳۶ء	جزائرِ فجی	۸۹۳۳۳
۱۹۳۳ء	آسٹریلیا	۲۴۰۴
۱۹۳۲ء	نیوزی لینڈ	۱۱۶۱
۱۹۳۴ء	برطانی شمالی بورنیو	۱۲۹۸
۱۹۳۶ء	عدن	۸۱۶۸
۱۹۳۱ء	برطانی صومالی لینڈ	۵۲۰
۱۹۳۲ء	سلطنت متحدہ	۷۱۲۸
۱۹۳۳ء	مالٹا	۴۱
۱۹۳۰ء	شرق الہند ولندیزی	۲۷۶۳۸
۱۹۳۱ء	تھائی لینڈ	۵۰۰۰
۱۹۳۱ء	ہند چینی	[illegible]
۱۹۳۱ء	جاپان	۳۰۰
۱۹۳۲ء	عراق	۲۵۹۹

برما کے ۱۴ لاکھ ہندوستانی اس کے نقشے میں شامل [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جہاں نما

موجودہ مصر

قاہرہ یونیورسٹی کے پروفیسر ادبیات ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ایشیاٹک ریویو میں موجودہ مصر کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے ذیل کے خیالات کا اظہار کیا ہے :-

ہماری قومی آزادی نے اب زیادہ پائدار صورت اختیار کرلی ہے اور دوسری قوموں سے ہمارے تعلقات روز بروز استوار ہو رہے ہیں۔ مصر کو مدت کے بعد ایسی آزادی، خودمختاری اور خوش حالی نصیب ہوئی ہے۔ اس آزادی و خودمختاری کا اظہار ہماری موجودہ ذہنی زندگی میں بھی نمایاں ہے۔ مصر کی تاریخ میں ایسا کوئی دَور نہیں آیا جب آج کل کی طرح حکومت نے عوام کی تعلیم کا فرض اپنے ذمے لیا ہو اور لوگ قانوناً اس بات پر مجبور ہوں کہ اپنے بچوں اور بچیوں کو ایک خاص مقررمعیار تک تعلیم دلوائیں۔ مصر کی تاریخ میں اس سے قبل کوئی ایسا دَور بھی نہیں آیا جب تعلیم کا ہر شعبہ عوام کے لئے کھلا ہو اور حکومت کے خرچ سے غریب لوگ بھی امیروں ہی کی طرح تعلیم حاصل کرسکیں۔ مصر کے ہر گاؤں میں اب کم ازکم ایک پرائمری سکول اور ہر قصبے میں کم ازکم ایک ہائی سکول ضرور موجود ہے۔ قاہرہ میں مشہورِ عالم مذہبی یونیورسٹی ازہر کے علاوہ ایک جدید مصری یونیورسٹی بھی قائم ہے جہاں تمام نئے علوم کی نئے یورپی طریقوں کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں متعدد صنعتی مدارس بھی کھل گئے ہیں اور جامعۂ ازہر کی شاخیں بھی جا بجا قائم ہیں۔ ایک اور نئی یونیورسٹی سکندریہ میں قائم ہورہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قدیم زمانے میں بھی سکندریہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ مصر میں جامعۂ ازہر اور اسلامی سلاطین کے قائم کردہ مدارس بھی موجود تھے لیکن تعلیم کا جو عام چرچا مصر میں آج کل ہے اور اس کے لئے جو وسیع ذرائع آج کل مہیا کر دیئے گئے ہیں ان کی مثال پہلے کسی زمانے میں نہیں ملتی۔ موجودہ مدارس کی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ دراصل ایک بہت بڑے تعلیمی منصوبے کا پیش خیمہ ہیں جس کے اثرات بہت وسیع اور دُور رس ہوں گے۔

مصر آج کل میدانِ جنگ بنا ہوا ہے لیکن مصریوں نے اس جنگ میں عملی حصہ نہیں لیا۔ وہ خاموشی سے اپنے تعلیمی و تمدنی منصوبوں کو جامۂ عمل پہنا رہے ہیں۔

معاہدۂ مصر و برطانیہ کی تشریح

نحاس پاشا کی حکومت نے موجودہ جنگ میں اتحادیوں کے مقاصد سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے مصر کی غیر جانب داری کو برقرار رکھنے کے لئے معاہدۂ مصر و برطانیہ کی تشریح کرتے ہوئے کہا :-

موجودہ جنگ ایک عالمگیر انقلاب ہے اور مصر کے مقاصد کے حصول کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اُس معاہدے پر پورا اعتماد رکھیں جس پر ہم نے اپنی قومی آزادی ...... کو برقرار رکھنے کے لئے برضا و رغبت دستخط ثبت کئے تھے .... معاہدۂ مصر و برطانیہ کا معاہدہ مصر کو برطانیہ کے لئے جنگ کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔ معاہدے میں متعلقہ فقرے یہ ہیں: "اگر فریقین میں سے کوئی فریق جنگ میں اُلجھ جائے تو دوسرا فریق ایک اتحادی کی حیثیت سے فوراً اُس کی مدد کرے گا .... اعلیٰ حضرت شاہ مصر ہز میجسٹی کنگ امپرر کو مصر کی سرزمین پر تمام ممکن امداد اور آسانیاں بہم پہنچائیں گے جن میں بندرگاہوں، ہوائی اڈّوں اور

فہرستِ مضامین

جلد ۴۲ — نمبر ۳

"ہمایوں" بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۲ء

ضروری اطلاع:- جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ ان کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت [illegible] ہے [illegible] کتابت کا [illegible] نا مقبول مضامین [illegible] نہیں بھیجے جائیں گے۔

چندہ سالانہ ۔۔۔۔ ششماہی [illegible] ۔۔۔۔ قیمت فی پرچہ ۸ ۔۔۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۳۹۲

قواعد

۱ - "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲ - علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں ۔
مسودے کا نہایت صاف اور خُوش خط ہونا مضامین کی قبولیت کی پہلی شرط ہے ۔

۳ - دِل آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ۔

۴ - جواب طلب امُور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ، اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے بصُورتِ دیگر دفتر "ہمایُوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیئے جائیں گے ۔

۵ - "ہمایُوں" کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ جانی چاہئے ۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ صرف قیمتاً مِل سکتا ہے ۔

۶ - منی آرڈر اور خط و کتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو چِٹ پر پتے کے اُوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہئے ۔ بصُورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی ۔

۷ - چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصُول ڈاک)، قیمت فی پرچہ آٹھ آنے ۔

مینیجر "ہمایُوں"

۳۲ - لارنس روڈ - لاہور

یہ کتاب بہت ضروری معلومات پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی جو کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ حجم ۶۸ صفحات قیمت ۱۲ار

پتا:- پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب عثمانیہ یونیورسٹی (شعبۂ اقتصادیات) حیدر آباد دکن۔

دُردانہ یہ آنسہ محمودہ صاحبہ رضویہ کے مختصر لطیف مضامین کا مجموعہ ہے جسے ایس جی کاروانی صاحب ایم۔اے نے مرتب کیا ہے۔ حجم ۹۶ صفحات قیمت ۱۲ر

پتا:- انجمن ترقی اُردو رام باغ کراچی۔

مشغلے از سید وقار احسن صاحب۔ یہ کتاب نوجوان تعلیم یافتہ لڑکوں کے لئے اس خیال سے لکھی گئی ہے کہ وہ دورانِ تعلیم میں یہ طے کر لیں کہ تعلیم کے بعد انہیں کون سا مشغلہ اختیار کرنا ہے۔ اس کتاب میں حسبِ ذیل مشاغل کے متعلق نہایت دلچسپ انداز میں معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں:- سول سروس، کونسل کی ممبری، جہازرانی، تجارت، وکالت، ڈاکٹری، انجنیئری، صحافت، معلمی، فوجی خدمت، زمینداری اور ہوابازی۔ احسن صاحب کی یہ جدت بہت قابلِ قدر ہے۔ انہوں نے یہ کتاب لکھ کر قوم کے نوجوانوں کی بہترین خدمت انجام دی ہے قیمت ۱۲ار

پتا:- جعفری برادرز الہ آباد (یو۔پی)

ہندوستانیوں کی مختصر تاریخ مصنفہ ایچ۔ جی۔ رالنسن، سی۔ آئی۔ ای۔ ایم۔اے۔ فیلو آف ہسٹاریکل سوسائٹی۔ آئی۔ ای۔ ایس (ریٹائرڈ) مترجمہ و مرتبہ مسٹر پو لچند ایم۔اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لنڈن) پروفیسر سیاسیات بنارس ہندو یونیورسٹی۔

عام تاریخوں میں ملک کے لوگوں کی تاریخ بہت کم بیان کی جاتی ہے اس کتاب میں یہ خوبی ہے کہ اس میں جہاں سلطنتوں اور بادشاہوں کے حالات ملتے ہیں وہاں ہندوستان میں بسنے والوں کے تہذیب و تمدن اور دیگر حالات پر بھی قابلِ قدر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تاریخ اس قابل ہے کہ مدارس کے نصابِ تعلیم میں شامل کی جائے۔ حجم ۷۰۰ صفحات سے زائد۔ قیمت مجلد ۶ر

پتا:- آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی۔

لائبریری اور اس کی تنظیم مصنفہ سید سجاد حسین صاحب رضوی ڈی۔ ایل۔ ایس۔ سی۔ لائبریرین امیرٹھ کالج۔ اس کتاب میں کتابوں کی فہرستیں تیار کرنے کے مختلف طریقے، طریقۂ تقسیم کتب، طریقۂ انتخاب کتب اور اجراء و واپسیٔ کتب کے متعلق مفید ہدایات درج ہیں۔ امید ہے کہ اس کتاب کی قدر کی جائے گی۔

حجم ۱۹۰ صفحات۔ کاغذ دبیز۔ قیمت مجلد ۴ر

پتا:- رستوگی اینڈ کمپنی، پبلشرز میرٹھ

گنج ہائے گرانمایہ از پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ملک کی بعض مشہور شخصیتوں مثلاً مولانا محمد علی، علامہ اقبال، ڈاکٹر انصاری وغیرہ کے حالات جن سے پروفیسر صاحب کے ذاتی تعلقات رہے ہیں دلچسپ اور مؤثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ کردار نگاری کا اچھا نمونہ ہے۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ آٹھ آنے (مجلد)

ملنے کا پتہ:- اُردو اکاڈمی۔ لوہاری دروازہ۔ لاہور

ب

دھڑکنیں احمد ندیم قاسمی صاحب کے قطعات کا مجموعہ ہے۔ بعض قطعات میں جواں فکر شاعر کی دیہاتی زندگی سے وابستگی کا نہایت کامیاب طور پر اظہار کیا گیا ہے۔ مختصر نظموں اور قطعات و رباعیات کی طرف ہمارے جواں سال شاعروں کا رجحان اُردو ادب کے لئے مفید ہے۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب نے اس کتاب پر دیباچہ لکھا ہے۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ چار آنے (مجلد)

اُردو اکاڈمی۔ لوہاری دروازہ۔ لاہور سے طلب کیجئے۔

ب

تعلیمی کھیلوں کی کتاب یہ کتاب ریونڈ ڈبلیو۔ ایم۔ راشبرن اور پنڈت ہنسراج نے لکھی ہے۔ اس میں بچوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے بہت سے دلچسپ کھیل تجویز کئے گئے ہیں۔ ہماری رائے میں اس کتاب سے والدین اور معلموں کو ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے۔ قیمت ۶ر

پتا:- پنڈت ہنسراج سینئر ورنیکلر ٹیچر۔ کرسچن ہائی سکول کھرڑ۔ ضلع انبالہ

مطبوعات

نشریات یہ پروفیسر ہارون خاں شروانی (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن) کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً حیدرآباد کی نشرگاہ سے نشر کیں۔

بعض تقریروں کے عنوان یہ ہیں۔ چین کا تمدن، بین الاقوامی سیاسیات، زلزلۂ اناطولیہ، روزہ، انڈیا نوبل ترکی، عالمی وفاق کا مسئلہ، سیاسیات اور اردو زبان وغیرہ مضامین پر از معلومات ہیں اور زبان اور انداز بیان اچھا ہے۔ قیمت ۱۲؍

پتا:- سید عبدالقادر اینڈ سنز تاجران کتب چار مینار حیدرآباد دکن۔

جواہر العلوم علامہ طنطاوی جوہری مصری کی عربی کتاب جواہر العلوم کا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ از مولانا عبدالرحیم صاحب مولوی فاضل پروفیسر عربی اسلامیہ کالج پشاور۔ کتاب مشہور ہے اور ترجمہ بہت اچھا ہے۔ حجم ۱۳۱ صفحات۔ بڑی تقطیع۔ قیمت ۱۲؍

پتا:- کتابستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۴ بمبئی نمبر ۳

۱۔ شان خدا } پہلی کتاب میں وجود خالق کے تمام نظریوں پر جدید علم کلام اور سائنس کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور خدا کی ہستی کو ثابت کیا گیا ہے۔
۲۔ محمد رسول اللہ } دوسری کتاب کارلائل کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ کارلائل کی جس کتاب سے یہ ترجمہ لیا گیا ہے بہت مشہور ہے۔ اور یہ کی دونوں کتابوں کے مؤلف اور مترجم مولانا عبیدالرحمان عاقل رحمانی ہیں۔ ہر مسلمان کو ان کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

پتا:- کتابستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۴ بمبئی نمبر ۳

کشمش نانی ادارۂ ادبیات اردو نے بچوں کی کہانیوں کے سلسلے میں یہ دل چسپ اور مفید کتاب شائع کی ہے۔ بچوں کی دل چسپی کی بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ کہانیوں کے اس سلسلے کی نگراں محترمہ رقیہ بیگم صاحبہ بی۔ اے (کنٹب) اپرنسپل کلیۂ اناث جامعہ عثمانیہ ہیں۔ اس کتاب کی قیمت دس آنے اور حجم ۷۰ صفحات ہے۔ پتا:- ادارۂ ادبیات اردو۔ حیدرآباد دکن

گارساں دتاسی اور اس کے ہمعصر بہی خواہان اردو اردو کے پہلے پروفیسر فرانس کے مشہور مستشرق گارساں دتاسی کے علمی و ادبی کارناموں، طریقۂ تعلیم، تلامذہ، کتب خانے، اردو کی حمایت و تبلیغ کی کوشش اُس کے عہد کی یورپی درسگاہوں اور اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں پر اجمالی تبصرہ از ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی (لندن)۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت ۸؍

پتا:- سب رس کتاب گھر۔ حیدرآباد دکن۔

ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۴۱ء میں یہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے کام کی سالانہ رپورٹ ہے۔ ارکان ادارہ جس جوش اور انہماک سے اردو زبان کی عملی خدمت کر رہے ہیں وہ اس بات کی متقاضی ہے کہ اہل اردو ادارہ کی بیش از بیش سرپرستی کریں اور اس کی مفید کتابوں کی خریداری اور ان کی نشر و اشاعت میں خاص حصہ لیں۔

کلچیں یہ حکیم نیر احمد خاں گلچیں کا مجموعۂ کلام ہے۔ زیادہ تر نظمیں قومی اور ملی ہیں۔ حکیم صاحب کے اشعار میں جوش اور صداقت کی کمی نہیں۔ قیمت ۱۲؍

پتا:- اردو اکیڈیمی۔ لاہور

شیخ و برہمن اور دوسرے افسانے یہ مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی کے سولہ دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے جو ۱۳۱ صفحے کی ایک دیدہ [illegible] کتاب کی صورت میں مجلد شائع ہوا ہے۔ "یہ کہانیاں دولت کے ہندو مسلمانوں کی اس یکجہتی کا [illegible] ہیں جو ابھی تک شیخ و برہمن کی آویزشوں سے آلودہ نہیں ہو سکی"

پتا:- کتب خانہ عظیم عل امین آباد پارک لکھنؤ۔

تسہیل الترتیل صحت قرآن کے متعلق ترتیل کی عام فہم تشریح مولفہ الحاج سید حافظ محمد الیاس برنی صاحب ایم۔ اے ایل ایل بی (علیگ)

کی پیر و مرشد نے بحال ارشاد فرمایا میر عمارت بہت جلد پاڑ کھلوا دیں گے۔ چوں کہ مسجد کے صحن میں بچے ہوئے ہزاروں پتھر رکھے ہیں اور ایک لاکھ بلیوں کی پاڑ ہے۔ جامع مسجد کی پشت پر سو قدم تک پاڑ بندھی ہوئی ہے اور اسی طرح شمال اور جنوب اور شرق میں بھی بہت دور تک بلیاں بندھی ہوئی ہیں ان کا کھولنا اور بلیوں کو وہاں سے ہٹانا اور صحن کے پتھروں کا باہر لے جانا یہ کام یقیناً بہت دیر کا ہے۔

مگر مثل مشہور ہے کہ راج ہٹ۔ تریا ہٹ۔ بالک ہٹ۔ یعنی بچوں میں بھی ضد ہوتی ہے عورتوں میں بھی ضد ہوتی ہے اور بادشاہ بھی ضد کیا کرتے ہیں۔ اس واسطے شاہ جہاں بادشاہ کو وزیر کی بات سن کر ضد پیدا ہوئی اور انہوں نے غصے کے لہجے میں فرمایا دیکھو آج بدھ ہے۔ پرسوں جمعہ کی نماز ہم نئی جامع مسجد میں پڑھیں گے وزیر نے بادشاہ کے تیور بگڑے ہوئے دیکھے تو وہ قدموں کی طرف جھکا اور اس نے ادب کے ساتھ عرض کی خدا حضور کے اقبال کو سلامت رکھے۔ فدوی ابھی انتظام کرتا ہے۔ جہاں پناہ پرسوں جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا فرماسکیں گے۔ وزیر کی یہ بات سن کر ہنسی آگئی اور انہوں نے وزیر سے کہا ابھی تو کہتا تھا کہ مسجد کے چاروں طرف سو سو قدم تک ایک لاکھ بلیوں کی پاڑ بندھی ہوئی ہے اور سارا صحن پتھروں سے بھرا ہوا ہے اور ایک مہینہ سے پہلے صفائی نہیں ہو سکتی پھر تو کیوں کر پرسوں تک اس کو صاف کرادے گا؟ وزیر نے بادشاہ کو خوش دیکھا تو یوں عرض کرنے لگا۔

از ہیبت شاہ جہاں لرزد زمین و آسماں

شاہ جہاں بادشاہ کی ہیبت سے زمین آسمان لرزتے ہیں۔

ظلِ سبحانی نے جو حکم دیا ہے اس حکم کی اتنی بڑی ہیبت ہے کہ پرسوں تک پاڑ کھل جانی اور پتھر صاف ہو جانے کچھ مشکل نہیں ہیں۔ بادشاہ نے فرمایا۔ اچھا۔ سارے شہر میں ہندو مسلمان رعایا کو اور ہماری فوج کے ہندو مسلمانوں کو اطلاع دے دو کہ ہم نے پاڑ کی بلیاں اور رسیاں اور بانس بچے ہوئے پتھر ان کو انعام میں بخش دیئے وہ آئیں اور چیزیں لے جا سکتے ہیں لے جائیں۔ یہ حکم سنتے ہی وزیر اور میر عمارت دونوں جھک گئے اور انہوں نے ادب کی زمین چومی اور عرض کی کہ بادشاہوں کی داد و دہش کے بہت سے قصے سنے ہیں مگر جو عطا اس وقت جہاں پناہ نے ظاہر فرمائی ہے اس کی مثال نہ پہلے کبھی سنی نہ آئندہ سننے میں آئے گی۔

چنانچہ سارے دلی شہر کے ہندو مسلمانوں اور فوج کے ہندو مسلمانوں میں ڈھنڈورے کے ذریعے شاہی فرمان پہنچا دیا گیا اور چھوٹے بڑے جوان عورت مرد جوق جوق آنے لگے۔ بدھ کی شام سے یہ لوٹ شروع ہوئی تھی۔ ساری رات جاری رہی اور جمعرات کی شام تک جاری رہی۔ جمعرات کی شام کو میر عمارت نے اور وزیر نے جا کر دیکھا تو نہ کوئی پتھر باقی تھا نہ کوئی بلی باقی تھی نہ کوئی بانس باقی تھا۔ سب چیزیں رعایا کے ہندو مسلمان اپنے اپنے گھروں کو لے گئے تھے۔ جمعرات کی شام سے میر عمارت نے مسجد کو دھلوانا شروع کیا اور صبح تک دھلائی ختم ہو گئی۔ اور صبح سے جمعہ کی نماز کے وقت تک مسجد میں دریاں اور قالینوں کا فرش بچھ گیا اور صحن میں شامیانے لگ گئے اور بادشاہ سلامت نے مسجد میں آکر جمعہ کی نماز ادا فرمائی اور اس طرح دہلی کی جامع مسجد میں نماز کا افتتاح ہوا۔

پس دلی کے سب ہندو مسلمان اس جامع مسجد سے بڑی محبت رکھتے ہیں اور اس کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اگر خدا نخواستہ کسی دشمن نے اس کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا تو سب ہندو مسلمان اس کی حفاظت کے لئے ایسے ہی ایک دل ہو جائیں گے جیسے کہ شاہ جہاں کے زمانے میں ایک دل ہو گئے تھے۔

خواجہ حسن نظامی

"منادی"

رُباعیاتِ صہبائی

مرے قلب و نظر کو آگہی دے — جو تجھ کو پا سکے وہ بے خودی دے
اندھیرے پر اندھیرا چھا رہا ہے — الٰہی روشنی دے روشنی دے!!

مری آنکھوں کا نور ہے ترا نام — مرے دل کا سہارا ہے ترا نام
جدا ہوتے نہیں اک دوسرے سے — بہت کچھ ہے ترا نام

[illegible]

مندر میں وہ اُس کے رُخِ روشن سے اُجالا — یا نُور کا چمکا ہے شوالے میں شوالا
اِک شمع ہے چمکی ہوئی چمکائی ہوئی سی

ملتے ہی نظر مجھ سے وہ چونکی ہوئی تصویر — جس طرح اچانک ملے اِک خواب کی تعبیر
آنکھوں میں لگاوٹ لئے گھبرائی ہوئی سی

مندر کی فضاؤں میں ہے اک برق سی مضطر — محبوب اداؤں میں ہے اِک برق سی مضطر
لپٹی ہوئی سمٹی ہوئی، تھرّائی ہوئی سی

ہنگامِ طواف آہوئے رَم خوردہ کا انداز — بھٹکی ہوئی نظروں کا وہ بھٹکا ہوا انداز
وحشت پہ وہ شوخی کی ادا چھائی ہوئی سی

انداز پذیرائی اُلفت ہے حسیں اور — پڑتا ہے کہیں پاؤں تو نظریں ہیں کہیں اور
کچھ کھوئی ہوئی چیز ہے کچھ پائی ہوئی سی

وہ چاند سے مکھڑے پہ بکھرتے ہوئے گیسو — قامت میں جوانی کا وہ چلتا ہوا جادو
ہر گام پہ جھومی ہوئی اِترائی ہوئی سی

پیغام نگاہوں کا مری غور سے پڑھنا — افسانۂ ارمانِ دلی غور سے پڑھنا
ہونٹوں پہ کوئی راز کی بات آئی ہوئی سی

وہ کیفِ مسلسل ہے نہ وہ جلوۂ بے تاب — اِک خواب تھا اِک خواب تھا اِک خواب تھا اِک خواب
تعبیر ہے تقدیر سے شرمائی ہوئی سی

پھرتی ہے نگاہوں میں مگر اب بھی وہ تصویر — ہے دل میں ترازو ترا چھوڑا ہوا ہر تیر
سینے میں تمنائیں ہیں اترائی ہوئی سی

اب محوِ پرستش کسی مندر میں کہاں تو — مندر وہ ترا من میں ہے رہتی ہے جہاں تو
ہر صبحِ تخیل پہ مرے چھائی ہوئی سی

"دین دنیا"

فیاض الدین احمد خاں

دہلی کی جامع مسجد

(۲۹ مئی جمعہ کی شام کو خواجہ صاحب نے سُنائی)

ہندوستان کا دل دلی ہے۔ اور دلی کا دل گوری گوری۔ لال لال جامع مسجد ہے دیکھنا وہ جمنا دریا کے کنارے لال قلعہ گردن اونچی کر کے کس کو دیکھ رہا ہے کیا دلی کی پیاری جامع مسجد کو دیکھ رہا ہے لال قلعہ کو معلوم ہے کہ جب شہنشاہ شاہ جہاں نے ترکوں اور افغانوں کی دہلی کے سامنے ایک نئی دلی بسانی چاہی تو اس نے جمنا دریا کے کنارے ایک بڑی فصیل بنائی اور پھر لال قلعہ بنایا اور ایک جامع مسجد بھی بنائی جس زمانے میں جامع مسجد بن رہی تھی شاہ جہاں ٹیا محل میں رہتا تھا اور اس کے مصاحب کوچہ چیلاں میں رہتے تھے۔ چونکہ مغل بادشاہوں کو مرشد اور گرو بھی کہا جاتا تھا اس لئے ان کے ذاتی نوکروں کو چیلہ کہا جاتا تھا۔ اور شاہجہاں کے ذاتی نوکر یعنی چیلے جس جگہ رہتے تھے اس کو کوچہ چیلاں کہتے تھے اور ٹیا محل کو ٹیا محل اس واسطے کہا جاتا تھا کہ یہاں کچے اور مٹی کے بنے ہوئے مکانات تھے۔ جہاں بادشاہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب لال قلعہ تیار ہو گیا تو بادشاہ ٹیا محل سے اٹھ کر قلعہ میں چلے گئے اور اپنے میر عمارت کو حکم دیا کہ جامع مسجد جتنی جلدی ممکن ہو تیار ہو جانی چاہئے۔ میر عمارت ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑا ہوا اور ادب سے گردن جھکا کر کہا جہاں پناہ آپ کے اقبال سے جامع مسجد بالکل تیار ہو چکی ہے۔ اب تو صرف گنبد کے کام باقی رہ گیا ہے جو ایک مہینہ میں کھل جائے گا بادشاہ سلامت نے میر عمارت کی طرف دیکھا اور پھر اپنے وزیر کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا کہتا ہے ایک مہینہ میں کھل جائے گی۔ پاڑ باندھنے میں دیر لگتی ہے اس کا کھولنا تو بہت آسان ہے وزیر نے ہاتھ جوڑ کر کہا

دس بجے ایک دوسرے بہرہ احمد علی ملنے کے لئے آئے۔ یہ میرے کئی برس کے دوست ہیں۔ ہم دونوں کرنل مارشل کے پاس اکٹھے تھے۔ اس نے پوچھا کہ میں آج کل یہاں کیا تنخواہ پاتا ہوں۔ میں نے جواب دیا بیس روپیہ خشک۔ اس نے کہا۔ ایک ہندوستانی انجینئر ابھی بدل کر کوئٹہ آئے ہیں۔ ان کو ایک بہرہ کی ضرورت ہے۔ پچیس روپیہ اور کھانا دیں گے۔ اگر میں چاہوں تو وہاں نوکری کروں میں نے جواب دیا۔ ہندوستانی صاحب تو اگر مجھے پچاس روپیہ اور کھانا دے۔ تو میں پھر بھی نہ کروں یہ لوگ ایک پیسہ کمیشن نہیں کھانے دیتے۔ ان کی میم صاحبہ تمام دن باورچی خانہ میں سر پر سوار رہتی ہیں۔ گھی کہاں گیا اور مرغی کے اتنے پیسے کیوں خرچ کئے اور کوئلہ اتنا مہنگا کیوں ہے۔ دو سال ہوئے میں مسٹر راما سوامی سرجن کے ہاں ملازم تھا۔ ان کی میم صاحبہ ہندوستانی تھیں۔ کمیشن کا ایک پیسہ حرام جو لینے دیتیں۔ دن بھر باورچی خانہ کی نگرانی۔ سامان لینے ساتھ جاتیں۔ چار جگہ سے پوچھ کر خریدتیں۔ میں تو ایک مہینہ میں ہی تنگ آ گیا۔ اور نوکری چھوڑ دی۔ تم تو پچیس روپیہ اور کھانا کہتے ہو۔ یہاں مجھے بیشک بیس روپیہ خشک ملتے ہیں۔ مگر دو روپیہ روزانہ کمیشن میں نہیں چھوڑتا۔ میم صاحبہ ایسی اچھی ہیں کہ ایک ایک مہینہ باورچی خانہ میں نہیں جاتیں۔ ہندوستانی صاحب کے ہاں نوکری کرو تو کھانے کو صرف چار روٹیاں اور دال ملے۔ یہاں ہم لوگوں کا کھانا مقرر نہیں۔ مگر مچھلی۔ گوشت۔ کٹلس چائے۔ ٹوسٹ۔ مکھن سب چیز کھاتے ہیں۔ صاحب کو یا میم صاحبہ کو کیا پتہ ہے۔ کہ ہم کیا کرتے ہیں۔

گیارہ بجے نصیبن آیا مجھ سے ملنے کے لئے آئیں۔ یہ میری دوست ہیں۔ ہم دونوں اکٹھے میجر ٹامسن کے ہاں ملازم تھے۔ اس نے بتایا۔ کہ یہ آج کل خالی ہے۔ کیوں کہ اس کے صاحب اور میم ولایت چلے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اس کی ملازمت کا انتظام کر دوں گا۔ خانساماں تو کھانا پکانے میں مصروف ہے میں اس سے باتیں کرتا رہا۔

بارہ بجے میم صاحبہ نے مجھے چند خط لا دیئے۔ جن کو لے کر میں ڈاک خانہ میں پوسٹ کرنے گیا۔ راستہ میں شبراتی ہوٹل والے کے ہاں کچھ دیر ٹھہرا۔ یہ بھی میرا پرانا دوست ہے۔ اس نے بتایا۔ کہ اس کا زلزلہ میں سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔ اب اس کا کام پھر اچھا ہے اس نے پنجاب کی ایک عورت سے شادی بھی کر لی ہے جس سے ایک بچہ ہے۔ ایک بجے واپس آیا۔ آنے کے بعد کھانے کی میز تیار کی۔ کیوں کہ صاحب ڈیڑھ بجے لنچ کے لئے آتے ہیں۔ ڈیڑھ بجے صاحب آئے میم صاحبہ اور صاحب نے کھانا کھایا۔ کھانے میں شوربہ۔ کٹلس۔ مچھلی۔ چاول۔ کری اور پڈنگ ہے۔ ایک پلیٹ صاف نہ تھی۔ صاحب بہت بگڑے۔ میں نے کہا۔ حضور میں ابھی دوسری صاف لاتا ہوں۔ بھاگا ہوا باورچی خانہ میں گیا۔ تو تمام پلیٹیں گندی تھیں۔ اور وہاں پانی بھی نہ تھا۔ کیوں کہ نل بند ہو چکا ہے۔ اب صاف کروں تو کیوں کر۔ میں نے جلدی سے پلیٹ میں تھوکا۔ اور اس گیلی گیلی کو جھاڑن سے رگڑا۔ بالکل صاف ہو گئی۔ بھاگ کر کھانے کے کمرہ میں آیا اور صاحب کے سامنے رکھی۔ صاحب کھانا کھا کر پھر دفتر چلے گئے۔ میم صاحبہ نے اپنے کمرہ میں جا کر پھر سلائی کا کام شروع کر دیا۔ یہ عورت دن رات بُنتی رہتی ہے۔ نہ معلوم اس کو اس سے کیا لطف آتا ہے۔ ہمارے ملک کی عورتوں کو جب کام نہ ہو۔ آرام سے سو جاتی ہیں۔

صاحب شام کے چار بجے دفتر سے واپس آئے۔ چائے پی۔ صاحب کے چائے پینے کے بعد میں نے اور خانساماں نے چائے پی۔ دوپہر کو لنچ کے وقت جو کٹلس بنے تھے۔ بہت لذیذ تھے۔ یہ چائے والے سینڈوچ بھی اچھے تھے مگر ہندوستانی پکوڑوں کی کیا بات ہے صاحب کے لئے بھی کبھی کبھی بناتا ہوں۔ مگر یہ کم بخت مرچوں کو پسند نہیں کرتا۔ حالانکہ مرچیں کھانے کی جان ہوتی ہیں۔

چائے پینے کے بعد صاحب شکار کے لئے چلے گئے چھ بجے واپس آئے۔ صاحب نے سات بجے غسل کیا۔ آٹھ بجے کھانے پر بیٹھے۔ آج ہمارے ہاں چھ مہمان کا ڈنر تھا۔ وسکی کی ڈیڑھ بوتل ختم ہو گئی۔ رات کے ساڑھے نو بجے تک یہ لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے رہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر بائیسکوپ گئے۔ میں آدھی بوتل وسکی کی جو بچی تھی باورچی خانہ میں لے آیا۔ میں اور خانساماں دونوں نے پی۔ اور کھانا کھایا۔ مچھلی بہت لذیذ ہے رات کو بارہ بجے صاحب اور میم صاحبہ آگئے۔ ان کو سونے کے کپڑے پہنائے اور حضور سلام کہہ کر واپس اپنے سرونٹ کوارٹر میں آگیا۔ اب سوتا ہوں۔ صبح جاگنا ہوگا۔

"ریاست"

من مندر کی دیوی

مست نظر، چال وہ اٹھلائی ہوئی سی
آنکھوں میں محبت کی چمک آئی ہوئی سی
بجلی وہ چمکتی ہوئی لہرائی ہوئی سی

اسی شبنم و صبا سے یہ چمن ہرا بھرا ہے — کوئی گریۂ شبانہ۔ کوئی آہِ صبح گاہی
ملی شیخ کو کہاں سے رہ و رسمِ فرقہ سازی — نہ یہ سنّتِ الٰہی۔ نہ طریقِ خانقاہی
یہ خودی بجز خدا کے نہ جھکے کسی کے آگے — نہ نیاز و گلہ پوشی۔ نہ طرازِ کج کلاہی
تری بخششوں کے صدقے مجھے کیا ملا ہے — کہیں رنجِ مرگِ ناگہ۔ کہیں دردِ زیست کاہی
کوئی پوچھے قضا سے کہ فرنگ کیوں ہے باقی — نہ یہ سایۂ الٰہی۔ نہ زہی جہاں پناہی
صفِ لشکرِ بلا کی نظر آئیں کیوں نہ برہم — اُٹھے دردمند دل سے اگر آہِ صبح گاہی
تری رحمتوں کے بادل کبھی کھل کے کیوں نہ برسے
ابھی تشنہ لب پڑی ہے مری کشتِ پُر گناہی

غلام رسول مہر — "حمایتِ اسلام"

ایک بہرے کا روزنامچہ

صبح پانچ بجے آنکھ کھلی۔ کوٹھڑی میں سردی کافی ہے۔ اس لئے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر کیا کروں۔ غلامی آخر غلامی ہی ہے۔ صاحب کو صبح ساڑھے پانچ بجے چائے چاہئے۔ یہ کم بخت آٹھ بجے تک تو پلنگ نہیں چھوڑتا۔ سویا رہتا ہے۔ مگر ہماری مصیبت کہ صبح ٹھیک ساڑھے پانچ بجے چائے دو۔ میں نے چائے تیار کی۔ دو ٹوسٹ ایک سنگترہ۔ اور انگریزی کا اخبار۔ جو صبح پانچ بجے ہماری کوٹھی پر پہنچ جاتا ہے۔ لے کر صاحب کے کمرے میں گیا۔ وہاں جا کر آہستہ سے دروازہ کو کھٹکھٹایا۔ پہلے تو صاحب بولے نہیں پھر دوبارہ کھٹکھٹایا تو صاحب نے جواب دیا۔ "کم اِن" اس جواب کے بعد میں اندر گیا۔ اندر جاتے ہی "حضور سلام" کہا اور چائے و اخبار چھوٹی میز پر رکھ کر واپس چلا آیا۔ اس کے بعد اسی طرح سے چائے ٹوسٹ سنگترہ اور اخبار لے کر میم صاحبہ کے کمرہ پر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ میم صاحبہ جاگ رہی تھیں "کم اِن" کہا۔ اندر گیا۔ "حضور سلام" کہا۔ چائے اور اخبار رکھا اور واپس چلا آیا۔

چائے دینے کے بعد گرم پانی کے لئے ٹین آگ پر رکھے کیوں کہ صاحب آٹھ بجے غسل کریں گے۔ غسل کیا خاک کریں گے۔ صابن سے ہاتھ۔ منہ گردن وغیرہ دھو لیتے ہیں اور شام کو نہاتے ہیں۔ جب کہ ڈنر کی تیاری ہو۔

پانی کے ٹین چولھے پر رکھنے کے بعد میں بازار گیا وہاں سے کوئلہ۔ سبزی۔ گوشت۔ مچھلی۔ انڈے اور مرغی لایا۔ تمام سامان ساڑھے چار روپے کا ہے اس میں سے ایک روپیہ مجھے کمیشن ملا۔ یہ کمیشن میں نے دکاندار سے ٹھہرا رکھا ہے اس میں سے آٹھ آنے خانساماں کو دوں گا۔ کیوں کہ وہ سامان خریدے تو کمیشن میں سے مجھے بھی حصہ دیتا ہے۔

کوٹھی پر پہنچ کر آٹھ آنے خانساماں کو دئے۔ بل میم صاحب کے پاس لے گیا۔ جو دکاندار سے لایا ہوں میم صاحب نے بل دیکھ کر رکھ لیا۔ اور کہا۔ کہ "ویل آج ٹماٹر کل سے زیادہ پیسہ کا ہے" میں نے جواب دیا۔ حضور برف پڑنے کے باعث ٹماٹر کا فصل خراب ہو گیا اور مارکیٹ میں باہر سے آتا نہیں۔

آٹھ بجے صاحب اور میم صاحبہ کے لئے غسل تیار کیا۔ پہننے کے کپڑے نکالے۔ بوٹ پالش کئے۔ غسل خانہ سے فارغ ہوا تھا کہ درزی آیا۔ جو میم صاحبہ کے کپڑے تیار کرتا ہے اس کا اڑتالیس روپے کا بل ہے۔ اس سے چار روپیہ کمیشن کا فیصلہ ہوا۔ میم صاحبہ جب غسل کر چکیں اور آیا نے کپڑے پہنا دئے تو میں درزی کا بل لے کر میم صاحبہ کے پاس گیا اور کہا۔ کہ حضور یہ درزی کئی بار آ چکا ہے۔ حضور مصروف تھیں میں نے حضور کو اطلاع نہیں کی۔ یہ بل لایا ہے۔ میم صاحبہ ناراض ہو کر بولیں کہ کیوں اطلاع نہیں کی۔ درزی کو خواہ مخواہ اتنی بار آنا پڑا۔ میم صاحبہ نے فوراً اڑتالیس روپیہ کا چیک کاٹ دیا۔ میں یہ چیک لے کر درزی کے پاس گیا۔ جو باورچی خانہ کے برآمدہ میں بیٹھا تھا چیک دے دیا اور چار روپے اس سے لے لئے۔ اگر یہ مجھے کمیشن کے چار روپے نہ دیتا تو ایک ماہ تک اس کو میم صاحبہ کے سامنے پیش نہ ہونے دیتا اور کپڑوں میں نقائص نکال کر بل میں کئی روپے کٹوا دیتا۔

ٹھیک نو بجے صاحب اور میم صاحبہ کھانے کے کمرہ میں آئے۔ میں نے پہلے پاریج یعنی دلیا دیا۔ پھر مچھلی دی۔ پھر فرائی انڈے اور بیکن دیا۔ اور چائے۔ ہمارے صاحب اس وقت صرف یہی کھاتے ہیں۔ ساڑھے نو بجے کھانے سے فارغ ہو گئے۔ چند منٹ ڈرائنگ روم میں بیٹھے پھر موٹر میں دفتر تشریف لے گئے۔ ہمارے [illegible] ہیں۔

محفلِ ادب

مرزا غالبؔ کے دو غیر مطبوعہ خط

[ذیل میں ہم مرزا غالبؔ کے دو غیر مطبوعہ خط نقل کرتے ہیں جو ہمیں حال میں دستیاب ہوئے ہیں۔ پہلا خط ایک خط کے جواب میں ہے جس کے لکھنے والے کوئی صاحب عبدالحق ہیں۔ پہلے ہم وہ خط لکھتے ہیں اور اس کے بعد مرزا صاحب کا جواب۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درخواست ملکۂ معظمہ کے نام ہے اور اس لئے بحث تذکیر و تانیث کی آ پڑی ہے۔ دوسرا خط کسی شہزادے کی شادی کے متعلق ہے۔ ممکن ہے کہ شہزادہ جواں بخت کی شادی سے تعلق رکھتا ہو جس کے لئے مرزا صاحب نے سہرا لکھا تھا۔ یہ دونوں خط ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں۔ ایڈیٹر]

بنام مرزا صاحب

قبلہ و کعبہ۔ جو حکم حضور کا۔ دو تین دن میں دے دیں گے۔ اے حضرت وہ سطر تو کاغذ افشاں پر لکھ چکے اب کیا ہوگا۔ عجب کی بات ہے کہ جو دیکھے گا ہنسے گا اور دوسری بات یہ ہے سلطانہا یا سلطانہ کے کیا معنی۔ چاہیے سلطنتہا یا سلطنتہ، خوب غور فرمائیے میری عرض پر اور جواب اس کا عنایت فرمائیے۔ والتسلیم۔ عبدالحق۔

جواب مرزا صاحب کا

بھائی یہ نہ سمجھو سلطان بمعنی مصدر آتا ہے۔ سلطنت اگرچہ من حیث القیاس صحیح ہے لیکن ٹکسال باہر ہے خلد اللہ ملکہ و سلطانہ لکھتے ہیں منشیانِ ایران و روم و ہند سب یوں ہی لکھتے آئے ہیں۔ ضمان بھی بمعنی ضامن اور بھی بمعنی ضمانت، سلطان بھی بمعنی بادشاہ اور بھی بمعنی سلطنت، اس میں کچھ تامل نہ کرو کس کی مجال ہے جو اس پر ہنس سکے لیکن ملکہ و سلطانہ علامت تذکیر ہے اگر ملکہا و سلطانہا بن جائے تو بہتر ہے ورنہ خیر یوں ہی رہنے دو ہم سے کوئی پوچھے گا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہ رعایتِ شکوہِ سلطنت ہم نے تانیث کی رعایت نہ کی۔ اور سچ تو یوں ہے کہ اگر کاتب سگھڑ ہو تو ہائے ہوز کا شوشہ مٹا دینا اور الف بنا دینا دشوار نہیں ہے بن سکے تو بنوا دو اور سلطانہا کو خدا کے واسطے مت بدلنا یہ بلغائے عرب و عجم کا قرارداد ہے۔ لہٰذا اس سب تقریر کے یہ عرض ہے کہ پرسوں پنجشنبہ کو عرضی لکھی ہوئی میرے پاس آ جائے ۱۲

غالبؔ ۱۲

دوسرا خط

جناب عالی یہ خط فتح پور سے آپ کے نام آیا ہے۔ میں اس وقت حاضر نہ ہو سکا خط پہنچتا ہے اس کو ملاحظہ کر کے جب اس کا جواب مجھ کو دیجئے گا تو میں فتح پور کو روانہ کروں گا۔

شادی بادشاہ کے فرزند ارجمند کی اور بزم گاہ دیوانِ خاص، رقعے لکھے جائیں گے صمصام الدولہ کی طرف سے۔ صمصام الدولہ امیر ہیں اور امرا و باہم اگر طریقۂ فروتنی کا سلوک رکھتے ہیں یعنی تشریف لائیے اور ہم کو ممنون کیجئے۔ پس اب میں رقعے کی عبارت میں کیا الفاظ صرف کروں۔ تشریف و تشریف آوری قدوم میمنت لزوم کو دیوان خاص سے مناسبت محض ہے اور پھر وہی صمصام الدولہ اگر شہزادے اور دیوان خاص کے لائق الفاظ لکھے جاویں تو حضرات مکتوب الیہ بُرا مانیں گے کہ ہم کو صمصام الدولہ نے کیا لکھا ہے اور اگر متواضعانہ عبارت لکھی جاوے تو کسرِ شانِ سلطنت ہے اب آپ مجھ کو ہدایت کیجئے کہ نگارش کا کیا انداز ہو والسلام اسد اللہ

"اردو"

آہِ صبح گاہی

تری زندگی پہ جب تک نہ لہو سے ہو گواہی | نہ ہے سود تاجِ شاہی نہ زیاں نمدکلاہی
تری زیست سر بہ زانوی زلیست سر بہ خنجر | ترا کیش خانقاہی مرا طریق بادہ سپاہی

اصغر کی یاد میں

آج اُداسی کا دن ہے!
دو سال ہوئے آج کے دن
آہ آج کے دن!
وہ ہمارا چاند!
ہم سے ہزاروں کوس دُور، پردیس میں
ایک دریا کی لہروں کے اندر
ڈوب گیا!
ہماری مطمئن زندگی پر،
ناشکری مطمئن زندگی پر
بجلی گری!
ہمیں معلوم ہوا کہ دُنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے!
پردے ہماری نگاہوں سے اُٹھ گئے،
ہم نے ایک جھلک سی دیکھی!
پھر دن آئے اور راتیں،
روشن دن اور تاریک راتیں،
صبح ہوئی اور شام
اور عمر یونہی تمام ہوتی گئی!
ایک برس گذر گیا اور وہی دن آیا
سمندر کے کنارے،
سمندر جس کے ہاتھ سونپا تھا اُسے،
سمندر پر ایک کرن سی چمکی!
پھر دن آئے اور راتیں:
کام اور آرام دُکھ اور شکوہ،
آئے اور چلے گئے، آئے اور چلے گئے!
دو سال ہو گئے، پھر وہی دن آیا کشمیر میں،
وہی دن اُداس، پاکیزہ، کشمیر کی طرح حسین، دل گیر!
اُس کی صبح سوتوں کو جگانے والی، شام جاگتوں کو سُلانے والی،
لیکن شام ہوئی کہ دل میں ایک بھونچال سا آیا! ——
دو سال!!

محبّت کی موت

بجھ گئی شمعِ شبستانِ حیات

آخری بار سنبھالا بھی لیا تھا اس نے

ہو چلی تھی مرے احساس میں شدّت پیدا

میرے کچلے ہوئے روندے ہوئے ارمانوں سے

اور جذبات کے ڈھائے ہوئے ایوانوں سے

کوئی آتا ہوا معلوم سا ہوتا تھا مجھے

دھیمی دھیمی سی میں سنتا تھا کسی کی آہٹ

نُور سا دُور افق پر نظر آتا تھا مجھے

اور تصوّر کے جھروکے سے کبھی

آس کی کوئی لرزتی ہوئی دھندلی سی کرن

زیست کے کلبۂ تاریک میں آجاتی تھی

اب مگر

بجھ چکی شمعِ شبستانِ حیات

م۔ا۔کلیم

ان دونوں فسانوں میں جہاں عشق کی سچی کرامتیں دکھائی دیتی ہیں وہاں عاشق و معشوق دونوں کی عصمت مآبی، پاکیزگی اور وفاداری کے جوہر بھی چمکتے نظر آتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں کے پڑھنے سے ماننا پڑتا ہے کہ عشق "ہوس" کا نام نہیں اور عشق "اضطراب وصل" کو نہیں کہتے بلکہ یہ وہ جذبہ ہے جو ایک پاک باز متقی اور ایک عصمت مآب شوہر دار خاتون کو ایک زنجیر میں جکڑ دینے کے بعد بھی ان کے دامن کو ہر طرح کی آلودگی سے پاک رکھتا اور رکھ سکتا ہے۔ انہیں دونوں افسانوں میں سچ پوچھئے تو غالب کے اس شعر کی بھی حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ: ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ　　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

"درانسکی" کو چھوڑیئے کہ وہ میرا موضوع نہیں ہے۔ صرف "افغان پسر" کو لیجئے۔ وہ محبت کی جاذبیتوں سے بے پروا تھا، صوفی پاکباز تھا، حسن و عشق کے جھگڑوں سے آزاد تھا مگر پھر بھی آدمی ہی تھا اس لئے "عشق" کا شکار ہو گیا۔ اس کے سینے میں بھی دل تھا پتھر نہ تھا۔ وہ نارسی سسٹس[1] نہ تھا جو اپنی جگہ اٹل رہتا لہٰذا جب عشق نے گرمی دکھائی تو یہ لوہا بھی پگھل ہی گیا مگر ہو کیا سکتا تھا۔ عورت شوہر دار تھی نفس کی مغلوب نہ تھی جو محبت کی باتیں اور وصل کی گھاتیں ہوتیں۔ دونوں بے لوث اور پاکباز تھے لہٰذا اپنی اپنی جگہ مجبور اور بے بس اس آگ میں پڑے جل رہے تھے۔ آخر کار قدرت نے اس کا فیصلہ کر دیا۔ عورت کا شوہر اتفاقاً مر گیا۔ جذبۂ شوہر پرستی کہئے یا سماجی پابندیاں۔ عشق کی دل خراشیوں سے گلو خلاصی کا طریقہ کہئے یا رسم و رواج کا نباہ۔ عورت "ستی" ہونے کے لئے شوہر کی لاش کے ساتھ چلی مگر مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ لیتی تھی کہ شاید اس آخری وقت میں دیدارِ یار بھی میسر آ جائے۔ اتفاقاً "افغان پسر" کو بھی اس کی خبر ہو گئی وہ اس خبر کو سن کر تاب نہ لا سکا۔ اور جذبۂ الفت سے بے بس ہو کر افتاں و خیزاں کنارے پہنچ گیا مگر آگ مردہ اور زندہ دونوں کو اپنی آغوش میں لے چکی تھی۔ اچانک عورت کی نظر "افغان پسر" پر پڑ گئی اور جب دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو عورت نے ایک دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ: ؎

کہا آئے ہو تو چلے آؤ تم　　　شتابی کرو جو ہمیں پاؤ تم

"افغان پسر" بھی عشق کا مارا تھا لہٰذا تڑپ اٹھا اور: ؎

یہ بے تاب ہو آگ پر جھپڑا　　　پتنگا سا اس آگ پر گر پڑا

مگر چوں کہ: ؎

چلے آئے تھے کتنے انصار ساتھ　　　وہیں کھینچ لائے اُسے ہاتھوں ہاتھ

اور ایک درخت کے نیچے لٹا دیا۔ یہ ادھر تڑپنے لگا اور وہ اُدھر جل کے خاک ہو گئی۔ مگر کچھ دیر کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ راکھ کے ڈھیر سے "عورت" نکل کر "افغان پسر" کے پاس پہنچ گئی اور بے ہوش نوجوان کو: ؎

اُسی ناز و انداز و خوبی کے ساتھ　　　اُٹھایا اُسے ہاتھ میں لے کے ہاتھ
گئے اس طرف لے جدھر تھی چلی　　　نظر کرتے تھے واقعی یہ سبھی
ہوئے جاتے جاتے نظر سے نہاں　　　گیا عشق کیا جانے لے کر کہاں

میرؔ کی عشقیہ مثنویوں میں درد اور کسک کا یقیناً ایک بے پناہ طوفان پنہاں ہے۔ جو اثر کئے بغیر نہیں رہتا اور نہیں رہ سکتا لیکن ان کا ایسا اختتام افسوس ہے کہ تمام پیدا شدہ اثرات کو اپنے خلافِ عقل ہونے کی وجہ سے کھو بیٹھتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اس وقت کی داستان گوئی اور فسانہ نگاری ایسی ڈگر پر چل رہی تھی اور ممکن ہے کہ میرؔ اس سے الگ رہتے تو لوگ ان کی مثنویوں کو اپنی ٹھوکروں میں رکھ لیتے مگر پھر بھی میرؔ ایسا کرنے پر مجبور نہ تھے۔ آخر کس بات میں انھوں نے عوام کا لحاظ کیا؟ نیز انھوں نے اپنی آپ بیتی مثنویوں میں اس طرح کی خلافِ عقل چیزیں کہاں داخل کی ہیں؟ بہرکیف اس نقص کے باوجود میرا خیال ہے کہ میرؔ کی عشقیہ مثنویاں سبھی قابلِ تعریف ہیں اور ان سب میں بہترین مثنوی ہے۔ صرف ان سب میں نہیں بلکہ اس کی داخلی حیثیت اسے اردو کی ہزاروں مثنویوں سے علیحدہ اور بلند تر کرتی ہے۔

---

[1] نارسی سسٹس ایک خوش رو یونانی نوجوان تھا جس پر ایک پری عاشق ہو گئی تھی مگر چوں کہ وہ عشق سے قطعاً غیر متاثر تھا لہٰذا اس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ پری اس غم میں گھل گھل کر مر گئی۔ یونانیوں کے عقیدے کے مطابق انتقام کی دیوی نے اس بے توجہی کی سزا نوجوان کو یہ دی کہ اس کو ایک چشمے میں اپنی شکل دیکھنے پر مجبور کیا۔ نارسی سسٹس چشمے میں اپنی حسین شکل دیکھ کر آپ اپنا فریفتہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ اپنی جان تک گنوا بیٹھا اور اس صورت سے پری کی بے تاب روح نے تسکین پائی۔

حکایتِ عشق

میرؔ کی مثنوی

میر تقی میرؔ دِلی والے شاعر نے جو اُردو زبان کے مجددِ اعظم تھے، اُردو زبان میں صاف، شُستہ، پُردرد اور پُراثر تخلیقی مثنوی کی بنیاد رکھی، معلوم نہیں میرؔ کی طبیعت میں سوز و گداز فطری تھا یا حالات اور ماحول کے زیرِ اثر اُن کی مسلسل محرومی اور ناکامی نے انہیں متشائم (Pessimist) بنا دیا تھا اور دِل میں وہ چیز پیدا ہوئی تھی، جسے شیفتہؔ "صداہ درد ناک"۔ اثرؔ "خستگی و بر شتگی" اور مجنوں گورکھپوری "دل خراشی و جگر سوزی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ چیز اِن میں کچھ اس طرح رَس بس گئی تھی کہ ہم اسے ان کی فطرت ہی قرار دے دیں، تو بے جا نہ ہوگا۔ بل (Mill) کا یہ قول اگر صحیح ہے کہ :-

"دراصل شاعری عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کا نتیجہ ہے"

تو ماننا پڑتا ہے کہ اسی چیز نے میرؔ کو وہاں پہنچا دیا تھا جہاں کا تو تصور بھی تخیل کی دسترس سے باہر ہے۔ مگر یہ چیز اِن کے کلام کی ہر صنف میں داخل نہیں بلکہ صرف "غزل" میں کار فرما ہے یا زیادہ سے زیادہ عشقیہ مثنویوں میں۔ ایسا ہونا ناگزیر تھا اس لئے کہ جذباتِ انسانی میں سب سے زیادہ ہمہ گیر اور بااثر جذبہ "عشق" کا ہے اور تاثراتِ عشق، واردات قلب کو بیان کرنے، دل کی حقیقی کیفیتوں کا جائزہ لے کر قلم سے اس کی تصویر کاغذ پر اُتارنے یا نفسیاتِ عشق کو الفاظ میں ظاہر کرنے کا جیسا سلیقہ اور ڈھنگ میرؔ کو تھا ویسا کسی کو نہ تھا۔ انگریزی زبان میں میرؔ کی اس خصوصیت کا مقابلہ کرنے والا بجز "سر فلپ سڈنی" کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔

میرؔ نے عشقیہ مثنویاں چھ لکھی ہیں مگر مجھے اُن چھ میں سے یہاں صرف ایک مثنوی کا ذکر مقصود ہے جس کا عنوان "حکایتِ عشق" ہے۔ اس میں ایک "افغان پسر" کی داستانِ عشق نظم کی گئی ہے۔ ذرا اس "افغان پسر" کی داستان "حسن و ایمان" ملاحظہ ہو۔ میرؔ صاحب فرماتے ہیں کہ :-

جواں خوش تھا پُرکار و پرہیزگار ... بہت حسن کا اس کے واں اشتہار

تناسب بہت اس کے اعضا کے خوب ... سراپا میں دیکھو تو ہر جا سے خوب

خوش اندام و خوش رو و پاکیزہ خو ... کسی وقت رہتا نہ تھا بے وضو

رہے محو پاکیزگی و صلوات ... نہ ہو ترک سہواً کبھی واجبات

اگر ہووے حور بہشتی دوچار ... وہ در پئے حسن اُس سے ڈھونڈے کنار

دگر آگے سے ہو پری کا گذر ... حیا سے نہ اس پر کرے ٹک نظر

جوانی کا ہنگام طاعت کا صرف ... لبِ سرخ بر دلبروں کا نہ حرف

مگر باایں ہمہ زہد و اتقا آخر کار وہ اپنا دامن عشق سے نہ بچا سکا۔ خود تو کسی کا گرویدہ نہ ہوا مگر ایک شوہردار حسین عورت اس کو اپنا دل دے بیٹھی۔

یہ مثنوی اگر آج کل چھپی ہوتی تو کہہ دیا جاتا کہ میرؔ نے اس کا پلاٹ روسی فسانہ نگار ٹالسٹائی کے فسانے سے چرایا ہے۔ دونوں فسانوں کی بنیاد ملتی جلتی سی ہے۔ جس طرح میرؔ کی مثنوی کی "ہیروئن" شادی شدہ خاتون ہے اسی طرح ٹالسٹائی کی ہیروئن "اینا کرینینا" بیاہی ہوئی عورت ہے۔ جس طرح میرؔ کا ہیرو "افغان پسر" جذبہ حسن و عشق سے بے خبر ہے اسی طرح ٹالسٹائی کا ہیرو "وارنسکی" الھڑ ہے۔ جس طرح میرؔ کی ہیروئن خاموش عشق کرتی ہے مگر آخر میں بے چین ہو کر کھل جاتی ہے، اسی طرح ٹالسٹائی کی ہیروئن چپکے چپکے آتشِ عشق میں جلتی ہے مگر آخر میں بے قرار ہو کر باؤلی ہو جاتی ہے۔

ہم "عشقِ حقیقی" کا قائل نہیں یعنی میں ایسے عشق کا وجود تسلیم نہیں کرتا جس میں جسدی تلذذ اور جسمانی مزے داریوں کا جذبہ موجود نہ ہو مگر یہ دونوں افسانے کچھ ایسے انداز میں پیش کئے گئے ہیں جو صریحاً میرے اس نظریہ کی تکذیب کرتا ہے۔ ان دونوں افسانوں میں "سچی خاموش عشق" کو پیش کیا گیا ہے۔ جس کے متعلق غالبؔ کہہ گیا ہے کہ :-

باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں ... ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

غزل

جوش کھا اور کہ سودا ہے ترا خام ابھی
عشق شورش ہے مگر شورشِ بے نام ابھی

جان بھی نذر کروں گا دلِ بے تاب ٹھہر
لوٹ لینے دے ذرا لذتِ پیغام ابھی

دل میں وہ شور ہے برپا کہ الٰہی توبہ
تم نے چپکے سے لیا کیا تھا مرا نام ابھی؟

جو کہا تھا تری آنکھوں نے دھڑکتے دل سے
گونجتا ہے مرے کانوں میں وہ پیغام ابھی

صورتِ شاہدِ مقصود نظر کیا آئے
ذوقِ دیدار میں حائل ہیں در و بام ابھی

کتنے ہی قیدِ علائق سے بھی آزاد ہوئے
تو ہے مصروفِ پرستارئ اوہام ابھی

ذرے ذرے نے سنا، وجد کیا، رقص کیا
تجھ کو ہے شکوۂ محرومئ پیغام ابھی

صبحِ عشرت سے ہم آغوش ہو کیا شامِ الم
تو نے توڑا نہیں پیمانۂ ایام ابھی

دیکھ سرمایۂ تسکیں نہ جراحت ہو جائے
رہنے دے کچھ خلشِ حسرتِ انجام ابھی

ایک صورت جسے ترتیب ستاروں سے دیں
میرے اشکوں میں جھلکتی ہے سرِ شام ابھی

دل سلامت ہے اکثر یہ گماں ہوتا ہے
میرے پہلو میں ہے اک شاہدِ خودکام ابھی

تیری تنویر سے آراستہ ہے میری سحر
تیری خوشبو سے مہکتی ہے مری شام ابھی

تم نے انسان کی فطرت پہ کبھی غور کیا؟
مئے سرجوش ابھی، دُردِ تہِ جام ابھی!

دیکھنا ہے تو انھیں فکر میں شاعر کی دیکھ
سینۂ سنگ میں سوتے ہیں جو اصنام ابھی

ہم ہیں وہ رند کہ مستی میں اگر ہو کر دیں
ایک مرکز پہ کھنچ آئیں سحر و شام ابھی

کہہ کے یہ کھینچ لیا ہاتھ اگر ساقی نے
تیرے دل سے نہیں نکلی ہوسِ جام ابھی؟!

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

میں مقابلہ کی تاب کہاں! صبح ہوتے ہوتے اچھا خاصا بخار تھا۔ دو دن بعد بخار نے نمونیا کی شکل اختیار کرلی اور آخرکار یہی بیماری ان کی موت کا سبب بنی۔

تمام لوگ اس واقعہ کو سن کر حیران و ششدر رہ گئے۔ مجلس پر ایک سناٹا چھا گیا۔ کسم اور شانتا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

ایک معتور نے مجلس کے سکوت کو یہ کہہ کر توڑا: "ایسا ایثار اور ایسی قربانی کم دیکھنے میں آتی ہے"

ایک دوسرے معتور نے کہا "زنجن بابو نے آخر اپنا شاہکار بنا کر ہی چھوڑا"

کسم کی آنکھوں سے اب بھی آنسو جاری تھے۔

(ماخوذ از اودہنری)

عبدالرزّاق قریشی

وہی اصلِ مکان و لامکاں ہے
مکاں کیا شے ہے اندازِ بیاں ہے
خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے؟

اقبالؒ

دن گزرتے گئے اور کسم کی حالت روز بروز بہتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ دن بھی آیا کہ اس نے غسلِ صحت کیا۔ اس خوشی میں شانتا نے مختلف احباب کو جن میں زیادہ تر مصور تھے ایک پارٹی دی۔ دورانِ گفتگو میں نرنجن کا بھی ذکر آگیا۔ ایک نوجوان مصور کے ہونٹوں پر ایک عجیب معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن ساتھ ہی اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور اس کے ہزار چھپانے پر بھی تاڑنے والی نگاہوں نے تاڑ لیا کہ کوئی بات ضرور ہے اور اس سے اصرار کر کے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ یہ نوجوان مصور، نرنجن کا بھتیجا تھا اور نرنجن اس کو بہت مانتا تھا۔

نوجوان مصور نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے زمین پر گر پڑے۔ لوگوں کو یہ دیکھ کر اور زیادہ حیرت ہوئی۔ انہوں نے اور زیادہ اصرار کے ساتھ اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟

آخر مصور مجبور ہو کر بولا "اگر آپ لوگ اصرار کر رہے ہیں تو پھر سنئے، نرنجن بابو میرے تو چچا ہی تھے لیکن مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ لوگوں کو بھی ان سے بہت محبت تھی اس لئے جو راز میں جانتا ہوں اس کا بتا دینا ہی بہتر ہے۔"

تمام لوگ گوش بر آواز ہو گئے۔

مصور نے کہا "آج ہم بہن کسم کے غسلِ صحت کے جشن میں جمع ہوئے ہیں، آپ لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ نرنجن بابو کی موت کسم بہن کی صحت کا باعث ہوئی۔"

تمام لوگ بالخصوص شانتا اور کسم یہ جملہ سن کر متعجب بلکہ ششدر ہو گئے اور سب کے سب اور زیادہ توجہ سے سننے لگے۔ مصور نے اپنا سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا،

"آپ لوگوں کو تو اس بات کا علم ہے کہ ہماری بہن نفسیاتی اثر کے تحت اپنی موت کا یقین کر چکی تھیں اور نفسیاتی اثر کو دور کرنا کسی دوا یا ڈاکٹر کے بس کی بات نہیں"

چند مصوروں نے گردن ہلائی۔

"نرنجن بابو کو بھی یہ بات معلوم ہوئی۔ وہ ایک ناکام مصور ضرور تھے لیکن انسانی نفسیات کو وہ خوب سمجھتے تھے اور آپ سب لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کسم بہن کو اپنی بیٹی کی طرح چاہتے اور مانتے تھے۔"

شانتا اور کسم دونوں بیک وقت بول اٹھیں "بالکل صحیح"

کسم۔ واقعی وہ مجھے بہت مانتے تھے۔

مصور۔ خیر تو نرنجن بابو نے کسم بہن کو بچانے کی تدبیر سوچی۔ یہ اس دن کی بات ہے جب صرف دس پندرہ پتیاں باقی رہ گئی تھیں۔ جب رات ہوئی اور سب لوگ بے خبری کے عالم میں پڑے آرام کی نیند سو رہے تھے تو نرنجن بابو اپنے برش، رنگوں کا ڈبا، ایک لالٹین اور ایک سیڑھی لے کر گھر سے نکلے۔

شانتا۔ رات کے وقت؟

مصور۔ جی ہاں، رات کے وقت، تقریباً آدھی رات کا وقت تھا۔ دسمبر کا مہینہ، اور اس پر ستم یہ ہوا کہ بارش ہونے لگی۔ لیکن انہوں نے کسی چیز کی پروا نہ کی۔ وہ اس دیوار کے پاس گئے جس پر کی آخری پتی کے ساتھ ہماری بہن کی زندگی بندھی ہوئی تھی۔

شانتا اور کسم دونوں کے دل کی حرکت تیز ہو گئی۔ مجلس پر بھی ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔

"انہوں نے اس دیوار پر برش سے ایک پتی بنائی۔ گو وہ عمر بھر ایک ناکام مصور رہے لیکن یہ پتی انہوں نے اتنی لاجواب بنائی کہ دور سے کسی کو یہ تمیز نہ ہو سکی کہ وہ اصلی پتی ہے یا بناوٹی۔"

نہ صرف شانتا اور کسم بلکہ پارٹی کے اکثر ممبر بیک وقت بول اٹھے "اچھا تو وہ پتی مصنوعی ہے؟"

مصور۔ جی ہاں، وہ پتی مصنوعی ہے، اس کو رنگ اس خوبی سے دیا گیا ہے اور اتنی اچھی بنائی گئی ہے کہ دور سے بالکل اصلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ لوگ چاہیں تو ابھی چل کر دیکھ لیں۔

کسم۔ لیکن ان کی موت کا سبب آخر یہ پتی کیسے بن گئی؟

مصور۔ میں ابھی بتا چکا ہوں کہ سردی کا موسم تھا اور اس پر بارش ہو رہی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ نرنجن بابو پانی میں شرابور ہو گئے۔ بڑھاپے کا بدن بھلا یہ

شانتا۔ دن، دو دن کی اور بات ہے!

کسم۔ ہاں دن، دو دن!

شانتا نے ہاتھ پکڑ کر کسم کا رُخ بدل دیا اور بولی "میری بہن ذرا کھل کر کہو آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟

کسم۔ وہ دیکھو، وہ سامنے بیلوں کی پتیاں ایک ایک کر کے گرتی جا رہی ہیں۔ پانچ چھ دن پہلے تو سینکڑوں تھیں گِننا دشوار تھا۔ لیکن اب تو مشکل سے پندرہ بیس ہوں گی۔ وہ دیکھو ایک اور گر گئی۔

شانتا۔ تو ان پتیوں کے گرنے سے تمہیں کیا؟

کسم۔ شانتا، جس دن آخری پتی گر جائے گی اسی دن میرا بھی خاتمہ سمجھو۔

شانتا کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ نرنجن آ گیا۔ شانتا نے اس سے کہا "نرنجن بابو کسم کی بات تم نے سُنی، وہ دیکھو، وہ بیلیں ہیں نا، ان کی پتیاں ایک ایک کر کے گرتی جا رہی ہیں۔ یہ کہتی ہیں کہ جس دن آخری پتی گر جائے گی میں بھی ختم ہو جاؤں گی۔

نرنجن یہ سُن کر ہنس پڑا، لیکن ساتھ ہی اس کے چہرہ سے صاف پتا چلتا تھا کہ اس کو یہ بات سُن کر بڑا دکھ ہو رہا ہے۔ وہ چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور کسی گہرے سوچ میں پڑ گیا۔

دوسرے دن صبح کو کسم کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ بیل میں صرف دو پتیاں باقی ہیں۔ شانتا بھی وہاں جا پہنچی۔ اس کو دیکھ کر کسم بولی "بس اب تو صرف دو پتیاں اور رہ گئی ہیں، دو پتیوں کے گرنے میں کتنی دیر؟" شانتا نے اس کو پیار کیا اور بولی "بہن تم نے اپنے دل میں یہ جھوٹا خیال کیسے بٹھا دیا۔ تم تو ایسی وہمی نہ تھیں؟"

کسم۔ وہم کی کوئی بات نہیں شانتا، مجھے یقین ہے کہ آخری پتی کے گرتے ہی میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

شانتا۔ تم کیوں بے کار پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔ پتی کے گرنے سے بھلا کسی کو آج تک موت آئی ہے؟

کسم۔ کسی کو آئی ہو یا نہ آئی ہو، لیکن مجھے تو ضرور آئے گی۔

شانتا۔ ارے نہیں پگلی، ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیوں بلاوجہ اپنا دماغ خراب کر رہی ہے۔

کسم۔ میری اچھی بہن تم میرا کہنا مان لو، اس پتی کے ساتھ میری روح ہے۔ اُدھر وہ پتی گری اِدھر میری روح بدن سے نکلی۔

شانتا دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ وہ یہ جانتی تھی کہ یہ کسم کا وہم ہے۔ جو آج تک کبھی نہیں ہوا ہے وہ اب کیسے ہو گا۔ لیکن محبت بحث کی قائل نہیں، وہ بلا چون و چرا ہر بات کو مان لینے کے لئے تیار رہتی ہے۔ باوجودیکہ عقل تسلیم نہیں کرتی تھی لیکن دل نے مان لیا کہ ہاں کسم کا کہنا سچ ہو سکتا ہے۔ کیا شانتا اس پتی کو گرنے سے کسی طرح روک سکتی تھی؟ لیکن قدرت کے کاموں میں انسان کو کہاں دخل۔ ایک معمولی سی پتی کو گرنے سے روک لینا کتنا مشکل بلکہ ناممکن کام! آہ انسان کی بیچارگی و مجبوری!

شانتا کسم سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ہوا کا ایک معمولی سا جھونکا آیا اور ان دو پتیوں میں سے ایک کو اڑا کر اپنے ساتھ لیتا گیا۔ شانتا کلیجہ پکڑ کر رہ گئی۔ اب بیل میں صرف ایک ہی پتی باقی تھی۔

دن ختم ہو گیا مگر وہ آخری پتی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ سورج ڈوب گیا۔ رات کی تاریکی نے چاروں طرف پردے ڈال دیئے۔ وہ رات شانتا کے لئے کتنی غم انگیز اور خوفناک رات تھی، اور کسم کے لئے؟ اس سے تو دنیا ہی چھوٹ رہی تھی۔

رات بھی خدا خدا کر کے ختم ہو گئی۔ صبح کو دیکھا گیا تو پتی اپنی جگہ پر موجود۔ شانتا نے انتہائی محبت سے کسم کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

دوسرا دن بھی ختم ہو گیا اور وہ پتی اپنی جگہ پر موجود۔ رات آئی اور وہ بھی چلی گئی لیکن پتی اپنی جگہ پر موجود۔ غرض اسی طرح تین دن اور تین راتیں گذر گئیں اور آخری پتی اپنی جگہ پر موجود۔ بالآخر کسم کو بھی یقین ہو گیا کہ اس کی زندگی کے دن باقی ہیں۔ اس میں پھر سے جینے کی خواہش پیدا ہو گئی۔

ایک ہفتے کے اندر اندر کسم میں صحت کے کامل آثار ظاہر ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے بھی یقین دلا دیا کہ اب خطرے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ آخری پتی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ اِدھر تو کسم کو صحت ہونے لگی اور اُدھر نرنجن دفعتاً نمونیا میں مبتلا ہو کر چل بسا۔

آخری پتّی

کسم کو تصویر کشی سے بچپن ہی سے بہت دل چسپی تھی، یہی وجہ ہے کہ کالج میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بجائے وہ مصوری کے اسکول میں داخل ہوئی اور پھر اس کی تکمیل کے لئے ممبئی گئی۔ ممبئی میں اس کی ملاقات شانتا سے ہوئی۔ کسم اور شانتا میں مختلف حیثیتوں سے بہت کچھ فرق تھا، مثلاً ایک برہمن کی لڑکی تھی، دوسری راجپوت کی، ایک دہلی کی رہنے والی دوسری گجرات کی۔ مگر مصوری کا مذاق اور اس سے دل چسپی دونوں میں یکساں تھی، اور اسی ہم مذاقی کا نتیجہ تھا کہ رفتہ رفتہ دونوں میں اتنا میل جول بڑھا اور دونوں ایک دوسرے پر اس طرح مٹنے لگیں کہ لوگ اُن کو سگی بہنیں سمجھتے تھے۔

مصوری کی تعلیم کی تکمیل کے بعد شانتا اور کسم دونوں نے مل کر ممبئی ہی میں اپنا نگار خانہ بنایا۔ ان کی تصویریں ملک میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں اور ان کے فن کے قدرداں ہندوستان جیسے قدر ناشناس ملک میں بھی سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں پیدا ہو گئے۔

نومبر کا مہینہ تھا کہ ممبئی میں نمونیا کی وبا پھیلی۔ کسم بھی اس کا شکار ہوئی۔ علاج ہوتا رہا لیکن فائدہ کیا معنی اور الٹی روز بروز حالت خراب ہوتی گئی۔ شانتا نے علاج اور تیمار داری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن اس کی حالت نہ جانے کیوں خراب سے خراب تر ہی ہوتی گئی۔ جس مکان میں شانتا اور کسم کا قیام تھا۔ اسی میں ایک فلیٹ میں چند بنگالی مصور بھی رہتے تھے۔ ان میں ایک بوڑھا مصور نرنجن، کسم سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اس کو اپنی بیٹی کی طرح مانتا تھا اور باپ کی طرح اُس کی تیمار داری کر رہا تھا۔

نرنجن کہنے کو تو ایک مصور تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کبھی تصویر کشی کے ذریعہ پیٹ پالنا نصیب نہ ہوا۔ چالیس برس کی لگاتار کوششوں کے بعد بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ اس کو ہمیشہ یہی کہتے سُنا گیا کہ "میں عنقریب اپنا شاہکار پیش کرنے والا ہوں" بہر حال نرنجن کی انتہا یہ تھی کہ اس نے صرف اسی پر اکتفا کی کہ دوسرے مصوروں کا چھوٹا موٹا کام کر دیا کرے۔ آدمی قناعت پسند تھا، جو کچھ تھوڑا بہت مل جاتا اسی میں مگن رہتا لیکن باوجود تمام ناکامیوں کے وہ ہمیشہ لوگوں سے یہ کہا کرتا کہ میں بہت جلد اپنا شاہکار پبلک کے سامنے پیش کرنے والا ہوں۔ لوگ یہ سُن کر مسکرا دیتے۔

کسم کے مکان کے پچھلے حصہ میں ایک چھوٹا سا صحن تھا جس کی چہار دیواری پر پھولوں کی کچھ بیلیں چڑھی ہوئی تھیں جو کافی پرانی ہو چکی تھیں۔ پت جھڑ کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ ان بیلوں کی پتیاں بھی ایک ایک کر کے جھڑتی جا رہی تھیں۔ کسم اپنے بستر پر لیٹی لیٹی انہی پتیوں کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھا کرتی۔ ایک دن یکایک اس کے دل میں یہ خیال گذرا کہ یہ پتیاں ایک ایک کر کے جھڑتی جا رہی ہیں جس دن آخری پتی گر جائے گی اس کی زندگی کی بیل بھی ہمیشہ کے لئے سوکھ جائے گی۔ کسم یوں تو بہت روشن خیال عورت تھی لیکن بیماری میں انسانی عقل کی پرواز ذرا کم ہو جاتی ہے۔ اگر یہی خیال کسی اور کے دل میں آیا ہوتا اور کسم کو معلوم ہو جاتا تو وہ اس کا مذاق اڑاتی اور اُسے وہمی اور نہ جانے اور کیا کیا کہتی، لیکن بیماری نے نحیف جسم کے ساتھ اس کے دماغ کو بھی نحیف اور کمزور بنا دیا تھا اور کمزور دماغ ہمیشہ توہمات کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

جیسے جیسے پتیاں زیادہ گرتی جاتی تھیں کسم کا یہ خیال پختہ ہوتا جاتا تھا کہ جس دن آخری پتی گر جائے گی اُسی دن اس کی زندگی کا چراغ گُل ہو جائے گا۔ اب اس نے ادھر اُدھر دیکھنا بالکل چھوڑ دیا۔ ہمیشہ انہی پتیوں کی طرف دیکھا کرتی۔ شانتا اس کے پاس آ کر بیٹھتی، اس سے باتیں کرنا چاہتی لیکن وہ ان پتیوں کی طرف سے نظر بالکل نہ ہٹاتی۔ شانتا تنگ آ گئی۔ کہنے لگی "تم نے بھی کیا عادت بنا رکھی ہے، ہر وقت کھڑکی میں سے دیکھتی رہتی ہو!"

کسم نے شانتا کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اپنے خیال میں محو، بولی "وہ لو ایک اور گر گئی"

شانتا نے کہا "کیا ایک اور گر گئی"

کسم دلگیر، شانتا کی طرف متوجہ ہو کے "اب تو بہت کم باقی رہ گئی ہیں۔ ہاں، بس اب دو دن کی اور دیر ہے"

شانتا "کیا تم کیا کہہ رہی ہو، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا"

کسم دلگیر شانتا کی طرف متوجہ ہو کے "بس اب دو دن، دو دن کی اور بات ہے"

غزل

دیکھ لے یہ کوئی اِک بار محبت کر کے
جیت میں بھی ہے بڑی ہار محبت کر کے

حُسن والوں سے اُلجھنا نہیں دُوراندیشی
جی کو ہو جائے گا آزار محبت کر کے

اہلِ دُنیا تجھے دیوانہ کہیں گے اے دوست
نہ بنے گا کوئی غم خوار محبت کر کے

کیجئے لاکھ جتن اُن کو بھلا دینے کے
یاد وہ آئیں گے ہر بار محبت کر کے

کسی دل باختہ سے پوچھئے مقبولؔ کا حال
ایک مدت سے ہے بیمارِ محبت کر کے

مقبول احمدپوری

غزل

لُطف یوں مجھ پہ بار بار نہ کر
میری فطرت کو شرمسار نہ کر

جام خالی سہی مگر اے گُل!
منتِ ساقیٔ بہار نہ کر!

ایک موہوم آرزو کے لئے
زندگی وقفِ انتظار نہ کر

یا نہیں درد آشنا کر دے
یا محبت کو آشکار نہ کر

بے سبب آ گئے ہیں کچھ آنسو
میری آنکھوں کا اعتبار نہ کر

عشق کا مدعا نہ کہہ جاؤں
دیدہ و دل کو بے قرار نہ کر

جو نفس ہو نہ اضطراب انگیز
زندگی میں اُسے شمار نہ کر

مسعود پرویز

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آسیب کا اثر کہہ کر چُپ ہو جاتے۔ انھوں نے سوچا کہ ایسی بیماریاں کہیں ذہنی اسباب سے نہ پیدا ہوتی ہوں۔ اس خیال کو سامنے رکھ کر انھوں نے مریضوں کی ذہنی زندگی کی پڑتال شروع کی۔ تحقیقات نے آخر ثابت کر دیا کہ اُن کا اندازہ غلط نہ تھا۔ دبے ہوئے خیالات ہم سے اُلٹے سیدھے کام ہی نہیں کراتے، ہماری صحت کے بھی دشمن ہیں۔ کبھی ظاہری جسمانی بیماریاں پیدا کر دیتے ہیں، کبھی سچ مچ کی جسمانی بیماریوں کو اچھا نہیں ہونے دیتے۔ وہی مرض جو پہلے پراسرار اور لاعلاج سمجھے جاتے تھے اب نفسیاتی طریقے سے ان کا کامیابی کے ساتھ علاج کیا جانے لگا ہے۔

مختلف قسم کی ذہنی خرابیوں اور اُن کے وسیع اثرات کا بیان سُن کر آپ گھبرا نہ جائیں۔ یہ قطعاً لازمی نہیں ہے کہ ہم ان سبھی کا شکار ہو جائیں جس مرض کی نسبت یہ معلوم ہو کہ وہ کس طرح شروع ہوتا ہے، ہم اس کی روک تھام بھی کر سکتے ہیں۔ جو معلومات اس وقت حاصل ہیں اُن کی روشنی میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ہماری آئندہ زندگی اور ہماری آنے والی نسلیں ذہنی خرابیوں سے محفوظ رکھی جا سکتی ہیں۔ بچّوں کی مناسب تربیت تو بعد میں ہوگی۔ پہلے ہم اپنی ذات کو سنبھالنے کی فکر کریں۔ اس کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے آپ سے جھوٹ نہ بولیں، اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش نہ کریں۔ اگر کوئی ناشائستہ آرزو بار بار ہمارے دل میں اٹھتی ہے، کسی لغزش کی تلخ یاد رہ رہ کر ہمیں ستاتی ہے، صورت، طاقت، دولت یا دماغی اور عملی صلاحیتوں میں ہم دوسروں سے کم ہیں، ہم سے کوئی حماقت سرزد ہو گئی ہے، یا کسی نے ہم سے ناروا سلوک کیا ہے، تو ہمیں اپنے سامنے ان ساری تکلیف دہ باتوں کا صاف صاف اعتراف کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔ ہم اپنے آپ کو دھوکا دینے کی عادت چھوڑ دیں تو کبھی ایسا نہیں ہوگا کہ ہمارے خیالات دل کی اتھاہ گہرائیوں میں دب کر ہماری شخصیت کو درہم برہم کر دیں۔

ذرا سی کوشش سے آپ کی زندگی سنور سکتی ہے۔ مگر چھوٹے چھوٹے بھولے بھالے بچے اس طرح سمجھائے نہیں سمجھ سکتے۔ غذا اور لباس کی طرح اُن کی ذہنی تندرستی کے لئے مناسب فضا پیدا کرنا بھی آپ ہی کے ذمے ہے۔ اس سلسلے میں دو باتیں جو بہت ہی ضروری ہیں اُن کا ذکر کئے دیتا ہوں۔ اکثر گھروں میں سارے بچوں سے یکساں سلوک نہیں کیا جاتا۔ ایک کو ماں زیادہ چاہتی ہے، دوسرا باپ کا منظورِ نظر ہے، اور باقی پانچ سات بچے اپنی محرومی کو روتے رہتے ہیں۔ کوئی بچہ کند ذہن ہو اور پڑھائی میں اچھا نہ چل سکے تو نادان والدین اپنے پرائے ہر ایک کے سامنے اسی کا رونا روتے رہتے ہیں، دوسرے بچوں سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس طرح اس بچارے کے لئے جینا اجیرن کر دیتے ہیں۔ نئے بچے کی پیدائش کے بعد پہلا بچہ کسی حد تک نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور وہ اس طرح کھویا کھویا نظر آتا ہے گویا کسی کو تخت سے اُتار دیا جائے۔ نئے بیاہ کے چاؤ میں وہی گھر جو پُرانی بیوی کے بچوں کے لئے پہلے بہشت کی حیثیت رکھتا تھا دوزخ کا نمونہ بن جاتا ہے۔ ہماری پُرانی قسم کی معاشرت پر ایک بہت ہی بدنما داغ یہ ہے کہ لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں سے ترجیحی سلوک کیا جاتا ہے۔ ننھی ننھی بچیوں کو سُنا سُنا کر کہا جاتا ہے کہ اُن کا وجود والدین کے لئے باعثِ زحمت ہے اور اُن کی پیدائش خوشی کے بجائے غم کا موقع تھی جب عزیزوں نے اس طرح افسوس ظاہر کیا تھا گویا پُرسا دینے آئے ہوں۔ یہ صورتِ حال اُن بچوں کے لئے جو آپ کے التفات سے محروم ہیں بے حد ضرر رساں ہے۔ دل پر تو اختیار نہیں۔ ظاہری برتاؤ میں فرق نہیں پڑنا چاہئے۔ پیار، توجہ اور کھانے پہننے کے معاملے میں کسی بچے کو بلا وجہ دوسرے پر فوقیت نہ دی جائے۔ میں نے کوئی گھر ایسا نہیں دیکھا جہاں بچوں سے امتیازی سلوک کیا گیا ہو اور وہ بڑے ہو کر تندرست شخصیتوں کے مالک بنے ہوں۔

دوسری بات برتاؤ کی مساوات سے بھی زیادہ اہم ہے۔ بچوں کی بہت سی حرکتیں آپ کے اخلاقی معیاروں پر پُوری نہیں اُترتیں۔ مگر اُن سے یہ نہ کہئے کہ وہ گناہ گار ہیں، نفرت کے سزاوار اور خدا کا عذاب اُن پر نازل ہونے کو ہے۔ اگر آپ کے وعظ کا اُن پر اثر ہو گیا تو ان کے نازک دل گناہ و ثواب کی کشمکش میں گرفتار ہو جائیں گے۔ جن کاموں کو آپ گناہ کہتے ہیں، وہ اُن کے خیال سے بھی لرز اٹھیں گے اور پارسائی کے شوق میں ایسے خیالات کو زبردستی بھلا دینے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح اُن کی شخصیت میں ابتری کی بنا پڑ جائے گی اور نتیجہ خدا جانے کیا ہو۔ اور بچوں کو گناہ گار کہنے میں آپ حق بجانب بھی تو نہیں ہیں۔ خود مذہب نے انہیں معصوم قرار دیا ہے۔ انہیں گناہ گار کہنا گناہ ہے۔ اُن کی لغزشیں آپ کے لئے گناہ ہوں گی، بچوں کے لئے ان کی حیثیت صرف ایسی ہے جیسے فٹ بال کھیلتے ہوئے غلطیاں کرنا۔ اچھا کھلاڑی نہ ہونے سے بچہ گناہ گار تو نہیں ہو جاتا، خدا کا قہر تو اس پر نازل نہیں ہوتا۔ آپ اپنے بچّوں کو زندگی کے اس کھیل کی اور فٹ بال کی طرح گناہ کی اُلجھنوں سے آزاد رہ کر کھیلنے دیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ وہ گر گر کے سنبھلتے، کچھ آپ کے سمجھانے سے، کچھ خود سمجھ کر، آہستہ آہستہ ایسے اچھے کھلاڑی بن جائیں کہ آپ کے ہر اخلاقی معیار پر پورے اُتر آئیں۔ اور اگر آپ نے انہیں گناہ کی تلخیوں سے آشنا کر دیا تو آپ کی ساری نصیحتیں دھری کی دھری رہ جائیں گی، اور کوئی بے راہ روی ایسی نہ ہوگی جس کی اُن سے توقع نہ کی جا سکے۔

مجھے اُمید ہے کہ ذہنی تندرستی قائم رکھنے کے لئے جو دو چار گُر میں نے آپ کو بتائے ہیں اُن پر عمل کرنے سے آپ کی شخصیت میں کوئی نمایاں

کے خلاف سازشیں کی جا رہی ہیں، اور ہر شخص اُس کا دشمن ہے۔ اس وہم کے زیرِ اثر وہ اکثر دوسروں پر حملہ بھی کر بیٹھتا ہے، اور موقع ملے تو قتل سے بھی نہیں چُوکتا۔

کچھ عادتیں ہمارے سر پر بھوت کی طرح سوار ہوتی ہیں۔ ہم انہیں بُرا جانتے ہیں، انہیں چھوڑ دینے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں، مگر ان کا تسلط کم ہونے میں نہیں آتا۔ ہزار ارادے کریں، ہزار توبہ کریں، ان سے چھٹکارا نہیں۔ ایسی عادتیں ذہنی خرابیوں کی مہربانی سے پیدا ہوتی ہیں اور نفسیاتی علاج کے سوا اُن سے نجات حاصل کرنا مشکل ہے۔ عام زندگی میں اس کی بیسیوں نظیریں مل جاتی ہیں مثلاً ہر وقت انگلیاں چٹخانا، دانتوں سے ناخن تراشنا، ناک اور ہونٹوں سے مضحکہ خیز شکلیں بنانا، بے تحاشا کھانا اور ہر وقت کھاتے رہنا، دن رات کسی نشے میں کھوئے رہنا، ہاتھ دھونا شروع کریں تو گھنٹوں اسی مشغلے میں گزر جائیں اور پھر بھی تسلی نہ ہو اور بہت سے جرموں کے علاوہ جنسی بے راہ روی کی ایسی کوئی قسم نہیں جو ذہنی خرابیوں کا نتیجہ نہ ہو۔ کسی نفسیاتی معالج سے آپ اُن ہولناک جنسی جرموں کا حال سُنیں جو اُس کے لئے روزمرہ کی باتیں ہیں تو آپ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔ ماہرینِ نفسیات کی رائے عام طور پر یہ ہے کہ ذہنی خرابیاں تقریباً تمام جرائم کی ذمہ دار ہیں۔ مجرموں کو سزا دینے کے بجائے نفسیاتی شفاخانوں میں بھیج دینا چاہئے اور جرم کی روک تھام کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آئندہ نسلوں کی ذہنی تربیت کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے۔

نیند میں چلنے کے مرض سے آپ ضرور واقف ہوں گے۔ اس مرض میں شخصیت کے دو حصے ہو جاتے ہیں، دبے ہوئے خیالات ایک طرف اور باقی شخصیت ایک طرف اور ان دونوں میں اتنی دشمنی ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو ایک نظر نہیں دیکھ سکتے۔ جب دبے ہوئے خیالات کو اُبھرنے کا موقع ملے تو وقتی طور پر ہماری زندگی اُنہی سے عبارت ہو جاتی ہے، اور عام شخصیت کا کہیں پتا نہیں چلتا۔ ایک لڑکی آئرین کو یہ مرض تھا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اس کی ماں نے ایک طویل بیماری کے بعد موت پائی اور اُس کے آخری دن انتہائی تکلیف میں گذرے تھے۔ آئرین ان تلخ دنوں کی یاد کو برداشت نہ کر سکی اور اُسے زبردستی بھلا دیا۔ دورے کی حالت میں اُسے اپنے آس پاس کی کچھ خبر نہ رہتی اور وہ اُن سارے کاموں کو دُہرانے لگتی جو اُس نے اپنی ماں کی زندگی کے آخری دنوں میں اس کی دیکھ بھال کرتے ہوئے کئے تھے۔ گویا وہ اُن بھلائے ہوئے دنوں کو دوبارہ بسر کرنے لگتی تھی۔ دورہ ختم ہونے کے بعد اُسے قطعاً معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ لمحے کسی اور دنیا میں گزار آئی ہے۔ اس مرض سے ملتی جُلتی لیکن اس سے کہیں زیادہ شدید یہ خرابی وہ ہے جس میں دبے ہوئے خیالات خواب کی سی کیفیت میں نہیں اُبھرتے بلکہ ایک نئی شخصیت کو جنم دیتے ہیں اور ہماری شخصیت اس طرح دو تین شخصیتوں میں بٹ جاتی ہے گویا جسم تو ایک ہو اور اس میں دو یا تین ہستیاں ہوں۔ مریض عام طور پر معقول، مہذب اور پارسا انسانوں کی سی زندگی بسر کرے گا لیکن نئی شخصیتوں میں سے کوئی ابھر آئے تو عام شخصیت گویا کہانی بن جاتی ہے۔ اب وہ شریر، اوباش، جھگڑالو اور اخلاقی پابندیوں سے آزاد انسان ہوگا۔ مریض کو پتا بھی نہیں چلتا اور کبھی ایک شخصیت اُوپر آ جاتی ہے کبھی دوسری۔

تین بیماریاں ایسی ہیں جو ساری کی ساری شخصیت کو نیا رنگ دے دیتی ہیں۔ پہلی میں انسان پر ہیجانی کیفیت طاری رہتی ہے اور وہ لمحے بھر سے زیادہ کسی طرف توجہ نہیں دے سکتا۔ وہ بلا وجہ خوش رہتا ہے۔ نقصان پر نقصان ہو رہا ہو، صدمے پر صدمہ پہنچے، اُس کے قہقہے ختم ہونے میں نہیں آتے۔ دوسری بیماری اس کے بالکل برعکس ہے۔ انسان غیر معمولی طور پر بجھا بجھا رہتا ہے۔ کوئی خوش خبری اُس کے چہرے پر مسرت کی لہر پیدا نہیں کر سکتی اور جو کام ایک دفعہ شروع کر دے اُسے چھوڑنے کا نام نہیں لیتا۔ تیسری بیماری بے دلی کی ہے۔ مریض اپنے ماحول سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ تماشائی سمجھتے ہیں کہ اس میں دیکھنے، سوچنے اور محسوس کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے دن سپنوں میں اس طرح کھویا رہتا ہے کہ اس کے لئے کسی اور شے میں کوئی دل کشی نہیں رہتی۔ دن سپنے ہم سبھی دیکھتے ہیں۔ وہ بہت خوش گوار ہیں اور حقیقت بہت تلخ۔ مگر حقیقت بار بار اِن دن سپنوں سے ٹکراتی ہے اور انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ کبھی کبھی انسان حقیقت کے تلخ احساس کو دبا دیتا ہے پھر اُس کے دن سپنے ہی اس کے لئے حقیقت بن جاتے ہیں۔ اس کا سارا وقت انہی سپنوں کی خوب صورت وادی میں گزرتا ہے۔

ذہنی خرابیاں ہماری صحت پر بھی اثر ڈالتی ہیں۔ فرائڈ اور چند دوسرے ڈاکٹروں نے دیکھا کہ بہت سے مریض ان کے پاس اس قسم کے آتے ہیں جنہیں کوئی نہ کوئی مستقل عارضہ ہے، لیکن جسمانی سبب اس کے لئے کوئی نہیں۔ اندھے ہیں لیکن آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔ کانوں میں کوئی نقص نہیں، اور سُن نہیں سکتے۔ ہکلاتے ہیں، اعصاب اچھی حالت میں ہیں۔ فالج، ہسٹریا، بدہضمی، دل [illegible] ٹانگوں کا اکڑ کر رہ جانا، غرض جسم کی کوئی فعلی [illegible] (Functional disorders) ایسی نہیں [illegible] تے نہیں کہ اس قسم کی بیماریوں کو

ذہنی خرابیاں

ذہنی خرابیوں کی ابتدا بہت سادہ ہوتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ناپسندیدہ خیالات ہمارے قریب پھٹکنے بھی نہ پائیں۔ کون سے خیالات ہمیں ناپسند ہیں؟ تلخ واقعات کی یاد، مثلاً کسی عزیز کی موت، کاروبار میں غیر معمولی نقصان، بے عزتی، عشق میں ناکامی اور ان گناہوں کی یاد جن کے ہم مرتکب ہو چکے ہیں، خاص طور پر وہ گناہ جن کا تعلق ہماری جنسی زندگی سے ہے۔ اس کے علاوہ بُرے کاموں کی آواز سے بھی ہمیں نفرت ہے۔ فرض کیجئے کہ اس قسم کے خیالات بار بار دل میں آ کر سوہان روح بن جاتے ہیں۔ ان سے نجات کس طرح حاصل کی جائے؟ اس کا صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی تھوڑی دیر کی ذہنی کوفت سہنے کے لئے تیار ہو جائے۔ کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد ان خیالات کی طاقت آپ سے آپ کم ہو جائے گی اور وہ ہمارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔ مگر کبھی کبھی ذہنی کوفت کی شدت سے گھبرا کر ہم اس مشکل کو خود فریبی کی مدد سے حل کرتے ہیں۔ ہم ناپسندیدہ خیالات کو سختی سے دبا دیتے ہیں تاکہ وہ اُبھرنے نہ پائیں۔ تھوڑی بہت کشمکش کے بعد وہ اس طرح دب جاتے ہیں گویا ہمارے دل میں کبھی آئے ہی نہ تھے۔ پھر ہمیں تسکین سی ہو جاتی ہے کہ ہمارے ماضی کے دامن میں کوئی تلخ یاد نہیں اور نہ کوئی گھناؤنی آرزو ہمارے سینے تڑپتی ہے۔ مگر یہ زبردستی بھلائے ہوئے خیالات دل کی گہرائیوں میں ہر وقت موجود رہتے ہیں اور وہاں سے ہماری زندگی پر ناخوش گوار اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ جہاں آپ نے کسی آرزو کو یا کسی یاد کو اس طرح دبا دیا وہیں کسی نہ کسی ذہنی خرابی کی ابتدا ہو گئی۔

انسان کو نیند کی حالت میں اپنے آپ پر زیادہ قابو نہیں رہتا۔ بہت سے دبے ہوئے خیالات اُس وقت اُبھر آتے ہیں۔ دن کو ہماری پارسائی پر چاہے فرشتے رشک کرتے ہوں، ہمارے خواب ہر قسم کی آزادی کو اپنے سے روا رکھتے ہیں۔ نئے گناہوں کی دبی ہوئی آرزوؤں کی تکمیل ہوتی ہے، پرانے گناہوں کے ڈرامے از سر نو کھیلے جاتے ہیں، اور اسی طرح تلخ واقعات کی یاد بھی تازہ ہوتی رہتی ہے۔ مگر دبے ہوئے خیالات کا یہ رات رات کا کھیل کچھ ایسی بدلی ہوئی صورت میں ہوتا ہے کہ وہ عام طور پر پہچانے نہیں جاتے۔ آرزو یہ ہو کہ باپ مر جائے اور اس کی جائداد پہ قابض ہوں تو ممکن ہے اس کا اظہار اس طرح ہو کہ ہمارا مکان کا چبوترہ گر گیا ہے اور اس کے نیچے ہمیں خزانہ ملا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ دن اور رات کی باتوں کا اختلاف تو ہم سب کی زندگی میں ہے۔ کیا سبھی ذہنی خرابیوں میں مبتلا ہیں؟ اس کا جواب اثبات میں ہے۔ جس طرح کامل جسمانی صحت کہیں نظر نہیں آتی، اسی طرح ذہنی خرابیوں سے بھی کوئی شخص بالکل پاک نہیں ہوتا۔ میری آپ کی ذہنی خرابیوں میں اور جنون میں کچھ اس قسم کا فرق ہے جو ہلکی سی خراش اور تلوار کے گہرے زخم میں یا معمولی بخار اور تپ دق میں ہے۔ ایسی خرابیاں ہر ایک میں ہیں، کسی میں اتنی ہلکی کہ انہیں آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے، کسی میں نمایاں، اور کسی میں اتنی بڑھی ہوئیں کہ اس کے لئے مناسب جگہ صرف دماغی ہسپتال ہے۔

معمولی ذہنی خرابیوں کا اثر عام طور پر خواب تک محدود رہتا ہے لیکن معاملہ ذرا بڑھ جائے تو ہمارے افعال عام لوگوں سے بہت ہی مختلف ہو جاتے ہیں۔ بچے کی موت کے بعد دس پندرہ روز تک غمزدہ ماں کا اس کی آوازیں سنتے رہنا معمولی بات ہے۔ وہ آوازیں واہمے کی تخلیق تو ضرور ہیں، لیکن یہ تھوڑے دنوں کی بات ہے، اور کوئی ماں لمبے صبر سے زیادہ دھوکے میں نہیں رہتی۔ اس سے ملتے جُلتے ذہنی مرض میں انسان واہمے کی تخلیق سے اکثر دوچار ہوتا رہتا ہے اور اس فریب کو فریب سمجھ ہی نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر آسیب کو لیجئے۔ عورتوں کو جن اور مردوں کو پریاں چمٹ جاتی ہیں۔ مریض کے لئے ان پُراسرار ہستیوں کی حقیقت میں شبہ کرنا مشکل ہے۔ وہ کیسے یقین کرے کہ اس کی آنکھیں، کان اور جسم اُسے دھوکا دے رہے ہیں؟ کوئی دعا کارگر ہوتی نہیں۔ آس پاس والے بھی مان جاتے ہیں کہ ہو نہ ہو کسی دیو پری کا سایہ ہے۔ یہ دیو اور پریاں سراسر واہمے کی تخلیق ہیں۔ ٹونے ٹوٹکے کے بجائے مریض کسی نفسیاتی معالج کا رُخ کریں تو دنوں میں تندرست ہو سکتے ہیں۔

ذہنی خرابیاں وہم بھی پیدا کر دیا کرتی ہیں۔ آپ بہت سی ایسی ہستیوں کو جانتے ہوں گے جنہیں اپنی طاقت، خوب صورتی، دولت یا عقل پر ناز ہے اور معاملہ اس کے برعکس۔ لطف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی بھکاری ٹوپی میں کوے کے دو پر لگا کر کہے کہ وہ آٹھ دس ملکوں کا بادشاہ ہے۔ اس قسم کے وہم صرف ہنسی کا سامان ہی پیدا نہیں کرتے وہ سماج کی ہم آہنگی کے لئے مستقل خطرہ ہیں مثلاً کسی مریض کو یہ وہم ہو جاتا ہے کہ اس

یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو لاہور سے نشر کی جا چکی ہے اور اب اسٹیشن ڈائریکٹر کی اجازت سے ضروری حذف و اضافہ کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔

مجھے معلوم ہے تم آج کتنا ہار بیٹھے ہو

(۹)

سنو، اگھن کے دن ہیں اور سفر کی دُھن سمائی ہے
فضا شادی رچاتی ہے
کہ ندی گیت گاتی ہے
کہو تو رام کی مُورت کا سیندور میں بھی بھر آؤں
کہو تو جانکی جی کی طرح میں بھی سنور آؤں
گلابی سردیوں میں اک دوشالہ اوڑھ کر آؤں
بہت کیف آفریں دن ہیں
ابھی جاڑے بھی کم سن ہیں
اگر ایسے میں تم گھر ہی رہو تو کیا بُرائی ہے!

(۱۰)

سنو، یہ پوس ہے، دیکھو یہ سردی کا زمانہ ہے
یہ راتیں تیز جاڑے کی
یہ صُبحیں نرم و نازک سی
ذرا دیکھو چمن کے کتنے کیف آور نظارے ہیں
یہی پھول اور کلیاں رات کے چاند اور تارے ہیں
یہی جاڑے کی راتوں میں مرے دل کے سہارے ہیں
مجھے کل اِن فضاؤں سے
سنو کی ضیاؤں سے

(۱۱)

سنو، یہ ماگھ ہے اور اِن دنوں تم گھر سے جاتے ہو
ہوائیں برف باراں ہیں
گھٹائیں بھی نمایاں ہیں
کھُلا دالان ہے، کھیتی بھی کٹ کر اس میں آئی ہے
چلو اوپر چلیں، پرسوں ہی تو مٹی لگائی ہے
رضائی چھینٹ کی کل ہی تو خوشبو میں بسائی ہے
ابھی جاڑا منانا ہے
کہ خوشیوں کا زمانہ ہے
تو جاؤ، چپکے چپکے زیرِ لب کیوں مُسکراتے ہو،

(۱۲)

سنو، پھاگن ہے، اب اگلے مہینے ممبئی جانا
فضا اس درجہ رنگیں ہو
اور اک تم ہو کہ غمگیں ہو
چلو کچھ پھول لے کر جلد پھلواری سے آؤں گی
سَتی دیوی کی پُوجا کے لئے مندر میں جاؤں گی
چلو مندر کے سائے میں غموں کے گیت گاؤں گی
ابھی تو سکھ منانا ہے
کملنے کو زمانہ ہے
ہماری زندگی کا ہر نیا سال ایک افسانہ!!!

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(٧)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(٦)

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(٤)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(٥)

[illegible]

ایک سال

سنو، یہ چیت ہے اور تم سفر کو جانے والے ہو
بہار اپنی جوانی پر ہے
دیکھو کیسا منظر ہے
چلو تم بھی کہ میں کچھ پھول مندر میں چڑھاؤں گی
چلو اک بات اُن برگد کے سایوں میں بتاؤں گی
چلو وہ گیت جو تم کہہ رہے تھے آج گاؤں گی
یہ کیوں آنکھوں میں مستی ہے
شرارت کیوں ٹپکتی ہے
تو سمجھی! مجھ سے کچھ کہہ کر، مجھے شرمانے والے ہو!!

(۲)

سنو، بیساکھ ہے اور تم یہ کہتے ہو کہ جائیں گے
ہوا گلشن میں گاتی ہے
چنبیلی مسکراتی ہے
چنبیلی کے ننھے پھولوں میں ہم تم کیوں نہ کھو جائیں
ہوا کی بانسری کی لے میں ہم کیوں گم نہ ہو جائیں
سویرا ہے، دوبارہ آؤ، پھلواری میں سو جائیں
سراپا حسرت و غم ہو
بتاؤ مجھ سے برہم ہو
تمہارے باغ میں ایسے نظارے پھر نہ آئیں گے

(۳)

سنو، یہ جیٹھ ہے کیوں گاؤں سے رخصت کی ٹھانی ہے
یہ رنگوں کا مہینہ ہے
کہ اک نازک حسینہ ہے
ذرا توسِ قزح کے رنگ میں ساری ڈبوؤں گی
میں اِس دیوی کے قدموں پر حسیں کلیاں پروؤں گی
شفق کی وادیٔ رنگیں میں تھوڑی دیر سوؤں گی
محبت ہر طرف خنداں
فضا میں دھوپ کی رقصاں
وہاں، اک نقرئی جذبات کی دلکش کہانی ہے

(۴)

سنو، پاوس ہے یہ اور تم نے بستر باندھ رکھا ہے
فضا میں آگ مدغم ہے
کوئی دوشیزہ برہم ہے
چلو دوشیزۂ برہم کو برہم اور کر آئیں
پسینوں کی حسیں بوندوں کی افشاں نوچ کر لائیں
اور ان کو گھر میں ساون کی طرح ہم خوب برسائیں
تو گرمی سے پریشاں ہو
بڑے نازک ہو، ناداں ہو

جواب ملا۔ "ہاں۔ کچھ کچھ ——— مجھے مرجانے دو!"

"تم مرجانا چاہتے ہو ——— ؟"

"ہاں۔!"

"تمہیں زندہ رکھنے کے لئے میرا دو ہزار روپیہ خرچ ہو گیا ہے۔"

"خدا کے واسطے مجھے مرجانے دو۔!"

"اچھا تو یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھی کون کون تھے۔ ؟"

"مجھے مرجانے دو۔!"

"جب تک نہیں بتاؤ گے میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ ہمارے پاس تمہیں کئی ہفتے تک زندہ رکھنے کے لئے کافی خون موجود ہے۔"

تقریباً سیاہ رنگ کے خون کے چند قطرے منہ میں سے نکل کر موم میں گر گئے۔ کچھ عرصے تک خاموشی رہی۔ پھر سر نے کہا "مجھے مرجانے دو۔!"

"بہت اچھا!" کپتان نے جواب دیا "ساتھیوں کے نام بتاؤ۔"

پھر کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ گویا سر کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اس کے بعد ہونٹوں میں سے سنائی دیا ——— "لنا سنگھ!"

"اور ——— ؟"

"برکت ——— "

"اور ——— ؟"

"کوئی نہیں۔"

"سچ کہتے ہو؟ جھوٹ نہ ہو ——— "

"سچ ہے۔"

کپتان نے کہا۔ "اچھا ابھی ایک گھنٹے میں تصدیق ہوئی جاتی ہے۔"

ٹیلیفون چلے۔ لنا سنگھ ایک شراب خانے میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ نیم مدہوش تھا اور پولیس سے بار بار کہتا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے کیوں پکڑتے ہو ——— ؟"

لیکن جب اسے کمرے میں لایا گیا جہاں جبرو کا سر تھا اور کپتان پولیس نے سر سے پوچھا۔ "جبرو۔ ایک بات اور بتا دو۔ میں تمہیں ابھی آزاد کئے دیتا ہوں۔ ادھر دیکھو ——— "

آنکھوں کی پلکیں ہلتی ہوئی معلوم ہوئیں۔

"یہی لنا سنگھ ہے ——— ؟"

سر نے جواب دیا۔ "ہاں۔! مجھے مرجانے دو ——— !"

لنا سنگھ کا تمام نشہ یہ الفاظ جبرو کے کٹے ہوئے سر سے سن کر ہرن ہو گیا۔ رنگ سفید پڑ گیا۔ اور کمرے سے باہر نکلتے ہی اس نے جرم کا اقبال

عطاء الرحمٰن

جبرو نے کہا "بہت اچھا۔ دیکھا جائے گا"۔

پھانسی دینے کا وقت صبح چھ بجے مقرر تھا۔ چند اخبار والے اور جیل کے افسر موجود تھے۔ چند منٹ میں سب کام ہو گیا۔ جیل کے ڈاکٹر نے دل کی حرکت دیکھ کر بتا دیا کہ اب جسم میں جان باقی نہیں۔ سب لوگ چلے گئے۔ لاش کو فوراً ایک لاری میں ڈال کر ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

ہسپتال کے جس حصے میں بنگالی ڈاکٹر کا آپریشن کا کمرہ تھا اس طرف کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ قفل پڑے ہوئے تھے یا پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ تمام دن اور تمام رات ڈاکٹر اور اس کا نائب کمرے سے نہ نکلے۔ دوسری صبح کو۔ یعنی پھانسی دینے سے ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد ڈاکٹر نے کپتان پولیس کو ٹیلیفون پر بلایا اور کہا "سب کچھ تیار ہے"۔

رب نواز خاں نے اٹھ کر کپڑے پہنے۔ یونیورسٹی کے تین پروفیسروں سے جن سے پہلے بات چیت ہو چکی تھی ٹیلیفون کے ذریعے کہہ دیا کہ تیار ہو جائیں، اور خود موٹر لے کر راستے میں سے ان سب کو ساتھ لیتا ہوا گھنٹے بھر کے اندر ہسپتال پہنچ گیا۔

آپریشن کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ جب کپتان پولیس نے آہستہ سے دستک دی تو آواز آئی "کون ہے ــــ؟"

"رب نواز خاں!"

"آپ کے ساتھ کون ہے ــ؟"

"یونیورسٹی کے تین پروفیسر۔ اور کوئی نہیں۔"

اس پر دروازہ کھلا اور سب اندر چلے گئے۔ دروازے کو اندر کی طرف سے مقفل کر دیا گیا۔

ایک میز پر جس کے اوپر کا تختہ موٹے شیشے کا تھا ایک شیشے کا گول برتن رکھا تھا۔ اس میں شفاف موم کے اندر دو انچ تک ڈوبا ہوا ایک انسانی سر تھا جس کی گردن کی رگوں کے ساتھ کئی ایک ربڑ اور شیشے کی نلیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ان نلیوں کے دوسرے سرے مختلف قسم کے آلات اور مشینوں کے اندر جاتے تھے۔ ان میں سے ایک مشین ایسی تھی جو خون کو ایک مقررہ حرارت پر قائم رکھتی تھی۔ دوسری چھوٹے سے موٹر کے ساتھ چل رہی تھی اور خون کے دوران کو سر میں جاری رکھنے کا کام کرتی تھی۔ کئی بجلی کے تار تھے جو خدا جانے کہاں سے آتے تھے اور کدھر کو جاتے تھے۔ لاش کا جسم ایک طرف چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ اسے ایک سفید چادر سے ڈھک دیا گیا۔

ڈاکٹر نے ایک بے داغ سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ اور سر پر سفید رومال باندھے تھا۔ کپتان پولیس اور پروفیسروں کے ساتھ معمولی سلام کے بعد اس نے ایک طرف سلفچی میں برش سے رگڑ رگڑ کر صابن سے ہاتھ دھوئے اور ایک بوتل میں سے دوائی ہاتھوں پر ڈال کر انہیں سکھایا۔ پھر چند فقرے سائنس کی اصطلاح میں پروفیسروں کو سمجھانے کے لئے کہے اور بتایا کہ بجلی کے ذریعہ سے دل کی حرکت مصنوعی طور پر جاری رکھی گئی ہے۔ یعنی بجلی کا دل خون کو متواتر دماغ میں دورہ کراتا ہے اور نبض باقاعدہ چل رہی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے کٹے ہوئے سر کے جبڑے کی ہڈی پر جہاں جبڑے کے ڈھانچے ایک انچ ٹھوڑی کی طرف انگلی رکھی اور گھڑی نکال کر پندرہ سیکنڈ دیکھے۔ اس کے بعد کالج کے ایک پروفیسر نے اسی جگہ انگلی رکھ کر نبض دیکھی تو ڈاکٹر نے کہا "ہلکا ہاتھ رکھئے گا۔ موم ابھی نرم ہے آپ دنیا میں پہلے آدمی ہیں پروفیسر صاحب جن کو یہ تجربہ دکھایا گیا ہے اور جو کچھ میں نے کیا ہے اس کی پوری تفصیل میرے چھپے ہوئے مضامین میں موجود ہے۔ گویا یہ پہلی مرتبہ ہے کہ یہ تجربہ انسان کے ساتھ کیا گیا ہے"۔

کٹے ہوئے سر کا چہرہ اصلی صحت کے رنگ سے قدرے نیلا پڑ گیا تھا۔ ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ منہ تھوڑا سا کھلا تھا اور آنکھیں بھی کچھ کھلی تھیں لیکن سانس نہیں چل رہا تھا۔ پھر بھی سر مردہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر نے کپتان پولیس سے کہا "اب آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں"۔ رب نواز خاں نے آگے بڑھ کر سوال کیا ــــ

"جبرو! کیا تم میری آواز سن رہے ہو ــ؟"

ڈاکٹر نے کہا "ذرا قریب ہو جائیے۔ اور ذرا بلند آواز سے بات کیجیے"۔

کپتان قریب ہو گیا اور بلند آواز سے پکارا "جبرو۔ کیا سنتے ہو ــــ؟"

ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے اور آواز سے تو نہیں لیکن جس طرح کوئی کان میں بات کرتا ہے سر نے کہا "مجھے مر جانے دو!"

"ابھی تمہیں مر جانے دوں گا جبرو" کپتان نے کہا "لیکن کیا تمہیں دکھائی دیتا ہے ــ؟"

جبر اور مجبوری

سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت ہی تھوڑی سی عقل دے کر دنیا میں بھیجا ہے۔ یہ غنیمت ہے کیوں کہ اگر زیادہ مل جاتی تو خدا جانے کیا کرتا۔

جس روز جبرو نے سراغ رساں افسر کو گولی ماری اسی روز اخباروں میں یہ خبر نکلی تھی کہ ایک بنگالی ڈاکٹر ایک عجیب قسم کے تجربے میں کامیاب ہوا ہے یعنی یہ کہ مرے ہوئے کتے کا دماغ اس کے دل کی حرکت کو بجلی کی مشین کے ذریعے جاری رکھنے سے زندہ رہ سکتا ہے۔ صرف اسی قدر تھا تفصیل نہ تھی۔ لیکن سراغ رساں کے قتل کی خبر کے مقابلے میں یہ اس قدر چھوٹی سی بات تھی کہ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور تمام اخباروں میں جبرو کا یہ آخری کارنامہ بڑی شد و مد سے بیان کیا گیا۔

جبرو بڑا مشہور کئی دفعہ کا سزا یافتہ ڈاکو تھا۔ دو مرتبہ جیل سے بھاگ چکا تھا۔ اس دفعہ شراب کے نشے میں اپنی ایک آشنا کے مکان پر قابو میں آگیا تھا لیکن پکڑے جانے سے پہلے اس نے سراغ رساں افسر کو جس نے مہینوں پیچھا کرنے کے بعد اسے گرفتار کیا تھا پستول کی گولی سے ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے دو ساتھی بھاگ گئے تھے۔

رب نواز خاں کپتان پولیس زنجیروں سے بندھے ہوئے ڈاکو کے سامنے جیل کے کمرے میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ دو روز سے کوشش کی جا رہی تھی اور ہر ممکن طریقہ عمل میں لایا جا چکا تھا کہ جبرو اپنے ساتھیوں کے نام بتا دے لیکن وہ کچھ نہ کہتا تھا آخر کار کپتان قیدی کے پاس کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

"دیکھو جبرو۔ اس معاملے کو اتنا آسان نہ سمجھو۔ اس واقعے سے پہلے تو جو کچھ ہو چکا۔ ہو چکا۔ لیکن اس دفعہ تم نے جسے مارا ہے وہ میرا پرانا دوست تھا۔ ہم نے اکٹھے تعلیم پائی تھی اور ملازم ہونے کے بعد بھی سگے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ مجھے تمہارے ساتھیوں کا سراغ لگانا ہے خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ اب آخری مرتبہ پوچھتا ہوں بتاؤ گے یا نہیں؟"

جبرو نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "مجھے معلوم نہیں۔"

کپتان نے کہا۔ "پھر سوچ لو۔ ایسا نہ ہو پچھتانا پڑے ——" ڈاکو خاموش رہا اور بدستور جیل میں بند کر دیا گیا۔ اس کا مقدمہ باضابطہ چالان ہوا اور مجسٹریٹ نے پھانسی کی سزا کا حکم سنا دیا۔ ڈاکو اب بھی خاموش تھا۔

سراغ رساں کے قتل کو تقریباً تین ماہ کا عرصہ گذر چکا تھا کہ ایک بنگالی ڈاکٹر شہر میں آیا۔ اس کی ہیئت عجب قسم کی تھی۔ پرانے فیشن کا کوٹ اور دھوتی پہنتا تھا اور سوائے اس مکان کے جو اس نے شہر سے باہر کرایہ پر لے رکھا تھا کسی جگہ آتا جاتا نہ تھا اس کا نوکر شہر سے کھانے پینے کا معمولی سامان خرید کر لے جاتا اور چونکہ وہ بھی بنگالی تھا اور کسی سے ملتا جلتا نہ تھا کسی کو ٹھیک طور پر معلوم نہ تھا کہ ڈاکٹر کیا کام کرتا ہے وہ مریض نہیں دیکھتا تھا اور اس کے پاس آنے جانے والا بھی سوائے رب نواز خاں کپتان پولیس اور کالج کے ایک دو پروفیسروں کے اور کوئی نہ تھا۔

ایک روز کپتان پولیس ڈاکٹر کے پاس آیا تو ڈاکٹر نے کہا: "دیکھئے کپتان صاحب۔ میری عمر کا مقصد سائنس کی تحقیقات ہے اور سائنس کے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن فقط علم کے لئے۔ اگر یہ مقصد مدِنظر نہ ہو تو میں کچھ نہیں کروں گا۔ میرا صاف انکار ہے"

کپتان نے جواب دیا: "ڈاکٹر صاحب میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ آپ جو کچھ کریں گے سائنسدانوں کے سامنے کریں گے"——

ڈاکٹر نے کہا "ہاں! اور صرف تجربہ کی صحت کو ثابت کرنے کے لئے ——"

چنانچہ تیاری شروع کر دی گئی۔ بازار سے تین چار چھوٹے چھوٹے موٹر خریدے گئے۔ یعنی اس قسم کے جن سے بجلی کے پنکھے چلتے ہیں۔ شیشے کے بہت سے آلات۔ ربڑ کی نلیاں۔ وغیرہ۔ ہسپتال کا ایک آپریشن کرنے کا کمرہ خالی کر دیا گیا اور اس میں ڈاکٹر اپنا سامان لگا کر صبح شام کام کرنے لگا۔

جبرو ڈاکو کو پھانسی دئے جانے کی تاریخ سے کچھ دن پہلے کپتان پولیس ایک دفعہ پھر اس کے پاس گیا اور کہنے لگا "دیکھو جبرو۔ اب بھی مان جاؤ۔ میں تمہیں آخری موقع دیتا ہوں۔ اپنے ساتھیوں کے نام بتا دو تو تمہیں نہایت سہولت کے ساتھ پھانسی دے دی جائے گی۔ ورنہ ——!"

جبرو مسکرایا: "جب پھانسی ہی دینا ہے تو دے ڈالو۔ اس سے زیادہ میرا کیا کر لوگے ——؟"

کپتان نے کہا "میں پھر کہہ دیتا ہوں کہ تم بتاؤ گے۔ ضرور بتاؤ گے:"

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

بچوں کا کہنا مانو

میرے بچے کچھ ایسی بُری طرح پلے ہیں کہ کسی وقت افسوس ہی نہیں کرتے۔ سو دفعہ سمجھا چکا ہوں کہ قوم کی حالت پر غور کرو بہتری کی تدبیریں سوچو قومی کاموں میں حصہ لو مگر کیا مجال کہ ان خود پسند پڑھاکوؤں پر کچھ اثر ہو۔

چھوٹی کی تو ایسی زبان چلی ہے کہ میں تو خیر کس گنتی میں ہوں ماں کو جواب دینے سے نہیں ٹلتی۔ اگلے دن میری بیگم لیگ کا ذکر کرتے ہوئے قومی شعار کو برقرار رکھنے کا لکچر سنا رہی تھی کہ چھوٹی بولی۔

چھوٹی۔ امی۔ آپ کی زبردستی سے ہم بچارے کڑوی زہر دوائی اندرانڈیل لیتے ہیں۔ یہ لکچر بھی آپ پلا دیجئے مگر اثر کچھ نہ ہوگا۔ قوم ہم ہیں آپ نہیں ہیں جو ہم اپنے لئے پسند کریں گے وہ ہوگا۔ آپ کیوں خواہ مخواہ ان بڈھے بڈھے لیڈروں کے کہنے میں آتی ہیں؟ انہیں کیا پتا کہ ہم لوگ کیا کرنے والے ہیں۔

بیگم بچاری دم بخود رہ گئی۔ اسے اپنا زمانہ یاد آیا۔ ان کے ابا قوم کا ذکر کرتے، ٹھنڈی آہیں بھرتے قومی ترقی کا راز تلاش کرتے، قومی نوحے سنتے، شاعروں کو داد دیتے اور بچے یہ ڈراما بصد ادب دیکھتے اور اب یہ حالت کہ ماں باپ کو گویا قوم ہی سے جواب ہے

مجھے الگ کر کے کہنے لگی "میں ہاری۔ تم جانو تمہارے بچے جانیں"۔

میں۔ میں پہلے ہی ہار مان چکا ہوں۔ تم جانو تمہارے بچے جانیں۔

بیگم۔ (خفا ہوکر) وہی پرانی بیہودہ عادت کہ میرا جملہ دہرا دیا۔ آخر کچھ کرو گے بھی یا یونہی منہ تکا کرو گے؟

میں۔ منہ تکتے رہنا بھی پرانی عادت ہے اور جس کی طرف تکتا ہوں وہ کچھ ایسے بُرے منہ والی بھی نہیں۔

بیگم۔ (خوش ہوکر) فقرے بازی چھوڑو کبھی تو عقل سے کام لو۔ میں تمہیں صاف صاف کہتی ہوں کہ ان بچوں میں ادب قواعد نام کو نہیں۔ اس چھٹکی کی گز بھر کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہی رہتی ہے۔ اتفاق سے میں نے سن لیا اگلے دن بڑی سے کہہ رہی تھی "ابا میں اور ہم میں کیا فرق ہے؟ انہیں افسوس کرنے میں مزہ ملتا ہے ہمیں خوش رہنے میں لطف آتا ہے۔ قومی قصے وہ دل بہلانے کی خاطر کرتے ہیں"۔

میں۔ کسی حد تک تو چڑیل نے خوب ہماری نبض پہچانی۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم میں سے اکثر قومی داستان محض اپنے ضمیر کو سلا دینے کی خاطر چھیڑ دیتے ہیں۔ مدعا یہ ہوتا ہے کہ کام کوئی اور کرے عیب ہم نکال دیں۔

بیگم۔ جھٹ تم بچوں کی طرف داری کرنے لگتے ہو۔ تو یہ بھی سچ ہے کہ قوم وہ ہیں ہم نہیں؟

میں۔ اس میں کیا شک ہے۔ ہمارے لئے تو اب باقاعدہ پسپا ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

بیگم۔ بندی ایسی بودی نہیں کہ کل کی چھوکریوں سے جواب سنے اور کچھ نہ کہے۔

میں۔ ہاں۔ جنگی پر مبارکباد عرض کرتا ہوں۔

بیگم۔ کچھ نہ کہوں گی مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ لوگ آخر کریں گے کیا؟

میں۔ ہم نے تم نے کون سا اماں باوا کا کہنا مانا کہ یہ ہمارا کہنا مانیں گے۔ اولاد ہمیشہ سے ناکہا مان چلی آتی ہے اور ہمیشہ ناکہا مان رہے گی۔ چپکے سے سہتی چلی جاؤ۔ یہ لین دین پشتینی ہے۔ دادا کا حساب پوتا چکاتا ہے۔ جو رنج میں نے باوا کو دیا اس کا بدلہ میرے باوا کا پوتا مجھ سے لے گا۔ نانی کا بدلہ نواسی لے گی۔

بیگم۔ رہنے بھی دو یہ خرافات بچوں کو ادب قواعد سکھانا ہمارا فرض ہے۔

میں۔ جی ہاں۔ قطعی۔ جب سے دنیا چلی ہے ماں باپ کا شکنجہ جاری ہے مگر نتائج آپ کے سامنے ہیں۔ ہمیں کیوں نہ بچوں کا کہنا مان لیں؟ آخر کوئی بُری بات تو نہیں کہتے۔

"فلک پیما"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

(٥)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

(٦)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

برسات کا ترانہ

پلائے جاؤ بے درنگ ~~~ پلائے جاؤ بے درنگ
مچل رہی ہیں بدلیاں
برس رہی ہیں خنکیاں
چھلک رہا ہے آسماں
کھنک رہی ہیں بوندیاں
چھڑا ہُوا ہے جلترنگ
پلائے جاؤ بے درنگ!!

(۲)

پلائے جاؤ بے درنگ ~~~ پلائے جاؤ بے درنگ
گھٹاؤں پر شباب ہے
ہواؤں میں شراب ہے
گناہ بھی ثواب ہے
فضول اجتناب ہے
سنُو نہ کوئی عذرِ لنگ
پلائے جاؤ بے درنگ!!

(۳)

پلائے جاؤ بے درنگ ~~~ پلائے جاؤ بے درنگ
گھٹا برس کے کھُل گئی
نظر بہ جام و مُل گئی

برسات کی بہار

(بہ تقلید محسن کاکوروی مرحوم)

سمتِ مشرق سے عجب شان سے اٹھا بادل — اب کوئی روز میں بھر جائیں گے سارے جل تھل
پتی پتی پہ چمن کی ہے یہ جوبن آیا — کھل گئی فرطِ مسرت سے ہے کونپل کونپل
کھیت سرسبز ہیں نالوں سے مچی ہے اک دھوم — واہ ری شان کہ جنگل میں ہوا ہے منگل
در و دیوار پہ سبزے کی بہار آئی ہے — پہلے ویراں تھے اب آباد ہوئے دشت و جبل
قطرے پانی کے ہیں پھولوں پہ کہ یہ موتی ہیں — فرشِ سبزہ ہے زمیں پر کہ بچھی ہے مخمل
چال ہے بادِ بہاری کی فضا میں ایسی — چل رہی باغ میں ہو جیسے پری اک چنچل
کوندتی پھرتی ہے یہ ابرِ سیہ میں بجلی — کہ اندھیرے میں دکھا دی ہے کسی نے مشعل
دیکھ کر ابرِ سیہ شور مچاتے ہیں مور — ان کی آواز نے تو سر پہ اٹھایا جنگل
تو کہاں ہے مرے ساقی مرے اچھے ساقی — مدتیں ہو گئیں یار۔ اب تو پلا دے بوتل
ہائے یہ فصلِ بہار اور یہ جنوں کا موسم — کہیں آ جائے نہ ان باتوں سے ایماں میں خلل
مرے مولا۔ مری رہتی ہے طبیعت بیکل — عمر آخر ہوئی جاتی ہے کہیں ہے اجل
جانتا ہوں کہ مرا ساتھ نہ دے گی دنیا — چھوڑنا چاہتا ہوں چھوڑے بھی لیکن کم تل
دِل علائق کی طرف سے ہے پریشاں میرا — مجھ سے کہتا ہے کہ سب چھوڑ کے جنگل کو نکل
موت کے نام سے ہوتا ہے طبیعت کو ہراس — دیکھتا ہوں تو نہیں پاس ہے کچھ حسنِ عمل
تو مرا مالک و مولا ہے میں بندہ ہوں ترا — تیری رحمت کا بھروسا ہے مجھے عزّ و جل
نفسِ امّارہ نے مولا نہ کہیں کا رکھا — مار ڈالا مجھے اس موذی نے دے اس کو کچل

وہ کرم حال پہ میرے ہو کہ دکھ دور ہوں سب
وہ عنایت ہو کہ کھل جائے مرے دل کا کنول

سید نذر حسن۔ ناشاد

کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں مگر بڑا فکر یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں اُن کی حق تلفی نہ ہو جائے کیوں کہ جن بے چاروں نے اتنی جاں فشانی اور عمر بھر کی محنت کا اجر فقط نام کو سمجھا اُن کے حصے میں کسی طرح کا نقص ڈالنا سخت ستم ہے۔

It is a Celebrated Thought of Socrates that if all the misfortunes of mankind were put into a public stock, in order to be publicly distributed among the whole species, those who now think themselves to be most unhappy would prefer the share they are already possessed of, before that which would fall to them by such a division. Horace has carried this thought a great deal further in the motto of my paper which implies that the hardships and misfortunes we lie under are more easy to us than those of any other person would be, in case we change condition with them. As I was ruminating upon these remarks in my elbow-chair, I insensibly fell asleep; when on a sudden, methought there was a proclamation made by Jupiter that every mortal should bring his griefs and Calamities and throw them together in a heap.

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہلِ دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اب اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو اور بھی بالا تر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔ میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان الافلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہلِ عالم اپنے رنج و الم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔

محمد صادق

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض
نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

اقبال

[illegible]

These are two kinds of immortality; that which the Soul really enjoys after this life, and that imaginary existence by which men live in their fame and reputation. The best and the greatest actions have proceeded from the prospect of the one or the other of these: but my design is to treat only of those which have chiefly proposed to themselves the latter as the principal reward of their labours. It was for this reason that I excluded from my tables of fame all the great founders and votaries of religion; and it is for this reason also that I am more than ordinarily anxious to do justice to the persons of whom I am now going to speak: for since fame was the only end of their enterprises and studies, a man cannot be too scrupulous in allotting them their due proportion of it.

[illegible]

یا دو مقامات پر اصل سے قصداً انحراف کیا گیا ہے مثلاً سیرِ زندگی کا آخری حصّہ یا شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار کا پہلا اور تیسرا پیرا آزاد نے اصل پر اضافہ کئے ہیں۔ شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار اور اڈیسن کے مضمون میں جس سے وہ ماخوذ ہے صرف یہ فرق ہے کہ اڈیسن اپنے مضمون میں مشاہیرِ یورپ کا ذکر کرتا ہے اس کے برعکس آزاد کا مضمون ہندوستانی مشاہیر پر مشتمل ہے دوسرے لفظوں میں مضمون کا درمیانی حصّہ آزاد کا اپنا ہے اور باقی حصّے اڈیسن سے ماخوذ ہیں۔

اب میں آپ کی خدمت میں ایک ایک کر کے آزاد کے مضامین اور انگریزی مضامین کے نام پیش کرتا ہوں جن سے وہ ترجمہ کئے گئے ہیں

۱۔ آغازِ آفرینش میں باغِ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا۔ — 1 An Allegorical History of Rest and Labour (JOHNSON)

۲۔ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ۔ — 2. Truth, Falsehood and Fiction, an allegory (JOHNSON)

۳۔ گلشنِ امید کی بہار — 3. The Gardon of Hope (JOHNSON)

۴۔ سیرِ زندگی — 4. The Voyage of Life. (JOHNSON)

۵۔ انسان کسی حالت میں خوش نہیں رہتا۔ — 5. The Endeavour of Mankind to get Rid of Their Burdens (Addison)

۶۔ علم کی بدنصیبی۔ — 6. The Conduct of Paleonage (JOHNSON)

۷۔ علمیت اور ذکاوت کے مقابلے۔ — 7. The Allegory of Wit and Learning (JOHNSON)

۸۔ جنت الحمقا۔ — 8. Paradise of Fools (PARNELL)(Spectator)

۹۔ خوش طبعی۔ — 9. False Wit and Humour The Spectator no 35 (Addison)

۱۰۔ نکتہ چینی — 10 Allegory of Criticism (JOHNSON)

۱۱۔ مرقعِ خوش بیانی — 11. Allegory of Several Schemes of Wit

Spectator, No 63, May 12, 1711

۱۲۔ سیرِ عدم — 12. The Spetator: No: 501, oct 4, 1712

۱۳۔ شہرتِ عام و بقائے دوام کا دربار — 13 The Vision of The Table of Fame.

Addison, TATLER: No: 81 Oct 15, 1709.

آپ پوچھیں گے کہ جب اکثر لوگوں کی رائے میں مولانا انگریزی زبان سے ناآشنا تھے یا انہیں کم از کم انگریزی زبان پر اس قدر عبور نہ تھا کہ وہ اس کی عبارت کا اپنی زبان میں ترجمہ کر سکتے تھے تو پھر انہوں نے ان مضامین کا ترجمہ کیسے کیا؟ مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اگر آزاد کی تصانیف کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انہیں انگریزی زبان پر اپنے معاصرین کے اندازے سے کہیں زیادہ قدرت حاصل تھی۔ یہ درست ہے کہ ہمارے پاس آزاد کے انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف ہونے کی کوئی بلا واسطہ اور قطعی شہادت نہیں۔ مولوی خلیل الرحمٰن کا بیان ہے کہ آزاد انگریزی سمجھ تو سکتے تھے لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے انہیں اس پر زیادہ عبور نہ تھا چونکہ اس مسئلے کے متعلق ہمارے پاس کوئی معاصرانہ شہادت نہیں۔ اس لئے ہمیں چار و ناچار ان کی تصانیف اور ادبی سرگرمیوں ہی سے بالواسطہ شہادت تلاش کرنی پڑتی ہے۔

یہ امر کہ آزاد انگریزی زبان سے کافی واقفیت رکھتے تھے نیرنگِ خیال کے ان اقتباسات سے ظاہر ہے جنہیں میں اس سے پہلے پیش کر آیا ہوں۔ اس رائے کی تائید میں ہمیں اس کتاب سے ادبی شہادت ہاتھ آتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"میں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغِ شوق روشن کیا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں ان مطالب پر مشتمل ہیں جنہیں (Essays) کہتے ہیں:

نیرنگِ خیال کے متعلق چند تازہ انکشافات

اگر نیرنگِ خیال کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آزاد اسے لکھتے وقت ایک سخت ذہنی اُلجھن میں مبتلا تھے۔ یہ کش مکش کچھ اُسی قسم کی ہے جو ہارڈی کے اکثر کردار اپنی زندگی کی اُن پُر آزمائش گھڑیوں میں محسوس کرتے ہیں جب مدت العمر کی بدنصیبی کے بعد انہیں اپنی زندگی میں امید کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس وقت ان کی عقلِ سلیم اور فطری انصاف پسندی اس امر کی متقاضی ہوتی ہے کہ وہ اپنی گذشتہ زندگی کی تمام روداد جس کا بیشتر حصہ صنفی کمزوریوں سے متعلق ہوتا ہے، کہہ سنائیں۔ لیکن ان کے بڑھتے ہوئے جذبات اور زندگی کی خواہش یا تو انہیں اِن واقعات کو چھپانے پر مجبور کرتی ہے یا وہ انہیں ایسے ادھورے اور مبہم طریقے سے بیان کرتے ہیں جس سے اُن کا مفہوم اچھی طرح ظاہر نہیں ہوتا۔ بعد میں جب یہ واقعات آشکار ہوتے ہیں تو اُن کا اثر طرفین کے لئے نہایت ناخوش گوار ثابت ہوتا ہے۔ بعینہٖ یہی حالت آزاد کی ہے وہ نیرنگِ خیال کے ماخذوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت کچھ کہہ بھی گئے ہیں لیکن ایسے انداز میں کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے پھر بھی کوئی شخص اب تک ان کے اصلی مفہوم سے آگاہ نہیں ہو سکا۔

نیرنگِ خیال مصنف کی طبع زاد تصنیف خیال کی جاتی ہے بجز اس کے کہ اس کا مواد غالباً ڈاکٹر لائیٹنر نے بہم پہنچایا۔ یہ رائے شیخ عبدالقادر نے جو بعد میں سر کے خطاب سے مفتخر ہوئے، آزاد کے متعلق اپنے ایک خطبہ میں ظاہر کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ "میں نے بعض لوگوں کی زبانی سنا ہے اور غالباً اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت بھی ہے کہ مصنف کو اس کتاب کا ڈھانچہ ڈاکٹر لائیٹنر سے ہاتھ آیا جو بذاتِ خود یونانی اور انگریزی ادبیات کا عالم تھا۔ اس نے آزاد کو اپنے خزانۂ معلومات سے معتد بہ طور پر بہرہ مند کیا اور مولانا مرحوم نے اسی مواد کی بنا پر نیرنگِ خیال کی عمارت تعمیر کی۔"

اس کتاب کے متعلق آزاد کے اپنے بیان تین ہیں اور وہ سب کے سب برسبیلِ تذکرہ اور مبہم ہیں۔ پروفیسر مرحوم مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"یہ چند مضمون جو لکھے گئے ہیں، نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کئے گئے ہیں۔ ہاں جو کچھ کانوں نے سُنا، اور فکرِ مناسب نے زبان کے حوالے کیا۔ ہاتھوں نے اُسے لکھ دیا۔"

اگر اس طولانی اور پیچیدہ عبارت کو سیدھی سادی نثر میں ادا کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جو باتیں مجھے سمجھائی گئی ہیں، میں نے انہیں قلمبند کر لیا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر آپ نے ان مضامین کو ترجمہ نہیں کیا بلکہ محض اُس مواد پر حاشیہ آرائی کی ہے جو انہیں مہیا کیا گیا۔ اسی مقدمے میں وہ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"انگریزی میں یونان اور روما کے مضامین کے ساتھ وہاں کے مذہب اور رسومِ قدیم کی باتیں اب تک انشا پردازی کا جزو ہیں۔ رومی اور یونانی ستارہ ہائے فلکی اور اکثر قوائے روحانی کے دیوتا جانتے تھے۔ چنانچہ انگریزی میں بڑے بڑے انشا پرداز وہی کہلاتے ہیں جن کی چشمِ سخن ہر بات میں ان کے قصوں پر اشارہ کرتی جائے مگر اُردو کے باغ نے فارسی و عربی کے چشموں سے پانی پایا ہے۔ وہاں دیوی دیوتا کا گذر نہیں۔ اور یہ سخت دشواری ہے کیوں کہ لکھنے میں اگر تصرف کریں تو ترجمہ نہ رہا اور اگر اصل کی رعایت کی تو کتاب معمائے دقیق ہوگئی نہ کہ رفیقِ تفریح۔" ظاہر ہے کہ یہاں آزاد ان دشواریوں کا ذکر کر رہے ہیں جو انگریزی عبارات و خیالات کو اُردو میں منتقل کرتے وقت پیش آتی ہیں۔ یہاں قابلِ غور امر یہ ہے کہ آزاد ذاتی مشکلات کا ذکر نہیں کر رہے ہیں بلکہ اُن تکالیف کا جو یونانی علم الاصنام کی بھرمار کی وجہ سے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرتے وقت پیش آتی ہیں۔

تیسرا بیان "علمیت و ذکاوت کے مقابلے" کے فُٹ نوٹ میں دیا گیا ہے جو ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

"انگریزی میں وِٹ اور لرننگ کا مباحثہ تھا۔ میں نے وِٹ کے واسطے بہت خیال کیا۔ کوئی لفظ نہ ملا۔ ناچار ذکاوت لکھ دیا۔"

مجھے ان مضامین کے انگریزی سے ماخوذ ہونے کا شبہہ اُس صریح مشابہت سے پیدا ہوا جو آزاد کے مضمون "سیرِ زندگی" اور جانسن کے "دی وائیج آف لائف" میں دکھائی دیتی ہے۔ جب میں نے ان کا موازنہ کیا تو آزاد کا مضمون انگریزی مضمون کا آزاد ترجمہ ثابت ہوا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی وہ زمانہ ہے جب انگریزی زبان میں تمثیلی موضوعات پر مضمون لکھنے کا مشغلہ اپنے پورے زور پر تھا چنانچہ جب میں نے اس صدی کی نثر کا مطالعہ کیا تو میرا شک یقین کے درجہ تک پہنچ گیا۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ نیرنگِ خیال کے تمام مضامین انگریزی مضامین کا ترجمہ ہیں۔ البتہ اصل سے جس حد تک استفادہ کیا گیا ہے اس کا درجہ مختلف ہے۔ ان میں سے اکثر لفظی تراجم ہیں اگرچہ بعض حصّوں میں کسی قدر حاشیہ آرائی سے بھی کام لیا گیا ہے [illegible]

پیشوں کی بنیاد پر جمہور کی نمائندگی

معاشری حالات کی تبدیلی کے ساتھ جمہوری اداروں کی ساخت اور اُن کے طریق کار میں تبدیلی پیدا ہونا لازم ہے۔ موجودہ صدی کی ابتدا میں بالخصوص ۱۹۱۴ء - ۱۸ء کے بعد جمہور کے نمائندہ اداروں کے نظام پر بہت ناقدانہ غور و فکر کی گئی۔ اس غور و فکر کے نتیجے کے طور پر جمہوری اداروں کے نظام میں کچھ ایسی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی گئی جن سے اُن میں عوام کی بہتر نمائندگی کا انتظام ہو سکے۔

ان تبدیلیوں میں سے اہم ترین تبدیلی جو ضروری سمجھی گئی یہ تھی کہ جمہور کی نمائندگی کی بنیاد شہری و ملکی حدود کے بجائے ان کے مختلف پیشوں پر قائم کی جائے برطانیہ میں گلڈ سوشلسٹوں کی تحریک کا مقصد بھی یہی تھا۔ صحیح نمائندگی کا اصول ہی یہ ہے جمہور کی نمائندگی بہ اعتبار عام افراد کے نہ ہو بلکہ اُن کے خاص خاص مشترک مقاصد کے اعتبار سے ہو۔ مثلاً ڈاکٹروں، زمینداروں، سُناروں اور خانگی ملازموں وغیرہ کی الگ الگ نمائندگی کا انتظام ضروری ہے۔

ہندوستان کے مختلف پیشہ وروں کے متعلق ذیل کا نقشہ اعداد و شمار جو ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ سے لیا گیا ہے اس سلسلے میں دلچسپی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

مختلف ذاتیں	کل تعداد جس میں عورتیں، کمانے والے مرد اور ماتحت کارندے شامل ہیں	اُن لوگوں کی تعداد جن کے روزگار کا ذریعہ اُن کا آبائی پیشہ ہے	اُن لوگوں کی تعداد جو اپنے دوسرے کام کے ساتھ زائد آمدنی کے لئے اپنے آبائی پیشے پر بھی قائم ہیں
بڑھئی	۷۶۰۰۶۰	۳۳۶۱۷۶ یا ۴۴ فی صدی	۶۸۹۲۰ یا ۹ فی صدی
بھنگی	۵۵۵۸۲۹	۳۱۰۹۸۳ یا ۶۰ فی صدی	۱۰۳۳۵ یا ۱ء۸ فی صدی
چمار	۵۰۷۵۳۰۷	۳۸۶۱۹۷ یا ۷ء۶ فی صدی	۸۹۸۷۷ یا ۲ فی صدی
درزی	۲۱۲۳۵۹	۱۲۳۶۸۷ یا ۵۸ فی صدی	۱۵۹۷۵ یا ۷ فی صدی
دھوبی	۹۵۱۰۵۸	۴۳۶۶۹۹ یا ۴۶ فی صدی	۹۳۶۳۱ یا ۹ فی صدی
گوجر	۷۱۲۰۶۶	۲۶۹۱۳۰ یا ۳۸ فی صدی	۱۲۳۶۲ یا ۱ء۷ فی صدی
جاٹ (کاشتکار)	۲۶۸۷۹۹۱	۱۷۵۳۴۸۸ یا ۵۵ فی صدی	۷۷۷۰۲ یا ۳ فی صدی
کھتری	۱۸۵۱۷۳	۹۲۹۹۲ یا ۵۰ فی صدی	۲۴۶۸ یا ۱ء۳ فی صدی
کُرمی (کاشتکار)	۲۰۵۸۵۸۰	۱۳۳۵۹۹۷ یا ۶۵ فی صدی	۳۳۶۹۳ یا ۱ء۶ فی صدی
کمہار	۳۶۹۹۰۲۳	۹۹۵۳۰۰ یا ۲۷ فی صدی	۱۰۳۰۹۱ یا ۱۰ء۳ فی صدی
لوہار	۷۶۳۵۸۲	۲۷۴۵۳ یا ۳ء۵ فی صدی	۶۵۱۶۸ یا ۸ء۵ فی صدی
تیلی	۱۰۷۹۲۲۹	۲۰۵۲۲۵ یا [illegible] فی صدی	۱۰۶۳۵۱ یا ۹ء۸ فی صدی
سُنار	۲۷۴۱۳۴	[illegible] فی صدی	۱۶۶۱۹ یا ۶ فی صدی

شوبرٹ کو اپنے ایک گیت کے معاوضے میں پانچ پاؤنڈ وصول ہوئے۔
کانن ڈائل کو "روڈنی سٹون" کے معاوضے میں سات ہزار پاؤنڈ حاصل ہوئے۔
اے۔ ایس۔ ایم۔ ہچنسن نے "اف ونٹر کمز" کے معاوضے میں تیس ہزار پاؤنڈ وصول کئے۔
ایڈم سمتھ کو "ویلتھ آف نیشنز" کے معاوضے میں پانسو پاؤنڈ ملے۔
مارلے نے "لائف آف گلیڈسٹن" کا مسودہ دس ہزار پاؤنڈ میں فروخت کیا۔
لیڈی آکسفورڈ کو اپنی سوانحعمری کے معاوضے میں تیرہ ہزار پاؤنڈ ملے۔
ٹامس گرے کو اپنی مشہور نظم Elegy written in a Country Churchyard کے معاوضے میں کچھ وصول نہ ہوا
ہندوستان کے عام مصنف اور شاعر ٹامس گرے کے ہم قسمت ہیں۔

ٹراونکور کی تعلیمی ترقی

تازہ اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ ٹراونکور تعلیمی ترقی کے لحاظ سے ہندوستان میں سب سے آگے ہے۔ ہندوستان کے سینسس کمشنر نے ہندوستانی صوبوں اور ریاستوں کی آبادی اور تعلیم کے اعداد و شمار ٹراونکور کی حکومت کو بھیجے ہیں۔ بڑی بڑی ریاستوں کی آبادی حسب ذیل ہے:

	آبادی
حیدرآباد	۱۶۰۰۰۰۰۰
میسور	۶۲۵۰۰۰۰
ٹراونکور	۶۰۰۰۰۰۰
کشمیر	۴۰۰۰۰۰۰
گوالیار	۴۰۰۰۰۰۰
بڑودہ	۳۰۰۰۰۰۰
کوچین	۱۵۰۰۰۰۰

تعلیم کے نقطۂ نظر سے ٹراونکور کا درجہ ہندوستان میں سب سے ممتاز ہے۔ اس ریاست میں ۸۸ء۴۷ فیصدی آبادی تعلیم یافتہ ہے۔ کوچین تعلیم کے لحاظ سے دوسرے درجے پر ہے۔ یہاں ۴۲ء۳۵ فیصدی آبادی تعلیم یافتہ ہے۔ دہلی میں تعلیم یافتہ آبادی ۲۵ء۷ فی صدی اور بڑودہ میں ۲۳ء۰۱ فی صدی ہے۔
صوبوں میں مدراس، بمبئی اور بنگال میں علی الترتیب ۱۳ء۰۱، ۵۰ء۹ اور ۱۲ء۱۶ فی صدی لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔
عورتوں کی تعلیمی ترقی کے لحاظ سے ٹراونکور اور زیادہ قابل ذکر ہے۔ یہاں کی ۳۶ فی صدی عورتیں تعلیم یافتہ ہیں۔ دوسری ریاستیں اور صوبے اپنے مردوں کی تعلیمی حالت سے بھی یہاں کی عورتوں کی تعلیمی ترقی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

وٹامن سی

اگر جسم کے کسی حصے پر عمل جراحی کیا جائے تو زخم آہستہ آہستہ بھرتا ہے لیکن اگر جسم میں وٹامن سی کی کمی ہو تو زخم کے اچھا ہونے کی رفتار بے حد سست ہو جاتی ہے بلکہ زخم بگڑ بھی جاتا ہے۔ وٹامن سی زیادہ تر سنگترے [illegible] ہرے پھلوں اور سبزیوں میں پائی جاتی ہے۔

جہاں نما

پرنسپل رام پرشاد ناشاد کی رحلت

یہ خبر تمام تعلیمی و ادبی حلقوں میں انتہائی رنج سے سنی جائے گی کہ پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ۱۲ جون ۱۹۴۲ء کو اس جہانِ فانی سے انتقال فرما گئے مرحوم ناشاد تخلص کرتے تھے اور مدت سے ہمایوں اور اردو کے دوسرے ادبی رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ سادگی صداقت پسندی اور حقیقت نگاری اُن کے خیالات و کلام کی خصوصیات تھیں۔ اُن کی تصنیف "مغل بادشاہت اور کلچرا ہندوستان کی تاریخ کے سلسلے میں ایک اعلیٰ حیثیت رکھتی ہے۔ شاید کسی اور ہندو مصنف نے ایسے انصاف اور بلند نظری کے ساتھ مغلوں کے کارناموں کا اعتراف نہیں کیا جیسا مسٹر کھوسلہ نے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں "ہندوستان کے مغلیہ شاہنشاہوں کے حق میں ہمیں یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ وہ عام طور پر اُس وسیع طاقت کا جو انہیں حاصل تھی غلط استعمال نہ کرتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کو کبھی ایک مسلم مملکت نہیں بنایا۔ انہوں نے سیاسی طور پر ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ برابری کا درجہ عطا کیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے سیاسی خیالات کو یہاں کے حالات کے سانچے میں ڈھال لیا اور یہی اُن کی طاقت کا راز تھا۔ مغل قومی بادشاہ تھے۔" پھر ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ "عدل کے بارے میں اورنگ زیب اپنے سب بزرگوں سے سبقت لے گیا۔"

مسٹر کھوسلہ ایک نہایت ہوشیار طالب علم ایک نہایت قابل پروفیسر اور ایک نہایت ہمدرد انسان تھے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی میں بی۔ اے اور ایم۔ اے میں اول رہے اور آکسفورڈ میں جا کر انہوں نے اپنے علمی کام میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ اُن کے انگریز معلم کا قول تھا کہ وہاں تمام ہندوستانی طلبا میں جن سے مجھے واسطہ پڑا سب سے زیادہ ذہین تھے۔ وہ پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے پھر مختلف تعلیمی اداروں میں کام کرتے ہوئے آخیر میں پٹنہ کالج کے پرنسپل ہو گئے پنجاب اور بہار دونوں صوبوں میں انہیں غریبوں کا دوست سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہر غریب طالب علم کو ہمیشہ مفت پڑھانے پر تیار رہتے تھے۔

پبلک حیثیت سے قطع نظر مجھے مسٹر کھوسلہ سے ایک خاص ذاتی تعلق تھا۔ پہلے پہل میرا اُن سے واسطہ پڑا جب گورنمنٹ کالج لاہور میں ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۰ء تک پروفیسر رام پرشاد تاریخ کے پروفیسر تھے اور میں ایف۔ اے کی جماعت میں دو سال تک اُن سے پڑھتا رہا۔ پھر جب میں آکسفورڈ گیا تو وہ بھی بعد میں وہاں بطور طالب علم کے مجھ سے آکر ملے ہمارے رخصت لے کر جب وہ پھر لاہور واپس آئے تو کبھی کبھی اُن سے دوستانہ ملاقات ہوتی رہی۔ مسٹر کھوسلہ کی سلجھی ہوئی طبیعت کا ایک وصف میں کبھی نہ بھولوں گا یہ تھا اُن کا سچا انکسار۔ باوجود مسلّمہ قابلیت کے غرور ان میں نام کو نہ تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب طالب وہ گورنمنٹ کالج میں لکچر دیا کرتے تھے ان کی نگاہ ہمیشہ اپنی میز پر جمی رہتی تھی۔ اُن میں جھجک نہ تھی لیکن وہ انتہا درجہ منکسر المزاج اور خاکسار تھے۔ بڑے آدمیوں سے عموماً بچ کر رہتے اور دنیا سے الگ تھلگ ایک مرنجاں مرنج زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے حالات سے پورے مطمئن تھے اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے تھے لیکن اپنی انتہائی حساسیت کی بنا پر صرف شاعرانہ طور پر نہیں بلکہ فلسفیانہ طور پر بھی ایک "ناشاد" شخصیت کے مالک تھے۔ ناشاد لیکن باہمت اور بلند نظر اور بلند حوصلہ! وہ نیچی نگاہیں اور وہ شفقت بھرا چہرہ اب ہمیشہ کے لئے چھپ گیا لیکن اُس قابلیت اور محبت کی یاد جلد نہیں مٹ سکتی!

ب ک

بعض مشہور تصانیف کے مسوّدوں کی قیمت

اولیور گولڈ سمتھ نے اپنے مشہور ناول "وکار آف ویکفیلڈ" کا مسودہ ساٹھ پاؤنڈ میں فروخت کیا۔

للنڈ جارج نے اپنی خود نوشتہ سرگذشتِ زندگی کے مسودے کی قیمت ایک لاکھ پاؤنڈ وصول کی۔

شیکسپیئر اپنے ڈراموں سے تقریباً تیس پاؤنڈ سالانہ کماتا تھا۔

الن کیمبل کی "وائف آف کرائسٹ" کا مسودہ ساٹھ ہزار پاؤنڈ میں بکا۔

جلد ۴۱ — ۴۲

فہرست مضامین

نمبر ۱

"ہمایوں" بابت ماہ جولائی ۱۹۴۲ء

چندہ سالانہ ۶ ؍ ششماہی ۳ ؍ مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ ؍

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن)، بیرسٹرایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مطبوعات

رنگ و بو۔ پروفیسر سید فیاض محمود صاحب کے پندرہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ تمام افسانے ہندوستانی بلکہ پنجابی سماج کے متوسط طبقے سے متعلق ہیں اور ان کی فضا بھی گھریلو ہے۔ ان افسانوں میں تصنع یا بناوٹ نام کو نہیں۔ بلکہ سادگی اور خلوص ان کی دو سب سے نمایاں خصوصیات ہیں۔ پروفیسر فیاض محمود کے سارے کردار سوسائٹی کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ عام طور پر اکثر افسانوں کا پلاٹ ایک ہی قسم کا ہے تاہم اندازِ بیان اس قدر شگفتہ ہے کہ کوئی افسانہ پھیکا معلوم نہیں ہوتا۔ پروفیسر صاحب کا محبوب موضوع ایک ہی کنبے کے مختلف افراد یا بالفاظِ صحیح تر رشتہ داروں کا باہمی عشق ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایک سے زیادہ افسانوں میں ماموں زاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد بھائی بہنوں میں عشق دکھایا گیا ہے۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ عریانی کے عیب سے بالکل پاک ہیں۔ وہ ترقی پسند افسانہ نگار جو جنسی عشق ہی کو حاصلِ زندگی سمجھتے ہیں اور جن کے نزدیک ترقی پسندی کا معیار اس عشق کی آڑ میں عریاں نگاری ہے اگر ان افسانوں کا مطالعہ کریں تو ان کے لئے مفید ہوگا اور انہیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ تہذیب اور شائستگی کے دائرے کے اندر رہ کر بھی عشق اور جنسی عشق کے متعلق کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ پروفیسر صاحب کے بعض کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ واقعی مستحقِ داد ہے۔ عام رواج کے خلاف پروفیسر صاحب نے اس مجموعے کا دیباچہ بھی خود ہی لکھا ہے۔ اپنے دیباچہ میں "اچھے افسانہ" کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے "مگر افسانے میں خواہ شعری خوبی ہو خواہ کسی واقعے کا بیان ہو اور خواہ کردار نگاری پر زور دیا گیا ہو وہی افسانہ فنی لحاظ سے اچھا سمجھا جاتا ہے جس میں مصنف کے ملک اور قوم کے تمدن اور تہذیب کی عکاسی ہو۔ اگرچہ افسانے کا میدان محدود ہے تاہم اس میں بھی افسانہ نگار اپنے طرزِ بیان کی مدد سے (کنایۃً ہی سہی) اپنے ماحول کے ان اساسی حقائق کو واضح کر دیتا ہے جو کسی تمدن کی جان ہوتے ہیں۔ اسی لئے افسانے کی حقیقت محض ایک قصے اور کہانی کی نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں افسانہ بھی نظم، ڈراما اور ناول کی طرح تمدن و معاشرت کی ترجمانی کا حق رکھتا ہے۔

ان تفصیلات کے بیان سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ میرے افسانے لفظاً و معناً اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تحریر میں میرا مطمحِ نظر یہ ضرور رہا ہے کہ اول ان کی افسانوی حیثیت برقرار رہے، دوم وہ کسی ایک طبقے یا جماعت کی ترجمانی میں محصور نہ ہو جائیں۔ بلکہ ہماری تہذیب اور عام مشرقی طرزِ زندگی کے نمائندہ ہوں۔ اور ان سے ہماری قدیم اور جدید مشرقی شان اور ہمارا مخصوص معاشرتی ماحول اور ہمارا طریقۂ زندگی آشکار ہو"

ان افسانوں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب اپنے مطمحِ نظر کے حصول میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ کتاب کی قیمت عہ ملنے کا پتا: مکتبہ اردو لاہور

"نظامی"

حرفِ ناتمام منشی مہاراج بہادر برق دہلوی مرحوم کا مجموعۂ کلام ہے۔ برق کے کلام میں بقولِ علامہ کیفی ہر قسم کے موضوع ملتے ہیں۔ داخلی بھی اور خارجی بھی۔ وہ کیٹس پرستی اور منظر نگاری دونوں میں برق تھے۔ ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان تھی۔ ہندو تہذیب اور ہندو تاریخ سے متعلق برق نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ حرفِ ناتمام کے شروع میں علامہ کیفی، خواجہ حسن نظامی، مسٹر آصف علی، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور خواجہ محمد شفیع دہلوی کے دیباچے بھی شامل ہیں۔ قیمت مجلد دو روپے غیر مجلد عیر۔ پتا: طالب دہلوی چاوڑی بازار گلی تیا شاں دہلی

"ن"

اشتہار

ضرورتِ رشتہ۔ ایک اعلیٰ اور متمول مسلم راجپوت خاندان کی لڑکی کے لئے ایک جوان عمر اعلیٰ تعلیم یافتہ برسرِ روزگار، شریف اور متمول مسلم راجپوت لڑکے کی ضرورت ہے پنجاب کے رہنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔

لڑکی اس سال میٹرک کا امتحان دے چکی ہے عمر پندرہ سال ہے۔ قبول صورت، نیک بہت حلیم الطبع اور خوش اخلاق ہے۔ خواہشمند حضرات ذیل کے پتہ پر خط و کتابت کریں: "ص" معرفت رسالہ "ہمایوں" لاہور

سید عبد اللطیف پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس ... لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۳۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا

سمجھئے خفیہ پولیس کی رپورٹ شہر کی جھاڑو۔ یہ آتی ہیں تو دو تین گھنٹوں سے پہلے اٹھنے کا نام نہیں لیتیں۔ اور مصیبت یہ ہوتی ہے کہ میں اپنے کمرے کے باہر جا نہیں سکتا۔ پردہ کا معقول انتظام کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں انہیں اپنی سہیلیوں کی آمد اور نشست برخاست کا اطمینان ہوتا ہے۔ ان سہیلی صاحبہ کو مجھ سے خاص ہمدردی ہے، کہتی ہیں کہ "تجھے شوہر نہیں بکری کا بچہ ملا ہے۔ کتنا خاموش، کتنا شریف" اور انہیں میرے سامنے آنے کا بھی بڑا شوق ہے۔ "دولہا بھائی سے کیا پردہ" مگر میں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا ہے کہ "دور کے ڈھول سہانے۔ بس جس حال میں ہوں اسی میں خوش ہوں" تو وہ آئیں بزرگانِ دین کے نام دُہرا دُہرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ "یہ تصویر کس کی ہے وہ تصویر کس کی ہے۔ یہ کیلنڈر بہت اچھا ہے۔ میں اسے لے جاؤں گی" اور اس کے بعد پاندان کھسکا کر "تو سنا تم نے اس بے چاری کے خاوند نے اسے چھوڑ دیا۔ فلاں جو ہیں نا ان کے گھر بچہ ہوا ہے مگر گھر والے خوش نہیں اور اس سال استانی ماں کے ہاں نیاز نہیں ہوئی" "پان پر چونا کتھا لگایا جاتا ہے۔" "وہ جو میرے گھر کے پاس رہتے ہیں ساس بہو میں بس ایسی رہتی ہے" وہ پان کو کشتی میں رکھ کر قینچی کی شکل بناتی ہیں اور دوبارہ پان ہاتھ میں آجاتا ہے۔ "کل بچے کی بسم اللہ ہے تم ضرور آنا" "میری چمپا کلی تو چوری گئی، تمہارے پازیب ہوں تو میں رات کی رات لے جاتی ہوں۔" اور ایک شادی کی تفصیل پان کے ختم ہونے تک جاری رہتی ہے۔ خدایا میری بیوی کو ان باتوں میں دلچسپی کیسے ہوتی ہوگی۔ جاتے جاتے وہ پازیب اور کیلنڈر لئے جاتی ہیں اور میرے لئے دعاؤں کا ایک طومار بخشتی ہیں۔ ان کا جانا ہی میرے لئے ایک برکت ہے۔ میں پودوں کی دیکھ بھال کے لئے صحن میں نکل آتا ہوں۔ "ارے توبہ معاف کیجئے" میرے منہ سے نکلتا ہے یہ بھی ان کی ایک سہیلی ہیں۔ تیزی اور شوق ملاقات میں اندر گھس آئیں اور مجھ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ بوٹا سا قد، گورا رنگ، گداز جسم، آنکھوں پر چشمہ، کسی اسکول کی معلمہ ہیں۔ تقریر کا بڑا شوق ہے۔ میری بیوی کے سامنے تقریروں کی مشق کی جاتی ہے اور آپ اندازہ کیجئے کوئی تقریر کرنے پر اتر آئے تو کتنی خوش گوار اور پرسکون فضا مسلط ہو جاتی ہے۔ خدا بچائے میں اپنے کمرے میں جانے کے بجائے باہر چلا جاتا ہوں، ان کے دفعہ ہونے پر اندر بلایا جاتا ہوں۔ دیکھتا کیا ہوں بیوی کے چہرہ کا رنگ بدلا ہوا ہے، "کیوں کیا بات ہے" میں مسکراتا ہوا پوچھتا ہوں۔ "آپ سے مجھے بڑی شکایت ہے۔ آپ نے میری سہیلی کا پردہ توڑ دیا، اس کو دیکھ کر آپ ہٹ کیوں نہیں گئے۔ وہ کہتی تھی آپ نے اس کا راستہ روک دیا، قصداً۔" آپ کے قریب چھوٹا یا بڑا پتھر ہو تو عنایت فرمائیے ذرا میں اپنا سر پھوڑ لینا چاہتا ہوں، سہیلی بیچاری آئی گھر کا سارا پروگرام ستیاناس کر دیا۔ وقت خراب کر دیا، اور جاتے جاتے یہ شگوفہ کھلا گئی بیچاری" اس پر بھی وہ کہتی ہیں کہ جیسے میرے دوست ویسی ان کی سہیلیاں ہیں۔ زمین آسمان کو ملانے پر کوئی تُل جائے تو سوائے خاموش رہنے کے اور کوئی چارہ نہیں، اسے ان کا ذکر تو میں بھول ہی گیا، جو اکثر اپنے خاوند سے لڑ کر آتی ہیں اور دو دو تین تین روز غریب خانہ پر قیام پذیر ہوتی ہیں اور میرا وہ حال ہوتا ہے جیسے کسی غیر کے گھر مہمان ہوں اور مالک مکان کسی اہم تقریب میں مصروف ہے، جھولے پڑ جاتے ہیں، تلن ہوتا ہے، قسم قسم کے کھانے پکتے ہیں، کیونکہ انہیں پکوان کا بڑا شوق ہے، گانا ہوتا ہے سننا اور دیکھنا شرط ہے۔ کیا نہیں ہوتا ان دنوں میں، ہم سے روٹھ روٹھ کر لڑ لڑ کر جو قیمتی ساڑھیاں منگوائی جاتی ہیں ان میں سے کوئی اس سہیلی کے پسند آجائے تو اس کے نذر ہو گئی سمجھئے۔ اب اسے اُنہی ساڑھی میں بنا ٹھنا دیکھ کر ہمارے دل پر کیا گزرتی ہوگی، ایک شوہر کا دل اپنے سینے میں رکھ کر محسوس کیجئے، اور سہیلیوں کا یہ ٹپکا سال دو سال میں ایک آدھ دن کا نہیں مہینے میں چھ سات دن تو ضرور ایسے گزرتے ہیں جن میں "ان کے قدم میمنت لزوم" کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اور ان کے خلاف میرے دوست بلانے بلانے پر گھنٹہ دو گھنٹے کے لئے آتے ہیں اور ہنس بول کر چلے جاتے ہیں، دوست اور سہیلی کا فرق تو واضح ہو گیا ہوگا۔ اب مرحلہ یہ باقی رہ جاتا ہے کہ کس طرح ان سہیلیوں سے پیچھا چھوٹے، وہ اگر اس بات پر راضی ہوں کہ میں اپنے دوستوں سے قطع تعلق کر لوں تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں، بشرطیکہ وہ اس مصالحت پر آمادہ ہوں، ورنہ اگر یہ تصفیہ ہو کہ "آپ کے دوست بھی رہیں گے اور میری سہیلیاں بھی" تو مجبوری ہے اور مجبوری کا دوسرا نام صبر۔ اور تیسرا نام دیوان خانے میں بستر ڈلوا لینا۔ دوستوں کو دن رات روک کے رکھنا، ان کے کھانے پینے کا انتظام کرانا، تاش کھیلنا اور گپ اڑانا، یوں تو یوں ہی سہی وہ اپنی سہیلیوں میں خوش، ہم اپنے دوستوں میں خوش۔

(رشیدہ قریشی)

"سب رس"

[illegible]

محفلِ ادب

بیوی کی سہیلیاں

اجازت ہو تو میں بھی داستانِ غم بیاں کروں لیکن اجازت دینے سے پہلے یہ بھی سن لیجئے کہ سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری تو اجازت ہے۔ سنئے! میں ایک بیوی کا شوہر ہوں بیوی سے مجھے کسی قسم کی شکایت نہیں' وہ مجھے سینما دیکھنے سے منع کرتی ہیں تو میں ہنس کر ٹال دیتا ہوں اور کسی نہ کسی دعوت کا بہانہ کر کے سینما چلا جاتا ہوں' وہ میری سستی اور کاہلی پر ناک بھوں چڑھاتی ہیں تو میں طبی صداقت نامہ پیش کر دیتا ہوں اور کسی نہ کسی شکایت کا عذر مجھے بستر پر اینٹھے پڑے رہنے کا موقع فراہم کر دیتا ہے۔ ویسے بھی بیوی کی شکایت کسی خاوند کے لئے زیبا نہیں' بیوی آخر بیوی ہی ہوتی ہے۔ خاوند کی فلاح و بہبود کے لئے اسے کیا کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ بعض ہمارے دوست ہیں کوئی اپنی بیوی کے فیشن پرست ہونے کی شکایت کرتا ہے' کوئی تیز مزاجی کا رونا روتا ہے' کوئی تعلیم یافتہ ہونے کی دہائی دیتا ہے۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے میری بیوی ان ساری متذکرہ بالا خصوصیات کی حامل ہے لیکن کسی سے بھی پوچھ لیجئے جو کبھی حرفِ شکایت میری زباں پر آیا ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں فدا روشن خیال واقع ہوا ہوں۔ عورت اور بالخصوص بیوی کو مساوی حقوق دینے کا زبردست حامی ہوں' اور یہی وجہ ہے کہ اپنی بیوی کے لئے فرشتہ سیرت قابلِ پرستش اور انتہائی خوبصورت شوہر ہوں وہ ہر ملنے جلنے والے کے آگے میری تعریف کے دفتر کھول دیتی ہیں۔ اور بڑی خوش الحانی سے سنانے لگتی ہیں اور جتنی بھی ان کی سہیلیاں ہیں ان سب کے لئے میری شوہریت قابلِ رشک بنی ہوئی ہے بنتا ہوں کہ وہ میری مثال دے دے کر اپنے خاوند کی اصلاحی کاروائی کو موثر بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن میں یہ دعائیں کرتا ہوں کہ میری بیوی کی سہیلیوں کے خاوند کبھی سدھرنے نہ پائیں خدا میری "چھاؤں" ان پر کبھی نہ ڈالے۔ وہ ویسے ہی سخت مزاج' جاہل اور اکھڑ قسم کے شوہر رہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنی بیوی کو روز صبح' دوپہر' شام پیٹا کرے' دیدہ زیب ساڑیاں نہ دلائے' عورتوں میں نہ جانے دے۔ آپ کہیں گے عورتوں کو مساوی حقوق دینے والا ان مظالم کو کیسے روا رکھ سکتا ہے۔ آپ ذرا سنئے تو میں عرض کرتا ہوں اس کے بھی وجوہ ہیں یہ جو سہیلیاں کہلاتی ہیں نا عورتوں کا ایک ایسا گروہ ہوتا ہے جو بلا کی طرح آسماں سے نازل ہوتا ہے اور جب تک اپنی کسی سہیلی کے خاوند کی توبہ قبول نہیں ہوتی برابر اسے دق کرتا رہتا ہے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ بیوی سے مجھے ذرہ برابر شکایت نہیں شکایت اگر ہے تو وہ ان کی سہیلیوں سے ہے۔ ایک دو دفعہ میں نے اپنی بیوی سے انہیں نیک بخت سہیلیوں کے سلسلے میں گفتگو چھیڑ دی تھی۔ لیکن وہ دن ان کی ماما کی گم شدگی کا دن تھا وہ اپنا ساماں اور ان کی ایک انگوٹھی لے کر غائب ہو چکی تھی۔ میں بھول ہی گیا کہ انساں کے محسوسات کا اندازہ کر کے بات چیت کی جاتی ہے۔ اس ذکر پر انہوں نے بھویں سکیڑ لیں۔ "تو کیا مطلب ہے آپ کا" انہوں نے تیز لہجے میں پوچھا' میں لہجے کی سختی اور نرمی سے بالکل غیر متاثر رہتا ہوں۔ کیونکہ بیوی ہمیشہ بیوی رہتی ہے البتہ اس کے مشتقات مثلاً نظریں' خیالات' طرزِ عمل اور لہجہ ہمیشہ ہر لحظہ بدلتے رہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے پوری ملائمت اور سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ یہ ہے کہ ..... کہ آپ نے آخر انہیں اتنا سر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ کچھ تو اپنے پٹھان خون کا جوش دکھاتے۔ بن بلائے مہمانوں کی طرح وہ ٹپکتی رہتی ہیں اور آپ ہیں کہ۔ "تو اس سے کیا ہوتا ہے' کیا بگڑتا ہے آپ کا ؟" "میرا کیا بگڑتا ہے' میرا کچھ نہیں بگڑتا' میں تو آپ کے لئے کہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے زیادہ بات چیت سے مجھے تو منع نہیں کیا ہے۔ آپ ہی کے خیال سے میں نے بھی کہا۔" میں اس کے سوا اور کیا کہتا۔ ان کی قطع کلامی نے خیالات کے تسلسل کو توڑ دیا ورنہ نہ جانے میں کیا کیا کہتا رہتا اور وہ کیا کیا سنتی رہتیں۔ تھوڑی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے "سمجھتی ہوں کسی کا اپنے گھر آنا تمہیں بھاتا ہی نہیں' خود تو نہ جانے کن کن سے ملتے ملاتے رہتے ہیں ہم جو کسی سے دو چار باتیں کر لیتے ہیں تو کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے"۔ "سنا آپ نے گویا ہم چاہتے ہی نہیں کہ ہماری بیوی باتوں میں بھی اپنا دل بہلائے' شام کو تفریح کو ساتھ چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ سینما ساتھ دیکھتے ہیں' دعوتوں میں ساتھ لے چلتے ہیں۔ وہ تو سب گویا ان کو جلانے اور کڑھانے کے لئے کرتے ہیں۔ ان کا دل بہلانا ہمارا مقصد ہی نہیں۔ "خیر جانے دیجئے یہی ہوگا" ہم نیچی گردن کئے آہستہ سے کہہ دیتے ہیں لیکن وہ تو شاید اس قضیہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتی تھیں: "دیکھئے میں آپ سے کہے دیتی ہوں میری سہیلیاں میری سہیلیاں ہیں جیسے آپ کے دوست آپ کو عزیز ویسے یہ سہیلیاں مجھے۔ وہ مجھ سے ملنے آتی ہیں میں انہیں بلاتی ہوں آپ کو بیچ میں اثر لینے اور کڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میری آنکھوں سے غصہ ابلنے لگتا ہے۔ وہ اگر میری طرف دیکھ لیتیں تو سمجھ جاتیں کہ میں اس فیصلہ سے ناخوش ہوں: میرے دوستوں کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ گن کر انہوں نے میرے جذبات

ii [illegible] .... [illegible]

[illegible]

iii [illegible] .... [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نغمۂ عندلیب

کس قدر دلدوز ہیں نغمے ترے اے عندلیب!
رو رہا ہو جیسے کوئی عاشقِ حرماں نصیب،
عشق کے غمہائے جاں فرسا کی خونیں داستاں
کنجِ تنہائی میں اپنے دل سے کرتا ہو بیاں؛
باوجودِ ضبط رُسوا کر رہا ہو رازِ دل؛
روک سکتا ہو نہ آوازِ شکستِ سازِ دل۔

تیرے اس ننھے سے سینے میں ہے کتنا سوز و ساز!
اُف نوائے آتشیں کی گرمیٔ پہلو گداز!
یہ تعجب ہے کہ تیرا جسم جل جاتا نہیں،
یا مثالِ شمع چپکے سے پگھل جاتا نہیں۔
محوِ حیرت ہوں تری یہ بے قراری کس لئے
نالہ ہائے آتشیں کی شعلہ باری کس لئے؟
وصل کچھ مشکل نہیں تیرے لئے محبوب کا!
ہے وفور اس باغ میں تیرے گلِ مطلوب کا۔
تو جدھر دیکھے اُدھر ہے جلوۂ رنگینِ یار،
زندگی تیری ہے گویا سر بسر باغ و بہار۔
پھر ترے لب پر نوائے دردِ ہجراں ہے تو کیوں؟
دل ترا یوں آشنائے رنجِ حرماں ہے تو کیوں؟
ہو نہ ہو تو بھی ہے مجھ سا اک شہیدِ آرزو،
تجھ کو بھی بیتاب رکھتی ہے کسی کی جستجو
وہ گلِ رعنا کہ اس گلشن میں مل سکتا نہیں،
اس خزاں دیدہ گلستاں میں جو کھل سکتا نہیں
لوگ جن پھولوں کو سمجھے ہیں کہ ہیں تزئینِ باغ
ہیں ترے خونِ تمنا کے یہ رنگا رنگ داغ

محمد ہادی حسین

سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

اسطون۔ نہیں، بس تمہیں ڈرامے میں "موت کی توبہ" کے ذریعے سے نہیں ختم کرنا چاہتا۔ بلکہ ایک بات اس سے بھی زیادہ اہم ہے —— میں نے اس وحشی پن کا ارتکاب انسانیت کے خلاف کیا ہے لہذا میں ہی اس کی سزا بھی بھگتوں گا [ڈرامے کا مسودہ اٹھاتا ہے] یہ تھا میرا ڈراما! اگر میں اپنی تمام بقیہ زندگی بھی صرف کر دوں تب بھی اس کے برابر کبھی نہیں لکھ سکتا — لیکن قبل اس کے کہ تم دنیا میں قدم رکھو میں اس کو ضائع کر دوں گا۔ میں اس کو پرزہ پرزہ کر ڈالوں گا اور پھر دیکھوں گا کہ تم کہاں ہو اور کیا کر سکتے ہو؟

ڈولن۔ کیجئے اور نتیجہ دیکھئے!

[اسطون مسودہ کو پھاڑتا ہے۔ لیکن ڈولن کھڑا مسکرا رہا ہے]

ڈولن۔ آہا! مسودہ! —— آقا! وہ تو "ماں کا پیٹ" تھا جس سے کہ میں پیدا ہوا۔ لیکن میرا "حمل" تمہارے "دماغ" میں تھا —— تم میرے خالق ہو جب تک تم زندہ ہو میں زندہ رہوں گا —— بیس، تیس یا چالیس چاہے کتنے ہی سال ہوں —— میں دنیا میں ادھر ادھر گھوموں گا —— اپنے پاؤں کیچڑ میں گھسیٹتا ہوا —— چاہے کبھی کبھی ستاروں کی طرف بھی نظر کر لوں — لیکن میری موت کا دارومدار تم پر ہے!

اسطون۔ (تیزی سے دراز کھول کر ریوالور نکالتا ہے) اچھا! — اگر تم انسان ہو اور اگر تم میں جان ہے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا — ہاں! قتل! —— قبل اس کے کہ تم میری جبین کو اپنے گندے، غلیظ ہاتھ اور ہونٹ لگا سکو! —— اگر تم جیسا کہ کہتے ہو دراصل وہی ہو جس کی کہ تخلیق میری بدکاری نسگی ہے — تو میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے!

[وہ فائر کرتا ہے۔ لیکن ڈولن پر کوئی اثر نہیں ہوتا]

ڈولن۔ آقا کیوں بیکار کوشش کرتے ہو —— میں تمہاری روح کا ایک حصہ ہوں —— تمہاری زندگی کا حصہ دار! —— میری زندگی تم پر منحصر ہے۔ اور تمہاری زندگی میں مجھے کبھی کوئی نہیں مٹا سکتا!

اسطون۔ اگر ایسا ہے تو پھر تم نے مجھے بتا دیا کہ میں کون سی راہ اختیار کروں — میں نے غلطی کی ہے، میں مجرم ہوں —— اس لئے سزا کا مستحق بھی میں ہی ہوں۔ اگر میری موت سے وہ بدکار چیز مٹ سکتی ہے جسے میں نے تخلیق دی ہے۔ تو میں ایسا ضرور کروں گا —— [آہستہ آہستہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں] اے خدا —— میرے گناہ معاف کر دے! —— میں نے جو کچھ کیا ہے اس پر میں شرمندہ ہوں! — میں ان تخیلات پر پشیمان ہوں! —— اے خدا! ——

[وہ ریوالور کو اپنے سینہ پر رکھ کر فائر کر دیتا ہے — ڈولن آہستہ آہستہ اکڑی ہوئی چال سے ڈیسک کے پیچھے پہنچ جاتا ہے۔ جوں ہی اسطون گرتا ہے ڈولن آنکھیں بند کر کے آہستہ آہستہ نظروں سے غائب ہو جاتا ہے]

(پردہ)

(ترجمہ)

شہاب سلمانی

جیک اس پارٹ کو میرے ساتھ ادا کرے گا۔ میں ڈرامے میں جیک
کے علاوہ کسی اور کے ساتھ کام نہیں کر سکتی!

ڈولن۔ میرا خیال ہے مس جین! کہ آپ کو میرے ساتھ اس ڈرامے میں کام
کرنا ہوگا! — میں نے ہیرو کے پارٹ کا ٹھیکا لے لیا ہے کیونکہ
آقا — میں عاشق ڈولن کا پارٹ بہت اچھی طرح ادا کروں
گا۔ تمہارے جیک سے بھی اچھا۔ تم خود دیکھ لو گی —
[وہ آگے بڑھتا ہے]

جین۔ (خوف زدہ اور گھبرائی ہوئی آواز میں) وہ! نہیں نہیں، نہیں! ابا
کیوں نہیں بولتے؟ — میں کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔ میں سوائے
جیک کے کبھی اور کسی کے ساتھ یہ پارٹ ادا نہیں کر سکتی —
کبھی نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے!

اسطون۔ (ڈولن سے) پیچھے رہو۔ آگے نہ بڑھو — سنتے نہیں! —
ابھی جین تم جاؤ۔ فوراً چلی جاؤ۔ مجھ سے ایک غلطی سرزد ہو گئی
ہے — پھر بتاؤں گا۔ لیکن تم جاؤ!

ڈولن۔ نہیں ٹھہرو! کوئی غلطی نہیں ہوئی! اور نہ کچھ سمجھانے کی ضرورت
ہے — میں ڈبل ڈولن کا پارٹ ادا کروں گا اور مس جین "میری"
کا — اور ہم ابھی ریہرسل کریں گے [وہ لیمپ اٹھا کر میز پر رکھ
دیتا ہے] میں یہاں کھڑکی کے پاس کھڑا ہوتا ہوں۔ یہاں سوائے
چاند کی روشنی کے اور کوئی روشنی نہیں ہے۔ بہت سرد اور ظالم
روشنی! — بقول آقا! — میں واپس آ گیا ہوں۔ میں میری
کو اپنے پاس بلاتا ہوں۔ میری جو میری زندگی میں مجھ سے نفرت
اور سخت نفرت کرتی تھی — لیکن موت نے مجھے نئی طاقتیں دے
دی ہیں — میں میری کو پکارتا ہوں! — میری! [جین ایک
نیند میں چلنے والے شخص کی مانند اس کی جانب بڑھتی ہے —
اسطون خوف زدہ نظروں سے دیکھتا ہے] میری! میرے پاس آؤ!
— میری! — مجھے تم سے محبت ہے — مجھے اپنے سچے محبوب
کی طرح پیار کرو! [جین اس کا بوسہ لیتی ہے] کیا تمہیں مجھ سے
محبت ہے؟

جین۔ ہاں! میں تم سے محبت کرتی ہوں!

ڈولن۔ کیا تم مجھے اپنا آقا۔ اپنا سرتاج سمجھتی ہو؟

جین۔ تم میرے آقا ہو!

ڈولن۔ کیا تم میری فرمانبرداری کرو گی؟

جین۔ میں تمہاری لونڈی ہوں!

ڈولن۔ جب میں بلاؤں گا تم آؤ گی؟ — خواہ تم دنیا کے کیسے ہی دور دراز حصے
پر ہو جب بھی آؤ گی؟

جین۔ اگر تم بلاؤ گے تو خواہ میں دنیا کے کسی حصے میں بھی ہوں ضرور آؤں گی!

ڈولن۔ (اسطون سے) دیکھا آقا تم نے! — وہ خود اقرار کر رہی ہیں —
وہ میرے ساتھ میری کا پارٹ ادا کرنے کو تیار ہیں — اب زیادہ کہنے
سننے کی ضرورت نہیں — اچھا مس جین اب تم جا سکتی ہو!
(جین کمرے سے چلی جاتی ہے)

اسطون۔ او شیطان! — پاپی! — تو نے یہ کیا کیا؟ — سچ بتا تو نے
اس پر کیا جادو کر دیا؟ — تو کون ہے؟

ڈولن۔ تم جانتے ہو میں کون ہوں پھر بھی مجھ سے پوچھتے ہو — پھر پوچھتے ہو
تو سنو! — میں تمہارے دماغ کی فاسد، دھوکا دینے والی، وحشی اور
بُری تحریکات کا مجموعہ ہوں! — تمہاری روح کی گہرائیوں میں جو
خیالات پرورش پا رہے ہیں ان ہی سے میری تخلیق ہوئی ہے!

اسطون۔ (سسکتے ہوئے) وحشی! ظالم! بدکار! — لیکن میں تیری جین تک
رسائی نہ ہونے دوں گا — تو اسے کبھی نہ دیکھ سکے گا!

ڈولن۔ اف! حسین چڑیا جین! — میں پاک و معصوم جین کو کیچڑ میں گھسیٹ
لے جاؤں گا! لیکن — لیکن [گھبرائے ہوئے لہجے میں] میں اس سمت
ستاروں تک کیوں نہیں پہنچ سکتا؟ — مجھے جین سے محبت ہو گئی
ہے! — تم شیطان ہو! تم ظالم ہو! — تم نے مجھے سؤر کی مانند
زندگی بسر کرنے کے لئے کیچڑ اور زندگی کی غلاظت میں پیدا کیا ہے
— حالانکہ تم جانتے تھے کہ مجھ میں ستاروں کی سی خوبصورتی ہے —
لعنت ہے تم پر! اور پھٹکار ہے تمہارے قلم پر! — لیکن اس کی
سزا تمہیں اپنی حسین جین کے ذریعہ سے بھگتنا پڑے گی!

اسطون۔ مجھ سے غلطی ہوئی — میں نے بے وقوفی کی۔ اف! — لیکن تم
کبھی اپنی باتوں پر یقین نہ کرنا! — تم اپنی باتوں پر بھروسا مت
رکھنا! میرے پاس ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے میں تمہیں
ایسا کرنے سے روک سکتا ہوں — میں تمہارا خالق ہوں! —
صرف مجھے اپنا قلم ایک مرتبہ اور اٹھانا پڑے گا!

ڈولن۔ (قہقہہ) سمجھا..... کیا تمہارا خیال ہے کہ تم اپنے ڈولن سے
"موت کی توبہ" کے ذریعے سے آزاد ہو جاؤ گے؟ — کبھی نہیں!
نہیں آقا! کبھی نہیں! — تخیلات حقیقت ہوتے ہیں حقیقت!
— مجھے بدکار تخلیق کیا گیا ہے۔ قصہ ختم تھا! لیکن تمہیں معلوم ہونا
چاہئے کہ مجھ میں جتنی شیطنت تم نے اپنے خیال سے رکھی تھی اس

اس کی مرضی کے خلاف کام کریں! — جھوٹ بولیں، قتل کریں،
چوری کریں اور اس کے نام کی توہین کریں! — کیا دنیا کو پیدا
کرنے سے پہلے اس نے سوچا تھا کہ وہ اپنی مخلوق کو ایک دوسرے
کے قتل و خون پر آمادہ دیکھے گا۔ اور لاکھوں کو بھوکا مرنا پڑے
گا تاکہ دس بارہ عیش کی زندگی گذار سکیں! — کیا تم سمجھتے
ہو کہ خدا کے کمال کا نمونہ یہی "دنیا" ہوگی؟ — اور اگر نہیں
تو پھر وہ کیوں اسے بدل نہیں ڈالتا؟ — میں تم سے کہوں
گا آقا اور ڈنکے کی چوٹ کہوں گا کہ وہ اپنی مخلوق کو قابو میں نہیں
رکھ سکتا — اور اسی طرح تم بھی مجھ پر قابو نہیں رکھ سکتے!
— یقین مانو! بالکل یہی معاملہ ہے!

اسطون۔ یہ سب غلط ہے — میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں ضرور خواب دیکھ رہا ہوں! ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ سب باتیں خیالی اور وہمی ہیں — لیکن کتنی خوفناک! — میں کیا کروں؟ خدایا! یہ کیا ہو رہا ہے! — (پرجوش لہجہ میں) لیکن اگر یہ حقیقت ہے اور میں خواب نہیں دیکھ رہا تو میں ڈولن کے کردار کو بدل دوں گا چاہے ایسا کرنے سے میرا ڈراما ہی خراب ہو جائے — میں بہت پریشان ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں — کیا سوچوں اور کون سی راہ اختیار کروں؟

ڈولن۔ او بے وقوف اور سادہ لوح انسان! — اس وقت تم نے کچھ نہ سوچا جب تم پر شیطان سوار تھا، جب تم نے ڈیسک پر بیٹھ کر سادہ کاغذ پر قلم کی ایک معمولی جنبش سے ایک "دہشت" کی تخلیق کی! — ایک ایسی خوفناک ہستی کی شکل میں جو اپنی خواہش کے مطابق انسانوں میں چل بسے!

اسطون۔ یہ صحیح نہیں ہے! یہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتا!

ڈولن۔ یہ صحیح ہے — تمہارا ان جرموں کی بابت کیا خیال ہے جن کے مرتکب بغیر سزا کے رہتے ہیں — اور ان ڈاڈھے قتلوں کی بابت تم کیا رائے رکھتے ہو جن کا ارتکاب ایسی چیزوں سے ہوتا ہے جن کی تخلیق کا باعث تم جیسے لوگ ہوتے ہیں؟

(وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے)

اسطون۔ (خوف زدہ ہو کر) دور رہو! — آگے مت بڑھو! — او خدا! — دور رہو!

ڈولن۔ آہا! ڈرتے ہو! اپنی ہی تخلیق سے ڈرتے ہو! — آہا! اف! ہم لوگ تم سے کتنی نفرت کرتے ہیں اور کتنی بد دعائیں دیتے ہیں تمہیں! کیونکہ تم ہمیں ایسا بناتے ہو جس کی نظیر دنیا میں مشکل سے ملتی ہے — بھدے، بے ڈول جسم، ناپاک روحیں! — اپنے خالق سے متنفر — ہمیں اپنی "وحشت" سے سخت نفرت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اس کے "مصنف" سے بھی — اوہ! غصہ سے! ہم سب وہ "کیلیبان" ہیں جن کی نظریں ہمیشہ ستاروں پر لگی رہتی ہیں۔ لیکن ستارے ہماری پہنچ سے اتنی دور ہیں، کہ مایوسی میں ہم "کیچڑ" میں گر پڑتے ہیں — لیکن — آقا! جو کچھ بھی ہو تم میرے آقا ہو! — تمہارے ڈرامے میں، میں اپنے کردار کو خود ادا کروں گا۔ اور تمہیں بتلا دوں گا کہ میں کتنا فاسد اور وحشی ہوں۔ کیونکہ تم نے مجھے راستا بتلا دیا ہے —

(جین داخل ہوتی ہے)

جین۔ ابا! میں نے تو سمجھا کہ آپ سو رہے ہوں گے — آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا — آپ صبح کچھ بھی کام نہ کر سکیں گے۔ (ڈولن کو دیکھ کر) اوہ! مجھے افسوس ہے! میں نے نہیں دیکھا کہ آپ یہاں کسی سے باتیں کر رہے ہیں!

اسطون۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) ہاں جین میں مشغول ہوں۔ تم اچھی لڑکیوں کی طرح یہاں سے فوراً چلی جاؤ۔ میں زیادہ دیر نہیں جاگوں گا — جاؤ چلی جاؤ!

جین۔ آپ کتنے عجیب و غریب نظر آ رہے ہیں۔ کیا خدانخواستہ دشمنوں کی طبیعت خراب ہے! — ہیں! آپ چپ کیوں ہیں! آپ مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟ ضرور آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ آپ اب سو جایئے!

اسطون۔ نہیں جین۔ میں اچھا ہوں۔ بس تھوڑی سی تھکان ہے — لیکن تم خدا کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔

ڈولن (آگے بڑھ کر) آقا! میرا اس جین سے تعارف کرا دیجئے نا!

(جین گھبرا کر پیچھے ہٹتی ہے)

اسطون (گھبرا کر) یہ ضروری نہیں ہے — جین تم سے میں نے کیا کہا — جاؤ!

ڈولن۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں — میں اپنا تعارف خود کئے لیتا ہوں — ٹھہریئے مس جین! — میں ڈولن ہوں! — ڈیل ڈولن!!

جین۔ (خوف زدہ لہجے میں) ڈیل! — ڈولن؟! — ابا جان! — آپ کا ڈراما — میرا خیال تھا..... آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ

کرنے کے بعد ڈراما ان ہی دونوں کے ہاتھ میں گیا ہے۔

ڈولن۔ تو پھر ثابت کروں گا کہ مجھے یہاں ہونے کا حق حاصل ہے —— سنئے! آخری منظر یہ ہے۔ "ڈولن خالی مکان میں واپس آجاتا ہے۔ بچہ جو باغ میں گھوم رہا ہے اسے دیکھ لیتا ہے ڈولن اس کو پکڑ کر بھوتوں کی آمد و رفت والے کمرہ میں بند کر دیتا ہے تاکہ وہ اس کی آمد کی کسی کو خبر نہ کر سکے اور پردہ بچہ کی ڈراؤنی اور ہیبت ناک چیخ پکاروں کے درمیان گرتا ہے جب کہ خوفناک بھوتوں کے مانند چیزیں دہلیز پر آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں" —— آقا۔ کیا آخری ایکٹ اس پر ختم نہیں ہوتا؟

اسطون۔ ہاں —— ہاں ہوتا ہے! —— ہوتا ہے! —— مگر خدا کے لئے جلد بتاؤ یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟

ڈولن۔ اوہ! —— آقا! کیونکہ میں "خود" ڈولن ہوں! —— میں زندہ ہوں! میں سانس لے سکتا ہوں! میں حرکت کر سکتا ہوں! دیکھو آقا! —— جب تم نے صفحہ پر "پردہ" لکھا تو تم نے مجھے زندگی کے روپ میں ڈھالیا —— تم میرے خالق ہو گئے! —— دیکھو آقا دیکھو! —— میرا منجمد اور اکڑا ہوا جسم دیکھو! —— لیکن میں زندہ ہوں! میں زندہ ہوں! مجھ میں جان ہے!

اسطون۔ (سر پکڑ کر) او خدا! کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں! یا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے! کیا میں پاگل ہو گیا ہوں! میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا! —— ڈراما! تخیل! ڈولن! حقیقت! —— یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟! —— تمہارا مطلب کیا ہے آخر بھائی؟ —— تم تو کاغذ پر صرف ایک خیالی کردار ہو۔ تمہاری کوئی اصلیت نہیں ہے!

ڈولن۔ لیکن آقا۔ ایسا ہی ہے! —— کاغذ پر سینکڑوں اور لاکھوں کردار ہوتے ہیں اور وہ کاغذ پر ہی رہتے ہیں۔ کاغذ ہی ان کی پیدائش کی جگہ ہوتی ہے۔ اور کاغذ ہی ان کا مقبرہ! —— لیکن کبھی کبھی کسی کردار کو کوئی "حیات بخش چنگاری" مل جاتی ہے جو اس کو زندہ کر دیتی ہے اس میں جان ڈال دیتی ہے۔ مجھے وہ چنگاری مل گئی ہے۔ جب تم نے "پردہ" نہیں لکھا تھا وہ مجھے نہیں ملی تھی —— لیکن اب میں حرکت کر سکتا ہوں! —— میں زندہ ہوں!

([illegible] اسطون کی طرف دو تین قدم بڑھتا ہے)

اسطون۔ (خوف زدہ لہجے میں) دور رہو! دور رہو! آگے مت بڑھو! —— خدا کے لئے پیچھے جاؤ —— میں نہیں جانتا —— میں نہیں سمجھ سکتا —— میرا دماغ ماؤف ہو رہا ہے —— میری طرف آؤ! —— دور رہو!

ڈولن۔ (لہجہ بدل کر) ہاں تمہیں ڈرنا ہی چاہئے! (ڈرامے کے مسودے کو اٹھا لیتا ہے) تم نے مجھے بھی کیا چیز بنایا ہے! —— ایک کمینہ خصلت، لرزہ پیدا کر دینے والا، حیوان سیرت انسان! —— ایک ہستی جس کو دیکھ کر ہر ایک وحشت زدہ ہو جائے! —— اور اب تم نے مجھے آزاد کر دیا ہے۔ تاکہ میں رات گئے وقت انسانوں پر اپنی حکومت چلاؤں!

اسطون۔ میں نے کیا کیا ہے؟ —— نہیں نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا! —— میں کبھی ایسی خوفناک جسارت نہیں کر سکتا —— میں نے آخر کیا کیا ہے؟

ڈولن۔ تم نے ایک ایسی چیز کی تخلیق کی ہے جس پر تمہارا خود قابو نہیں ہے! —— تم ایک ایسی ہستی کی پیدائش کا باعث ہو جس نے تم سے انتقام لینے کا تہیہ کر لیا ہے —— میں تمہاری طاقت سے بلند بہت بلند ہو گیا ہوں! —— ایک پھونک میں تم جلتی ہوئی دیا سلائی کو بجھا سکتے ہو لیکن اسے کسی خشک "آتش گیر مادّے" پر پھینک دو اور پھر دیکھو ننھی سی دیا سلائی کیا کرشمے دکھاتی ہے —— غراتی ہوئی خوفناک آگ جو ہر اس چیز کو نگل جاتی ہے جو اس کے راستہ میں آجائے۔ —— یہی ہے جو تم نے کیا ہے —— میں برباد کروں گا! —— مسمار کروں گا!

اسطون۔ ڈیل ڈولن! اگر یہ معاملہ ہے تو تم اپنے اوپر بھروسا مت رکھو —— میں اس "ننھی سی دیا سلائی" کو ہلکی سی پھونک ہی سے بجھا دوں گا۔ میں اس "غراتی ہوئی خوفناک آگ" کو پاؤں سے روند ڈالوں گا قبل اس کے کہ وہ "لَو" دے —— اگر میں نے تمہاری تخلیق کی ہے تو میں ہی تمہارا آقا بھی ہوں۔ تمہارا خالق ہوں —— تمہیں میرے حکم پر چلنا ہوگا!

ڈولن۔ آہاہا! میرا خیال ہے کہ خدا نے بھی یہی سوچا تھا جب اس نے پہلے پہل دنیا کی تخلیق کی —— کیا تم نے کبھی سوچا کہ خدا تعالیٰ کو پشیمانی کے آنسو بہانا پڑیں گے جب وہ اپنی کاریگری پر دوبارہ نظر ڈالے گا! —— کیا تم خیال کرتے ہو کہ دنیا کی تخلیق خدا نے اس لئے کی تھی کہ اس کی تخلیق کی ہوئی "کٹھ پتلیاں"

تخاطل مضبوط نہیں ہوا --- سارے وہ تو کاغذ پر ہے۔ اس
کی اصلیت اور حقیقت ہی کیا ہے۔ وہ تو صرف تخیل کی پرواز
تک محدود ہے --- اور تم اس سے سچ مچ ڈرنے لگی ہو۔
--- خیر اب تم زیادہ تھک گئی ہو۔ رات بھی زیادہ جا چکی
ہے --- میں بھی تھک گیا ہوں۔ اور تم جیک؟ تم بھی تھکے ہوئے
ہو۔ اب میں تو جاتا ہوں اور جیک تم بھی جاؤ۔ کیونکہ میری
لاڈلی بیٹی اب سوئے گی --- شب بخیر!

جیک۔ شب بخیر جناب! --- واقعی اب کافی رات گذر چکی
ہے اور میں یہاں بہت دیر ٹھہرا --- کل رات حاضر
ہوں گا۔ تاکہ اس ڈرامے کے متعلق تفصیلی گفتگو کر سکوں
--- جین کیا تم مجھے کوٹ پہننے میں مدد دے سکو گی؟

(وہ دونوں باہر چلے جاتے ہیں۔ اسطون ڈیسک کی طرف
بڑھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کاغذات ہیں۔ وہاں کھڑے
ہو کر وہ ادھر اُدھر سے صفحات پڑھتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ
قلم اٹھا کر آخری صفحے کے آخر میں "پردہ" لکھ دیتا ہے
--- وہ پھر قالین کی طرف جاتا ہے اور نیچے بیٹھ کر اپنی
آنکھیں جھکے ہوئے انداز میں بند کر لیتا ہے ---
یکایک ڈیسک کے پیچھے سے ایک شکل آہستہ آہستہ
ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ بہت کریہہ اور موت
کی مانند سفید ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ ہونٹ بہت سرخ
ہیں --- ایک کاندھے پر تھوڑا سا کوبڑ ہے اور اس
کی تمام حرکات اکڑی ہوئی آٹومیٹک (خود عمل) مشین
کی مانند ہیں --- اسطون آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں
کھولتا ہے اور اسے دیکھتا ہے)

اسطون۔ کیوں؟ --- کیوں؟ --- تمہارا مطلب؟ --- تم کون
ہو؟ --- یہاں میری تنہائی میں تم دخل دینے والے کون؟
--- تمہیں کس نے اندر آنے دیا؟ --- اس وقت میرے
پاس بغیر اجازت آنے والے تم کون ہو؟

ڈولن۔ آقا --- تم خود --- جانتے ہو --- میں --- کون ---
ہوں!

(وہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے)

اسطون۔ کیسی باتیں کرتے ہو --- ڈیسک سے ہٹ کر کھڑے
ہو --- تم کون ہو؟

ڈولن۔ آقا میری بات سنو میں سب کچھ بتا دوں گا۔

اسطون۔ تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا تم پاگل ہو؟

ڈولن۔ میں --- ڈولن --- ہوں!!

اسطون۔ ڈولن؟! --- میں نہیں سمجھا! --- تمہیں اندر کس نے
آنے دیا؟

ڈولن۔ آقا! --- تم نے ہی مجھے اندر آنے دیا! --- میں ڈیل ڈولن
ہوں!

اسطون۔ (غصے میں) سمجھا! --- کوئی شخص خفیہ طور پر میرے ڈرامے
کو پڑھ رہا تھا اور یہ اسی کی شرارت ہے کہ تمہیں میرے کردار
کے مانند بنا دیا ہے --- کس نے تمہیں اس حرکت پر مجبور کیا؟
کس نے میرے ڈرامے کو پڑھا ہے؟ --- بتاؤ! ---
میں اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا ڈراما ایک راز ہے
ابھی تک۔ سوائے انگرام کے اس کی بابت کسی اور کو خبر نہیں
ہے اور مجھے اس پر پورا بھروسا ہے کہ اس نے ابھی اس کو کسی
پر افشا نہیں کیا ہو گا اور میری بیٹی اور ہونے والے داماد نے
صرف آخری ایکٹ پڑھا ہے --- جواب دو! بت کی مانند
کیا کھڑے ہو؟ --- کیا اپنے کئے پر پچھتا رہے ہو؟ ---
لیکن تم اس خیال میں مت رہنا کہ اپنے میک اپ سے تم مجھے
دھوکے میں مبتلا کر دو گے۔ یہ پہلے سے طے ہو چکا ہے کہ اس
کردار کو کون ادا کرے گا۔

ڈولن۔ آقا۔ وہ میں ہی ہوں گا --- ہاں! وہ پارٹ میں ہی ادا
کروں گا

اسطون۔ کیا بک رہے ہو! --- تم اس پارٹ کو نہیں ادا کر سکو گے
--- ہاں! اور میرا خیال ہے کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔ اور اگر
تم یہاں سے فوراً --- رفوچکر نہ ہوئے تو مجھے ڈر ہے کہ
مجھے کوئی دوسرا طریقہ اختیار نہ کرنا پڑے --- سمجھے؟!

ڈولن۔ آقا! مجھے کوئی نہیں نکال سکتا --- تم بھی نہیں!

اسطون۔ تم جاتے ہو یا نہیں --- یا پھر اپنے نوکر کے ذریعے
سے کسی کانسٹیبل کو بلوا کر تمہیں مداخلت بیجا کے الزام میں
گرفتار کراؤں؟

ڈولن۔ ٹھہریئے۔ آقا! آپ کے علاوہ کیا اور کوئی بھی آپ کے ڈرامے
کے آخری ایکٹ کے انجام سے واقف ہے؟

اسطون۔ صرف میری بیٹی اور جیک رانڈیل۔ کل رات میرے ختم

اِسطون ۔ ہاں ــــ اور میں ہمیشہ یہ خواب دیکھا کرتا تھا کہ میں ایک لانبا اور خوبصورت شخص ہوں ۔ ہر شخص میرا کہنا مانتا ہے اور عزت کرتا ہے ــــ لیکن افسوس کہ میرے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے ــــ اور میرے قد و قامت نے میرا ساتھ نہ دیا ۔ پانچ فٹ چھ انچ سے زیادہ کبھی میرا قد ہوا ہی نہیں ــــ حکومت کرنے کے ہوائی قلعے بھی مسمار ہو گئے اور اب تم خود دیکھتے ہو کہ میری بیٹی بھی کس طرح مجھ پر حکم چلاتی ہے ــــ یہ کہتے ہوئے مجھے کوئی تامل نہیں کہ میں اپنے خیالوں کا بالکل الٹ ہوں ۔ اور اسم بے مسمّیٰ ہوں ــــ تعجب خیز بات ہے یہی ! ــــ ہم لوگ بھی کیا ہیں ! ہم وہ بننا چاہتے ہیں جو اصل ناممکنات میں سے ہوتا ہے !

جین ۔ میں سمجھتی ہوں ۔ میں مانتی ہوں ۔ میں نے اب تک جتنے پارٹ ادا کئے ہیں وہ بہت شریف اور متحمل کرداروں کے تھے ۔ اور اگر انصاف کی آنکھ سے دیکھا جائے تو میں نے ان کو بڑی عمدگی سے ادا بھی کیا ہے ۔۔ ــ لیکن میری سب سے بڑی آرزو ہے کہ میں ایک "جواری" کا پارٹ ادا کروں ۔

جیک ۔ ہاہاہا ۔ تم اور جواری کا پارٹ ! کتنی مضحکہ خیز بات ہے ! لیکن کوئی کیا کر سکتا ہے ــــ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی ــــ میں نے سوائے "کیریکٹر رول" کے کوئی اور کام نہیں کیا ۔ لیکن نوجوان ہیرو بننے کی مجھے بھی آرزو رہی ــــ یہ مثال بالکل ایسی ہی ہے جس طرح کہ ایک مزاحیہ اداکار کو "رومیو" کا پارٹ ادا کرنے کی خواہش ہو یا ایک حسین دوشیزہ جس کا چہرہ مجسم مسکراہٹ ہو "گرانڈ ٹریجڈی" میں پارٹ کرنے کی آرزومند ہو !

اِسطون ۔ اچھا ۔ اب یاد آیا ۔ اسی قسم کی چیزوں نے مجھے ڈرامہ لکھنے کی طرف مائل کیا ــــ ایک ادیبہ نے جو کہ میری دوست تھی ایک مرتبہ مجھ سے کہا : میں نے ڈرامے لکھنا اس لئے شروع کر دیئے کہ اب میرے سب بچے بڑے ہو گئے ہیں ۔ انہیں اب میری ضرورت نہیں رہی ہے ۔ اب مجھے انہیں یہ بتانا نہیں پڑتا کہ وہ کیا پہنیں ۔ کب نہائیں ۔ کس طرح بتائیں یا کیا کھائیں اور حقیقت انہیں اب میری ضرورت محسوس بھی نہیں ہوتی ۔ اب مجھے ان کے بجائے کام ... انہیں ... کرنے پر ... نہیں

دینی پڑتی ــــ وہ میرے کھیل کی چیزیں تھیں جن سے میں کھیل چکی ۔ اور اب چونکہ میری گڑیاں مجھ سے چھین لی گئی ہیں ۔ میں دوسری گڑیاں تخلیق کرنے کی طرف منہمک ہو گئی ہوں ۔ جو میرے لئے ایک کٹھ پتلی کی مانند ہوں گی ۔ جو میں حکم دوں گی انہیں کرنا ہوگا ۔ جب میں کہوں گی "آؤ" وہ فوراً حاضر ہو جائیں گی اور جب میں ان سے کھیلتے کھیلتے تھک جاؤں گی تو اپنے آخری الفاظ لکھ دوں گی اور "پردہ" گرا دوں گی ۔

جین ۔ کیسا عمدہ خیال ہے ! ــــ

اِسطون ۔ ہاں ۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ مجھ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے ۔ ناکام امید نے مجھے ڈراما نگاری پر مجبور کیا ۔ ــــ اگر میں ہیرو کا پارٹ ادا نہیں کر سکتا تو میں ہیرو کو حکم دے سکتا ہوں ۔ میں اسے اپنی خواہش کے مطابق چلنے پر مجبور کر سکتا ہوں ــــ اچھا ۔ ابھی مجھے "پردہ" لکھنا ہے اور اپنی نئی "کٹھ پتلی" کو خدا حافظ کہنا ہے ۔ اس لئے میری رائے ہے کہ ہم پہلے اس کی صحت کا ایک ایک جام پی لیں ۔

(جین اٹھتی ہے اور میز پر سے شراب اٹھا کر سب کو دیتی ہے ــــ تینوں اپنے جام اونچے کرتے ہیں)

اِسطون ۔ ڈیل ڈولن ! ــــ جیک ! میرے بچے ! میں تمہیں اس کے جام صحت کے ساتھ اس کا پارٹ ادا کرنے میں کامیابی کی دعا کرتا ہوں ۔

جیک ۔ ڈیل ڈولن ! ــــ اس کی صحت کا جام ! ــــ اس امید میں پیتا ہوں کہ میں اس کے کردار کو اچھی طرح سے ادا کر سکوں !

جین ۔ (مرتعش آواز میں) ڈیل ــــ (ایک خوفناک چیخ کے ساتھ وہ اپنا گلاس گرا دیتی ہے اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیتی ہے) ــــ اوہ ! نہیں نہیں ! میں نہیں کہہ سکتی !

جیک ۔ کیوں جین ! اچھی جین ! بتاؤ تو کیا ہو گیا ؟

جین ۔ میں نہیں جانتی ــــ میں نہیں جانتی ۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے ۔ وہ بہت وحشی ہے ــــ میرے اس خوف پر تم ہنسو گے ــــ لیکن مجھے اس سے ڈر لگتا ہے ۔ میں اس کی صحت کا جام نہیں پی سکتی !

اِسطون ۔ بچی ہی رہی ! ــــ ابھی تک تیرا بچپن کا معصوم اور

(دونوں پڑھتے ہیں)

جیک۔ ڈیل ڈولن کا کردار پیش کر کے واقعی تمہارے والد نے ایک بہت بڑا کام کیا ہے ــــ ذرا اس منظر کا خیال کرنا اسٹیج پر کتنا موثر اور دردانگیز ثابت ہوگا ــــ "بچہ خوفزدہ سہما ہوا بھوتوں کی آمدورفت والے کمرہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ خوفناک شکل دہلیز پر سے جھانک رہی ہے!" ــــ اُف، کتنا خوفناک منظر کھینچا ہے۔ جین تمہارے والد کہاں ہیں۔ میں ان کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔

جین۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت سو رہے ہوں گے کیونکہ وہ کل تمام رات اس ڈرامے کو پورا کرنے میں مشغول رہے۔ اور رات بھر جاگنے کی وجہ سے تمام دن بے چین رہے۔ تم خود جانتے ہو کہ جب وہ کسی ڈرامے کو ختم کر لیتے ہیں تو ان کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ گویا انہوں نے کسی چیز کو گم کر دیا ہے چاروں طرف اس کی تلاش میں پھرتے ہیں۔

(جین کی گفتگو کے درمیان اسطون کمرہ میں باغ کی طرف سے داخل ہوتا ہے اور ان دونوں کو اپنے بازوؤں میں لے لیتا ہے)

اسطون۔ کیوں جیک کیا ابھی تھیٹر سے چلے آ رہے ہو؟ میں باغ میں ٹہل رہا تھا۔ آج کی رات بڑی سہانی ہے۔

جین۔ (مصنوعی سخت لہجے میں) ابا آپ کل رات کتنا سوئے تھے جو آج بھی اب تک جاگ رہے ہیں؛ آپ نے تو مجھ سے جلد ہی سو جانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ آپ کو اس وقت بستر میں ہونا چاہئے تھا۔ آپ اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں کرتے۔

اسطون۔ ہاں ہاں۔ بولے جاؤ ننھی جین! جب تم خفا ہوتی ہو تو اچھی لگتی ہو۔

جین۔ اچھا آپ پہلے یہ بتائیے کہ آپ اب تک کیوں جاگ رہے ہیں؟

اسطون۔ واقعی یہ بالکل سچ ہے میں گنہگار ہوں لیکن ننھی جین کو مجھے معاف کر دینا چاہئے کیونکہ قصور چاند کا ہے۔ اور چاند ہی میری اس خطا کا ذمہ دار ہے۔ وہ تم سے میری برأت کے لئے بہت کچھ کہہ سکے گا ــــ اچھا! تو تم لوگ ڈراما پڑھ رہے ہو ــــ تو جیری کا فیصلہ کیا رہا جیک؟

(وہ آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

جیک۔ (جوشیلے لہجے میں) تعجب خیز ہے جناب! ــــ آپ نے تو واقعی غضب ہی کر دیا ہے: ــــ یہ ڈراما واقعی ایک بہترین نمونہ ہے۔ اور میں بہت شکرگذار ہوں کہ ڈیل ڈولن کے اہم کردار کے لئے آپ نے مجھ خادم کو منتخب کیا۔ یہ کردار واقعی مجھے بہت بڑھا دے گا۔ اگر میں اسے اچھی طرح سے ادا کر سکا ــــ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا سنہری موقع میرے ہاتھ آجائے گا۔

اسطون۔ (پیار بھرے لہجے میں) نہیں یہ انگرام کا کام ہے۔ اس نے پہلے چند ایکٹ ہی پڑھ کر اس ڈرامے کے حقوق مجھ سے خرید لئے تھے۔ جین اس میں لازم طور پر کام کرے گی۔ کیونکہ اس کا انگرام کے ساتھ ایک سال کا ٹھیکا ہے۔ اور جب میں نے ڈولن کے کردار کے لئے تمہارا نام پیش کیا تو فوراً راضی ہو گیا ــــ ڈراما کچھ خوفناک ضرور ہے۔ تمہارا آخری ایکٹ کے متعلق کیا خیال ہے؟

جیک۔ خدا کی قسم تعریف نہیں کر سکتا۔ اور پھر اس کی طرز نگارش کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ یہ ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے!

جین۔ اچھا جیک! ادھر سنو! میں اب تمہیں ان کی جھوٹی تعریف نہ کرنے دوں گی۔ وہ ایک سادہ لوح بوڑھے شخص ہیں۔ اور ان کا کام سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ ایک مکڑی کی طرح بیٹھے ہوئے اپنے دماغ میں پلاٹ کا جالا بنا کریں۔ اور اپنے "کرداروں" کو دھوکے سے گرفتار کرنے کی سعی کریں ــــ میرے خیال میں تو یہ ایک بیوقوفی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس مرض کا شکار میں نہیں ہوئی

اسطون۔ ہم میں سے ہر ایک مریض ہے اور ہر کسی کو کوئی نہ کوئی "مرض" لاحق ہے مجھے لکھنے کا مرض ہے تو تمہیں ایکٹ کرنے کا "مرض" ہے تم بھی مرض سے بچی ہوئی نہیں ہو۔ اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی خواہش انسان کو ہونی ہی چاہئے ــــ ورنہ وہ انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہو سکتا۔

جین۔ (منہ بنا کر) جی ہاں! بجا ارشاد ہے! اور یہ منطق ہماری سمجھ سے باہر ہے:

جیک۔ جناب آپ نے ڈرامے لکھنا کیوں شروع کئے ــــ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کا پہلا ڈراما آج سے دس سال پہلے اسٹیج کیا گیا تھا ــــ آپ کو ادبی راہوں میں سے صرف ڈراما نویسی ہی کیوں پسند آئی؟

اسطون۔ مجھے خیال نہیں ہے ــــ البتہ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ مجھے ایکٹ کرنے سے بہت رغبت تھی۔

جیک۔ یہ بہت عجیب اور دلچسپ بات ہے مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کو بھی ایکٹ کرنے کا شوق رہا ہے۔

"ادبی تخلیق"

کردار :——

جیرلڈ اسطون —— ڈراما نویس
جیک رانڈیل —— ایکٹر، اسطون کی لڑکی کا منگیتر
جین اسطون —— اسطون کی بیٹی
ڈبل ڈولن —— ؟؟......؟؟

—: منظر :—

[جیرلڈ اسطون کا مطالعہ کا کمرہ۔ کمرہ سجا ہوا ہے۔ نرم نرم قالینیں بچھی ہوئی ہیں۔ ان پر آرام کرسیاں سلیقہ سے سجی ہیں۔ ایک کونے میں رکھی ہوئی ڈسک کے برابر کا دروازہ اور ایک فرانسیسی طرز کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ جس میں سے باغ کا منظر نظر آرہا ہے۔ اگست کی ایک چاندنی رات ہے۔ اور دروازے میں سے صرف آسمان کی نیلی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔
جیک اور جین بیٹھے ہوئے جیرلڈ اسطون کے ایک ڈراما کا مطالعہ کر رہے ہیں —— یکایک جین کانپتی ہے]

جین۔ اوہ!

جیک۔ اف! مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ لیکن غضب کردیا ہے
کیوں؟ کیا خیال ہے؟

جین۔ سچ مچ۔ حیرت انگیز ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ابا جیسا شخص اس قسم کی چیز کیسے لکھ سکتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

جیک۔ تم سمجھتی تو ہو نہیں۔ ان کے خیالات بہت بلند ہیں۔ اور ان کا دماغ نئے نئے تخیلات کا منبع ہے۔ منبع! کیا تم ان کی حیرت انگیز قابلیت سے ناواقف ہو؟

جین۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اباجان کی قابلیت کا اچھی طرح سے اندازہ نہیں کرسکتی اور ڈراما نگار کی حیثیت سے میں ان کے مرتبہ کو نہیں پہچانتی —— لیکن تم ذرا ابا کی عادات وخصائل کو دیکھو کہ وہ کتنے شریف اور کتنے نرم مزاج ہیں۔ اس کے برعکس ان کے ڈراموں یعنی ان کی تخلیقات پر غور کرو کہ وہ کس قدر کریہہ اور ڈراؤنے کردار پیش کرتے ہیں —— کیسے عجیب اور حقیقت سے کس قدر قریب —— کیسے خوفناک اور کتنے قوی —— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کردار ان ہی کی زندگی کا ایک جزو ہیں۔

جیک۔ ہاں میں سمجھ گیا۔ واقعی یہ حیرت انگیز بات ہے —— مجھے تعجب ہے! ایسے تخیلات ان کے پاک دماغ میں کہاں سے آجاتے ہیں —— اور پھر یہ کردار! —— کتنا خوفناک ہے یہ! —— لیکن جین اس کردار کو میں ادا کر رہا ہوں —— کتنا سنہری موقع ہے!

جین۔ یہ اچھی بات ہوئی کہ اس کردار کو تم ادا کر رہے ہو۔ وہ اتنا خوفناک کردار ہے کہ اگر تمہارے سوا کوئی اور شخص اسے ادا کرتا تو یقیناً میں 'میری' کا پارٹ ادا نہ کرسکتی تھی۔

جیک۔ ہوں! —— پھر وہی بچوں کی سی باتیں۔

جین۔ لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ اس کا خیال ہی —— مجھے خوفزدہ کئے دیتا ہے —— وہ اسٹیج پر کتنا خوفناک معلوم ہوگا —— مجھے اس کے ساتھ پارٹ ادا کرنے میں کتنا —— اُف!

جیک۔ اری پگلی! یہ بھی کوئی حقیقت ہے جو ڈر لگتا ہے —— یہ تو ایک خیالی انسان ہے۔ خیر اس کردار کو میں ادا کروں گا تب تو تمہیں ڈر نہیں لگے گا۔

جین۔ نہیں! —— بشرطیکہ تم اس کو نرمی سے ادا کرو —— اوہ! کتنا وحشیانہ کردار ہے!

جیک۔ ہاں ہے تو! —— اچھا آؤ۔ ذرا آخری ایکٹ ایک مرتبہ اور پڑھ لیں۔

تقاضائے زندگی

نہیں کہ دنیائے رنگ و بو میں مرے لئے دلکشی نہیں ہے
نہیں کہ زہرہ جبیں حسینوں سے مجھ کو دلبستگی نہیں ہے
نہیں کہ پابندِ دام ہو کر خیالِ وارستگی نہیں ہے
نہیں کہ اپنی شکستہ حالی کا مجھ کو احساس بھی نہیں ہے
نہیں کہ بے چارگی ہے لیکن علاجِ بے چارگی نہیں ہے
نہیں کہ خاکسترِ جوانی میں شعلۂ سرکشی نہیں ہے
نہیں کہ انسان ہو کے انساں کے درد سے آگہی نہیں ہے
نہیں کہ اس آگہی سے دل میں لگی ہوئی آگ سی نہیں ہے
نہیں کہ میرے دلِ خود آگہ پہ یہ حقیقت کھلی نہیں ہے
کہ اس طرح نامراد جینا عذاب ہے زندگی نہیں ہے

مگر یہ احساسِ نامرادی بذاتِ خود اک وبالِ جاں ہے
علاجِ بے چارگی کرے کچھ جنونِ حشر آفریں کہاں ہے؟

نئی طرح پر نئے سرے سے پھر آج آرائشِ جہاں ہو
نہ یہ زمیں ہو نہ آسماں ہو نہ یہ مناظر نہ یہ سماں ہو
ہر اک تجلّی ہر ایک جلوہ پھر اک نئے روپ میں عیاں ہو
زمیں پہ پھولوں کی انجمن ہو کہ چرخ پر بزمِ کہکشاں ہو
وفورِ آسودگی ہو ہر سو، بہار ہر سمت حکمراں ہو
چمن کا ہر کنج گل بداماں، چمن کا ہر گوشہ آشیاں ہو
ہر ایک ذرّے پہ گلستاں کے تسلّطِ اہلِ گلستاں ہو
نہ برق دگلچیں کی چیرہ دستی نہ دخلِ صیاد و باغباں ہو
نہ کفر و ایماں کی الجھنیں ہوں، نہ دین و الحاد کا نشاں ہو
نہ اہرمن سے کسی کو شکوہ، نہ کوئی یزداں سے سرگراں ہو
کسی کو سبقت نہ ہو کسی پر جو ہم سفر ہو وہ ہم عناں ہو
ہر ایک رہرو ہو اپنا رہبر، ہر ایک سالارِ کارواں ہو

غرض تقاضا ہے زندگی کا کہ منقلب ہو نظامِ ہستی
بنائیں دنیا اک ایسی جس میں نہ بیش و کم ہو نہ اوج و پستی

رشید کیفی

ہو"۔۔۔۔ پرماتما کے لئے اور کچھ نہ کہنا منگھو پیر سب کچھ سنتا ہے۔ اُس کی دیا ہی سے کام چلے گا۔ ناراض ہو جائے تو گودی میں ڈال کر بھی چھین لیتا ہے ٹکی سندھنی کی بات نہیں سنی شاید؟ اُس نے بیٹے کے لئے چالیس جمعراتیں مانی تھیں۔ منگھو پیر نے اُس کی گود ہری کردی۔ جب وہ ٹھیک ہوگئی تو اپنے لاڈلے کو لے کر منگھو پیر کے درشنوں کو آئی اُس کا پتی بھی اُس کے سنگ تھا۔ بس وہ یہیں کھڑے تھے۔ اُس کے پتی نے کوئی بے ادبی کا لفظ کہہ دیا۔ بس اُس کا کہنا ہی تھا کہ بچہ ٹکی کی گود سے اُچھل کر چشمے میں جا پڑا اور منگھو پیر کے مگرمچھ اُسے نکا نکا کرکے کھا گئے۔"

اتنے میں مجاور نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنے گھر سے نکل کر ہماری طرف آ رہا تھا۔ رانی شاید یہ سوچ کر کہ کہیں ہم مجاور کے سامنے کوئی بے ادبی کی بات نہ کہہ دیں خود ہی چشمے کے دوسرے کنارے پر مجاور کے پاس چلی گئی۔ مجاور نے اُس کے ہاتھ سے گھی کا کٹورا لے کر چراغ میں اُنڈیل دیا اور رانی روٹ کے ٹکڑے توڑ توڑ کر مگرمچھوں کے آگے پھینکنے لگی۔ مگرمچھ دھڑام دھڑام چٹانوں پر سے پانی میں گرنے لگے۔ چھوٹے سے چشمے میں گویا بھونچال آگیا تھا۔ مجاور سبز رنگ کا لمبا کرتا پہنے اور کانچ کی موٹی موٹی چوڑیوں والے بازو اوپر کی طرف اُٹھائے رانی کے قریب کھڑا ہو کر دعا مانگنے لگا۔ اُس کے درجن کے قریب چھوٹے چھوٹے لڑکیاں لڑکے بھی رانی کے چاروں طرف چپ چاپ کھڑے روٹ کے ٹکڑے کھا رہے تھے"

منگھو پیر۔۔۔۔ ہیں ہیں۔۔۔۔ منگھو پیر۔۔۔۔" میرا میزبان ایک کڑوی سی ہنسی ہنسا اور پھر میری طرف منہ موڑ کر بولا "جانتے ہو، یہ منگھو پیر کون تھا؟"

"نہیں تو؟"

"آج سے کئی سو سال پہلے وہ اِدھر آیا تھا۔ سنتے ہیں۔ اس کے ساتھ دو چیلے بھی تھے جو یہاں پہنچ کر پیاس سے نڈھال ہو گئے مگر اِدھر میلوں تک پانی کی بوند نہ ملتی تھی۔ پیر نے زمین پر اپنی ایڑی ماری اور ایک چشمہ پھوٹ نکلا۔ سنتے ہیں۔ پھر اُن لوگوں نے یہیں رہنا شروع کر دیا۔ ایک دن پیر نے اپنی گُدڑی کو چشمے میں جھاڑا۔ سینکڑوں جوئیں جھڑ کر پانی میں گر پڑیں اور یہ مگرمچھ وہ جوئیں ہی تو ہیں۔۔۔۔ سنتے ہیں"

میں ہنسنے لگا۔ مگر وہ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا "آپ ہنس رہے ہیں مگر تمام علاقہ اس بات کو سچ مانتا ہے۔ کتنی ہی ماؤں کو یہاں سے بچے مل چکے ہیں اور شاید اسی لئے تمہیں سندھ میں ہزاروں آدمی منگھو رام یا منگھو دین کے نام کے مل جائیں گے۔ نہ جانے آدمی کی جہالت کو کب تک لُوٹا جائے گا؟"

میں نے کہا "جب تک اُسے جاہل رکھا جا سکے گا"

"ہاں یہ سب سامان آدمی کو جاہل رکھنے کے لئے ہی ہیں۔ منگھو پیر کیا اور مذہب کیا اور خدا کیا۔۔۔۔۔۔

مجاور دعا ختم کر چکا تھا۔ اُس کے بچے روٹ کے ٹکڑوں کو جلدی میں کاٹتے ہوئے پیسے مانگنے کے لئے ہماری طرف لپکے۔ وہ ہماری ٹانگوں سے لپٹ کر آنکھیں اوپر کی طرف اُٹھائے ہوئے کتیا کے پلّوں کی طرح ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے لگے۔

بابو ایمان کی سلامتی کریں گا۔۔۔۔۔۔ بابو ایمان کی سلامتی کریں گا۔۔۔۔ بابو ایمان کی سلامتی۔۔۔۔۔۔

موہن سنگھ

ضروری اطّلاع

مضمون نگار حضرات کو اپنے مضامین کی صاف اور صحیح طباعت کے لئے اِس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ان کا مسودہ نہایت واضح، صاف اور خوش خط لکھا ہو۔ شکستہ مبہم اور غیر واضح الفاظ کو کاتب عموماً غلط پڑھتے اور غلط لکھتے ہیں۔ اِس طرح مسودوں اور کاپیوں کی تصحیح میں صرف غیر ضروری کوفت اٹھانی پڑتی ہے بلکہ طباعت بھی صاف نہیں ہوتی اور غلطیاں بھی کم و بیش رہ جاتی ہیں۔

"ہمایوں"

کرنے لگی ہے۔"

میں بوٹ کے تسمے باندھ کر کھڑا ہو گیا اور ہم دونوں کشتی کی سمت چلنے لگے۔ رانی شاید ہمیں بات چیت کرنے کا موقع دینے کے خیال سے آگے آگے چل رہی تھی۔ سمندر کی تیز ہوا نے اُس کی ساری کو بدن کے ساتھ دبا کر اُس کے خوبصورت جسم کو نمایاں کر دیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میرا میزبان پھر بولا:-

"اب منگھو پیر کو جاتی ہے ...... ہر جمعرات کے دن"!

"ہوں!" میں نے ہنکارا بھرا

"پانچ سیر کا ایک روٹ اور کٹورا گھی کا ساتھ لے جاتی ہے۔ روٹ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے مگرمچھوں کے سامنے پھینک دیتی ہے اور گھی کو بڑے چراغ میں"

"جہاں سے نکال کر مجاور کو ضرور کھا لینا چاہئے" میں نے مسکراتے ہوئے اُس کی بات پر گرہ لگائی" "حیران ہوں، پڑھے لکھے لوگ بھی اوہام پرستی سے نہیں نکلتے"

میرے میزبان نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کشتی ہولے ہولے گھاٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ رانی بھی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ وہ اپنے سامنے والے تختے پر بیٹھی ایک بدگل کالی عورت کی طرف دیکھ رہی تھی جو بچے کو دودھ پلانے میں مصروف تھی اور میں رانی کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا جس پر کئی قسم کے اُداس جذبات باریک لہروں کی طرح چڑھ اُتر رہے تھے۔ کشتی میں سے نکل کر ہم موٹر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ رانی پچھلی سیٹ پر اور میں اور میرا میزبان اگلی سیٹ پر۔ موٹر جلد ہی شہر سے نکل کر تلات کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچ گئی۔ آہستہ آہستہ ہموار زمین خشک ٹیلوں کی شکل میں اُبھرنے لگی۔ جہاں تک نظر پہنچتی تھی کسی قسم کی ہریاول کا نشان نہ تھا۔ سڑک کے دونوں طرف پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ خوبصورت اور بانجھ۔ مجھے رانی کا خیال آ گیا۔ میں نے گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ رانی آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ اُس کے دائیں طرف گھی کے کٹورے پر دھرا ہوا روٹ رومال میں بندھا ہوا ہل رہا تھا۔ پھر میں نے اپنے میزبان کی طرف دیکھا جو اپنے خیالوں میں مستغرق موٹر چلا رہا تھا۔ وہ کراچی کے سرکاری کالج میں پروفیسر تھا۔ ایک نہایت قابل اور متبحر پروفیسر۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے باہر کی طرف دیکھا اور موٹر کو بالکل آہستہ کر لیا۔ میں نے بھی باہر کی طرف دیکھا۔ ایک بکری سڑک سے چند قدم ہٹ کر بچہ جن رہی تھی۔ ایک میمنا باہر آ چکا تھا۔ بکری ایک قدم آگے ہو گئی۔ چمکدار خون اُس کی ٹانگوں پر سے بہہ کر زمین پر ٹپک رہا تھا۔ درد سے اُس کی پچھلی ٹانگیں ٹیڑھی ہو کر کانپ رہی تھیں مگر جلد ہی اُس نے گھوم کر میمنے کو چاٹنا شروع کر دیا اور اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

میرے میزبان نے پیچھے کی طرف گھوم کر دیکھا۔ رانی آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ پھر وہ بولا۔

اتنا خون! اتنا درد! پھر آنکھوں میں چمک! کچھ پتا نہیں چلتا۔ آخر بنا کیا؟ یہ میمنا پلے گا، بکے گا، کھا لیا جائے گا۔ یہی حال آدمی کے بچے کا ہے، درد، خون، بچہ، پلتا ہے، بکتا ہے اور کھا لیا جاتا ہے ---"

وہ پھر چپ ہو گیا۔ اب پہاڑیاں پھر ہموار زمین میں تبدیل ہو رہی تھیں اور ہریاول کے آثار بھی نمودار ہونے لگے تھے۔ کچھ دیر کے بعد گندھک کے چشمے شروع ہو گئے اور ہم لوگ گاڑی میں سے نکل کر منگھو پیر کے چشمے کے کنارے پر جا پہنچے، چشمہ چھوٹا ہی تھا اور اُس کے اردگرد بے ڈھنگے پتھروں کی دیوار سی بنی ہوئی تھی۔ پانی کے درمیان بھی کچھ بڑی بڑی چٹانیں اُبھری ہوئی تھیں جن پر کئی مگرمچھ دھوپ میں لیٹے ہوئے تھے۔ اُن کے بھونڈے اور مکروہ جسم بالکل خشک تھے، شاید پانی میں گندھک ہونے کی وجہ سے۔ اور اگر وہ بیچ بیچ میں ہلنے جلنے نہ لگ جاتے تو یہی نظر آتا کہ پانی میں سڑے ہوئے درختوں کے کچھ خشک تنے پڑے ہیں۔

میں نے کہا "چھوٹے سے چشمے میں اتنے مگرمچھ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے"

"اسی حیرت ہی سے تو مجاور لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ آدمی کے اسی جذبے پر تو پیر پرستی، مذہب، اور اس قسم کے دیگر اوہام کے ڈھانچے کھڑے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان کے ڈر اور اس کی جہالت کو کب تک لوٹا جائے گا۔ منگھو پیر ...... ہیں ہیں ...... منگھو پیر ......"

"یہ مہاتما کے لئے ......" رانی نہایت انکسار سے اپنے شوہر کے بازو سے لپٹتے ہوئے بولی جیسے کسی نے اُس کے معبود کی بے ادبی کر دی

منگھوپیر

ہر نئی جگہ کی ایک الگ خصوصیت ہوتی ہے جو نووارد کو اپنی ایک مبہم اور نامانوس سی فضا میں لپیٹ لیتی ہے۔ یہ فضا جگہ کی نوعیت کے مطابق
[illegible]ہوں، گھڑیوں یا دنوں تک قائم رہتی ہے۔ اس عرصے میں آدمی ایک عجز آفریں سے نشے میں ہوتا ہے۔ اُس کے تمام حواس اور اعضاء ڈھیلے پڑ کر
اثرات کو اخذ کرنے کے لئے مستعد ہوتے ہیں۔ جیسے کسی دلھن کی حالت شوہر کے لمس سے پہلے ہو یا کسی مرید کی پیر پکڑنے کے وقت۔

میں نیا نیا کراچی پہنچا تھا زندگی میں پہلی مرتبہ سمندر کی گرج میرے کانوں میں پڑی تھی۔ لہروں کی زمردّی اور نقرئی ابال کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا
[illegible]ہ وہ اپنے پُرشکوہ غرور میں پھر رہی ہیں۔ پانی کی وسیع چادر سینکڑوں میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ دُور اُفق سے بھی پرے تک جہاں پہنچنے سے پہلے پہلے
انسانی نظر اور سمجھ بیکار ہو جاتی ہے۔ میری روح کو ایک شاندار خاموشی نے اپنی گود میں لپیٹ لیا تھا۔ ایک پُرامن اور پُرلطف خاموشی نے۔

کوئی گیارہ بجے تک ہم منوڑا کے ساحل پر خاموش ٹہلتے رہے۔ کبھی کوئی بات شاید ہو جاتی ہو، بالکل نرم اور دھیمی آواز میں جیسے کسی مذہبی
[illegible]کے تقدس کا احترام مدِنظر ہو۔ پھر میں ریت پر لیٹ گیا۔ میرا میزبان بھی میرے نزدیک لیٹ گیا اور اُس کی بیوی اُس کے پاس بیٹھ گئی۔ ہم
خاموش تھے۔ میں نے بُوٹ اُتار کر اپنے سرہانے رکھ لئے تھے۔ ہم لوگ لہر کی مار سے پرے تھے۔ پھر بھی کبھی کبھی کسی لہر کی پھوار میرے پاؤں کو لطف اندوز
[illegible]تی، دوپہر ڈھلنا شروع ہو گئی تھی۔ کرنوں کے لمحہ بہ لمحہ گھٹتے ہوئے زاویوں سے لہریں نئے نئے رنگ بدل رہی تھیں۔ میری آنکھیں ایک پُرلطف
[illegible]کے عالم میں رنگوں کی اِس میلا کو دیکھ رہی تھیں۔

میرا میزبان بھی بالکل خاموش تھا۔ قدرتی طور پر یا شاید میری خاموشی کے احترام میں۔ اُس کی بیوی بھی اِس عرصے میں کچھ نہ بولی تھی لیکن
[illegible]ہر ڈھلنے کے بعد اُس نے اپنے شوہر کے کان کے قریب منہ لے جا کر کچھ کہا۔ اُس کے شوہر نے ایک ہلکا سا اشارہ کیا اور وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ
[illegible]ے بعد وہ بے بسی اور دُکھ کی علامات ظاہر کرنے لگی۔ اور اُس نے پھر شوہر کے کان کے قریب اپنا مُنہ کیا۔ اُس کے شوہر نے پھر اُسے چپ
[illegible]نے کا اشارہ کیا۔ میں کوئی بات کر کے اِس متبرک خاموشی کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میرے منہ سے نکل گیا۔

"کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں!" اُس کا شوہر مبہم طور پر مسکرایا۔

"کچھ تو ہے؟" اس کی بیوی کو مسکراتے اور لجاتے ہوئے دیکھ کر میں نے پھر پوچھنے کی کوشش کی۔

"اسی سے پوچھ لو، رانی سے" میرے میزبان نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کیا جو دوسری طرف منہ موڑے انگلیوں سے ریت کرید رہی تھی۔

"کیوں جی؟" میں نے رانی سے پوچھا۔ وہ میری طرف گھوم کر مسکرائی اور پھر دوسری طرف منہ موڑ کر سورج کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیوں جی، کیا بات ہے؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"اگر نہ بتاؤ گی تو پھر مجھے کچھ نہ کہنا۔" اُس کے شوہر نے گویا اپنی ذمہ داری کو گلے سے اُتار کر پرے پھینکتے ہوئے کہا۔

"ہمیں وہاں بھی جانا ہے ......" وہ آہستہ سے بولی

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"منگھوپیر" وہ ساری کے آنچل کو سر پر کھینچتے ہوئے بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ دیکھ لیں گے منگھوپیر بھی۔ ابھی مجھے دو ہفتے اور ادھر ہی رہنا ہے" یہ کہہ کر میں لہر کی نقرئی ابال کا نظارہ کرنے لگا۔ کچھ
[illegible]کے لئے پھر خاموشی چھا گئی۔ رانی اُٹھ کر ساحل پر بے بسی اور انتظار کی حالت میں ٹہلنے لگی تھی۔ وہ بار بار سورج کی طرف دیکھتی تھی۔

"کیا بات کیا ہے؟" میں نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے اپنے میزبان سے پوچھا۔

"بات یہ ہے ......" وہ مسکرایا اور پھر رانی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "ہمارے بیاہ کو آٹھ نو سال ہو گئے ہیں مگر ابھی تک ہمارے ہاں
[illegible] میں نے اِس بات کو محسوس نہیں کیا تھا۔ رانی نے بھی اِسے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ مگر پچھلے دو ایک سال سے وہ اِسے بہت محسوس

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

اور یہ بھی نہیں کہ یونہی پیٹنا شروع کر دے بلکہ باقاعدہ طور پر ایک بہانہ ہوگا اور اس کے بعد ایک الٹی میٹم بھی، تب جا کے کہیں پیٹا جاتا ہے۔ جتنا ایک چھوٹے بھائی کا کسی بچے کو پیٹنا ضروری ہے اتنا ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس پیٹے جانے کی شکایت بڑے بھائی تک پہنچے۔ بڑا بھائی اس شکایت کے ازالے کے سلسلے میں چھوٹے بھائی کی گردن پکڑتا ہے اور گلی کے ایسے حصے میں لاتا ہے جہاں سے اس کی آواز اس شکایت کرنے والے کی بیوی کے کان تک پہنچ سکے۔ اس کے بعد پہلے ایک کڑکا سنائی دیتا ہے پھر ایک چپت جمتا ہے، پھر کڑکا — پھر چپت، پھر کڑکا پھر چپت —— اور ایک عرصے تک یہ عمل جاری رہتا ہے — محلے دار اکٹھے ہوتے ہیں، چھوٹے بھائی کو پکڑ لیتے ہیں اور بڑا بھائی چھوٹے بھائی کی وساطت سے ہمسایوں کو کوستا ہوا گھر واپس چلا جاتا ہے۔ دوسرا منظر کھلتا ہے، مقام وہی گلی، وقت، اگلا روز، چھوٹا بھائی جو پہلے منظر میں شلوار پہنے تھا اب نکر کسے ہوئے ہے اور شکایت کرنے والے ہمسائے کے اسی بچے کو یا اس کے کسی اور بچے کو (ایک ہی بات ہے) جو اب گلی کے نکڑ پر بیٹھنے والے بڈھے سے گنڈیریاں یا مونگ پھلی خرید رہا ہے، اپنے بھائی کی سی پاٹ دار آواز میں کڑک کے یہ کڑکا دے رہا ہے اور گھونسے پہ گھونسہ جما رہا ہے۔ یہ چکر پھر چلتا ہے اور دو ہمسایوں کے آپس میں پُرترنم گالی گلوچ پر ختم ہوتا ہے۔

چھوٹا بھائی صبح سویرے اُٹھتا ہے، دہی لاتا ہے، اور اس کے بعد اگر دیا سلائی ختم ہو چکی ہو تو وہ بھی لینے جاتا ہے۔ آدھا پراٹھا اور دہی کھانے کے بعد ننھی کے لئے گوجروں کے ہاں سے گائے کا دودھ لاتا ہے۔ اور پھر ہاتھ منہ دھو کر بستہ باندھتا ہے اور بازار سے سبزی اور گوشت لاتے لاتے ختم ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد اگر سکول دیر میں پہنچے تو مار کھاتا ہے۔ شام کو بڑا بھائی دفتر سے تھکا ہارا آتا ہے۔ تمام دن سرخ کھال کی جوتی پہنے ہوئے زرد مونچھوں والے موٹے ہیڈ کلارک کی گھرکیاں سہی ہوتی ہیں۔ طبیعت میں ایک چڑچڑا پن اور جلن ہوتی ہے۔ گھر پہنچنے پر کچھ کھانے کے لئے نہیں ملتا۔ چاہتا ہے کہ غصہ نکالے لیکن الجھن درپیش یہ ہوتی ہے کہ کس پر نکالے اور کیسے نکالے۔ چھوٹے بھائی کی بھاوج سے کچھ کہنے کی یوں ہمت نہیں پڑتی کہ بیوی ہے، ماں کو اس لئے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے پاؤں تلے بہشت ہے، باپ کے سامنے یوں زبان نہیں ہلتی کہ تیس روپے تنخواہ ہے اور اس نے رہنے کو مکان دیا ہے۔ ماتھا پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب چھوٹا بھائی میدان میں آتا ہے اور بتا کر کہ وہ یہاں کیا کر رہا تھا دھڑا دھم مار کھاتا ہے اور غصہ نکلواتا ہے۔ اور اس کے بعد تمام گھر ایک پُرسکون سی فضا میں ڈوب جاتا ہے۔

بڑے بھائی کی فطرت ہی کچھ عجیب ہے۔ بڑے بھائی معاف فرمائیں تو یہ کسی حد تک احمقانہ کہی جا سکتی ہے۔ خود حقہ پیتے ہیں، اور چھوٹے بھائیوں سے چلمیں بھرواتے ہیں مگر لطف یہ ہے کہ اگر سن پائیں کہ چھوٹا بھائی سگرٹ پیتا ہے تو اس کی کھال اُدھیڑ کے رکھ دی جاتی ہے۔ خود رات کے گیارہ گیارہ بجے گھر آتے ہیں اور چھوٹا بھائی ہی دروازہ کھولتا ہے، لیکن جو چھوٹا بھائی کبھی سورج غروب ہونے کے بعد آئے تو اس پر جوتیاں برستی ہیں۔ اگر بڑے بھائی نے جھوٹ بولا یا چوری کی تو گھر میں لطیفہ ہوا اور جو چھوٹے بھائی نے یونہی طبع آزمائی کی تو اخلاقی جرم ٹھہرا۔ ہمارے چچا کے ایک صاحبزادے ہیں وہ اپنے بڑے بھائی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ایک روز ہمارے یہاں تشریف لائے اور کلمہ کی انگلی اُٹھاتے ہوئے فرمایا ۔۔۔ "سنو" ہم اس وقت بیشتر چھوٹے بھائی ہی تھے۔ "سنو۔ بھائی جان ہمیں سگریٹ پینے نہیں دیتے، ہمارے ہاتھ کی صفائی ملاحظہ ہو۔ کوئی منتر نہیں جادو نہیں، یاروں نے انہی کی ڈبیا سے سگرٹ اُڑائے ہیں"۔ مسعود میاں تو ڈینگ مار کے چلتے بنے۔ اس سے اگلے ہی روز ایک لطیفہ ہوا سننے سے پیشتر یاد رہے کہ لطیفہ پر صرف ہنسا جاتا ہے، غور نہیں کیا جاتا تو ہم چچا کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے، چچا کے بڑے صاحبزادے تشریف لائے اور پاٹ دار آواز میں کڑک کے بولے ۔۔۔ "آج میرے کمرے میں کون گیا تھا؟" اور بھولا بھالا چھوٹا بھائی بول اُٹھا ۔۔۔ "میں نے بھائی جان آپ کی سگرٹ کی ڈبیا کو ہاتھ تک نہیں لگایا" لطیفہ ختم ہو چکا لیکن اس کے بعد مسعود میاں پر کیا گزری یہ ان سے پوچھ ہی کے بتائیں گے۔

امجد حسین

حق دار اور چھوٹا بھائی کلی طور پر اس کا دست نگر۔ نتیجہ یہ کہ یورپ میں بیشتر زمیندار اور فرموں کے مالک بڑے بھائی ہیں اور کارخانوں کے مزدور، دفتروں کے کلارک، فوج کے سپاہی اور گرجوں کے پادری چھوٹے بھائی۔ اس لئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یورپ میں اقتصادی جنگ سرمایہ دار اور مزدور کی نہیں بلکہ بڑے اور چھوٹے بھائیوں کی ہے۔ بڑا بھائی والد کے وفات پانے پر مارکوئس یا کاؤنٹ بن گیا، چھوٹے بھائیوں کے سینگ کہیں اور نہ سمائے تو آبادیات کا رخ کیا۔ ذہانت تھی، محنت کر سکتے تھے، گھاٹ گھاٹ کا پانی پینا پڑا تھا، سلطنتوں کی بنیادیں رکھ دیں۔ اور یہ سلطنتِ برطانیہ جو آج سورج کو غروب ہونے نہیں دیتی، انہی چھوٹے بھائیوں کی محنتوں پر استوار ہوئی۔ جہاں تک دودمانِ تیموری کے قانونِ وراثت کا تعلق ہے وہاں تو قصہ ہی اور تھا۔ نوابی دور ―― چھوٹے بڑے کی تخصیص ہی نہیں۔ جس کے ہاتھ لاٹھی رہی وہی بھینس ہانکتا رہا۔

آنکھیں بند کرتے ہوئے غور کرنے کی کوشش کی جائے تو اوسط درجے کے ہندوستانی چھوٹے بھائی کی تصویر کچھ ایسی ہی ذہن میں آئے گی۔ چھریرا بدن، ناک بالعموم بہتی، ڈھیلا لباس، ننگا سر، شلوار پر جا بجا نیلی سیاہی کے دھبے، اکثر ایک پائنچہ کا بخیہ ادھڑا ہوا، اچھلتا، ناچتا، فلمی گانے گنگناتا، کبھی گلی میں، کبھی سڑک پر اور سردیوں میں عموماً گھر کی چھت پر نظر آتا ہے۔ فراغت ہو تو دانتوں سے ناخن کاٹتا ہے۔ یہاں آپ کے کان کھڑے ہو سکتے ہیں کہ یہ تصویر ایک کمسن بھائی کی پیش کی گئی ہے۔ چھوٹا بھائی بڑی عمر کا بھی ہو سکتا ہے جس کی شلوار پر نیلی سیاہی کے دھبے نہ ہوں بلکہ ایک باپ بھی ہو سکتا ہے ―― بجا۔ لیکن جیسے ایک جوان دادا ابا کو ذوقِ سلیم برداشت نہیں کرتا۔ دادا ابا کی تصویر سفید داڑھی اور ہلتے ہوئے سر ہی کے ساتھ ذہن میں اترتی ہے اسی طرح ایک بڑی عمر کا چھوٹا بھائی بھی ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اگر ایک چھوٹا بھائی قد اور عمر میں چھوٹا نہیں رہا تو اسے کچھ اور کہہ لیجیے۔ آپ بھی "لانگ شارٹ سٹوری" کے مصداق اسے "بڑا چھوٹا بھائی" کہہ سکتے ہیں۔ کون روکتا ہے بلکہ ایک ادبی ترکیب کا اضافہ ہوگا۔ بہرحال ہمارے نزدیک ضروری ہے کہ ایک سچا چھوٹا بھائی قد اور عمر میں فی الحقیقت چھوٹا ہو۔ اور اگر ایک چھوٹا بھائی قد اور عمر میں چھوٹا نہ ہو تو آپ چار دوستوں میں بیٹھ کر اس کی ذہانت کی کبھی تعریف نہ کر سکیں گے اور ساتھ ہی مسکرا کے یہ بھی نہ کہہ سکیں گے ―― "شریر بہت ہے، ہی، ہی، ہی" ――

ہمارے والد کے ایک ملنے والے ہیں۔ ان کا ہر چھوٹا بھائی ذہین اور شریر ہے۔ کمرے میں داخل ہوں گے اور چھوٹتے ہی ارشاد فرمائیں گے ―― "ارے میاں کیا مصیبت ہے، عجب چکر میں ہوں" ہم پوچھیں گے ―― "کیا ہوا پیر صاحب۔ کیا مصیبت ہے، کیا چکر ہے" تو کہیں گے ―― "اجی وہ چھبو ہے نا بدبخت، ماسٹر سے عجب اٹ پٹانگ سوال کرتا ہے، ماسٹر غریب بوکھلا جاتا ہے" ―― اور یہ کہہ کر خود بھی بظاہر بوکھلا جائیں گے گویا چھبو میاں کی ذہانت نے ایسا ناک میں دم کر رکھا ہے کہ کچھ اور سوجھتا ہی نہیں پھر ہماری طرف یوں دیکھیں گے گویا اس الجھن کا حل پوچھ رہے ہوں۔ تو ہم کہیں گے ―― "اجی بچہ ہے نا بڑا ہو کر رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائے گا" اور اس کے بعد جو شرارتیں سنانے پر اترتے ہیں تو سنتے سنتے دم گھٹنے لگتا ہے۔ شامتِ اعمال یہ کہ آپ کے چھوٹے بھائی، ہر چند آندھی ہو یا طوفان ضرور آپ کے ایک نہ ذہانت کی بات اور نت نئی شرارت کر بیٹھتے ہیں۔ خواہ آپ کے منہ کا ایکسپریس چارپائی کی ادوائن میں ٹانک کر سکوں جائیں۔

چھوٹا بھائی اعلیٰ طبقے کا ہو یا نچلے طبقے کا روایتہً ذہین ہوتا ہے۔ ذہانت اور محنت (بڑے بھائیوں کے عقیدے کے مطابق) چونکہ دو متضاد خواص ہیں لہٰذا لکھنا پڑھنا کچھ کم ہے۔ تضیعِ اوقات کے لئے اعلیٰ طبقے کا چھوٹا بھائی یا تو فوٹوگرافی کی مشق کرتا ہے، یا ڈاک کے ٹکٹ اور تصویریں اکٹھی کرتا ہے، یا پھر تتریاں پکڑ کر ان کے رنگین پروں کو جوڑتا ہے اور نہیں تو بڑی بہن کے ساتھ آواز ملاتے ہوئے ہارمونیم پر انگلیاں چلاتا ہے اور نچلے طبقے کا چھوٹا بھائی سردی ہو تو کنکوے اڑاتا ہے اور گرمی ہو تو گولیاں کھیلتا ہے کبھی کبھی بڑی بہن پر کڑکنا بھی نظر آتا ہے۔ کنکووں اور گولیوں سے قطعِ نظر مذکورۂ بالا حرکات کو hobby کہا جاتا ہے۔ ہر پڑھے لکھے گھرانے کے چھوٹے بھائی سے توقع کی جاتی ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی "ہابی" ضرور ہوگی اور اسی توقع کی بنا پر ہر جماعت کے سالانہ امتحان کے انگریزی کے پرچے میں ایک مضمون بعنوان "مائی ہابی" ضرور لکھنے کو کہا جاتا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ ہمارے ایک نائل پاس استاد بچپن میں کنکوے اڑاتے اور گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھ پانے پر ہمیں دھمکایا کرتے پھر ساتھ ہی مختلف ہابیوں کے متعلق باتیں سنایا کرتے اور ہم ان انگریز بچوں پر رشک کیا کرتے جن کی ایک نہ ایک ہابی ہوا کرتی ہے۔ مدتوں ہماری یہ خواہش رہی کہ کاش ہماری بھی کوئی ہابی ہو لیکن آج تک ہم تیتریوں کے پر اکٹھے نہ کر سکے اور نہ بیرونی ملکوں سے ہم تک ٹکٹ ہی پہنچ سکے۔

اگر غور کیا جائے تو ایک اوسط درجے کے چھوٹے بھائی کی ایک ہی "ہابی" ہے ―― بڑے بھائی سے مار کھانا۔ یہ بات تو خیر الٹی ہوئی ہے کہ چھوٹا بھائی گلی محلے کے چھوٹے بچوں کو ضرور پیٹتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ معصوم بچوں کو کسی قسم کی جسمانی تکلیف دی جائے بلکہ فقط اپنی روحانی تسکین کی خاطر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

حق سے بغاوت

چرندوں میں کیا ذکرِ وحدت نہیں ہے؟ پرندوں میں کیا اس کی کثرت نہیں ہے؟
ہر اک شے ہے کونین کی سر بسجدہ فقط تجھ کو ذوقِ عبادت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

خدا کرتا ہے منکروں سے محبت خدا کو نہیں کافروں سے شکایت
خدا ڈھونڈتا ہے محبت جہاں میں کسی سے مگر تجھ کو الفت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

ترا شغل ہے بیکسوں کو ستانا ستم کو ترے رو رہا ہے زمانا
خدا محو ہے سب کی دلجوئیوں میں تجھے دل دکھانے سے فرصت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

خدا تو ترے دل کا ہر مدعا دے مگر تو غریبوں کی ہستی مٹا دے
تڑپتے ہیں فاقوں سے تیرے پڑوسی تجھے رحم سے کوئی نسبت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

بتا کس غریقِ الم کو نکالا؟ بتا کتنے گرتے ہوؤں کو سنبھالا؟
بتا بات کس کس کی بگڑی بنائی؟ جواب اس کا کچھ بے حمیت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

ہواؤں میں آزاد کمزور چڑیاں بیابان میں آزاد بے عقل حیواں
بشر ہو کے ہے تیرا پیشہ غلامی تجھے اس کی کچھ شرم و غیرت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے

نمود و نمائش میں لاکھوں لٹا دے جگہ نام کی، آگ گھر میں لگا دے
رئیسوں کی دعوت میں بن جائے حاتم پئے فاقہ کش تیری دولت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

دغا سے مزین ترا آستانہ ترے پاس جبر و ستم کا خزانہ
بہیمی بھی ہے بربریت بھی تجھ میں نہیں ہے تو اک آدمیت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

کہیں یہ نہ ہو، تیری لٹ جائے دولت کہیں یہ نہ ہو، تیری مٹ جائے طاقت
سزا موت ہے تیری قدرت کے باغی کہ تو قائلِ زورِ قدرت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

ابر احسنی گنوری

[illegible]

(18)

[illegible]

(19)

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

جمع نہ ہو سکتے جس کا نمونہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ سب لوگوں کی شرکت کی خوشی میں شکریہ کے طور پر میں اپنی جیب سے آج سے پانچ سو روپیہ ماہوار فنڈ میں دیا کروں گا۔ آپ سب کا مکرر شکریہ'

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ مردوں نے عورتوں کو کوٹ پہنوائے اور بازو میں بازو ڈال کر ہال سے نکلنا شروع ہوئے۔ کچھ جوڑوں نے جاتے جاتے طرّے کو اُس کی سخاوت پر مبارکباد دی۔ سب لوگوں کے جانے پر طرّہ ہال سے باہر نکلا۔ دو ملازموں نے بڑھ کر پگڑی سنبھالی اور فیلٹ ہیٹ سر پر پہننے کے لئے پیش کی۔ آنریبل سر ــــ نے ہیٹ لگاتے ہوئے کہا:۔

یہ پگڑی بھی کتنی بڑی مصیبت ہے۔ مجھے تو اس سے سر میں درد ہونے لگتا ہے'

ایک ملازم نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "حضور درست فرماتے ہیں لیکن آپ ہی تو کہا کرتے ہیں کہ پبلک کے سامنے اِس کا پہننا ضروری ہے"

آنریبل سر بڑھ کر رکشا میں بیٹھ گئے۔ چھ گز معمولی قلی رکشا کو دھکیلنے لگے۔ ساوؤے کی ڈھلوان پر ساٹھ درجے کی سردی میں کھدر قلی پھٹی پرانی شالیں اوڑھے ہوئے سنگریزوں والی سڑک پر سو رہے تھے۔ رکشا کی گڑگڑاہٹ سے کچھ قلی گھبرا کر جاگے اور دو تین نے بڑھ کر پکارا " رکشا چاہیے حجور؟ یہ رکشا چاہیئے حجور؟"

آنریبل سر غریب قلیوں کے آواز دینے سے جھلا گئے۔ اپنے قلیوں سے للکار کر بولے " رکشا کھڑی کرو" رکشا کے رکتے ہی ایک زمین کو بستر بنا کر سونے والا فقیر آگے بڑھ کر بولا " صاحب رام کے نام کا ایک پیسہ دو" اس صدا نے صاحب کے بڑھتے ہوئے غصے پر تازیانے کا کام دیا۔ اپنے قلیوں سے بولے " مارو ان سالوں کو۔ یہ سڑک پر کیوں پڑے ہیں۔ ان سے راستہ صاف کردو" اتنے میں آنریبل سر ثم صاحب کے ملازم بھی آ پہنچے انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنی آہنی نوک والی لاٹھیوں سے قلیوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ نیند کے ماتے اور نیم بیدار قلی اپنی پھٹی ہوئی چادریں سنبھالتے ہوئے سڑک پر بھاگنے لگے اور صاحب نے ایک قہقہہ لگا کر کہا:۔

" یہ تو پاگل معلوم ہوتے ہیں" رکشا کی گڑگڑاہٹ میں صاحب کا شیطانی قہقہہ اور فقرہ دونوں گم ہو کر رہ گئے۔

ڈاکٹر صاحب اور میں یہ غور کرتے ہوئے ساوؤے کی ڈھلوان پر سے اُترنے لگے کہ پانچ سو روپے ماہوار خیرات کرنے والے مسلمان بھی اس ملک میں موجود ہیں جہاں بعض مسلمانوں کی ماہوار آمدنی پانچ سو کوڑی بھی نہیں۔ تم ہی کہو اُس ملک کے غلاموں کا کیا حال ہوگا جس کے آقاؤں نے بھیک مانگنا شروع کر دیا ہے اور جس کے عام غلاموں کو بھیک دینے کی توفیق نہیں اور اس جذبے کو کس لقب سے یاد کرو گے جس سے کام لے کر تمہارے سربرآوردہ لوگ عوام کے سامنے طرّہ دار پگڑی باندھ کر جاتے ہیں اور عوام کے پیٹھ موڑتے ہی ہیٹ پہن لیتے ہیں۔ پھر یہی پانچ سو روپیہ ماہوار خیرات کرنے والے لیڈر پانچ کوڑی بھی اُن فقیروں کو نہیں دے سکتے جن کے پیٹ کی جلد فاقوں سے کاغذ کی مانند پتلی ہو رہی ہوتی ہے۔ بلکہ خیرات کے عوض اُس جلد پر کوڑے برساتے ہیں جس میں سے اُن کے اس ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے خون بھی نہیں گرتا۔ اگر میں ریا کار ہوں تو ان لوگوں کے لئے تمہیں کوئی نئی اصطلاح ہی وضع کرنی پڑے گی۔

مسوری۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۴۱ء

محمد باقر

ضروری اطلاع

جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بہ صورتِ دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین ہرگز واپس نہ کئے جائیں گے۔

"مینجر"

تو بھڑکیلے فرنگی سایوں اور دُم دار کوٹوں کے درمیان کئی زرتار ساریاں اور سیاہ اچکنیں ناچنے لگیں۔ فرنگی عورت نے جسمانیت کو عریاں سے عریاں طریق پر دنیا کے سامنے پیش کرکے خراجِ تحسین وصول کیا ہے لیکن مشرقی عورت کو تن ڈھانپ کر دل برمانے کا جو فن آتا ہے اُس تک ابھی تک مغربی عیش پسند نگاہ کی رسائی نہیں ہوئی۔ اور یا میں قدامت پسند ہونے کی وجہ سے مشرق کو یہ داد دے رہا ہوں۔ بہرحال لندن کے ہنگاموں کو دیکھنے کے بعد ساوڈے کا ناچ گھر دیکھ کر تم بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے کہ مشرقی سونے پر جب مغربی سہاگہ چڑھتا ہے تو اِس کندن کی جلا دوبالا ہو جاتی ہے۔

رات کے بارہ بجے تک شراب اور ناچ کا ہنگامہ گرم رہا۔ اِس وقت اِس محفل کو منعقد کرنے والے صاحب طرّہ دار دستار کے ساتھ آموجود ہوئے۔ اِن صاحب کی آمد پر میزوں سے ایک خفیف سا شور بلند ہُوا۔ اور طرّہ بند صاحب تمام میزوں کے سامنے سے گذرتے ہوئے اور ایک گھنٹوئے تبسم کے ساتھ نوجوان لڑکیوں کے سامنے جھکتے ہوئے ایک ایسی میز پر جا بیٹھے جہاں دو لڑکیاں ایک نوجوان سمیت اُن کا انتظار کر رہی تھیں۔ آرکسٹرا نئے سے نئے ناچ کے سر نکالنے کے بعد کونگا (conga) بجا رہا تھا۔ طرّے نے سامنے بیٹھی ہوئی ساری کی طرف متبسّم ہو کر دیکھا۔ ساری تھرکتی ہوئی میز سے اُٹھی اور طرّے کے سینے سے سینہ لگا کر فرش پر تھرکنے لگی۔ رفتہ رفتہ آرکسٹرا کی صدا بلند اور تیز ہوتی گئی۔ آرکسٹرا کا کنڈکٹر (conductor) ہاتھ میں لکڑی کا ایک ساز (castanets) لے کر مائیکروفون کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور تھرکتا ہوا اُسی لَے میں گانا گانے لگا۔ ساری کا پلو سر سے ڈھلک کر شانے پر آ رہا اور شانے سے گر کر کمر تک آ پہنچا۔ آرکسٹرا کی تیزی کی نسبت سے ڈھول اور بینڈ لیوں کی سریع حرکت کے ساتھ ساری کا سر بھی ہلنے لگا۔ طرّہ بھی ساری کی بڑھتی ہوئی وحشت کا ساتھ دے رہا تھا۔ دوسرے جوڑے اِس جوڑے کا ناچ دیکھ کر رفتہ رفتہ فرش سے ہٹ گئے اور اب سارے کمرے میں آرکسٹرا کے ساتھ صرف یہی طرّہ اور ساری ناچ رہی تھی اور تمام لوگ تحسین آمیز نگاہوں سے اِن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یکایک آرکسٹرا نے سُر ختم کیا۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ طرّہ اور ساری پسینہ پسینہ ہو کر رُک گئے۔ سارے ہال سے بیک وقت صدا بلند ہوئی کہ آنریبل سر ـــــ خاں صاحب اور مس ـــــ ایک دفعہ اور ناچیں۔ واہ واہ کے شور میں آرکسٹرا پھر بجنے لگا اور طرّہ اور ساری ناچنے میں مشغول ہو گئے۔ سارا ہال بُت بنا ہُوا اُن کی طرف دیکھ رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا آرکسٹرا کے سروں نے متحرک ساری اور طرّے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ناچ ختم ہُوا۔ آرکسٹرا کے خاموش ہونے پر مردوں نے تالیاں بجائیں لڑکیاں اور عورتیں ساری اور طرّے کی طرف داد دینے کے لئے دوڑیں۔ کنڈکٹر نے بجلی کی روشنی چند ثانیوں کے لئے گُل کر دی۔ کس مقصد کے لئے یہ تم سمجھ ہی سکتے ہو۔ تاریکی بڑے بڑے جرائم کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ اور یہاں تو آنریبل سر ـــــ خاں صاحب کا ظاہر و باطن تاریک تھا۔ بہرصورت جب روشنی ہوئی تو مرد بدستور تالیاں بجا رہے تھے اور آنریبل سر ـــــ رومال سے منہ صاف کر رہے تھے۔ پسینہ پونچھنے کے لئے یا کسی اور خیال سے۔

اسی طرح رات کے دو بج گئے۔ اب بیشتر مردوں کے پاؤں لڑکھڑانے لگے ناچ کی تھکاوٹ سے یا شراب کی بدمستی سے یہ صحیح طور پر معلوم ہو سکا۔ لیکن ٹھیک ڈھائی بجے آنریبل سر ـــــ ڈگمگاتے ہوئے پاؤں کے ساتھ بغل میں لی ہوئی دو فرنگی لڑکیوں کا سہارا لے کر فرش کے بیچ جانب رُک گئے اور حاضرین کو مخاطب کرکے بولے۔

"خواتین اور حضرات! میں آج اپنے پاس آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کافی الفاظ نہیں پاتا۔ آپ نے میری ناچیز استدعا پر وار فنڈ چندہ دینے کے لئے جس خوش دلی سے آج کے ([illegible]) میں شرکت کی ہے اُس کا اجر میں تو دے نہیں سکتا لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انگلستان آج کل جس موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اُس سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو یقیناً اِس قربانی کا صلہ دے گا جو آج آپ نے کی ہے اور میرا تو خیال ہے کہ اس کا صلہ ہمیں ابھی سے مل رہا ہے۔ ہندوستان کی آزادی انگلستان کی آزادی سے وابستہ ہے۔ اگر انگلستان آزاد رہے گا تو ہندوستان کو آزاد کرے گا۔ ورنہ ہندوستان کے آزاد ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ بلکہ اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ انگلستان کے آزاد ہونے کی وجہ سے ہندوستان اس وقت بھی آزاد ہے۔ ہم سب لوگ آزاد ہیں اور اُن ملکوں سے ہزاروں درجے اچھے ہیں جہاں نازیوں کی حکومت ہے۔ دوسرے لوگوں کے متعلق میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انگریزوں کے عہدِ حکومت میں بالکل آزاد ہیں۔ ہندوستان میں قرآن پڑھ سکتے ہیں۔ نمازیں ادا کر سکتے ہیں مسجدیں بنا سکتے ہیں اور مسجدوں میں اذان دے سکتے ہیں۔ یہ آزادی نہیں تو اور کیا ہے اگر ہم آزاد نہ ہوتے اور انگریزوں کی حکومت کے علاوہ کسی اور قوم یا مذہب کی حکومت ہوتی تو آج ہم اِس آزادی سے یہاں

[illegible]

[illegible]

[illegible] (homos) [illegible]

[illegible]

[illegible]

کو درس گاہ کا افتتاح کرنا ہے وہ آپہنچتے ہیں۔ بجلی کی روشنی میں چند سفید طرّے عام سروں سے بلند نظر آرہے تھے۔ طرّوں کے مختصر سے جلوس کے پیچھے پیچھے بیڈول جسم اور بھاری توندوں والے چند اور آدمی ہندوستان میں دستیاب ہونے والے بہترین سوٹ زیب تن کئے ہوئے آہستہ آہستہ ایسے ہی چل رہے تھے جیسے بطخیں پانی پر تیر رہی ہوں۔ میزوں سے اُٹھ کر بھی چند آدمی پیشوائی کے لئے لپکے۔ کچھ اس نفسا نفسی میں جلد جلد کلیاں کرتے ہوئے لوگوں سے نظر بچا کر اپنی موٹروں میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ طرّوں اور بطخوں کے تھم جانے پر جلسے کی کارروائی شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے مہتمم صاحب نے ایک طرّے دار صدر کی اجازت سے اپنی رپورٹ پڑھی۔ جس کا اقتباس یہاں درج ہے:-

"حضرات اور محترم خواتین! (یہ قناتوں کے پیچھے گپ شپ میں مصروف تھیں اور ان کے قریب بیٹھے ہوئے ایک مولوی صاحب انہیں بار بار خاموش رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ مگر جب مولوی صاحب ڈانٹتے اور محترم خواتین کچھ عرصے کے لئے خاموش ہو جاتیں تو کوئی بچہ وہاں رونے لگتا اور مولوی صاحب اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے اور کہتے "خدا کے لئے اسے چپ کرو") خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج ہم یہاں ایک اسلامی درس گاہ کے افتتاح کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم جس کس مپرسی کی حالت میں ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر یہ درس گاہ قائم کی گئی ہے کہ مسلمان لڑکیاں بھی یونیورسٹی کی تعلیم سے بہرہ ور ہو سکیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس درس گاہ کے انتظام کے لئے ہمیں مس ــــــ دستیاب ہوئی ہیں۔ آپ فارن (ولایتی) درس گاہوں کی تعلیم یافتہ ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ تہذیب یافتہ اور متمدن ممالک کے ذاتی تجربوں کی مدد سے وہ ہماری لڑکیوں کی زندگی کو بدرجۂ اتم سدھار سکیں گی۔ اور اُن کے عادات و اطوار میں یورپ کی ترقی یافتہ عورتوں کی سی خوبیاں پیدا کر سکیں گی۔ (ہیئر ہیئر کی آوازیں) .... اس درس گاہ میں لڑکیوں کو اسلامی تعلیم بھی دی جائے گی۔ گو ابھی تک اس کی تدریس کا انتظام نہیں ہو سکا لیکن منتظمین کی کمیٹی کے سامنے یہ اہم مسئلہ پیش ہے۔ انشاء اللہ اس کا حل جلد سوچا جائے گا۔ فی الحال ہوسٹل میں رہنے والی طالبات پر باقاعدہ نماز پڑھنے کی پابندی عاید کی گئی ہے اور اس کی نگرانی کا کام مس ــــــ کے سپرد کیا گیا ہے جو نہایت صالح عورت ہیں اور ایک عرصے تک ہز ہائی نس ــــــ کے حرم کی نگران رہی ہیں...........

آخر میں مجھے سر ــــــ کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی خاص عنایتوں کی وجہ سے اور جن کے مفید مشوروں کے باعث ہم یہ درس گاہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ آپ نہ صرف ہمارے قومی رہنما ہیں بلکہ ہمارے مذہبی امور میں بھی از حد دلچسپی لیتے ہیں۔ یہی دلچسپی آج انہیں صدارت کے لئے یہاں کھینچ لائی ہے۔ میں ان کا آپ کی طرف سے اور ساری قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب آپ کے سامنے اس درس گاہ کی صدر مس ــــــ چند کلمات عرض کریں گی"۔

مہتمم کی تقریر ختم ہونے پر تالیوں نے سائبان کے پرخچے اڑا دیئے۔ اور مس ــــــ ایک خوشگوار تبسم کے ساتھ صدر کی اجازت سے تقریر فرمانے لگیں۔ صدر جو ابھی تک اونگھ رہے تھے یکایک جاگ اُٹھے۔ یہ مس ــــــ کی جارجٹ کی ساری کی سرسراہٹ کا اثر تھا یا اُن کے معطر جسم سے ہوا میں پھیلنے والی عطر کی لپٹوں کا کرشمہ تھا کہ صدر اُن کی تقریر کے دوران میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ اونگھے بلکہ سارا عرصہ اُن کی طرف تکتے رہے۔ تالیوں کے شور کے درمیان درس گاہ کی صدر کی تقریر ختم ہوئی۔ جلسے کے صدر نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور درسگاہ کی بقا کے لئے ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگی۔ جس کا اختتام اُن آیات پر کیا جو میاں جی صاحب کی مسجد کی محراب کے اوپر لٹکے ہوئے بورڈ پر لکھی ہوئی ہیں۔ جلسہ برخاست ہوا۔ مہتمم صاحب نے لپک کر درسگاہ کی صدر اور ہوسٹل کی نگران کا تعارف صاحب صدر سے کرایا۔ تبسموں کا تبادلہ ہوا۔ ملاقات کی تقریب سے موضوع بدل کر موسم کی باتوں تک پہنچا۔ اور پھر مس ــــــ نے یورپ سے سیکھے ہوئے ہتھیاروں کی مدد سے باتوں باتوں میں صاحب صدر کو سینما کے سیکنڈ شو میں چلنے پر آمادہ کر لیا بلکہ صاحب صدر نے صدر درس گاہ اور ہوسٹل کی نگران سے درخواست کی کہ وہ اُس کے ساتھ سینما چلیں۔ دیگر طفیلیوں نے موقع شناسی کا ثبوت دیا اور اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ صرف ایک طرّہ موٹر کی پچھلی نشست پر اپنے دونوں پہلوؤں کو عطر بیز جھونکوں سے ... کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے گرماتا ہوا سینما کو روانہ ہو گیا۔

سنتے ہیں انسان نے ہوس کاری کے وہ وہ دلفریب اور پاکیزہ طریقے ایجاد کئے ہیں کہ شیطان بھی ششدر رہ گیا ہے۔ اسلامی درس گاہ کے افتتاح کی جو تصویر میں نے دیکھی ہے اس کو اگر [illegible] دیکھ پائے تو [illegible] کی ریاکاری پر رشک کرنے کی بجائے [illegible]

توند ملں اور چربیلی کے منہ میں پانی آرہا تھا۔ رسمی افتتاح سے پہلے کھانے سے فراغت پانا ضروری سمجھا گیا تھا۔ تاکہ افتتاح کی رسم پر کافی وقت صرف ہوسکے اور وہ لوگ آسانی سے جلد گھروں میں جاسکیں جنہیں افتتاح کے مقابلے میں اکل و شرب میں زیادہ دلچسپی تھی اور جنہیں ذاتی طور پر ممنون کرنے کے لئے منتظمین نے یہاں جمع ہونے کی دعوت دی تھی۔ کھانے کے دوران میں ایک سوٹ پوش نوجوان نے پاس بیٹھے ہوئے ایک اچکن پوش بزرگ سے پوچھا۔

"اس شہر میں لڑکیوں کے لئے اور بھی بہت سی درس گاہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے موجود ہیں۔ آخر اس قدر صرفِ کثیر سے ایک نئی درس گاہ کے افتتاح سے آپ کا مقصد کیا ہے؟"

اچکن پوش نے جواب دیا "حضرت مقصد تو بالکل واضح ہے۔ شہر میں لڑکیوں کے لئے درس گاہیں تو بہت موجود ہیں لیکن اسلامی درس گاہ کوئی نہیں"

سوٹ پوش نے پُرمعنی انداز میں کہا "تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ اِس درس گاہ میں لڑکیوں کے لئے اسلامی نصاب اور اسلامی نظامِ حیات رائج کریں گے"

اچکن پوش اسلامی درسگاہ کی اِس تصریح پر کچھ کھٹکے۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اسلامی درس گاہ کا تخیل منطقی رو سے صرف یہی ہوسکتا ہے کہ وہاں اسلامی نصاب اور اسلامی نظامِ حیات کی تعلیم دی جائے۔ کچھ گھبرا کر کہنے لگے۔

"جی ہاں قرآن کی تعلیم اور نماز کی پابندی لازمی ہوگی لیکن نصاب تو یونیورسٹی کا مقرر کردہ ہی ہوگا کیونکہ اُس کے بغیر یونیورسٹی سے درس گاہ کا الحاق نہیں ہوسکے گا"

سوٹ والے نے پوچھا "لیکن قبلہ آپ کو اتنی مصیبت کیا پڑی ہے کہ درس گاہ کا الحاق یونیورسٹی سے کرایا جائے۔ اگر آپ کا مقصد لڑکیوں کو ڈگریاں دلانا ہے تو اِس کے لئے اور کالج بھی موجود تھے اور یہ کہئے کہ لڑکیوں کو ڈگریاں دلاکر آپ کیا کریں گے۔ آپ کے لڑکے تو ڈگریاں لے لے کر بھوکوں مرنا شروع ہوگئے ہیں۔ اب کیا آپ لڑکیوں کے لئے بھی ایسی مستقبل کا سامان پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ دھوبی کے کتے کی طرح نہ گھر کی رہیں نہ گھاٹ کی؟"

اچکن پوش نوجوان کے انقلابی خیالات سے کچھ برہم سا ہوگیا۔ بولا "آپ تو سوشلسٹ معلوم ہوتے ہیں۔ سوشلسٹوں کا تو یہ وطیرہ ہے کہ وہ ہر ایک بات پر اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ اب آپ ہی کہئے کہ ایک اسلامی درس گاہ قائم کرنے میں کیا حرج ہے"

اب نوجوان نے بھی اپنے تیور بدلے۔ کہنے لگا "قبلہ گستاخی معاف۔ یہی تو میں آپ سے پوچھ رہا تھا کہ یہ درس گاہ اسلامی درس گاہ کیسے ہوگئی۔ اِس لئے کہ ہم اور آپ یہاں بیٹھے ہوئے پلاؤ قورمہ کھا رہے ہیں یا اِس لئے کہ آپ نے یہاں قرآن کی تعلیم اور نماز کی پابندی لازم قرار دے کر اُس کی نگرانی ایک ہندو عورت کے سپرد کردی ہے جس نے درس گاہ کی صدر کی حیثیت سے آج یہ افتتاحی رپورٹ مرتب کی ہے جو ہم لوگوں کے سامنے ہے اور جس میں یہ بھی لکھا ہے کہ درس گاہ میں دن رات مقیم رہنے والی لڑکیوں کی نگرانی مِس ـــــ کے سپرد کی گئی ہے جو اس درس گاہ میں آنے سے پہلے ہز ہائی نس ـــــ کی حرم سرا کی مہتمم تھیں"

ایک اور ڈاڑھی والے بزرگ درمیان میں بول اُٹھے "صاحب آپ حقیقت بیانی سے کام نہیں لے رہے۔ درس گاہ کی صدر ہندو خاتون نہیں بلکہ عیسائی ہیں۔"

اچکن پوش نے دیکھا کہ معاملہ حد سے بڑھ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی اور گل کھلے اس لئے بے تاب ہوکر بولے "دیکھئے صاحب ہم ہندوستانیوں میں یہی تو نقص ہے کہ ہم مجلس میں بیٹھ کر بھی ذاتیات کی بحث سے گریز نہیں کرتے۔ ہم میں سے جب بھی کوئی آدمی اچھا کام کرے ہم اُس کے کام کو دیکھنے کی بجائے اُس کی ذات کے نقائص نکالنا شروع کردیتے ہیں۔ ذاتیات کو چھوڑیئے۔ کام کو دیکھئے"

سوٹ پوش نوجوان اِس منطق سے مطمئن ہونے کے لئے تیار نہ تھا پھر بول اُٹھا "تو حضرت پھر اسلامی درس گاہ قائم کرنے کی تکلیف ہی کیوں کی گئی۔ یونیورسٹی کی غلام ساز تعلیم دینے والی تو اور درس گاہیں بہتری ہیں آپ سے کوئی حکیم نے تھوڑا ہی کہا ہے کہ پلاؤ کھاکر ایک نئی درس گاہ کا افتتاح کریں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یکایک نعرۂ تکبیر کی صدا پر اللہ اکبر کے نیم جان نعرے بلند ہوئے۔ سب لوگ کھانا کھاتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ معلوم ہوا کہ جن صاحب

ویٹر جانے لگا تو ساری نے پھر اُسے پکارا۔ اور ہاں دیکھو۔ دونوں پانی پینے کے ٹمبلر میں لاؤ۔ وائن گلاس نہیں چاہئیں۔

ویٹر "بہتر حضور" کہہ کر مسکراتا ہوا چلا گیا اور تھوڑی دیر میں دو سفید گلاسوں میں دو بیرنگ مرکب ڈال کر لے آیا۔ ایک بھرا ہوا تھا اور ایک میں پینے سے لگی ہوئی سیّال شے تھی۔

ساری اور اچکن نے گلاس ختم کئے۔ ساری نے ٹشنیر کو جمپر کے نیچے چھپایا۔ اچکن نے دو پلّی ٹوپی سر پر رکھی۔ اور وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ ہمیں جلد چلنا چاہئے۔ مہاتما...... تو اب تک آچکے ہوں گے۔ لیکچر شروع ہونے والا ہوگا اور اگر کہیں اُن کے لیکچر کے درمیان ہم وہاں پہنچے۔ تو مجمع میں گڑبڑ ہو جائے گی کیونکہ آپ پہلی دفعہ یہاں تشریف لائی ہیں اور آپ کے درشن کے لئے لوگ ضرور اٹھ کھڑے ہوں گے اور پھر نعرے بھی ضرور لگیں گے۔

ساری نے لجاتے ہوئے جواب دیا۔ یہ آپ کا حسنِ ظن ہے۔ میں کوئی اتنی بڑی قومی سیوک تو ہوں نہیں جس کے درشن کے لئے لوگ بے تاب ہو رہے ہوں'

اچکن نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ آپ کی قومی سیوا میں تو شبہ کرنے کی گنجائش نہیں لیکن لاہور بھر میں آپ کے Personal charm کی بھی تو دھوم مچ رہی ہے'

کھدر پوش شوفر نے دروازے پر کھڑی ہوئی لیموسین کار کا دروازہ کھول دیا۔ ساری نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ آپ بڑے شریر ہیں' اور کار ہال روڈ سے گزرتی ہوئی پنڈال کی طرف چلی گئی۔ بھلا کیا سمجھے؛ اقبالؔ کی زبان سے ایک اشارہ کردوں۔

مے خانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

قوم پرست غیر مسلم مسلمان کو قوم پرست بنانے کے لئے "میخانۂ یورپ کے دستور" کے مطابق عمل کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ حکیمِ اُمّت نے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا۔

کیا دبدبۂ نادر کیا شوکتِ تیموری
ہو جاتے ہیں سب دفتر غرقِ مئے ناب آخر

اور میں نے اپنی آنکھوں سے اِس شعر کی تعبیر دیکھی ہے۔ جب اِس قوم پرست مسلمان کی تقریر ختم ہونے لگی تو جانتے ہو وہ کیا کہہ رہا تھا!

'بھائیو۔ اب آپ شریمتی...... کی تقریر سنیں گے۔ آپ اِن کا درشن آج پہلی مرتبہ کر رہے ہیں' میں انہیں اُس وقت سے جانتا ہوں جب چند سال پہلے میں قومی وفد کے ساتھ انگلستان گیا تھا اور آپ وہاں کیمبرج میں تعلیم پا رہی تھیں۔ آپ وہاں قومی جماعت کی سرگرم کارکن تھیں۔ آپ کے پریم، خلوص اور قومی خدمت کے جذبہ کی دھوم انگلستان بھر میں مچی ہوئی تھی۔ چند مہینوں کے قیام میں میں بھی آپ کی گوناگوں خوبیوں کا قائل ہو گیا۔ ایک Modern ہندو گھرانے میں تربیت پانے کے باوجود آپ کے دل میں ذرہ بھر بھی تعصب نہیں بلکہ جب میں اِن کو دیکھتا ہوں تو جہاں مجھے یہ فخر ہوتا ہے کہ ہماری قوم میں ایسی ایسی شریف اور سمجھدار دیویاں موجود ہیں وہاں مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ قومی میدان میں مسلمان خواتین ایسی دیویوں سے بہت پیچھے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ مسلمان عورتیں قومی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گی۔ اِسلام......'

اِسلام کا نام سنتے ہی کوئی بھولا بھالا مسلمان اپنا پورا گلا کھول کر پکارا۔ 'نعرۂ تکبیر'

پنڈال کے تمام مسلمانوں نے بیک وقت 'اللہ اکبر' کا نعرہ لگایا جس کی فلک بوس صدا آس پاس کے مکانوں سے ٹکرا کر گونجنے لگی اور اِس شور کے درمیان مقرر کا فقرہ گم ہو کر رہ گیا اور شریمتی...... صوفے سے اٹھ کر مائیکروفون کے سامنے آکر کھڑی ہو گئیں۔

دوست اگر مجھے ریاکار کہتے ہو تو اِس قوم پرست کے لئے کون سا نیا لفظ ایجاد کرو گے؟

مسلمان لڑکیوں کے لئے ایک درسگاہ کا افتتاح ہو رہا تھا۔ فرنگی آقا کے بڑے بڑے خطاب یافتہ اور خطاب کی اُمید پر جینے والے غلام جن کے پادؔ، وردیؔ، بیانی اور ہر طرح کے لیے کمانے نیبوں پہنچے جا رہے تھے جن میں ان کی بکثرت موجود تھا جس کو دیکھ دیکھ کر کھلنے والوں کو

انہیں ملامت بھی نہیں کرتا۔ یہ تسلیم کہ ہر ایک آدمی کا ضمیر اُسے بدی کرنے سے روکتا ہے اور بدی کرنے پر ملامت کرتا ہے لیکن وطن پرستوں اور قوم پرستوں کا ضمیر کہیں ہو تو بدی سے روکے یا بدی کرنے پر ملامت کرے۔ ان کا ضمیر آغازِ شعور سے ہٹ دھرمی اور ہوس کاری کے چوکے کھاتا ہُوا آخر کار مندمل نہ ہونے والے گھاؤ کا شکار ہو کر مر جاتا ہے اور اس ضمیر کے خلا پر پھر کئی طرح کے شیطان قبضہ پا لیتے ہیں جو دن رات قوم پرست کو ریاکاری اور منافقت کی نئی سے نئی راہیں سمجھاتے رہتے ہیں۔ ان کی تفصیل سنو تو دنگ رہ جاؤ۔

یہ لاہور کے ایک قہوہ خانے کا ذکر ہے۔ حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ واپس آؤ گے تو لاہور کا حلیہ بدلا ہُوا پاؤ گے اور بعض جگہوں پر تو بالکل لندن کا نقشہ نظر آئے گا۔ اب لاہور میں جگہ جگہ قہوہ خانے کھل گئے ہیں اور ان میں سے بعض میں ہر اُس چیز کی نقل کی جاتی ہے جو فرنگی آقا نے غلام آباد کو لُوٹ لُوٹ کر اپنے ملک میں مہیا کر لی ہے۔ چنانچہ جس قہوہ خانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں بیشتر فرنگی رنگ ہی نظر آتا ہے۔ ہم ایک چائے پر مدعو تھے۔ ایک غلام اپنی سعید اور پاک روح کے غلام جسم میں گرفتار ہونے کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ وہ اِسے فرنگی آقا کی پیروی میں (Birthday) (برتھ ڈے) پکارتا تھا۔ اور ہم اُسے اُس کی عمر کے پچیس سال کامیابی سے غلامی کی نذر ہو جانے پر مبارکباد دینے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ ہمارے قریب ایک میز پر ایک ادھیڑ عمر کے قوم پرست اور اسی گروہ کی ایک نوجوان خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ قوم پرست حسبِ معمول سرتا پا کھدر میں ملبوس تھے صرف سیاہ اچکن کے ساتھ میل کھانے والی سیاہ بدیشی جرابیں پہنے ہوئے تھے اور یہ بات نظرِ غائر کے بغیر معلوم نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ہر لحاظ سے بظاہر قوم پرست اور بباطن مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ خاتون بھی گاڑھے کی ساری زیبِ تن کئے ہوئے تھیں۔ البتہ گردن کے زیریں حصے پر جمپر کی قوس کے نیچا ہونے کی وجہ سے اُن کی سلک کی بدیشی شمیز کے پھول بار بار باہر نکل آتے جن کو وہ کیوٹکس سے رنگے ہوئے نوکدار ناخنوں سے بار بار جمپر کے نیچے دبانے کی کوشش کرتیں۔ ان دونوں قوم پرستوں کے بظاہر سودیشی اور بجسم بدیشی کپڑے دیکھ کر پہلے تو تعجب ہُوا لیکن معاً خیال آیا کہ آخر ان بیچاروں کا کیا قصور ہے اگر سودیشی کارخانوں والے ناز و نعمت میں پلے ہوئے جسموں (اور بیشتر معزز قوم پرستوں کے جسم ناز و نعمت ہی میں پلے ہوئے ہوتے ہیں) کے لئے سلک کے موزے، سلک کی شمیزیں اور کیوٹکس نہیں بناتے تو یہ لوگ مجبوراً بدیشی چیزوں کی طرف رجوع نہ کریں تو کیا کریں۔ آخر انسانی جسم پتھر کا تو ہے نہیں جو گاڑھے اور سلک میں فرق محسوس نہ کرے۔ دونوں کے لمس میں اذیت اور لطف کا جو فرق ہے اُس کو معزز قوم پرستوں کے سلجھے ہوئے جمالیاتی ذوق سے بہتر اور کون محسوس کر سکتا ہے۔ پھر جب شمیز، موزے اور کیوٹکس ضروریاتِ زندگی ٹھہرے تو انسان بدیشی سے بھاگ کر کہاں جائے۔ خود گاندھی جی ہی کو دیکھ لو۔ سودیشیوں کی سستی سے مجبور ہو کر وقت دیکھنے کے لئے بدیشی گھڑی استعمال کر ہی لیتے ہیں۔ اور وقت کم ہو تو تھرڈ کلاس میں بیٹھنے کی بجائے فسٹ کلاس موٹر کاریں بھی سفر کرتے ہیں۔ اب ہر ایک آدمی کی ذاتی ضروریات میں فرق ہے۔ سب لوگ نیم برہنہ رہ کر تو زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اگر گاندھی جی ذاتی ضروریات کی وجہ سے بدیشی مشینیں استعمال کرنے پر مجبور ہیں تو ان قوم پرستوں کا کیا قصور ہے جو بدیشی مشینوں کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کر رہے ہیں۔ تم اِسے ریاکاری کہہ لو لیکن میں تو انسانی کمزوریوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اِس سے درگذر ہی کروں گا۔ یوں بھی اِن سطحی باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے تمہیں قوم پرستوں کے خیالات اور جذبات پر غور کرنا چاہئے۔ اس کی ایک مثال تمہیں انہیں قوم پرستوں کی اِس گفتگو میں مل جائے گی جس میں وہ اس وقت مشغول تھے۔

اچکن پوش قوم پرست کہہ رہا تھا "شراب بالخصوص تو ہمارے مذہب میں منع نہیں۔ ہر ایک چیز جو نشہ دیتی ہے، وہ منع ہے۔ زیادہ کھانا کھانا بھی منع ہے کیونکہ اُس سے بھی نشہ سا ہو جاتا ہے۔ (یہ "خمر" کی تعریف ہو رہی تھی) اور اگر کسی چیز سے نشہ نہ ہو تو وہ حلال ہے"

ساری نے جواب دیا "میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ شمپین سے بالکل نشہ نہیں ہوتا۔ یہ بالکل ہلکی شراب ہے۔ اور رنگ بھی پانی کا سا۔ غالباً آپ نے کبھی taste نہیں کی"

اچکن: "یہ تو میں دعوے نہیں کرتا کہ میں نے شراب کبھی چکھی نہیں کیونکہ میں اتنا متعصب مسلمان نہیں۔ نیشنل کاموں میں حصہ لینے کے لئے ایسے scruples کو ایک طرف ہی رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن کھلے بندوں ایسے مجمع میں ایسی باتوں میں indulge کرنے سے شہرت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ آپ پسند کریں تو آپ شوق فرما سکتی ہیں۔ میں سوڈا منگوا لوں گا اور آپ کی رفاقت رہے گی"!

ساری: "بہتر۔ اگر آپ کی یہی رائے ہے تو اسی طرح سہی۔ (ملازم کی طرف مخاطب ہو کر) ویٹر! ایک شمپین اور ایک سوڈا"

[illegible]

२९३

[illegible]

[illegible] ....

.... [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اشتهار

جسم میں ایک ایسی برقی رو دوڑا دی جائے گی کہ اگر کوئی شخص اس کو ہاتھ لگائے گا تو اُسے سخت برقی جھٹکا محسوس ہوگا۔ مالک کی حفاظت کے لئے ایسی کنجی مہیا کی جائے گی جس کے استعمال سے جھٹکا وغیرہ محسوس نہ ہوگا اور برقی رو بند ہو جائے گی۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اِس قفل کے استعمال سے موٹروں کی بیٹری کی بہت طاقت صرف ہو جایا کرے گی۔

قدرت کا محکمۂ صفائی

سانپ قدرت کا توازنِ پیدائش و مرگ قائم رکھنے کے لئے' چوہوں کیڑوں مکوڑوں اور دیگر حشرات الارض کا شکار کرتے رہتے ہیں اگر سانپ وغیرہ یہ کام نہ کریں تو دیہات اور شہر حشرات الارض میں دب جائیں۔ بلیاں اور اُلّو بھی یہی کام کرتے ہیں۔ بلی اور چوہے کی دشمنی تو مشہور ہے ہی مگر اُلّو بھی اس سلسلے میں چھپا رستم ہے۔

سؤر خوراک کے معاملے میں عموماً صفائی پسند رہنا چاہتے ہیں لیکن اگر کوئی کیڑوں سے بھری' سڑی ہوئی لاش مل جائے تو یہ تر نوالہ بھی چھوڑا نہیں جا سکتا۔

پرندوں کی حالت بھی ایسی ہی ہے۔ اُن کی عام خوراک پھل پھول ہے لیکن بُسا ہُوا گوشت کون چھوڑے۔

کُتّے کا رات کو بھونکنا عموماً ناگوار معلوم ہوتا ہے لیکن عام کُتّے جہاں چوکیدار کا بہت اچھا کام کرتے ہیں اور مالک کو خطرے سے آگاہ کرتے رہتے ہیں وہاں صفائی کے کام میں بھی بہت مدد دیتے ہیں۔ فراغت کے وقت عموماً وہ کوڑے کرکٹ کو سونگھتے رہتے اور سڑی بُسی چیزوں کا حتی الامکان صفایا کرتے رہتے ہیں۔

ہندوستانی فلمیں

حال میں ایک فلمی رسالے "فلم انڈیا" کے خاص نمائندے نے سر رادھا کرشنا سے ملاقات کی۔ سر رادھا کرشنا نے اِس ملاقات کے دوران میں ہندوستانی فلموں کے متعلق بہت مفید اور قابلِ عمل خیالات کا اظہار کیا۔

"پرکاش پکچرز" کی فلم "بھرت ملاپ" کا ذکر آیا تو سر رادھا کرشنا نے اِس کی تعریف کرتے ہوئے کہا:۔

مجھے یہ علم ہے کہ عام ہندوستانیوں کے مذہبی رجحان اور مذہبی ماحول کی وجہ سے ہندوستان میں ایسی فلمیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں جو مذہبی روایات پر مبنی ہوں۔ لیکن اِس کے باوجود میں اس خیال کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہم لوگ "روایات پسندی" کے شوق میں حد سے آگے نکل گئے ہیں۔ ہمیں اپنی قدیم روایات کو محفوظ رکھنا چاہئے لیکن اِس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی روزانہ زندگی میں اُن کی ملتی جلتی مثالیں تلاش کریں۔ موجودہ لوگ اور موجودہ حالات بہرحال ہمارے پیشِ نظر رہنے چاہئیں۔

ہمارے ملک کی فلمی صنعت کو یا کم از کم اِس کے ایک حصّے کو قدیم روایات اور سادھوؤں وغیرہ کی فضا سے نکل آنا چاہئے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبے کی فلمی صنعت کے کارپرداز اس معاملے پر غور کریں۔ یہ صنعت اب تیس سال کی عمر کو پہنچ چکی ہے اب اس کو زندگی کے حقائق سے دوچار ہونا چاہئے اور ملک کے موجودہ معاشری اور اقتصادی مسائل پر توجہ کرنی چاہئے۔

حامد علی خاں

"ہمایوں" کے لئے بہتر کاغذ کا انتظام

فروری کے پرچے میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ اب "ہمایوں" پہلے کے مقابلے میں گھٹیا کاغذ پر چھپا کرے گا اگرچہ یہ گھٹیا کاغذ بھی زمانہ جنگ سے پہلے کے بڑھیا کاغذ سے تقریباً تین گنا مہنگا تھا۔

جس وقت ہم نے اُس کاغذ کا انتظام کیا اُس کے بعد لاہور میں تقریباً دو مہینے تک ہڑتال رہی اور کاغذ قطعاً نایاب ہوگیا۔ اسی وجہ سے دو مہینے تک بعض مقامی رسائل کے پرچے شائع نہ ہو سکے۔ یہ محض حسنِ اتفاق تھا کہ ہم نے ہڑتال سے پہلے کاغذ کا انتظام کر لیا تھا اور "ہمایوں" حسبِ معمول باقاعدہ نکلتا رہا۔

فروری مارچ' دو مہینے وہ کاغذ ہم نے استعمال کیا۔ اپریل سے ہم پھر بیش قیمت سفید کاغذ استعمال کر رہے ہیں اور اُمید ہے کہ آئندہ ہمیں یہ کاغذ ملتا رہے گا۔ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ محض کاغذ کی تخفیف سے "ہمایوں" کے مضامین میں کمی نہیں ہوئی۔ موجودہ ہا یک خط اور ۳۲ سطریں ہی بجالا رہا۔ ضموماً پسند کی گئی ہیں۔

جسم میں ایک ایسی برقی رو دوڑا دی جائے گی کہ اگر کوئی شخص اس کو ہاتھ لگائے گا تو اُسے سخت برقی جھٹکا محسوس ہوگا۔ مالک کی حفاظت کے لئے ایسی کنجی مہیا کی جائے گی جس کے استعمال سے جھٹکا وغیرہ محسوس نہ ہوگا اور برقی رو بند ہو جائے گی۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اِس قفل کے استعمال سے موٹروں کی بیٹری کی بہت طاقت صرف ہو جایا کرے گی۔

قدرت کا محکمۂ صفائی

سانپ قدرت کا توازن پیدائش و مرگ قائم رکھنے کے لئے چوہوں کیڑوں کوڑوں اور دیگر حشرات الارض کا شکار کرتے رہتے ہیں اگر سانپ وغیرہ یہ کام نہ کریں تو دنیا اور حشرات الارض میں دب جائیں۔ بلیاں اور اُلو بھی یہی کام کرتے ہیں۔ بلی اور چوہے کی دشمنی تو مشہور ہے ہی مگر اُلو بھی اس سلسلے میں چھپا رستم ہے۔

سؤر خوراک کے معاملے میں عموماً صفائی پسند رہنا چاہتے ہیں لیکن اگر کوئی کیڑوں سے بھری سڑی ہوئی لاش مل جائے تو یہ تر نوالہ بھی چھوڑا نہیں جا سکتا۔

ریچھوں کی حالت بھی ایسی ہی ہے۔ اُن کی عام خوراک پھل پھول ہے لیکن بُسا ہُوا گوشت کون چھوڑے۔

کتے کا رات کو بھونکنا عموماً ناگوار معلوم ہوتا ہے لیکن عام کتے جہاں چوکیدار کا بہت اچھا کام کرتے ہیں اور مالک کو خطرے سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ وہاں صفائی کے کام میں بھی بہت مدد دیتے ہیں۔ فراغت کے وقت عموماً وہ کوڑے کرکٹ کو سونگھتے رہتے اور سڑی گلی چیزوں کا حتی الامکان صفایا کرتے رہتے ہیں۔

ہندوستانی فلمیں

حال میں ایک فلمی رسالے "فلم انڈیا" کے خاص نمائندے نے سر رادھا کرشنا سے ملاقات کی۔ سر رادھا کرشنا نے اِس ملاقات کے دوران میں ہندوستانی فلموں کے متعلق بہت مفید اور قابلِ عمل خیالات کا اظہار کیا۔

"پرکاش پکچرز" کی فلم "بھرت ملاپ" کا ذکر آیا تو سر رادھا کرشنا نے اِس کی تعریف کرتے ہوئے کہا:۔

مجھے یہ علم ہے کہ عام ہندوستانیوں کے مذہبی رجحان اور مذہبی ماحول کی وجہ سے ہندوستان میں ایسی فلمیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں جو مذہبی روایات پر مبنی ہوں۔ لیکن اِس کے باوجود میں اس خیال کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہم لوگ روایات پسندی کے شوق میں حد سے آگے نکل گئے ہیں۔ ہمیں اپنی قدیم روایات کو محفوظ رکھنا چاہئیے لیکن اِس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی روزانہ زندگی میں اُن کی ملتی جلتی مثالیں تلاش کریں۔ موجودہ لوگ اور موجودہ حالات بہرحال ہمارے پیش نظر رہنے چاہئیں۔

ہمارے ملک کی فلمی صنعت کو یا کم از کم اِس کے ایک حصے کو قدیم روایات اور سادھوؤں وغیرہ کی فضا سے نکل آنا چاہئیے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبے کی فلمی صنعت کے کارپرداز اِس معاملے پر غور کریں۔ یہ صنعت اب تیس سال کی عمر کو پہنچ چکی ہے اب اِس کو زندگی کے حقائق سے دوچار ہونا چاہئیے اور ملک کے موجودہ معاشرتی اور اقتصادی مسائل پر توجہ کرنی چاہئیے۔

حامد علی خاں

"ہمایوں" کے لئے بہتر کاغذ کا انتظام

فروری کے پرچے میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ اب "ہمایوں" پہلے کے مقابلے میں گھٹیا کاغذ پر چھپا کرے گا اگرچہ یہ گھٹیا کاغذ بھی زمانۂ جنگ سے پہلے کے بڑھیا کاغذ سے تقریباً تین گنا مہنگا تھا۔

جس وقت ہم نے اِس کاغذ کا انتظام کیا اُس کے بعد لاہور میں تقریباً دو مہینے تک ہڑتال رہی اور کاغذ قطعاً نایاب ہو گیا۔ اسی وجہ سے دو مہینے تک بعض مقامی رسائل کے پرچے شائع نہ ہو سکے۔ یہ محض حسنِ اتفاق تھا کہ ہم نے ہڑتال سے پہلے کاغذ کا انتظام کر لیا تھا اور "ہمایوں" حسبِ معمول باقاعدہ نکلتا رہا۔

فروری مارچ دو مہینے وہ کاغذ ہم نے استعمال کیا۔ اپریل سے ہم پھر ٹیش قیمت سفید کاغذ استعمال کر رہے ہیں اور اُمید ہے کہ آئندہ ہمیں یہ کاغذ ملتا رہے گا۔ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ حجم کی تخفیف سے "ہمایوں" کے مضامین میں کمی نہیں ہوئی کیونکہ موجودہ باریک خط اور ۲۳ سطریں بھی بجالات عموماً پسند کی گئی ہیں۔

م۔ و

غیر ملکی سیاح عموماً یہ منظر دیکھتا ہے کہ ریلوے کے ملازم گاڑی میں یا اسٹیشن پر کسی بچے کے قد کو اپنے پیمانے سے ناپ رہے ہیں۔ یہ واقعہ عموماً ایسے موقعوں پر پیش آتا ہے جب بچے کے ماں باپ اور ریلوے کے ملازموں کے درمیان اس کے قد کے طول کے متعلق اختلاف ہو۔ بچوں کے ٹکٹوں کے متعلق قواعد حسبِ ذیل ہیں:-

دو فٹ چھ انچ سے کم لمبے بچوں کے لئے	ٹکٹ کی ضرورت نہیں
چار فٹ چار انچ قد تک	نصف کرایہ
چار فٹ چار انچ سے اوپر	پورا کرایہ

ہندوستان میں ڈاک اور تار کا محکمہ

ڈاک اور تار کے محکمے کے عظیم الشان کام کا کچھ اندازہ حسبِ ذیل اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے جو ۱۹۴۰-۴۱ء کی سالانہ رپورٹ سے حاصل کئے گئے ہیں۔

گزشتہ سال محکمۂ ڈاک کے ہاتھ سے ۱۲۱۵۰۰۰۰۰ اشیاء گزریں جن میں خطوط، پارسل، منی آرڈر بیمے وغیرہ شامل ہیں۔

گزشتہ سال ڈاک خانے کے ملازمین کی کُل تعداد تقریباً ۱۲۱۰۰۰ تھی اور ڈاک خانوں کی کل تعداد ۲۵۳۳۸ تھی۔

ڈاک کے ذریعہ سے گزشتہ سال جو رقوم بھیجی گئیں اُن کی کل میزان سالِ ماسبق کی طرح تقریباً ۲۹۸۰۰۰۰۰۰ روپے تھی۔

۳۹۰۰۰۰۰۰ رجسٹریاں بھیجی گئیں جن میں ۲۵۰۰۰۰۰ سے زاید بیمے شامل تھے۔

۳۴۰۰۰۰۰۰ منی آرڈر بھیجے گئے جن کے ذریعے ۸۰۰۰۰۰۰۰۰ سے زائد روپے کی ترسیل ہوئی

۱۹۰۰۰۰۰۰ تار محکمۂ ڈاک کے ہاتھوں سے گزرے۔

۲۸۰۰۰۰۰ کامیاب ٹیلیفون ٹرنک کال ہوئے۔

وی۔ پی کے ذریعے سے بھیجی ہوئی اشیاء کی قیمت کے طور پر سولہ کروڑ روپے جمع کئے گئے۔

سیونگ بنک میں جمع شدہ رقم کی میزان ۵۹۰۰۰۰۰۰ روپے تھی۔

گزشتہ سال کے خاتمے پر بہ مقابلہ سالِ ماسبق ڈاک خانوں کی تعداد میں ۲۲۳ کا اضافہ معلوم ہُوا۔

ہندوستانی موٹر کار

مسٹر والچند ہیرا چند نے جہازوں اور طیاروں کی ساخت کا کام شروع کر کے ہندوستان کی صنعتی تاریخ میں اپنا نام زندۂ جاوید کر لیا ہے۔ باوجودیکہ حکومت کی طرف سے اُن کی کچھ قابلِ ذکر حوصلہ افزائی نہیں ہوئی اب انہوں اپنی ہمت سے موٹر سازی کے کام کی طرف بھی توجہ شروع کی ہے۔ اپنے اس منصوبے کی منظوری کے لئے انہوں نے حکومتِ ہند کو جو درخواست بھیجی ہے اس میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اُن کے اس کام کو مساعیٔ جنگ کا ایک جزو سمجھنا چاہئے۔

مسٹر والچند اور اُن کے رفقائے کار کا خیال ہے کہ دورانِ جنگ میں حکومت کی طرف سے اگر موٹر گاڑیوں کے لئے انہیں باقاعدہ فرمائشیں وصول ہوتی رہیں تو وہ اس کام کو بہت اچھی طرح چلا سکتے ہیں اور انہیں سرمائے وغیرہ کے متعلق کسی قسم کی دقت پیش نہ آئے گی۔

حکومت کے نام مذکورۂ بالا درخواست میں یہ یقین ظاہر کیا گیا ہے کہ جنگ کے بعد ہندوستانی موٹر سازی کا یہ کارخانہ تجارتی تحفظ کے بغیر غیر ملکی کارخانوں کا مقابلہ کر سکے گا۔

برقی قفل

جان۔ ایل۔ ادسگڈ نے موٹر کاروں کی حفاظت کے لئے ایک نیا پرزہ ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے سڑک وغیرہ کے کنارے ٹھہری ہوئی موٹروں کی حفاظت کے لئے کوئی آدمی کھڑا کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ یہ ایک قفل ہوگا جو موٹر کے دروازے کو بند رکھے گا [illegible]

جہاں نما

فنِ طباعت

اب سے چند صدیاں قبل ہر کتاب قلمی ہوتی تھی۔ یورپ میں ٹائپ کے حروف کی ایجاد کو بہت زیادہ مدت نہیں گزری۔ سنہ ۱۴۴۰ء میں ایک جرمن موجد گٹن برگ نے سٹراسبرگ میں ٹائپ کے حروف بنائے۔ اس کے بعد اس فن نے بہت سرعت کے ساتھ ترقی شروع کی۔ بنارس یونیورسٹی کے رسالے میں ایک مضمون نگار لکھتا ہے:-

طباعت کی ایجاد نے دنیا کے تمدن پر ایک انقلابی اثر ڈالا ہے۔ تہذیب و معاشرت پر اس کے وسیع اثرات کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

فنِ طباعت کی ترقی سے پہلے اظہارِ خیال کا ذریعہ زیادہ تر نظم ہی تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ نظم کو انسانی حافظہ بہ آسانی محفوظ رکھ سکتا تھا اور نثر کے مقابلے میں اس کے زبانی دہرانے میں بھی آسانی رہتی تھی۔

فنِ طباعت نے ناخواندگی کو دُور کرنے میں جادو کا کام کیا ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ عالموں کی تقریریں سننے کے لئے جمع ہو جایا کرتے تھے۔ اب یہی کام کتابوں کے مطالعہ سے لیا جاتا ہے۔ آج کل سامعین میں زیادہ تر صرف ریڈیو کی تقریریں سننے والے ہیں ورنہ مطبع نے سامعین کو گھٹا کر قارئین کی تعداد میں لاکھوں کروڑوں کا اضافہ کر دیا ہے۔

مطبع نے ایک اَور اہم کام کیا ہے۔ اس کی وجہ سے نثر کو بہت نمایاں ہوتی ہے اَور دنیا کا علم و ادب گزشتہ ۵۰۰ سال میں اچھی کتابوں سے مالا مال ہو گیا ہے۔

فنِ طباعت کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے جمہور نے بے حد ذہنی ترقی کی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مشینوں کی ایجاد انسان کے لئے وبالِ جان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی انسانی ایجاد بجائے خود مفید یا مضر نہیں بلکہ اس کا طریقِ استعمال اس کو مفید یا مضر بناتا ہے۔ طباعت کی مشین بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ طباعت نے علم کے خزانوں کو محفوظ بھی کر دیا ہے اَور ان کو وسیع پیمانے پر بنی نوعِ انسان میں تقسیم بھی کیا ہے لیکن اس طباعت کے طفیل ہی دنیا میں تباہی کے جراثیم پھیلے ہیں اور پھیل رہے ہیں مشینوں کے استعمال کے متعلق مذکورہ بالا مضمون نگار کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں:-

سائنس کے کارناموں پر ایک نظر ڈالو۔ انسانی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے بجائے کچھ مدت سے یہ انسانیت کی بربادی کے ذرائع پیدا کرنے میں بہت سرگرم ہے۔ ایڈورڈ شرینر نے سچ کہا ہے:-

"ریل گاڑی بیل گاڑی سے صرف اُسی صورت میں بہتر کہلا سکتی ہے کہ اُس پر اچھے آدمی سوار ہوں اور تیز رفتاری صرف اُسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے کہ ہم حسن و صداقت کی منزل کی طرف بڑھ رہے ہوں۔ ہر حرکت کا نتیجہ ترقی نہیں نہ ہر تبدیلی اصلاح پر منتج ہوتی ہے"

اسی سلسلے میں مضمون نگار نے بُدھ کا یہ دو ہزار سال پُرانا قول پیش کیا ہے جو آج بھی اس قابل ہے کہ آبِ زر سے لکھا جائے:-

"اگر کوئی نظم دو ہزار ایسے اشعار پر مشتمل ہو جو مفہوم کے لحاظ سے بے مایہ ہوں تو اُس کے مقابلے میں صرف ایک ایسا معنی خیز شعر بہتر ہے جسے سن کر کسی کے دل کو سکون حاصل ہو جائے۔"

چینی ٹکٹ

چین میں غیر ملکی سیاح عموماً ایک عجیب نظارہ دیکھتا ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک میں ریل گاڑی پر سوار ہونے کے لئے بچوں کا ٹکٹ اُن کی عمر کے لحاظ سے نصف یا پورا لیا جاتا ہے۔ لیکن چین میں یہ عجیب رواج ہے کہ وہاں بچوں کا قد ناپ کر ٹکٹوں کے متعلق اندازہ کیا جاتا ہے چنانچہ

[illegible]		[illegible]	[illegible]
[illegible]		[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فصیحِ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تعلیمِ جدید:۔ محمد صدیق میمن صاحب کا مقالہ ہے۔ تعلیم جدید پر مولویانہ رنگ میں تنقید ہے۔ مقالہ نگار کا نقطۂ نگاہ انتہا پسندانہ ہے۔ قیمت ۳ر پتا:۔ انجمنِ اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ "ن"

پریم مندر:۔ از سید شبیر حسن صاحب۔ فلمی طرز کا ایک قصہ ہے۔ ...... ! قیمت ۵ر۔ پتا:۔ حیدرآباد بک ڈپو سانچہ توپ حیدرآباد دکن۔ "ن"

سلیس اُردو:۔ مرتبۂ انجمنِ ترقی اردو حیدرآباد دکن۔ یہ کتاب بالغ مبتدیوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ہے۔ اس میں معلوماتی مضامین اور کہانیوں کے علاوہ نظمیں بھی شامل ہیں۔ مضمون نگاروں میں سجاد مرزا صاحب غلام السیدین صاحب اور آغا حیدر حسن صاحب شامل ہیں۔ زبان نہایت شستہ اور سلیس ہے۔ حجم ۲۲۲ صفحے۔ پتا:۔ انجمنِ ترقی اُردو حیدرآباد دکن۔

زندہ چین:۔ مرتبہ و مترجمہ تمنائی:۔ یہ خوبصورت کتاب گیارہ چینی افسانوں کے تراجم کا مجموعہ ہے۔ تمام افسانہ نگار چین کی انقلابی تحریک سے متاثر ہیں۔ ان افسانوں کے کرداروں میں زندگی کی حرارت معلوم ہوتی ہے۔ اُردو کے نوآموز افسانہ نویسوں خصوصاً نئے ادب کے پرستاروں کو ان افسانوں کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔ قیمت درج نہیں۔ پتا:۔ نیا سنسار کتاب گھر بانکی پور "ن"

سازِ شکستہ:۔ یہ مختصر ناول مولانا رشید اختر ندوی کی تصنیف ہے۔ مولانا کو ناول کی ٹیکنیک سے قطعاً کوئی واقفیت نہیں۔ اور سماج کے جس طبقے سے انہوں نے اپنے کردار منتخب کئے ہیں اس سے بھی وہ ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ناول محض ایک مضحکہ خیز افسانہ بن کر رہ گیا ہے۔ ندوی صاحب نے انڈین پولیس کے ایک سابق رکن کو لارڈ بنا کر دارالامرا میں پہنچا دیا ہے۔ کیمبرج میں جرنلزم کا ایک کالج کھول مارا ہے لارڈ کی لڑکی کا ہیرو سے عشق بالکل بے معنی اور مایوسی کے بعد اس کا انتقام اس سے زیادہ بے معنی ہے۔ کردار اتنے غیر قدرتی ہیں کہ ایک انٹرنس پاس انگریزی میں اہم سیاسی اور دستوری مسائل پر اتنے تھوڑے دنوں میں ایک کتاب لکھ دیتا ہے کہ اس مختصر عرصے میں انگریزی زبان کا کوئی فاضل اتنے اہم موضوع پر ایک مقالہ لکھ دینے کی ہامی بھی نہ بھرے۔ انجام بہت پست ہے۔ اور فضل بک ڈپو کے اکثر ناول اسی طرح ختم کئے گئے ہیں کہ ایک کردار ناچ دیکھنے یا بازارِ حسن کی سیر کرنے جاتا ہے اور وہ دخترِ گناہ جس کی کشش اسے وہاں تک کھینچ لائی اس کی حقیقی بہن ہوتی ہے! مولانا عبدالمجید سالک اپنے تعارف میں فرماتے ہیں۔ "مجھے یقین ہے کہ اہلِ ذوق کے حلقے میں اس افسانے کی قدر کی جائے گی۔ اور مولانا رشید اختر اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔ ان کی طبیعت میں بہترین افسانہ نگاری کے ممکنات مضمر ہیں، جن کے اظہار کے تقاضے کو روکنا بہت بڑا ظلم ہوگا۔" ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے! قیمت ایک روپیہ۔ پتا:۔ اُردو بک سٹال لاہور "ن"

دفترِ دیوانی و مال و ملکی سرکارِ عالی:۔ یہ کتاب حکومتِ حضورِ نظام نے شایع کی ہے۔ نہایت مفید معلومات کا مجموعہ ہے۔ ساری کتاب نفیس آرٹ پیپر پر چھپی ہے بعض نہایت اہم فرمانوں اور خطوط کے فوٹو بھی شاملِ کتاب ہیں۔ قیمت درج نہیں۔ "ن"

تبویبِ حیدری:۔ از فضل اللہ احمد بی اے۔ مؤلف نے اس مختصر سے رسالے میں بڑی محنت کے ساتھ کتابوں کی ترتیب اور فہرست بنانے کے نئے علوم و فنون کی تقسیم کی ہے۔ اس ضمن میں اُردو زبان کی ہیئتِ ترکیبی ماحول، موجودہ سرمایہ اور آئندہ ترقی کے امکانات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کتابوں کی تقسیم و ترتیب کے متعلق غالباً اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ اس لئے اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ لائبریریوں کے لئے یہ کتاب خاص طور پر مفید ہے قیمت ۸ر پتا:۔ مہتمم حیدری گشتی کتب خانہ حیدرآباد دکن "ن"

تاریخِ وطنیت:۔ از شبلان۔ یہ کتاب وطنیت پر ایک علمی مقالہ ہے۔ مؤلف نے نظریۂ وطنیت کے آغاز و ارتقا پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور یورپ و ایشیا میں وطنیت نے جو گل کھلائے ہیں ان سب کا جائزہ لیا ہے۔ ہندوستان میں تحریکِ وطنیت پر جو باب ہے وہ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کتاب میں کافی معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ مگر کتابت و طباعت پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ پتا:۔ ادارۂ تجدیدِ علم حیدرآباد دکن۔ "ن"

فتحِ مبین:۔ از حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب۔ اس کتاب میں سنہ ہجری سے وفات تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ اسلوبِ تحریر پرانا ہے مگر کتاب انتہائی خلوص سے لکھی گئی ہے اور مؤلف نے واقعات کی چھان بین میں بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ قیمت درج نہیں۔ پتا:۔ شروانی بک ڈپو علی گڑھ۔ "ن"

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۲۔ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔
[illegible]

روحِ اقبال - مؤلفہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب شعبۂ تاریخ و سیاسیات جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن - علامۂ اقبال کے متعلق یہ بہت جامع کتاب ہے۔ اقبال کے آرٹ، اُن کے فلسفۂ تمدن، اُن کے مذہبی اور مابعد الطبیعی تصوّرات پر نہایت قابلیت سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ادب کے ہر عنوان کے ماتحت نہایت نکتہ آموز بحثیں کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال کے آرٹ کے زیرِ عنوان حسبِ ذیل مباحث ہیں :- (۱) اقبال کی شخصیت (۲) آرٹ اور زندگی (۳) خلوصِ شعر (۴) شاعر اور عالمِ فطرت (۵) اقبال کا شاعرانہ مسلک (۶) رومانی آرٹ (۷) تخئیلی پیکر (۸) فنی تجزیہ (۹) شاعرانہ تصوری (۱۰) اقبال کی غزل وغیرہ حجم ۷۰۳ صفحات - کتابت، طباعت کاغذ نفیس۔ قیمت درج نہیں۔ پتا :- سید عبد القادر اینڈ سنز گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن۔

اُردو شاعری کی مختصر تاریخ از محمد جمیل صاحب ایم اے (بریلوی) یہ کتاب ابتداء سے لے کر عہدِ حاضر تک کے شعراء کے حالات و نمونۂ کلام پر مشتمل ہے طلبہ اور دیگر شائقین اردو کے لئے پُر از معلومات ہے۔ حجم ۳۶۰ صفحات قیمت ہے۔ پتا :- نولکشور پریس لکھنؤ

مضامینِ عظمت - (حصّہ اوّل) مرزا عظمت اللہ خاں مرحوم سابق مددگار ناظمِ تعلیمات حیدرآباد دکن اُردو شاعری میں ایک الگ مسلک قائم کرنے کے لحاظ سے تاریخِ ادبِ اُردو میں ایک خاص جگہ حاصل کر چکے ہیں۔ مرحوم بہت ذہین اور عالم تھے اور اُن کی ادبی تنقید خاص وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی کچھ عرصہ قبل بیگم عظمت اللہ خاں نے اُن کی نظموں کا مجموعہ شائع کیا تھا ہمیں مسرت ہے کہ اب بیگم صاحبہ نے مضامینِ فرحت کا یہ مجموعہ شائع کر کے ایک بڑا فرض ادا کر دیا۔ ان مضامین میں بعض ترجمے ہیں اور بعض خود نوشتہ۔ مرحوم کو اُردو نثر پر بہت اچھی قدرت تھی۔ اُن کے ترجموں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس فن سے اُن کو خاص مناسبت تھی۔ اِن سے بہتر مترجم اُردو میں کم ہوں گے۔ اس مجموعے میں علاوہ حالاتِ عظمت کے حسبِ ذیل مضامین ہیں۔ (۱) زندہ بدست مردہ (۲) اٹوائی کھٹوائی (۳) انگریس (۴) خوش مذاقی (۵) کتاب کے کیڑے (۶) علم دوست خواتین (ڈراما از مولیئر) (۷) گڑیا خانہ (۸) سورما چار (۹) بھیڑیا چال۔ اس مجموعے میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں نظر آتی ہیں جو نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔ قیمت مجلد عہ۔ پتا :- علی اسد اللہ خاں صاحب بی ایس سی (عثمانیہ) برکت بنگلہ۔ ٹھگی جیل قدیم حیدرآباد دکن

راہگذر :- یہ حضرتِ عاشق بٹالوی کے تقریباً پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل اُن کے افسانوں کا ایک مجموعہ سوزِ ناتمام کے نام سے چھپ کر بہت مقبول ہو چکا ہے۔ موجودہ مجموعے کا دیباچہ ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ ایم اے ڈی لٹ لکچرار پنجاب یونیورسٹی نے لکھا ہے۔ دیباچہ بہت سیر حاصل اور قابلِ تعریف ہے۔ حضرتِ عاشق افسانے میں اپنی جس مہارتِ فن کے لئے مشہور ہیں موجودہ مجموعہ اس کے کمال کا آئینہ دار ہے جہاں تک صحتِ زبان اور حسنِ بیان کا تعلق ہے پنجاب کے نوجوان ادباء میں حضرتِ عاشق کا ہم پایہ دوسرا نظر نہیں آتا۔ موجودہ مجموعے میں جگہ جگہ سحرِ تحریر کے بدیع المثال نمونے ملتے ہیں۔ تمام افسانے نوجوانوں کی زندگی کے حقائق کا دلاویز مرقع ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب سوزِ ناتمام سے بھی زیادہ مقبول ہوگی۔ قیمت مجلد ۱۲؍ پتا :- لاہور بک شاپ۔ نسبت روڈ لاہور

رسالہ حیوانیات :- مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا یہ رسالہ خالص علمی ہے اور شعبۂ حیوانیات سے متعلق ہے۔ اُردو میں بہ مشکل ایک آدھ رسالہ اور ایسا ہے جو خالص علمی تحقیق کے لئے وقف ہو۔ اس رسالے کا معیار کافی اچھا ہے اور چونکہ اسے عام خریدار نہیں مل سکتے اس لئے اہلِ ذوق کا یہ فرضِ خاص ہونا چاہئے کہ وہ اس کی اعانت کریں۔ ہمارے پیشِ نظر فروری ۱۹۴۳ء کا پرچہ ہے جس کے بعض مضامین کے عنوانات یہ ہیں :- (۱) پرندوں میں گانے کے مقاصد (۲) ذیابیطس کے اسباب اور اس کا علاج (۳) جانوروں کے اخلاق و آداب (۴) حیاتین (۵) جانوروں کی جنس کی ابتداء اور ارتقا اور عروج وغیرہ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے طلب فرمائیے۔ (حامد علی خاں)

کشتیِ نوح مترجمہ پریتم سنگھ ایم۔ اے۔ پروفیسر صاحب نے ایچ جی ویلز کی ایک تمثیل کا ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ خاصا ہے مگر اکثر جگہ انگریزی محاوروں کا لفظی ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۰؍ ملنے کا پتہ :- پروفیسر پریتم سنگھ ایم۔ اے ۳۹ شبل روڈ لاہور "ن"

ہندو دھرم اور اصلاحی تحریکیں :- از پروفیسر پریتم سنگھ صاحب۔ اس کتاب میں برہمو سماج تھیوسافیکل سوسائٹی۔ آریا سماج۔ رام کرشن مشن۔ رادھا سوامی مت اور دیو سماج کے متعلق مفید معلومات درج ہیں قیمت مصنف سے ملے گی "ن"

کلمۂ طیبہ :- از قاری محمد طاہر صاحب۔ یہ مختصر سا رسالہ کلمۂ طیبہ کے اسرار و غوامض کے متعلق ہے اور واقعی پڑھنے کی چیز ہے قیمت ۲؍ ملنے کا پتہ :- انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ "ن"

بہن:۔ از حضرت محبوبؔ دکنی، دیباچہ از حضرت ماہر القادری۔ روزنامچے کی صورت میں ایک افسانہ ہے۔ قیمت ۸ر۔ پتا:۔ عابد شاپ حیدرآباد دکن

گردھاری:۔ ایک فلمی ڈراما از شبیر حسین صاحب نفیس۔ قیمت ۶ر۔ پتا:۔ حیدرآباد بک ڈپو۔ سانچہ توپ حیدرآباد دکن

خطابیات:۔ از شیخ رحیم الدین کمال۔ مقدمہ از نواب بہادر یار جنگ۔ قیمت ۱۲ر۔ پتا:۔ ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد (دکن) یہ کتاب فنِ تقریر کے متعلق لکھی گئی ہے۔ بعض عنوانات یہ ہیں (۱) گروہی تقریر (۲) ضیافتی تقریر (۳) نشری تقریر وغیرہ ہر قسم کی تقریر کے متعلق فنی نکات بیان کرنے کے بعد کسی مشہور مقرر کی تقریر بطورِ نمونہ پیش کی گئی ہے۔ آخر میں اُردو کے اِن مشہور مقرروں کے متعلق مختصر مضامین درج کئے گئے ہیں۔ سر سید احمد خاں، محسن الملک، عزیز مرزا، عطاء اللہ بخاری، ابو الکلام آزاد، بہادر یار جنگ، مولانا محمد علی، ڈاکٹر نذیر احمد۔ کتاب دلچسپ اور مفید ہے

قابیل:۔ اس نام سے لارڈ بائرن کے ایک ڈرامے کا ترجمہ اُردو کے مشہور ادیب اور شاعر حضرتِ مجنوں گورکھپوری نے کیا ہے۔ ڈراما دلچسپ اور خیال آفریں اور ترجمہ بہت صاف اور شستہ ہے۔ قیمت مجلد عہ۔ پتا:۔ ایوان اشاعت گورکھپور۔

نغمۂ زندگی:۔ یہ سید فضل احمد کریم فضلی بی لٹ (آکسن) آئی سی۔ ایس (بنگال) کا مجموعۂ کلام ہے جو تقطیع ہے اور نہایت نفیس کاغذ پر ٹائپ کے حروف میں چھپا ہے۔ کلام قابلِ مطالعہ ہے۔ قیمت جلد چرمی عہ جلد پارچہ ولایتی عہ۔ پتا:۔ فضلی برادران لمیٹڈ۔ کنٹ ہاؤس کلکتہ و دفتر انجمن ترقی اردو دہلی

برجیس طلعت:۔ ایک نوجوان لڑکی کی آپ بیتی ہے۔ اس اوسط درجے کے ناول کی مصنفہ بلقیس ضیا صاحبہ ہیں۔ حجم ۲۰۹ صفحات۔ قیمت عہ۔ پتا:۔ انڈین پریس الہ آباد

۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں:۔ یہ مجموعہ حلقۂ اربابِ ذوق لاہور نے شائع کیا ہے۔ حلقۂ مذکور نوجوان اور ترقی پسند ادیبوں کی ایک جماعت ہے جو بہ۔ خاموشی سے مفید ادبی کام کر رہی ہے۔ اس سال کے شروع میں حلقے کی طرف سے یہ مجموعۂ نظم شائع ہوا جس میں پنجاب اور بیرونِ پنجاب کے شعراء کی ۴۴ ایسی نظمیں جمع کی گئی ہیں جنہیں حلقے کے ارکان نے گزشتہ سال کی بہترین نظمیں قرار دیا۔ مجموعہ قابلِ مطالعہ ہے۔ قیمت ۸ر۔ پتا:۔ مکتبۂ اربابِ ذوق لاہور

میر محمد مومن:۔ (حیات اور کارنامے) یہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیرِ اعظم میر محمد مومن کی سوانح عمری ہے۔ میر صاحب زبردست ماہرِ سیاست، مصلح اور تعمیر کار تھے۔ اس کتاب کے مؤلف ڈاکٹر محی الدین قادری زور ہیں۔ اُردو میں اچھی سوانح عمریاں کم ہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اہلِ اُردو کے شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے اُردو سوانح عمری میں ایک اضافہ کیا۔ حجم ۱۱۳ صفحات ہے اور کاغذ، کتابت و طباعت بہت نفیس ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ ہاف ٹون عکسی تصویریں بھی دی گئی ہیں جن کی مجموعی تعداد ۱۴ ہے۔ قیمت مجلد عہ۔ پتا:۔ سب رس کتاب گھر حیدرآباد دکن

سر سید احمد پاشا (یا قاف کی پری) مصنفہ سید علی عباس حسینی صاحب۔ یہ ایک دلچسپ ناول ہے جو اب دوسری مرتبہ شائع ہوا ہے۔ یہ ناول واقعات یا تاریخ پر مبنی نہیں بلکہ تخیلی ہے۔ حجم ۸۸ صفحات۔ قیمت مجلد عہ۔ پتا:۔ معیار گو ایک ڈپو امین آباد لکھنؤ۔

نقشِ اوّل:۔ یہ بیگم صالحہ عابد حسین کے چند معاشرتی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے لکھا ہے اور بیگم صاحبہ نے اس کو اپنے بھائی خواجہ غلام السیدین کے نام معنون کیا ہے۔ افسانے قابلِ مطالعہ ہیں۔ حجم ۲۴۳ صفحات۔ قیمت مجلد عہ۔ پتا:۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

تصوّرات:۔ ملک سلمان الارشد صاحب کے چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ملک صاحب نوجوان ہیں۔ امید ہے کہ اُن کا آئندہ مجموعہ اس سے بہتر ہوگا۔ قیمت مجلد عہ۔ پتا:۔ عتیق الرحمٰن ذکر الرحمٰن تاجرانِ کتب چوک بازار بھوپال۔

بھگوت گیتا (بزبان فارسی) از فیضی۔ گیتا کے اس منظوم فارسی ترجمے کے متعلق خیال ہے کہ یہ فیضی کے قلم کا رہینِ منت ہے۔ زبان سادہ اور شستہ اور عام فہم ہے۔ امید ہے کہ شائقین اس کی قدر کریں گے۔ اس ترجمے کے دُنیا بھر میں صرف دو تین قلمی نسخے تھے۔ محمد شفیع صاحب کبوہ نے بڑا کام کیا کہ اس کتاب کو چھپوا کر شائع کر دیا۔ مسٹر پی۔ کے۔ ڈائل اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب نے اصل مسودہ کو بغور پڑھ کر کتابت وغیرہ کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔ کتاب صاف ستھری رنگین چھپی ہے۔ قیمت مجلد ہے۔ پتا:۔ دفتر نشر و اشاعت۔ خسرمید بھگوت گیتا۔ بزبان فارسی۔ کوچہ چراغ شاہ گڑھی شاہو لاہور

داستانِ تاریخ اُردو:۔ اردو نثر کے متعلق یہ ساڑھے آٹھ سو صفحے کی کتاب ابتداء سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک کی مفصل تاریخ ہے۔ جابجا اور عہد بہ عہد نثر کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ اتنی کثرت سے تصانیف کے نمونے اور کسی کتاب میں نہیں ملتے۔ نمونوں کے ساتھ مصنفین کے حالاتِ زندگی بھی درج کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے فاضل مؤلف جناب حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانز کالج آگرہ اہلِ اردو کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت سے ایک بڑی ضرورت پوری کر دی ہے۔ کتاب بہت اچھی چھپی ہے۔ مجلد ہے۔ قیمت درج نہیں۔ پتا:۔ لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب آگرہ۔

مطبوعات

تمدنِ اسلام کی کہانی اُسی کی زبانی - مفسرِ قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی کا وہ بصیرت افروز مقالہ جو انہوں نے انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیرِ اہتمام پڑھا قیمت ۳ر - پتا: معتمد نشر و اشاعت انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

صد برگِ گلِ جاوید عشرت :- حضرت عشرت گیاوی کے سو شعر انتخاب از سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی - قیمت ۲ر - پتا:- سید آل نبی حسینین منزل گیا (بہار)

بلقان - از حفیظ صدیقی صاحب بی۔ ایس سی قیمت ۳ر پتا- ادارۂ ادبیات اُردو حیدر آباد دکن - یہ کتاب عام معلومات کی کتابوں کے سلسلے میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا مطالعہ بلقان کے متعلق معلومات میں بہت کچھ اضافہ کر سکتا ہے۔

شمس الاعراب - مرتبہ پیر محمد اکبر صاحب قیمت ایک آنہ تین پائی۔ پتا:- میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور۔ اس کتاب میں سینکڑوں ایسے الفاظ کا صحیح تلفظ درج ہے جو اُردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ کتاب مفید ہے۔

اُردو اعراب - از محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ۔ اس کتاب میں اُردو زبان کے مستعمل اعراب میں ترمیم و اضافہ کی بعض تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مفید ہے۔ پتا: حبیب کمپنی اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن۔ قیمت ار

عزم و عمل - محکمۂ پنچایت پنجاب نے اپنے پروپیگنڈے کے سلسلے میں جو لکچر کرائے اُن کا مجموعہ ۱۶۴ صفحات میں شائع کیا ہے۔ مقرروں میں سر سکندر حیات، سر عبدالقادر، مسٹر ایف ایل برین، نواب فضل علی، پروفیسر تاج محمد، راجہ حسن اختر، میاں عبدالحی، مولوی فتح دین، شیخ نور الٰہی وغیرہ شامل ہیں۔ تقریریں پر از معلومات ہیں اور دیہاتیوں کے علاوہ شہریوں کے لئے بھی مفید ہیں۔ محکمۂ پنچایت پنجاب سے ملتی ہے۔

رہبرِ املا - از جناب پوکرمل صاحب گپتا وکیل ہائی کورٹ الہ آباد قیمت ۵ر - پتا:- لالہ دیا شنکر نقشہ نویس لادیا دروازہ الور۔ اس کتاب میں اُردو الفاظ کا املا سیکھنے کے لئے مفید طریقے درج ہیں۔

اُردو زبان کی نئی تحقیق - از پروفیسر اویس احمد ادیب۔ قیمت ۳ر - پتا:- دفتر پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبۂ متحدہ - بدایوں

ناکام - از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی مصنف دلی کا سنبھالا، گناہ، ہم اور وہ، روپ متی۔ سو صفحے کا ایک دلچسپ اور نکتہ آموز ناول ہے۔ قدرتِ زبان قابلِ تعریف ہے قیمت ۱۲ر - پتا:- اُردو مجلس پبلشرز مٹیا محل دہلی۔

بتیسی - بچوں کے لئے بتیس کہانیوں کا مجموعہ ہے جسے وقار احسن صاحب نے مرتب کیا ہے اور جعفری برادرز - مطبع انوار احمد الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ ہر کہانی ایک دلچسپ لطیفہ ہے۔ قیمت ۸ر

ادبی تاثرات - مرزا قدرت اللہ صاحب ایم اے نے اس کتاب میں ڈاکٹر محی الدین زور قادری کے چند مختصر مقدمے اور تبصرے جمع کئے ہیں۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے اس سے بہت سی نئی اُردو کتابوں کا پتا چل جاتا ہے اور اُن کے مضامین کے متعلق بھی کچھ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ قیمت ۱۲ر - پتا:- سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدر آباد دکن

تقویم ہجری و عیسوی - مرتبہ ابو النصر خالدی صاحب ایم اے عثمانیہ بہ نظرِ ثانی پروفیسر محمود احمد خاں صاحب پتا:- انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی - قیمت درج نہیں۔ اس تقویم سے ہجری اور عیسوی سنوں تاریخوں اور دنوں کی مطابقت معلوم ہو سکتی ہے۔ اُردو میں پہلے اس قسم کی کوئی تقویم نہ تھی۔ انجمن ترقی اُردو نے اس کی اشاعت سے ایک مفید خدمت سر انجام دی ہے۔

تاریخی اٹلس - از الطاف احمد صاحب علوی بی اے بی ٹی۔ پتا:- سلطانیہ بک ایجنسی ۹۸ نظیر آباد لکھنؤ قیمت ۱۰ر اس اٹلس میں آریوں کی آمد سے لے کر اس وقت تک کے متعدد نقشوں سے سنہ وار ہندوستان کی سیاسی حیثیت کی تاریخ واضح کی گئی ہے۔ ہر نقشے کے سامنے تشریحی مضمون ہے۔ تاریخ ہندوستان سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے بہت سادہ آسان اور دلچسپ طریقہ ہے۔

کیا ہمارے ادیبوں کو یہ نظر نہیں آتا کہ ہمارا نظامِ تعلیم ناقص ہے اور ہمارا طریقۂ تعلیم طالب علموں کی صلاحیتوں کو اُبھارتا نہیں بلکہ دفن کرتا ہے۔ ہمارے مدرسوں اور کالجوں کے معلم استادانہ شفقت اور عالمانہ خلوص سے محروم ہیں۔ اور ہمارے طالب علم علمی شوق اور سماجی محبت سے بے گانہ ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہماری نمایندہ حکومتوں کے عہدے دار اور وزراء رشوت خوار ہیں اور ہمارے قومی رہبر اپنے فرقے اور طبقے کے علاوہ دوسرے فرقوں کو کتوں کی طرح کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ چاہے اس کتے کی طرح جو کاٹنے سے پہلے علانیہ بھونکتا ہے اور چاہے اس کتے کی طرح جو بغیر بھونکے ہی چپکے سے کاٹ کھاتا ہے۔ کیا اس کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ بورژوا سماج کے خلاف آواز اُٹھانے والوں کی اخلاقی پستی کا یہ حال ہے کہ وہ بورژوا اقدار پر خود عمل پیرا ہیں اور نچلے طبقوں سے آنے والے ذہین نوجوانوں کی ذہنی پستی کا یہ عالم ہے کہ وہ بورژوا کی سی لایعنی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کی ساری جدوجہد کا حاصل یہی ہوتا ہے کہ وہ بورژوا بن جائیں۔ کیا یہ حقیقت تلخ نہیں ہے کہ ہمارے ادیب جس سماج کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، اُسی سماج کی سب سے بڑی لعنت کو وہ خود مستحکم کرنے میں پیش پیش ہیں۔ یہ اور بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کا سامنا ہمیں کرنا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں نے ان کی طرف سے آنکھیں کیوں بند کر لی ہیں۔ اُن پر اُن کا قلم کیوں نہیں اُٹھتا۔ کیا ان امراض سے ہمارا سماج دکھی نہیں ہے۔

ایک بات اور کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ ترقی پسند ادیب طبقۂ نسواں کے زیادہ تر ایسے کردار پیش کرتے ہیں جن کی جنسی بھوک مشتعل ہے اور جن کی آنکھیں عصمت کے نور سے خالی ہیں۔ وہ وفادار بیویوں یا محبت بیٹیوں اور مشفق ماؤں کا ذکر نہیں کرتے۔ حالانکہ ہمارا سماج ان پر جو ستم ڈھاتا ہے وہ ایک ترقی پسند ادیب کا موضوعِ تحریر بن سکتے ہیں۔ ان کے اس رویے سے تو ایسا شبہہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب خود جنسی بھوک میں مبتلا ہیں اور وہ عورت کو فاحشہ ہی دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کی تسکین اور حظ کا باعث بنے۔ اور یہ شبہ۔ اس وقت اور پختہ ہو جاتا ہے جب جب ہم دیکھتے ہیں کہ جنسی مسائل کو ایسے لہجہ میں بیان کیا جاتا ہے جس سے چٹخارے کی آواز آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے لکھنے والے کا مقصد عبرت دلانا نہیں بلکہ ترغیب دلانا ہے۔ اور وہ جنسی مسئلہ کے پھوڑے پر نشتر چلا نہیں رہا بلکہ اس کو نشتر سے آہستہ آہستہ سہلا رہا ہے تاکہ اس کی میٹھی میٹھی کھجلی سے لطف اندوز ہو۔ اسی لذتیت کی روح ہمارے ادیبوں میں کار فرما ہے اور اسی کی بدولت ان کے افسانوں میں جنسی خواہشات کا جا و بے جا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

اس بات کا افسوس کرنا غلط ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے ——— جو اُردو کی اُمیدوں کے مرکز ہیں اور جنہوں نے اُردو ادب کو اپنے پیش رووں سے زیادہ صحیح رستہ پر ڈالا ہے ——— یہ بے اعتدالیاں کیں۔ ایسا ہونا تو قدرتی امر ہے۔ کسی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے جائز مطالبات پیش کرنے سے روکا جائے تو ہاتھ ہٹنے پر وہ بات کو بڑھا کر بھی کہتا ہے اور زور سے چیخ کر بھی۔ ایسے زور سے کہ سننے والے اس کی بات سمجھ بھی نہ سکیں۔ یہی واقعہ ہمارے ادب پر بھی گزرا۔ اس کو سماج کے جنسی مطالبات کے اظہار سے روکا گیا۔ تو اس کا ردِ عمل بھی سختی سے ہوا۔ لیکن اب اس ردِ عمل کو شروع ہوئے بہت عرصہ گزر چکا۔ اس لئے ترقی پسند ادیبوں سے گزارش ہے کہ وہ جنسی مسائل کو مناسب حدود اور مناسب لہجہ میں بیان کریں اور ادب کے ذریعہ تنقیدِ حیات کریں اور حیات سے مراد صرف جنسی خواہشات نہیں ہیں۔

(رضوان الحق از دہلی)

"کتاب"

ضروری اطلاع

مضمون نگار حضرات کو اپنے مضامین کی صاف اور صحیح طباعت کے لئے اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ان کا مسودہ نہایت واضح صاف اور خوش خط لکھا ہو۔ شکستہ، مبہم اور غیر واضح الفاظ کو کاتب عموماً غلط پڑھتے اور غلط لکھتے ہیں۔ اس طرح مسودوں اور کاپیوں کی صحت میں نہ صرف غیر ضروری کوفت اٹھانی پڑتی ہے بلکہ طباعت بھی صاف نہیں ہوتی اور غلطیاں بھی کم و بیش رہ جاتی ہیں۔

جائنٹ ایڈیٹر

ہنود اس کی ترقی کو روک کر اُردو کی ترقی پر دل لگاتے ہیں۔"

مضمون اخبار الابصار، فروری ۱۸۶۹ء

مضمون مولوی تفضل حسین، بحث اس باب میں کہ رواج تحریر اُردو کا سررشتہ جات سرکاری میں بحال رہنا چاہئیے یا نہیں، "ان ایام میں بعض صاحب اہلِ ہنود نے تحریک اس امر میں کی ہے کہ جو رواج اُردو زبان کا سررشتہ جات سرکاری میں ہے وہ موقوف ہو کر بجائے اس کے زبان ہندی بخط ناگری رواج پائے۔ ...... ایسی تحریک اہلِ ہنود کی بجائے خود ہے اور علیٰ ہٰذا القیاس اگر اہلِ اسلام اس کے بالعکس تائید اُردو کی کریں تو وہ بھی بے محل نہیں، لیکن اوّل یہ بات غور طلب ہے کہ قوت باعثہ اس بات کی کہ وہ ایک جزو تحریک کا ہے کوئی شے دینی اور مذہبی ہے یا غیر اس کے سوا امر مذہبی اور دینی کی موثریت تو اس میں نہیں پائی جاتی کیونکہ دینی زبان مسلمانوں کی عربی ہے ...... پس اگر امر مذہبی یا فوائد علمی پر نظر ہو تو مسلمانوں پر تحریک رواج زبان عربی کی اور ہنود پر سنسکرت کی ضروری ہے نہ اُردو یا ہندی کی، اور اگر کہیں کہ اُردو کو عربی سے اور ہندی کو سنسکرت سے تعلق ہے تو یہ وجہ موجہ نہیں کیونکہ تعلق اُردو و ہندی کا عربی سنسکرت سے بر سبیل فرعیت ہے اور اصل کو چھوڑ کر فرع پر رجوع لانا مزیت فرع کی اصل پر لازم کرتا ہے جو عقلاً ممتنع ہے۔"

نمونہ مضمون رتن پرکاش الہ آباد

"ہماری رائے میں تمام ہندوستان کے قصبات اور بلاد میں اُردو زبان کا اس قدر رواج ہے کہ خواص و عوام کے محاورہ میں یہی زبان رائج و شائع ہے گو قریات میں اور زبانیں بھی بولی جاتی ہوں، علی الخصوص ممالک مغربی شمالی و اودھ کے قریات و دیہات میں فقط اُردو زبان سے کارروائی ہوتی ہے، علاوہ اس کے اردو زبان لب لباب چند زبانوں کی ہے اس میں الفاظ مستکرہ و شدید التلفظ سے بہت اجتناب ہے اُردو کی تحریر میں ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ تھوڑے حرفوں میں بہت مضمون سما جاتا ہے اور پڑھنے میں کسی قسم کا تکلف و تردد نہیں واقع ہوتا، اُردو کی ایک سطر کا مضمون ہندی کی تین سطر سے کم میں نہیں آسکتا ...... غرض عموماً ہندی کے رواج سے نوع بنوع کی دقتیں پیش آئیں گی اور کارروائی میں بہت ہرج واقع ہوا کرے گا، اس لئے کہ ہندی زبان مدت سے متروک ہے اس کے رواج و اشاعت کے واسطے زمانہ دراز چاہئیے۔

"مُصنف"

.... کا سالنامہ دیکھ کر

ہمارا سماج بڑا روگی ہے۔ اور برسوں سے چند در چند روگ اُسے اندر ہی اندر کھا رہے ہیں۔ ڈر یہ تھا کہ اگر ان روگوں کی روک تھام نہ ہوئی تو سماج کی اصلی روح بھی کہیں مسخ نہ ہو جائے۔ عرصے سے ہمارے ہاں کئی اصلاحی تحریکیں چل رہی ہیں۔ کسی کا مقصد سیاسی بیداری ہے کوئی اقتصادی آسودہ حالی کے درپے ہے۔ اقبال اور ٹیگور نے ادب و شعر کی دنیا بدلی گاندھی جی، محمد علی اور جواہر لال نے سیاسی آزادی کا صُور پھونکا۔ لیکن سماج کے وہ روگ جو اس کے سرچشمۂ زندگی کو خشک کر رہے تھے وہ اِن رہنماؤں اور فلسفیوں کی بلند نظروں سے اوجھل ہی رہے۔ اور عملاً ان کو بے نقاب کرنے اُن کو مٹانے کی طرف ہماری کسی سیاسی اور اجتماعی تحریک نے توجہ نہ کی اور حقیقت میں یہ اُن کا کام بھی نہیں تھا۔ ادب کا کام سماج کے ان جوہڑوں کو کھنگالنا ہوتا ہے اور ظاہرداری اور ریاکاری کے پردوں کے پیچھے دنیا جو کرتی ہے وہ اسے کھلم کھلا نظروں کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ سماج کو اپنے کرتوتوں سے گھِن آئے۔ فریب اور ریا کا طلسم ٹوٹے۔ اور طمع کی زندگی کا بھرم کھلے اس سلسلہ میں ترقی پسند ادیبوں کی جدوجہد واقعی اس قابل ہے کہ انہیں سراہا جائے۔ اور اُن کے مشن کی خواہ وہ بظاہر گھناونا ہی کیوں نہ ہو، داد دی جائے۔ آخر چیرنے پھاڑنے کا کام بھی کسی نہ کسی کو کرنا ہی پڑتا ہے۔

لیکن ترقی پسند ادیبوں کی یہ ساری جراحی دے دے کے صرف جنسی خواہشات تک محدود کیوں ہے؟ جنسی خواہشات اور اُن کی گوناگوں کارفرمائیوں کے سوا کچھ بھی ہو۔ اگر انہیں عورت کی مفلسی کی طرف اشارہ کرنا ہوگا تو اس سے پیشہ کرائیں گے۔ مرد کی کش مکش روزگار میں ناکامی دکھانا ہوگی تو اس سے چکلہ کھلوائیں گے۔ کسی نوخیز رئیس زادے کی بدعنوانیاں جتلانا مقصود ہو تو کسی خادمہ لڑکی کو اس کے جنگل میں پھنسا دیں گے اور کسی کارخانہ دار یا زمیندار کا جور و ستم اور اس کا تسلط دکھانا ہو تو مزدور اور کسان عورتوں کو اس کی خلوت گاہ میں دھکیل دیں گے۔ ان افسانوں کے پڑھنے سے تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے سماج کے جسم پر صرف ایک ہی پھوڑا ہے اور ... ہے جنسی مسئلہ۔

محفلِ ادب

اُردو ہندی کی پُرانی کشمکش

اُردو ہندی کی باقاعدہ کشمکش جس نے ہمارے زمانہ میں بڑی خطرناک صورت اختیار کرلی ہے اس کے آثار انیسویں صدی کے اخباروں میں ملتے ہیں گارساں دتاسی اپنے ایک مقالہ[1] (۱۸۶۹ء) میں اس کا ذکر کرتا ہے' وہ لکھتا ہے کہ ۱۸۶۹ء کے اُردو اخباروں میں اُردو ہندی کی کشمکش زور صاف صاف نظر آتا ہے' اس سال الہ آباد انسٹیٹیوٹ میں ایک خاص جلسہ منعقد ہُوا اور لطف یہ ہے کہ وہ لوگ جو اُردو کی مخالفت اور ہندی کی موافقت میں کھڑے ہوئے تھے خود اُردو میں تقریریں کر رہے تھے' اودھ اخبار نے اس جلسہ کی کارروائی پوری تفصیل کے ساتھ شائع کی جس ہندی کے علمبرداروں کی ہٹ دھرمی اور زیادتی اور اس لسانی رسہ کشی کی ابتداء کا پورا پورا حال معلوم ہوتا ہے' علی گڑھ کے اخبار سین ٹیفک سوسائٹی میں بھی اسی موضوع پر ایک مضمون شائع ہُوا تھا جسے اودھ اخبار نے دوبارہ نقل کیا۔

۵ مارچ ۱۸۶۸ء کو پھر ایک مضمون علی گڑھ گزٹ میں اُردو کی تائید وحمایت میں شائع ہُوا اور ۱۲ مارچ ۱۸۶۸ء کے اخبار میں سرسید احمد خاں نے اس موضوع پر قلم اُٹھا' میرٹھ کے اخبار جلوۂ طور میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہُوا جس میں گیا تھا کہ چونکہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اس لئے وہ اپنے حسبِ خواہش تبدیلیاں کر سکتے ہیں' اودھ اخبار نے اس سلسلہ میں بڑی دیانت سے کام لیا اور وہ تمام مضامین جو اس سلسلہ میں اُردو کی حمایت یا مخالفت میں شائع ہونے کے لئے موصول ہوئے انہیں چھاپ دیا' چونکہ یہ مسئلہ آج اور بھی اہم ہوگیا ہے اس لئے مذکورہ بالا مضامین میں سے بعض کے اقتباسات ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں:۔

ان اخباروں میں اس بحث کی ابتداء گورنمنٹ کی اس تجویز پر ہوئی کہ ہندوستان کی عدالتوں میں کونسی زبان اور کون حروف رواج پانے کے مستحق اس سلسلہ میں گارساں سب سے پہلے بنارس گزٹ کے ایک مضمون کا ذکر کرتا ہے چنانچہ پہلے ہم وہی اصل مضمون لے کر اس بحث کی ابتداء کرتے ہیں

نمونہ بنارس گزٹ[2]۔ جنوری ۱۸۶۹ء

"واضح ہو کہ جس وقت سے مسلمان اس ملک میں آئے اور ان کی قوت اور حکومت کو وسعت ہوئی تو انہوں نے ہندی حروف کو یک قلم اپنی سے دور رکھا بلکہ زبان بھی فارسی ہی قائم کی .... اسی وجہ سے بہتیرے ان میں (یعنی اہلِ ہند) سے ایسے ہوگئے کہ اب وے اپنی دیسی زبان پڑھ اور لکھ نہیں سکتے .... خیال کرنا چاہئے کہ اُردو زبان اگرچہ کم تاہم بیشتر عام میں جاری ہے لیکن یہ زبان نہ تو حاکم کی ہے اور نہ ہندوستان دیسی زبان سے تعلق رکھتی ہے اور وضع تحریر اس کی فارسی ہے اور بہ سبب اس کے کہ فارسی میں ایسے حروف بہت کم ہیں جن سے ہندی لفظوں ٹھیک ٹھیک لکھ سکیں اس وجہ سے ان کے پڑھنے میں نہایت قباحت ہوتی ہے اور ان کے لکھنے میں بیشتر غلطی واقع ہوتی ہے جس سے بڑی خرابی ہوتی ہے ...... اُردو زبان کو فارسی سے مدد مل سکتی ہے۔ اور چونکہ فارسی خود ہی ایک محتاج کم مایہ ہے تو بقول اس کے "عیسیٰ آپ ہے دوسرے کو کیا صحت بخشے گا" اس سے بدرجہ لاچاری عربی سے مدد لی جاتی ہے' اب اوّل تو فارسی ہی ہم سے غیر مانوس ہے دوم عربی سے بالکل غیر مخلوط ہے ...... حقیقت میں ہندی زبان ہمارے ملک میں بہ نسبت اُردو کے کہیں زیادہ مروج ہے اور اگر اوسط نکالا تو اغلب ہے کہ فی صدی بیس اُردو کے خواہاں پائے جاویں گے اور فی صدی اسّی ہندی کے خواستگار پائے جائیں گے .... اس (یعنی ہندی) کو زیادہ تر مدد سنسکرت سے مل سکتی ہے .... اور یہی سبب ہے کہ ہندی میں سنسکرت ملنے سے اس کو زیبائش علاوہ اس کے سنسکرت نہایت پُرمایہ زبان ہے' نظر بریں ہماری دانست میں ہندی زبان اور حروف سرکاری اور نیز عوام کے کاروبار کرنا چاہئے .... لیکن اب جو ہم دیکھتے ہیں کہ جابجا یہ تجویز ہو رہی ہے کہ اُردو کی یونیورسٹی قائم ہو' اور یہی زبان اور یہی وضع تحریر بار جاری کی جائے تو ہم کو نہایت افسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کے حق میں ڈنک کیا کر رہے ہیں .... اور اس پر افسوس کرنا چاہئے کہ

---

۱ بحوالہ مقالات گارساں دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اُردو'

۲ مقام اشاعت بنارس'

[illegible] — iii

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اصغر کی یاد میں

اس وقت میرے سامنے دو چھوٹی سی کاپیاں پڑی ہیں ایک میں اصغر کے متعلق واقعات کا نقشہ ہے دوسری میں کاغذات و اشیاء کی فہرست ہے۔ ان بنیادوں پر میں اُس کے سوانحِ حیات تعمیر کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے اصغر کے چمن سے چند سدا بہار کلیاں لے کر میں ہمایوں کی بزم میں ادھر اُدھر بکھیرتا رہا؛ جو کچھ اب کرنا چاہتا ہوں نہیں معلوم آخر کار وہ کیا صورت اختیار کرے لیکن میرے لئے کافی ہے کہ فی الحال کبھی کبھی اس سلسلے میں ہمایوں میں کچھ لکھتا رہوں۔ ہمایوں جو اصغر کے دادا کی یادگار ہے اس میں اُس کا بھی کچھ حصہ ہے! بعض پڑھنے والے شاید بعض باتیں بھول گئے ہوں اس لئے انہیں دہرا دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

اصغر ۱۱ اگست ۱۹۲۰ء کو اپنی امی کی اکیسویں سالگرہ کے دن شملے میں پیدا ہوا۔ شروع ہی سے ذہانت اور تیزی اُس کی ایک ایک ادا سے ٹپکتی تھی۔ وہ چھ برس کی عمر میں لاہور میں کوئین میری سکول میں داخل ہوا۔ گیارہ برس کا ہوا تو اُسے بشپ کاٹن سکول شملہ میں بھیج دیا گیا۔ دو سال کے بعد وہ لاہور میں سینٹ انتھنی سکول میں پڑھنے لگا۔ جہاں سترہ سال کی عمر میں اُس نے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔ ۲ اپریل ۱۹۳۸ء کو وہ ہندوستان کو خیرباد کہہ کر انگلستان کو سدھارا جہاں اعلیٰ تعلیم پانے کی غرض سے وہ واڈھم کالج آکسفورڈ میں داخل ہوا۔ ولایت میں دو سال رہ کر اُس نے مختلف علوم و فنون میں خوب دسترس حاصل کی اور مغربی زندگی کے مختلف شعبوں میں نہایت کامیابی کے ساتھ حصہ لیا۔ آخر ۲۴ مئی ۱۹۴۰ء کو یہ روشن ستارہ آکسفورڈ کے ایک چھوٹے سے دریا میں ڈوب کر ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا!

اصغر میں گوناگوں خوبیاں تھیں جو بہت کم نوجوانوں میں یکجا پائی جاتی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اُس کے دادا (جسٹس شاہ دین ہمایوں مرحوم) اور اُس کے نانا (سر محمد شفیع مرحوم) کے بعض متضاد اوصاف اُس میں آ کر جمع ہوئے۔ قابلیت اور خلق کا مظہر، دماغ میں تفکر کی قوت اور چہرے پر تبسم کی کشش، حسین، نانا ابا کا ذہین اور پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ اپنی سرگرمی اور تیزی کے ساتھ دوسروں سے انتہائی ہمدردی اور محبت! فلک پیما نے اُسے دو لفظوں میں بیان کیا ہے "ہمہ تن شوق"، یہ تھا اصغر!

میرے قریب ہی الماری میں ترتیب دی ہوئی اُس کی چیزیں پڑی ہیں۔ "واقعات" اور "کاغذات" کی فہرستوں کی دو چھوٹی کاپیاں تو میرے پاس میز کی دراز میں رہتی ہیں جس پر بیٹھے دن رات میری زندگی گزرتی ہے۔ ان کے ساتھ اُس کی ایک ننھی سی تصویر ہے۔ الماری کچھ دور نہیں پھر بھی غنیمت ہے کہ وہ بند رہتی ہے۔ کاغذات و اشیاء کی مختصر کیفیت یہ ہے۔ سکول کی رپورٹیں۔ انگریزی میں ایک نا تمام کہانی جو اصغر نے ولایت جانے سے پہلے لکھی اور جس کا ہمایوں میں ترجمہ چھپ چکا ہے۔ انگریزی میں بیس بائیس نظمیں کچھ ہندوستان اور کچھ انگلستان میں لکھی ہوئی۔ آکسفورڈ کی بارہ کاپیاں جس میں فارسی فرانسیسی تاریخ انگلستان اور سیاسیات وغیرہ پر مختصرات ہیں۔ اصغر کی کتابیں، اس میں ۱۹ تو [illegible] چکی ہیں ۵۷ [illegible] صاحب نے انگلستان میں روک لیں، تاریخ فرانسیسی فارسی انگریزی ادب موسیقی شطرنج ٹینس شعر و شاعری سیاسیات وغیرہ کے متعلق کتابیں ہیں گلستان، دیوانِ حافظ، بانگِ درا، جذباتِ ہمایوں بھی نکلیں۔ ضبط شدہ کتابیں سوشلزم اور موجودہ تحریکات کے متعلق تھیں۔ بعض کی ضبطی پر عقل زیادہ ہی حیران ہے مثلاً ہندوستان کے متعلق دو چار ایسی کتابیں جو میں نے یہاں سے لے کر بھیجی تھیں۔ آکسفورڈ کی مجالس یونین سوسائٹی اور انڈین مجلس میں اصغر نے بعض مباحثوں میں حصہ لیا ان کے مختصرات ہیں۔ ہندوستان کی سیاسیات پر چند نوٹ ہیں۔ تین چار مختصر روزنامچے ہیں۔ مغربی موسیقی پر علاوہ بہت سی کتابوں کے اصغر کا گراموفون اور بعض لاجواب ریکارڈ ہیں۔ ریڈیو ہے جسے اُس کے بھائی بہن اور ہم ہر روز استعمال کرتے ہیں۔ شطرنج، ایک پاکٹ شطرنج بھی ہے۔ ٹینس کے بلّے تھے جو سب تقسیم کر دیئے گئے۔ اصغر کے اُتارے ہوئے فوٹو جن میں آکسفورڈ کے دوستوں اور دریاؤں اور کالجوں کی اور پیرس اور سوٹزرلینڈ کی تصویریں ہیں۔ ایک ننھی حمائل جو اُس کی امی نے رخصت کے وقت اُس کے گلے میں ڈالی تھی، اُس کی [illegible] پاسپورٹ۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی ٹوپی اور گاؤن۔ سگرٹ کیس جس میں دو سگرٹ موجود ہیں۔ سگرٹ جلانے والا جو کسی دوست نے تحفہ دیا تھا۔ ایک فونٹن پن جس سے اصغر لکھا کرتا تھا۔ اصغر کی گھڑی جس میں دس بجنے میں پانچ منٹ ہیں (شاید یہ اُس کی آخری رات کی آخری ساعت ہے جب اُس نے تاریک دریا کی کھلی آغوش میں جگہ پائی تھی!) گھڑی کچھ آب زدہ اور کچھ زنگ خوردہ معلوم ہوتی ہے۔ چند بٹن۔ چند کپڑے۔ ہماری طرف اُس کے زندگی بخش بے نظیر خطوط۔ اصغر کے انجام کے متعلق خط و کتابت اور معلومات۔ قبرستان کی تصویریں، اُس کے جنازے اور قبر کی تصویریں۔ قبر پر حلقۂ احباب کی تصویر۔ خطوطِ تعزیت میں سے چند خطوط۔ اصغر کے دوستوں کے بعض خطوط جن میں اُس کی سیرت کا نقشہ کھینچا ہے یا بعض واقعات بیان کئے ہیں۔ چند مرثیے اور تاریخیں۔ اصغر کی تصویریں بچپن سے لے جوانی تک۔ اور ان کے علاوہ اپنے بیٹے کی وہ موہنی تصویر جو دل میں ہے اور جو آنکھیں بند کئے بیٹھی ہوں گاہے گاہے نظر آ جاتی ہے!

بشیر احمد

اور جب کانی سونے بھیگی ہوئی پلکوں سے لوسی کو گود میں اُٹھا کر چاروں طرف دیکھا تو دور دور تک کسی سپاہی کا پتا نہ تھا اور وہ اس عزیز جسم کو اُٹھائے ہوئے یہ سوچتا ہُوا خیمے کی طرف چل پڑا کہ کیا اِس عورت کو مار کر جس نے اس کا ہر مصیبت میں ساتھ دیا اس نے انتہائی سفاکی کا ثبوت نہیں دیا اور کوئی اندرونی آواز اس سے یہی کہتی رہی کہ اگرچہ انسان محبت کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے مگر موقع پر فرض اپنا کام کر جاتا ہے اور محبت ہاتھ ملتی رہ جاتی ہے۔ اگر تم صحیح وطن پرست ہو تو لوسی جیسی سینکڑوں لڑکیوں کی محبت سر پٹکتی رہ جائے گی اور تم انہیں کوئی کانٹا نہ بنا دو گے اور تمہیں بنانا بھی چاہئے۔ اور پھر یہ سوچ کر کہ لوسی بھی اِس جذبے میں اُس سے کچھ کم نہیں تھی اُس نے لوسی کے مُردہ جسم کو سینے سے لگا لیا اور اس کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا جس سے یوں ظاہر ہوتا تھا گویا لوسی نے اس کے دماغ میں گونجنے والے تمام خیالات سن لئے ہوں اور میدان سے لے کر خیمے تک جاتے ہوئے اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے اُس نے لوسی کو گود میں اُٹھائے ہوئے امریکہ سے جاپان تک پیدل سفر کیا ہو۔ اس کی باہیں شل ہو گئیں۔ ٹانگیں شل ہو گئیں۔ دماغ شل ہو گیا۔ اور وہ خیمے کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے گر پڑا۔

اسعد گیلانی

مطلعتان

(بزمِ گرامی ہوشیار پور کے تیرھویں سالانہ مشاعرے کی غزلیات سے انتخاب)

داغِ غم، داغِ الم، داغِ تمنا دل میں	جوشش	اتنی شمعوں سے بھی رہتا ہے اندھیرا دل میں
بن گیا پھول ہر اک داغِ تمنا دل میں	منوّر	کون ہے یہ چمن آرا چمن آرا دل میں
کون سے غیرتِ مہ کی ہے تمنا دل میں	قیس	اِک تموّج ہے دلِ دیدۂ دریا دل میں
لے کے پہنچے تھے جو اک جوشِ تمنا دل میں	عیش	رہ گئے انجمنِ ساقیٔ دریا دل میں
شوق دل میں ہے طلب دل میں تمنا دل میں	قیصری	ہم لئے پھرتے ہیں بستی ہوئی دنیا دل میں
نور افگن ہے جو وہ نورِ سراپا دل میں	مذاق	شعلۂ طور ہے ہر داغِ تمنا دل میں
شمع رو کون سا آئے گا خدایا دل میں	شاکی	داغ روشن ہیں مثالِ یدِ بیضا دل میں
جلوہ گر جب سے ہے وہ جانِ تمنا دل میں	ساگر	فکرِ عقبےٰ ہے نہ اندیشۂ دنیا دل میں
مشتعل ہوتے ہیں جذباتِ تماشا دل میں	فیضی	رکھ دیا تم نے یہ کیا آگ کا ٹکڑا دل میں
کشتیٔ صبر نہ کیوں ہو تہ و بالا دل میں	شاغل	شوق ہے یا کوئی اُمڈا ہوا دریا دل میں
اب نہ وہ شوق نہ وہ شوق کی دنیا دل میں	فدا	ہو گئی دفن مرے دل کی تمنا دل میں
رونق افروز ہوا وہ گلِ رعنا دل میں	شرر	کوئی ارماں ہے نہ اب کوئی تمنا دل میں
نت نئی صدقے کی ہوتی ہے پوجا دل میں	قتیل	نت نئے ڈھب کا لگا رہتا ہے میلا دل میں

رسالہ امر چند [illegible]

کی آزادی کے لئے مسلسل جدوجہد کر رہا تھا۔ جس کا احسان چین کے بچے بچے کی گردن پر تھا اور جس کا نام لے کر ہر چینی کا سر احترام سے جھک جاتا تھا۔ وہی جنرل جس کے خلاف جاپانی اخبار دن رات زہر اگلتے رہتے تھے اور بعض اسے پہاڑی چوہا' جیسے خطاب سے بھی سرفراز کرتے تھے وہی جنرل چان جس نے چین کی آزادی کے گلے میں پڑے ہوئے پھندے کو کاٹ کے رکھ دیا تھا اور جس نے چینی عظمت کے ڈھلکتے ہوئے سر کو ایک بار پھر سنبھال لیا تھا۔ وہی چینیوں کی عظمت ہستی اور جاپانیوں کا پہاڑی چوہا' سامنے والی پہاڑی میں فوج جمع کر رہا تھا تاکہ کائی سو کے دستے پر حملہ کر کے ان خوفناک دشمنوں کو اپنی سرحد سے باہر بھگا دے۔

کائی سو نے یہ خبر سُنی تو شام ہی سے اپنے دستے کو تیاری کا حکم دے دیا اور سامنے کے ٹیلے پر ایک مشین گن لگا کر لوسی سے کہا کہ جب اُدھر سے میں اشارہ کروں اور تمہیں کوئی شخص گھوڑے پر سوار بھاگتا ہوا نظر آئے تو اس پر باڑھ مار دینا۔ اور اسے کچھ دستہ دے کر خود صبح ہی صبح دوسری طرف سے ہو کر پہاڑی کے عقب سے جنرل پر حملہ کر دیا۔ وہ اس اچانک حملے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا اور اس کی فوج ہلکی سی مدافعت کے بعد تتر بتر ہو گئی۔ جنرل سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا پہاڑی کے پیچھے سے نکلا اور بڑھتا چلا گیا۔ دور سے سیٹی نے بج کر اور جھنڈی نے ہل کر لوسی کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ لوسی کے ہاتھ مشین گن کی طرف بڑھے اور اس کی آنکھیں چینی سردار کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ ہستی اس کے سامنے تھی جسے چینی پوجتے تھے۔ جس نے چین کی بدنصیب ماؤں کے بیٹوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے جانے سے بچا لیا تھا۔ جس کی آزادی کے لئے جدوجہد قابلِ احترام تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بھی ایک چینی لڑکی ہے اور احترام سے اس کی گردن جھک گئی۔ جن آنکھوں سے اس نے جنرل چان کو دیکھا اُن میں سے ایک چینی لڑکی کی روح جھانک رہی تھی۔ یہ وہ آنکھیں تھیں جو سب سے پہلے چین ہی میں کھلی تھیں جنہوں نے سب سے پہلے اسی کی فضا کو دیکھا تھا۔ انہیں کانوں سے اس نے اپنے ہم وطنوں کی فریادیں اور کراہیں سُنیں جن سے کبھی اُس نے اسی سرزمین میں میٹھی میٹھی لوریاں سنی تھیں۔ وہ انہیں پاؤں سے اپنے وطن کی آزادی کچل رہی تھی جنہوں نے سب سے پہلا نقش اسی سرزمین پر چھوڑے تھے۔ اور انہیں ماؤں کی گودیں خالی ہوتے دیکھیں جن میں سے ایک کی گود میں اُس نے خود ایڑیاں چلائی تھیں اور وہ اُسی وطن کی آزادی کا ایک زبردست بازو توڑ دینے والی تھی جس کی آغوش میں وہ پلی تھی۔ وہ خیالات کی رَو میں ایک بے بس تنکے کی طرح بہ گئی اور جذبات نے اسے حواس باختہ کر دیا۔ اس کا ہاتھ مشین گن کی طرف اُٹھا۔ بڑھا۔ دُور پہاڑی پر ایک جھنڈی اپنی محبت کا واسطہ دے دے کر اسے گولی چلانے کی ترغیب دے رہی تھی اور اس نے گولی چلا بھی دی لیکن مشین کا رُخ اپنے ہی دستہ کی طرف تھا۔ چینی سردار دُور پہاڑیوں کے سلسلے میں غائب ہو گیا۔ پہاڑی سے ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور لوسی لڑکھڑا کر گر پڑی۔ کائی سو نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

"لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں کیا آخر؟" کائی سو نے خون سے تر لوسی کو اپنی گود میں اُٹھا کر کہا

"مجھ سے اس کے متعلق کیا پوچھتے ہو۔ کائی سو! میں کچھ نہیں جانتی۔ میں کچھ نہیں جانتی کہ کیا ہُوا۔ تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں نے دغا کی۔ غلط کہتے ہو تم۔ وہ جس نے گولی چلائی وہ میں تو نہیں ہوں۔ وہ تو ایک چینی لڑکی تھی۔ جس نے چین میں پرورش پائی تھی۔ جسے اس کے فرض نے بُلایا تھا اور اس نے اپنے فرض کی آواز پر قدم بڑھا دیا۔ میں تو نہیں ہوں جس نے گولی چلائی۔ وہ چلی گئی ——— وہ لڑکی ——— وہ چینی لڑکی جس نے تم پر ہی گولی چلا کر تمہارا شکار تمہارے ہاتھ سے بچا لیا۔ اس چینی لڑکی نے اپنا فرض ادا کر دیا مگر افسوس کہ میں اپنا فرض ادا نہ کر سکی اب تم مجھ سے بھلا کیا پوچھتے ہو۔ میں تو وہی تمہاری محبوبہ ہوں لوسی! وہ چینی لڑکی جس نے گولی چلائی وہ تو معلوم نہیں کون تھی۔ لیکن اتنا جانتی ہوں کہ وہ مجھ میں ہی رہتی تھی۔ اس کی موجودگی سے میں بے خبر تھی ———!" (لوسی کی سانس اکھڑنے لگی)

"مجھے معاف کر دو لوسی۔ میں نے بہت بڑا گناہ کیا۔ تم نے میرے لئے وطن چھوڑ دیا۔ والدین چھوڑ دیئے۔ اور پھر میرے ہی ہاتھوں تمہاری یہ حالت ہو۔ معاف کر دو مجھے لوسی!"

"لیکن تم نے تو ایک چینی لڑکی کو مارا ہے۔ کائی سو! جسے مارنا تمہارا فرض تھا۔ اور اپنی محبوبہ کو تو تم گود میں لئے بیٹھے ہو۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا میں خوش ہوں کہ تم نے اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کی۔ افسوس کہ میں ایک چینی لڑکی کے وجود کو اپنے وجود سے کبھی الگ نہ کر سکی!" (لوسی کا دم ٹوٹنے لگا)

"فرض اور محبت یکجا نہیں رہ سکتے۔ ہم نے انہیں اکٹھا رکھنے کی ناکام کوشش کی!" (اس کی حالت متغیر ہو گئی۔

"مجھے تم سے ویسی ہی محبت ہے لوسی۔ جیسی ہمیشہ تھی!"

"میں بھی خوش ہوں کہ تمہاری آغوش میں جان توڑ رہی ہوں!"

فرض

جس طرح ایک ہی شہر کے دو شخص کسی اجنبی شہر میں مل کر اپنے آپ کو ایک دوسرے کے بہت قریب پاتے ہیں اسی طرح وہ ہمسایہ ملکوں کے رہنے والے جب دنیا کے اس سرے پر ایک دوسرے سے ملے تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے چین اور جاپان ایک دوسرے میں پیوست تھے اُسی طرح جیسے دُور افق کے پاس دو درخت ایک دوسرے سے فاصلے پر ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے گتھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور امریکا جیسے ملک میں بیٹھ کر انہوں نے ایک دوسرے کو اپنا ہمسایہ محسوس کیا۔ کائی سو جاپان سے امریکا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آیا ہوا تھا اور لوسی اپنے باپ کے ساتھ جو ایک چینی تاجر تھا نیویارک میں ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ دونوں کلب میں اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے سے ملے اور دوستوں کی طرح وہاں سے نکلے کچھ دنوں میں دونوں کی فرصتیں ایک دوسرے کے لئے وقف ہو گئیں اور جب وہ اپنے وطن کی باتیں کرنے لگتے تو معلوم ہوتا کہ انہوں نے دو ہمسایہ ملکوں میں نہیں ہمسایہ گھروں میں جنم لیا تھا۔

اور ایک دن دبی زبان سے کائی سو نے لوسی پر اپنی محبت بھی ظاہر کر دی۔ ایک مشرقی لڑکی جس طرح بے صبری سے اس نئے پاؤں آنے والی محبت کا انتظار کرتی ہے اور اشتیاق اور شرم کے جن ملے جلے جذبات سے اس کا استقبال کرتی ہے لوسی نے بھی کیا اور لمبے چہروں اور ستواں ناک والوں کے ماحول میں رہ کر جو اسے غلط فہمی ہو گئی تھی کہ چپٹی ناک اور گول چہرہ بدصورتی کی علامتیں ہیں دور ہو گئی اور اس نے بھری محفل میں جلتی ہوئی اس شمع کی طرح جس کے گرد کوئی پروانہ نہ ہو اپنے اس ایک ہی پروانے کو بڑی فراخدلی سے اپنی آغوش میں جگہ دی۔ انہوں نے سول میرج کر لی۔

اور جب کائی سو وطن روانہ ہونے کی تیاریاں کرنے لگا اور اس نے لوسی کو بھی اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا تو اُس نے بالکل اس مشرقی عورت کی طرح جو اپنے شوہر کی بات نہ ماننا گناہ سمجھتی ہے ہامی بھر لی اور اپنے والد کے روکنے کے باوجود تیار ہو گئی۔

جاپان پہنچ کر کائی سو کے رشتہ داروں اور والدین نے بڑی خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا اور وہ کچھ دن ٹھہر کر ملک کی سیر کو روانہ ہو گئے اسی دوران میں چین جاپان کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور جاپانی نوجوان آ آ کر فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ سینکڑوں روزانہ بھرتی ہوتے۔ تربیت حاصل کرتے اور محاذ پر بھیج دیے جاتے جہاں وہ یہ سمجھے بغیر کہ وہ کیوں لڑ رہے ہیں لڑتے۔ توپوں کی گرج اور سرنگوں میں سے دھوئیں کے اٹھتے ہوئے فواروں میں ان کی روحیں تلملاتیں، اور بموں کے دھماکوں میں ان کی روحیں چیخ چیخ کر ریزہ ریزہ ہو جانے والے جسموں میں سے نکل جاتیں۔ سپاہیوں کے سامنے گولے پھٹتے۔ زمین کے پرخچے اُڑتے۔ گولیوں کی باڑھیں چلتیں لیکن وہ ان سب آوازوں کی طرف سے کان بند کئے صرف ایک آواز "بڑھے چلو! بڑھے چلو!" سنتے اور ہولناک مناظر کے لئے بے حس آنکھیں صرف بندوقوں کی نالیں دشمنوں کی طرف سیدھی جمائے رکھنے کا کام دیتیں۔ آگے بڑھنے والے قدم چاہے انہیں موت کے دروازے پر پہنچا دیں چاہے فتح کے دروازے پر۔ وہ ان باتوں سے بے پروا آگے بڑھتے اور کٹ مرتے۔ خون کے فوارے چھوٹتے اور جنگ کے دیوتا کی پیاس اور بڑھتی جاتی۔ وہ شیرنیاں جنہوں نے اپنے بچے اسی نیت سے پالے تھے کہ وطن کی آن پر کٹ مریں گے ہنسی خوشی رخصت کرتے ہوئے اُن سے کہتیں بیٹا شکر کرو کہ خدا نے تمہیں اپنے وطن کے بہادروں اور شہیدوں میں شامل ہونے کا موقع دیا ہے اور بہنیں اپنے بھائیوں کو پرانے بہادروں کے گیت سنا سنا کر ان کی ہمت افزائی کرتیں۔ بیویاں "تمہارے سوا میرا کوئی نہیں" کہہ کر رونے کی بجائے پھولوں کے ہار پہنا کر بخیر و عافیت فاتح واپس آنے کی دعائیں کرتیں اور اس طرح بہادر سپاہی وطن کی عزت پر اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کے لئے جنگ کو روانہ ہو جاتے۔ ہوائی جہاز فضا میں چیلوں کی طرح پرواز کرتے ہوئے غراتے اور آگ کی بارش سے دشمن کے اوسان خطا کر دیتے۔ اور جب ملک کو نوجوانوں کی ضرورت پڑ گئی تو کائی سو نے بھی فوج میں بھرتی ہو کر ایک دستے کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔

میدان جنگ میں لوسی بھی جسے موجودہ فنون حرب سے کافی واقفیت تھی کائی سو کے ساتھ تھی۔ وہ اس سے لمحہ بھر کے لئے بھی جدا ہونا نہ چاہتی تھی۔ کائی سو کا دستہ کئی جگہ فتوحات حاصل کر چکا تھا اس کے دستے نے چینی گیدڑوں کے پرخچے اُڑا دیے تھے۔ کئی گاؤں کو لوٹا تھا۔ لڑائی شروع ہوئے کچھ کافی عرصہ گزر چکا تھا چینی مغلوب ہوتے جا رہے تھے مگر ایک سرکش چینی سردار اب تک جاپانیوں کو ناک چنے چبوا رہا تھا اور یہ تھا جنرل چان ماؤ تنگ کائی سو تک خبر پہنچی تھی کہ جنرل چان سامنے والی پہاڑیوں میں فوج جمع کر رہا ہے اور وہ ایک دو دن میں حملہ کیا ہی چاہتا ہے وہ جنرل چان جس

شفیع صاحب کے بچوں سے بہت محبت تھی۔ وہ خود انہیں گھور بھی لیتا تھا لیکن وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اُن کی طرف کوئی اور آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے۔ اس لئے شفیع صاحب اگر کبھی بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے تو امام الدین اپنا سلینہ پیٹنے لگ جاتا اور چیخ چیخ کر اس قدر سخت احتجاج کرتا کہ شفیع صاحب کو ہتھیار ڈالنے پڑتے۔ اصل میں اُس کی محبت میں شدت کو بہت دخل تھا۔ اُس کے دل میں جس آدمی کے متعلق اچھا خیال پیدا ہو جاتا اُس کی نسبت وہ اپنی رائے کبھی تبدیل نہیں کرتا تھا۔ تحریک شہید گنج کے دنوں میں وہ محلے کی مسجد کے چبوترے پر کھڑے ہو کر مجلس احرار پر تبرے بھیجا کرتا تھا۔ لیکن اُس کی تقریر کی تان ہمیشہ "عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد" پر ٹوٹتی تھی۔ وہ شاہ صاحب کے متعلق کوئی گستاخانہ فقرہ نہیں سُن سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے سامعین میں سے اُسے چھیڑنے کے لئے اگر کوئی "عطاء اللہ شاہ بخاری مردہ باد" کا نعرہ لگاتا تو وہ فوراً نعرہ لگانے والے کی طرف اشارہ کر کے پکار اُٹھتا "مرزائی مردہ باد" "کافر مردہ باد" وہ اس بات کو ماننے سے متواتر انکار کرتا رہا کہ شاہ صاحب اُس مجلس احرار کے رکن ہیں جس کو وہ مسجد شہید گنج کے انہدام کا ذمہ دار قرار دیتا تھا۔ امام الدین نے کہیں سے یہ مسئلہ سن لیا تھا کہ مسلمانوں کو آپس میں ناراض نہیں رہنا چاہئے۔ منظور حسین صاحب ہمارے دوست لطیف صاحب کو دق کرنے کے لئے اُس کے اس اعتقاد کا پورا پورا فائدہ اُٹھاتے۔ چنانچہ وہ امام الدین کو مخاطب کر کے ٹیبے تعجب سے کہتے۔ "مولوی! تم نے لطیف صاحب کو ناراض کیوں کر دیا ہے" اور جب وہ انکار کرتا۔ تو کہتے "اچھا اگر تم ناراض نہیں ہو تو مسلمانوں کی طرح لطیف صاحب کے گلے مل کر دکھاؤ" اب لطیف صاحب کتراتے ہیں اور امام الدین اپنے گرد سے اٹے ہوئے جسم اور پسینہ سے شرابور کپڑوں کے ساتھ اُن کی طرف بازو پھیلائے بڑھ رہا ہے۔ لطیف صاحب لاکھ کہتے ہیں کہ "مولوی صاحب میں راضی میرا خدا راضی" لیکن منظور صاحب اُسے برابر اُبھارتے جاتے ہیں اور لطیف صاحب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں "بھئی اب تو صاف پتہ چل گیا کہ تم مولوی صاحب سے ناراض ہو گر ناراض نہیں ہو تو اُن سے بغل گیر کیوں نہیں ہوتے"۔ یہ سُن کر امام الدین اور بھی آگے بڑھتا لطیف صاحب بھاگنے کی کوشش کرتے۔ اس کشمکش میں کبھی تو ہم انہیں جبراً پکڑ کر مولوی صاحب سے بغل گیر کرا دیتے۔ اور کبھی کبھی وہ بھاگ کر جان چھڑا لیتے تھے۔

امام الدین اصل میں جہلم کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ لیکن بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ کئی دفعہ بیمار ہوا مگر وطن کی یاد نے اُسے کبھی نہیں ستایا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ مرض الموت میں وطن کی کشش نے بے تاب کر دیا تھا۔ چنانچہ اُس کی خواہش پر منظور صاحب کے والد محترم نے اُسے وطن بھجوا دیا۔ روانگی کے وقت اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگا۔

"جب منظور کے ہاں بیٹا ہو تو مجھے خط ضرور لکھئے گا"

سب نے اُسے دلاسا دیا کہ تمہیں ضرور اطلاع دیں گے اور پھر تم آ جانا۔ لیکن وہ واپس آنے کے لئے تو گیا ہی نہ تھا۔ جہاں کی خاک تھی وہیں کی مٹی میں مل گئی۔

عطاء اللہ سجاد

غزل

پھر اُس پہ روزگار کا قابو نہ چل سکا — جو دل تری نگاہ کی زد سے سنبھل سکا
شاہد ہے تو کہ مجھ کو غم دل عزیز تھا — دونوں جہان کا عیش نہ جس کو بدل سکا
دلبستگی کے دہر میں ساماں ہزار تھے — تیرے بغیر دل نہ ہمارا بہل سکا
محشر میں انتظار کی یہ لذتیں کہاں — کچھ اور تیرا وعدہ فردا نہ ٹل سکا

حسرت مزاج یار کا اللہ رے احترام
اک حرف مدعا بھی نہ لب سے نکل سکا

حسرت ترمذی

امام الدین

امام الدین کی وفات کو تقریباً دو سال ہونے کو آئے لیکن اُس کی شخصیت اور کردار کے نقوش میری یادداشت کے صحیفہ پر ابھی تک نمایاں ہیں۔ ممکن ہے کہ تاریخ کے طالب علم کو اس کی سیرت میں کوئی کشش نظر نہ آئے کیونکہ وہ کوئی سپاہی۔ لیڈر یا بہادر جرنیل نہیں تھا لیکن جہاں تک انسانی نفسیات اور رجحانات کا تعلق ہے۔ وہ اپنی وحشت اور نیم دیوانگی کے باوجود وزیرآباد میں ہمارے محلے کی ایک نہایت ہی دلچسپ ہستی تھا۔

اُس کی تمام عمر میرے بچپن کے ساتھی اور عزیز دوست منظور حسین صاحب کے ہاں بیت گئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے گھر میں اُسے ایک بزرگ فرد خاندان کی تمام مراعات حاصل تھیں۔ وہ منظور صاحب کو چشم نمائی کر سکتا تھا۔ اُن کے بڑے بھائی شفیع صاحب سے تو اکثر اُس کی دانتا کلکل رہتی تھی۔ کیونکہ وہ اُس کا نام بگاڑ کر اُسے عام طور پر امام الدین کی بجائے مامون کہا کرتے تھے۔ خود منظور صاحب کے والد اُس کی بہت ناز برداری کرتے تھے۔ محلے کے دوسرے گھروں میں بھی امام دین بے روک ٹوک آ جا سکتا تھا۔ عورتیں اُس سے اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری کے لئے دعائیں منگوانی تھیں اور بچے تالیاں پیٹتے ہوئے اُس کے آگے پیچھے دوڑتے پھرتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب اُس سے ایک دو دن کے لئے ملاقات نہ ہو سکتی تو میں یوں محسوس کرتا جیسے میری زندگی کے روزانہ معمول میں کوئی فرق آ گیا ہے۔ ہمارے شاعروں نے گریباں چاکی کو عاشق کی نشانی قرار دیا ہے اور اِس نظریہ کے لحاظ سے امام الدین بہت بڑا عاشق تھا۔ گرمی ہو یا سردی، بارش ہو یا آندھی اُس کا گریباں ہمیشہ کھلا رہتا تھا اور اس کے ننگے فراخ سینے پر بالوں کی گھنی فصل ہمیشہ نظر آتی تھی۔

اب بھی اُس کی تصویر بالکل سامنے ہے۔ میانے سے کچھ نکلتا ہوا قد۔ گندمی رنگ۔ گھنے ابرو جن کی سفیدی صبح پیری کے طلوع کا پیغام دے رہی تھی۔ آنکھوں پہ کچھ ایسا بوجھ گویا ہر چیز کو غور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چھوٹی سی داڑھی جس پر ذنت نے اپنی نشان چھڑک رکھی تھی۔ اوپر کا ہونٹ درمیان سے کٹا ہوا شاید یہی وجہ تھی کہ جب وہ بات کرتا تو منہ سے تھوک اُڑ کر داڑھی میں موتی بکھیر دیتا۔ سر کبھی بالکل گھٹا ہوا اور کبھی پریشان اور گرد آلود بالوں سے ڈھکا ہوا۔ اکثر ننگے پاؤں چلتا تھا اور اسی لئے اُس کے تلووں پر ایک ایسی سخت تہ پیدا ہو گئی تھی جس نے اُسے جوتے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ جب تو دونوں ہاتھ پیٹھ پر رکھ لیتا تھا۔ اُس کی چال میں رقص کا ایک عنصر تھا۔ یعنی چلتے چلتے داہنی طرف خاص جھکاؤ پیدا کر کے پھر خود ہی جسم کا توازن قائم کر لیتا جیسے گرتے گرتے سنبھل گیا ہو۔ چلتے وقت دونوں ہاتھ پیٹھ پر رکھنے کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ اُسے کتوں سے بہت دشمنی تھی۔ اس لئے وہ بالعموم اپنے ہاتھوں میں اینٹ یا پتھر رکھتا تھا۔ جب کوئی انجان یا غیر محتاط کتا اُس کے نشانے کی زد میں آتا تو وہ اُس پر اینٹ یا پتھر دے مارتا اور کتا چوں چوں کرتا ہوا بھاگ نکلتا۔ اُس وقت امام الدین کی آنکھوں میں کامیابی کی خوشی چمک اُٹھتی اور وہ پسپا ہوتے ہوئے فریادی کتے کی طرف ایک ایسے فاتحانہ تبسم کے ساتھ دیکھتا جو ہر کامیاب نشانہ لگنے کے بعد غیر شعوری طور پر شکاری کے ہونٹوں پر آ جاتا ہے۔ امام الدین کو ہم لوگ مولوی کہا کرتے تھے اور وہ اس خطاب کو اپنا حق سمجھتا تھا۔ میں نے سُنا ہے کہ نماز کی پابندی اُس نے مرض الموت کے ایام میں بھی نہیں چھوڑی۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کے دشمنوں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وضو اور نماز کی رکعتوں کے بارے میں وہ شرعی احکام کا کچھ ایسا پابند نہیں تھا۔ امام الدین کو مولوی کہنے کے لئے ہمارے پاس ایک وجہ اور بھی تھی۔ عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں کے دوران میں اس نے بے شمار تقریریں اور نظمیں سُنی تھیں اور اِن تقریروں اور نظموں نے اُس کے ذہن پر کچھ مبہم اثرات چھوڑے تھے۔ اِن اثرات کے اظہار کے طور پر اُس نے ترنم کے ساتھ تقریر کرنا شروع کر دیا تھا۔ جہاں کسی نے "مولوی امام الدین زندہ باد" کے نعروں سے گرمایا۔ وہ اپنی مترنم تقریر شروع کر دیتا۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ اُس کی تقریریں "برطانیہ" "ہمارا" "خدا" "اللہ" اور "کہ" کے الفاظ کے سوا کبھی اور کوئی لفظ میری سمجھ میں آیا ہو۔

امام الدین نے مارشل لا کے زمانے میں پکڑ دھکڑ ہوتے بھی دیکھی تھی اس لئے سپاہی کا لفظ آخری دم تک اُس کے سینے کا کابوس بنا رہا چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ بازار میں امام الدین کی سماعت میں کسی نے سپاہی کا نام لیا اور امام الدین نے گھر کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ بازار میں بگڑے دل یکا لتے "دیکھنا! دیکھی جانے نہ پائے"۔ امام الدین دوڑتا جاتا اور ساتھ ساتھ اپنی تسکین کے لئے پیچھے مڑ مڑ کر بھی دیکھتا جاتا۔ امام الدین کو

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

(٢)

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

(١)

[illegible]

[illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]

(٥)

[illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]

(٤)

[illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]

(٣)

[illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]

(٢)

[illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]

(١)

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

چھوکری کے تلخ و تیز جملے میرے کانوں میں دہکتی ہوئی سلاخ بن کر پیوست ہوئے ہیں۔ میں اسے اس تلخ کلامی کا مزہ ضرور چکھاؤں گا۔ تمہارے مقدس لب اس لڑکی کے ناپاک لبوں سے کیوں پیوست ہوئے میں یہ نہیں برداشت کر سکتا۔ ملکۂ حسن و شباب سیفو کی تمام ادائیں، مسکراہٹیں نوازشیں اور اُس کی شراب حسن کا ہر جام میرے لئے اور صرف میرے لئے ہے۔

سیفو۔ (بگڑ کر) یہ کیا بیہودہ بکواس ہے زرکویت، تمہیں میرے خانگی معاملات میں دخیل ہونے کی جرات کیونکر ہوئی۔ میری مہربانیوں اور عنایتوں کی قیمت تم نے خوب ادا کی۔ تمہیں میری فینی سے اپنی اس بیہودگی اور سخت کلامی کی معافی مانگنی پڑے گی۔

زرکویت۔ معاف کرنا سیفو مجھے تمہاری عدالت کا یہ انوکھا فیصلہ ہرگز منظور نہیں ہے، مجھے نہیں بلکہ اس مغرور کمینہ چھوکری کو اس بیہودہ گوئی کا مزہ ضرور چکھنا پڑے گا۔

فینی۔ میں تیرے گندے اور گھناؤنے ہونٹوں کی اب ایک جنبش بھی نہیں برداشت کر سکتی۔ اب اگر زبان درازی کی تو تیری زبان تراش لی جائے گی۔ بیہودہ، بے وقوف آدمی۔

زرکویت۔ بیہودہ — بدزبان — کمینی چھوکری — (زرکویت نے فینی کو تخ دیا)

فینی۔ اُف، اُف — مرگئی — میں اِس کا بدلہ سیفو تجھی سے لوں گی۔ تیرے عاشق نے مجھے پٹخا ہے میں تیرے ارمانوں، آرزوؤں اور تمناؤں کو روند ڈالوں گی۔

سیفو۔ (چیخ کر) یہ کیا کیا تو نے گستاخ چھوکرے، بس دور ہو میری نظروں سے، ابھی، اسی وقت، فوراً۔ ورنہ تیری ہڈیاں تک چبا جاؤں گی۔ بوٹیاں نوچ ڈالوں گی۔

(تالی کی آواز — پھر قدموں کی)

ایک خادمہ۔ کیا حکم ہے ملکہ —؟

سیفو۔ اِس مغرور اور کمینے لڑکے کو باہر نکال دو، ابھی۔ اسی وقت۔

زرکویت۔ تکلیف کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی جا رہا ہوں —

(جانے کی آواز)

سیفو۔ فینی میری پیاری فینی، میری دنیا مجھے معاف کر۔ میں نے گستاخ زرکویت کو بے عزت کر کے نکلوا دیا ہے اور اب تیری قسم کھاتی ہوں تمام عمر اُس کا منہ نہ دیکھوں گی۔

فینی۔ بس اب بند کرو یہ بکواس۔ میں کچھ نہیں سُن سکتی، مجھے کچھ مت سناؤ۔ میں آج سے تمہاری دوست نہیں دشمن ہوں۔ میں قسم کھاتی ہوں اپنے عزیز زائرنگ کی کہ مجھے آج سے تمہاری صورت دیکھنا بھی حرام ہے۔ چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو۔ مت روکو۔ جانے دو مجھے۔

(تیزی کے ساتھ فینی سیفو کے یہاں سے چلی جاتی ہے)

(چھٹا منظر)

سیفو حیران و پریشان کمرے میں ٹہل رہی ہے۔
تھوڑی دیر بعد ایک خادمہ داخل ہوتی ہے۔

خادمہ۔ غضب ہو گیا ملکہ، زرکویت نے آپ کی بساطِ محبت پر اپنی جان کی بازی لگا دی

سیفو۔ نتیجہ — نتیجہ کیا نکلا —؟

خادمہ۔ بے چارے کی قسمت خراب تھی۔ مات ہو گئی غریب کو۔

سیفو۔ (گھبرا کر) یعنی؟

خادمہ۔ نیمیو قیا کی ندی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی حسرتیں، آرزوئیں اور تمنائیں ڈوب کر رہ گئیں۔

چھپا دینا چاہتا ہے۔ اچھا ہی ہوا میں موت کے فرشتہ کا استقبال کروں گا ــــ مطمئن رہئے بدنصیب پجاری حُسن کی دیوی سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔

سیفو۔ ناراض نہیں ہو۔ شکر ہے، مگر پجاری کبھی دیوی سے اتنی دُور نہیں ہُوا کرتا۔ نزدیک آؤ۔

زرکویت۔ مگر پجاری زیادہ ضرور ہے دیوی کے عتاب سے۔ اور پھر اُس پجاری کے خوف وہراس کا کیا عالم؟ جس کا والہانہ محبت پائے حقارت سے ٹھکرا دیا گیا ہو۔ اظہار کی بھی جرأت نہیں۔

سیفو۔ تم تو شاعروں کی سی باتیں کرنے لگے زرکویت، بندشِ الفاظ قابلِ داد ہے۔ خیر چھوڑو ان جھگڑوں کو اور قریب تر ہو نے عا ؤ اپنی دیوی کے یہی تمنا ہے یہی آرزو ہے زرکویت۔ اب تمہاری سیفو کی۔ میں نے تمہیں بہت دُکھ پہنچایا مگر اب ایسا کبھی نہ ہوگا۔ ہم اپنے دل کی دھڑکنوں کو ایک ساتھ سنیں گے، ہماری رفتارِ تنفس ایک ہوگی اب ہمارے سائے ایک ہوں گے۔

زرکویت۔ (فرطِ انبساط سے مجبور کر، جذبات کی کشاکش سے الفاظ کی بے ترتیبی کے ساتھ) کیا ــــ کیا کہا میری دیوی نے، میری دنیا، میری روح، زندگی، میری تمنا کیا میں تمہیں حاصل کر سکوں گا۔ میں ــــ میں ــــ میں کیا اتنا خوش نصیب ہو سکتا ہوں۔ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا کہیں۔

سیفو۔ تم عالمِ بیداری میں ہو زرکویت شادی کی قید وبند سے آزاد رہتے ہوئے بے شک آج سے سیفو تمہاری ہے۔ اس لئے کہ شاید میں تمہاری محبت کی پیاس بجھ سکے۔ تمہارے مضطرب دل کو سکون نصیب ہو

زرکویت۔ میری ملکہ ــــ میری حسین دنیا۔

(دوڑ کر سیفو کے قدموں سے لپٹ جاتا ہے)

سیفو۔ قدموں سے اُٹھو زرکویت اب تم دیوی کے پجاری نہیں بلکہ اُس کے حُسن وجوانی کے مالک ہو۔

(پانچواں منظر)

سیفو اپنی محبوبہ فینی کو اپنی آغوشِ محبت میں لئے محبت کی باتیں کر رہی ہے۔

سیفو۔ تم میری روح ہو، میرا سرمایۂ حیات۔ میری یہ حسین دنیا صرف تمہارے باعث قائم ہے فینی، مگر تم اپنی بدنصیب سیفو سے اتنی دور کیوں رہنے لگی ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ہاتھ بک چکی ہوں میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

فینی۔ مگر تم تو آج کل دوسری دنیا میں رہتی ہو سیفو، کیا انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ بیک وقت دو دنیائیں بسا سکے، ایک ساتھ دو کشتیوں پر سوار ہونا اتنا آسان نہیں سیفو جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ میں نے تمہارے لئے کیا نہیں کیا، اپنی زندگی وقف کر دی تمہارے لئے، دنیا اور دنیا والوں کے طعنے سنے تمہاری خاطر، مگر اب میں تنگ آ گئی ہوں اس زندگی سے مجھے نہیں چاہئے ایسی دُنیا، مجھے نہیں چاہئے ایسی محبت، ایسا پیار۔ میں بھی اب تمہاری طرح اپنی زندگی میں انقلاب دیکھنا چاہتی ہوں، میں بھی مرد سے محبت کر سکتی ہوں اور جب کہ میرا سچا عاشق زانثر تنگ میرے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے مجھے اس پر یقیناً ترس کھانا چاہئے۔

سیفو۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو فینی، مجھ بدنصیب کو اور زیادہ پریشان مت کرو، میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی، میری دنیا زرکویت سے نہیں بلکہ تم سے آباد ہے، مجھے زرکویت کی نہیں بلکہ تمہاری ضرورت ہے۔ زرکویت طفل تسلی ہے اور تم سکونِ زلیست، اطمینانِ قلب۔

فینی۔ مگر سیفو اب تم مجھے ان طفل تسلیوں سے بہلا نہیں سکتیں، میں نے وہی فیصلہ کیا ہے جو میرے دل نے چاہا، اگر تم اپنے دل سے مجبور ہو تو میں اپنے دل کا کیا کروں، وہ بھی تو آخر کچھ چاہتا ہے۔ مجھے نفرت ہے زرکویت کے سائے سے، مجھے چڑ ہے اُس کے وجود سے، میں اب تمہارے اُن ہونٹوں کو کبھی نہیں چوم سکتی جن کی تازگی اور رونق زرکویت کے کریہہ اور گھناؤنے ہونٹوں نے چرالی ہے۔ میں اب ــــ"

(دروازہ کھلنے کی آواز ــــ زرکویت داخل ہوتا ہے)

زرکویت۔ میری آرزوؤں اور تمناؤں کا خون اس بے دردی کے ساتھ آخر تم نے کیوں بہا دیا سیفو؟ اس مغرور کمینہ فطرت اور بے لگام

۔میری سمجھ تو اِس گُتھی کو سلجھانے سے قاصر ہے کہ میں اپنے معصوم بھولے زرکویت کو کیونکر دوبارہ انسانی جامہ پہناؤں۔ میں اُس سے شادی تو نا زیست نہیں کر سکتی اِس لئے کہ میں اپنے لئے اہلِ یونان نیز دُنیا والوں کا تمسخر کسی صورت میں بھی خریدنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ممکنات کی خوشی کی قیمت بہت گراں ہے مجھ سے ادا نہ ہو سکے گی۔

ٹ۔ مگر یونان کی پری جمال شاعرہ کو اتنا سنگدل نہ ہونا چاہئے۔ اور قیمت ——؟ وہ دُنیا میں ہر چیز کی ادا کر سکتی ہے، نہایت ہی آسانی کے ساتھ۔

۔تم تو شاعری کرنے لگے ہیں —— "

ٹ۔ درباتِ کاٹ کر معاف کیجئے گا، بیمارِ محبت کے جذبات، احساسات نیز روحانی اذیت کا احساس شاعر کو زیادہ ہوتا ہے اور پھر یونان کی حسین ترین شاعرہ ملکہ سیفو کو اور زیادہ اِس لئے کہ وہ نہ صرف یونان بلکہ دنیا کی سب سے بڑی شاعرہ ہے۔ شاعر دنیا کی وہ قابلِ پرستش ہستی ہے جو دردمند دلوں کی گہرائیوں میں پہنچ کر وہاں کے مدفون خزانوں کو دنیا والوں کے سامنے رکھ دیتا ہے، درد، سوز، بے تابیاں اور بے قراریاں بیمارِ محبت کے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے وہ انمول موتی ہیں جنہیں سوا شاعر کے دنیا میں کوئی نہیں پرکھ سکتا۔ پھر تعجب ہے کہ شاعرہ سیفو زرکویت کے دل کی گہرائیوں میں کیوں نہیں پہنچتی۔ یقیناً اُسے وہاں پہنچنا چاہئے اس لئے کہ وہاں دنیائے محبت کا بیش قیمت خزانہ مدفون ہے۔

۔تم تو حقیقتاً شاعری کرنے لگے سائبرٹ۔ مگر تمہیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ تم یہاں عشق و محبت کی گُتھی سلجھانے آئے تھے نہ کہ شعر و شاعری کے خزانے لٹانے۔

ٹ۔ شعر و شاعری کے خزانے ہی تو عشق و محبت کے امین اور اس کے پیامبر ہیں۔

۔تم واقعتہً زبردست دماغ کے مالک ہو سائبرٹ، اچھا خیر جاؤ تم آج شب کو زرکویت کو یہاں بھیج دینا، معلوم نہیں اُس نے آنا جانا کیوں ترک کر دیا۔

ٹ۔ شکریہ ملکۂ حسن سیفو کی اس کرم گستری کا بہت بہت شکریہ۔ شکر ہے کہ یونان کے حقیر شاعر سائبرٹ کو ملکۂ شعر سیفو کے دربار سے خالی ہاتھ واپس نہیں کیا گیا، رحم و کرم کی بھیک سے اُس کا دامن بوجھل ہو رہا ہے وہ جا رہا ہے مسرت و شادمانی کے دامن پر سجدۂ شکر ادا کرتا ہوا۔

(چلا جاتا ہے)

(چوتھا منظر)

آج بے شمار کافوری شمعیں سیفو کے شبستان کو مُنوّر کر رہی ہیں، عود و عنبر سلگ رہا ہے کیوڑے اور گلاب کے عرق میں غُسل کر چکنے کے بعد آج نکھار کر رہی ہے۔ چُست، مہین قیمتی لباس اُس کے حُسنِ پوشیدہ کے فتنوں کو جگا رہا ہے۔ شہد میں ملے ہوئے خون کو تر سے آج اُس نے کو پہلے سے زیادہ شیریں اور سُرخ و دلآویز بنا لیا ہے۔ آج وہ اتنی حسین معلوم ہو رہی ہے گویا پرستان کی پری یا جنت الفردوس کی حور وہ دوشیزہ نہ تھی مگر آج ہزاروں اور لاکھوں دوشیزاؤں کا حسن اس پر سے قربان کیا جا سکتا ہے۔

(دروازہ کھلنے کی آواز —— ایک کنیز داخل ہوتی ہے)

۔شہزادہ زرکویت باہر آپ کے منتظر ہیں۔

۔ اوہ! آ گئے وہ، بھیج دو انہیں یہیں

کنیز کے جانے کی آواز —— تھوڑا وقفہ —— قدموں کی مشترکہ آوازیں۔

(زرکویت داخل ہوتا ہے)

۔ میرے معصوم، بھولے زرکویت کے مزاج کیسے ہیں؟ کیا وہ اپنی سیفو سے ناراض ہے؟

یت۔ بیکلی، بیقراری، خلش و اضطراب، اختلاجِ قلب اور دل و دماغ کا مسلسل ہیجان۔ مجھ غریب کی تقدیر کیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

کے لئے تمہاری شادی کسی یونانی مہ پارہ سے خود کردوں گی یقین ہے کہ تم بہل جاؤ گے۔

زرکویت۔ مگر ـــ مگر میں آپ کے بغیر اب زندہ نہیں رہ سکتا۔ میری زندگی، میری روح، میرا دماغ، میرے ہوش و حواس، میری عقل و خرد سب کچھ آپ کے قبضے میں ہے، آپ اگر چاہیں تو میری یہ تمام چیزیں مجھے واپس مل سکتی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ خود کو آپ میں جذب کردوں، اپنا شیرازۂ ہستی آپ کے قدموں پر بکھیر دوں۔

(زرکویت دوبارہ سیفو کے قدموں پر گر کر رونے لگتا ہے)

سیفو۔ تم مجھے اور زیادہ پریشان مت کرو پیارے زرکویت، آہ! تمہیں کیا معلوم کہ میں کس قدر رنجور ہوں۔ میں کسی کی شریکِ حیات نہیں بن سکتی، اس لئے کہ میرا ضمیر مجھے ایسا کبھی نہ کرنے دے گا۔ تم نہیں جانتے پیارے زرکویت کہ میرے خزانۂ حسن کا انمول موتی چرا لیا گیا ہے۔ آہ بدبخت، ظالم، سفاک اور کمینہ خصلت زدرو کی بہیمانہ قوت اور آہنی ہاتھ جنہوں نے مجھے بے طاقت پا کر کے جبر و ظلم کا شکار بنایا۔ چونکہ تم میرے سچے پرستار اور عزیز ہو، میں نہیں چاہتی کہ میرا یہ راز جو میرے ساتھ قبر کی تاریکیوں میں دفن ہوتا تم سے پوشیدہ رکھوں۔ سوچو! پیارے زرکویت بار بار سوچو کیا تم ایک ایسی عورت کو اپنی آغوشِ محبت میں خوشی سے پناہ دے سکو گے جس کے پاس تمہاری محبت کے نذرانہ کے لئے کچھ بھی نہ ہو، جس کا نذرانۂ محبت اُس سے پہلے ہی چرا لیا گیا ہو۔ وہ تمہیں کیا دے سکے گی۔ تم مجھے محبت کی دیوی کہا کرتے تھے مگر اب یقیناً تمہاری رائے بدل گئی ہوگی۔ حقیقت کا یہ تلخ جام جس کے مزے سے صرف میں ہی آشنا تھی مجبوراً آج تمہیں بھی پینا پڑا۔

(زرکویت نے سیفو کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور اُٹھ کر چلا گیا)

سیفو۔ اچھا ہوا، جامِ حقیقت کی تلخی نے زرکویت کے منہ کو بگاڑ دیا۔ اب وہ کبھی دوبارہ مجھے منہ لگانے کی کوشش نہ کرے گا ـــ بے چارہ زرکویت!

(دوسرا منظر)

زرکویت اپنے عزیز ترین دوست سائبرٹ کے پاس بیٹھا ہے، سائبرٹ اُسے سیفو کے عشق سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ زرکویت کو سمجھا رہا ہے کہ تم ایک بہت بڑے والیٔ ریاست کے بیٹے ہو۔ اس جنون سے باز آؤ۔

سائبرٹ۔ میرے عزیز زرکویت میں مطلق نہیں سمجھ سکتا کہ آخر تمہیں کیونکر سمجھاؤں۔ سیفو یونان کی پری پیکر ہے، اُسے قدرت نے حوروں کو شرما دینے والا حسن بخشا ہے، وہ حسن کا مجسمہ ہے، اُس کے رگ و پے میں حسنِ جہاں سوز کی بجلیاں کوند رہی ہیں، وہ مجسم شرابِ جوانی ہے۔ وہ حسن کی دیوی ہے مگر محبت کی نہیں۔ وہ سخت ظالم، سنگدل اور بے وفا ہے۔ اُسے بے حد مزہ آتا ہے اپنے عشق میں مظلوموں کو دیکھ کر، اُس نے یونان کے جلیل القدر صاحبِ زر، صاحبِ اثر نیز صاحبِ دماغ والیانِ ریاست کے ارمانوں کو ہمیشہ پائے حقارت سے ٹھکرایا ہے۔ وہ تمہاری رفیقۂ حیات کبھی نہیں بن سکتی۔ تم اُسے بھول جاؤ۔ گلشنِ یونان میں رنگ برنگ کی حسین تیتریاں تمہارے قدموں پر نثار ہونا باعثِ فخر سمجھیں گی۔

زرکویت۔ یہ تم نے سب کچھ ٹھیک کہا سائبرٹ، مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو چکا ہوں۔ سیفو کے عشق نے میری آنکھوں پر پٹیاں چڑھا دی ہیں، اپنی محبت کے دہکتے ہوئے انگارے بھر دیئے ہیں سیفو نے میرے تمام جسم میں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ محبت کی اس دہکتی ہوئی آگ کو جو میری ہستی کو جلا کر بہت جلد خاکستر کر دینے والی ہے اپنے آنسوؤں کے سمندر میں غرق کر دوں، اپنی آہوں کے کبھی نہ رکنے والے جھونکوں سے بجھا دوں مگر سب بے سود۔ تمام کوششیں رائیگاں ہو گئیں، میرے آنسوؤں نے اس پر تیل کا کام کیا اور آہوں نے اس آگ کو اور ہوا دی۔ تم ہی بتاؤ سائبرٹ اب میں کیا کروں۔ تم تو یونان کے عالی مرتبت شاعر ہو اور سیفو کے منہ لگے دوست بھی، تم ہی اُس بے وفا، سنگدل اور ظالم کو سمجھاؤ، میرے حالِ زار پر [illegible] کھانے کے لئے اُسے آمادہ کرو۔

سائبرٹ۔ کوشش کرتا ہوں۔ تم کو تباہی اور بربادی سے بچانے کے لئے اگر میری جان بھی کام آ گئی تو میں خود پر فخر کروں گا۔

(سائبرٹ چلا جاتا ہے)

تیسرا منظر

سیفو اور سائبرٹ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں

سیفو کی موت

افرادِ تمثیل:-

سیفو ~~~~~~ یونان کی حسین ترین شاعرہ
زرکویت ~~~~~~ یونان کا نوعمر حسین شہزادہ (سیفو کا پرستار)
فینی ~~~~~~ سیفو کی حسین و جمیل محبوبہ
سائبرٹ ~~~~~~ یونان کا مشہور شاعر، سیفو کا منگیتر، زرکویت کا عزیز دوست
اور چند خدام عورت و مرد ~~~~~~

پہلا منظر

شام کا وقت ہے سیفو کا نوعمر عاشق زرکویت عالمِ دیوانگی میں اس کی مخملی زرتار جوتی کو بوسے دے رہا ہے۔ سیفو کمرے میں اتفاقیہ داخل ہوتی ہے۔

سیفو۔ یہ کیا! یہ تم کیا کر رہے ہو زرکویت؟ آخر میری جوتی کو اس طرح دیوانہ وار چومنے کا مطلب۔ کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟ —— ایں! ارے یہ کیا تم تو رو بھی رہے تھے شاید۔ تمہیں ہو کیا گیا ہے، کچھ کہو بھی تو۔

(زرکویت آواز کے ساتھ روتا ہوا دوڑ کر مسہری پر گر جاتا ہے)

سیفو۔ میرے ننھے شہزادے، میرے معصوم زرکویت، کچھ تو کہو آخر یہ تمہیں ہوا کیا ہے؟

(زرکویت مسہری پر سے اٹھ کر سیفو کے قدموں پر گر پڑتا ہے اور مزید سسکیوں کے ساتھ رونا شروع کرتا ہے)

سیفو۔ یہ تم کر کیا رہے ہو۔ یہ قدموں پر گرنے سے حاصل، اس کا مطلب، آخر کچھ کہو تو بات کیا ہے تم مجھے اس طرح کیوں شرمسار کر رہے ہو زرکویت؟

زرکویت۔ (سسکیاں بھرتے ہوئے) میں یہ اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ میری ہستی قطعاً آپ کے قابل نہیں، آپ ملکۂ حسن ہیں، اہلِ یونان کی محبت کی دیوی۔ مگر —— مگر اچھی ملکہ میں مجبور ہوں، میں پاگل ہو گیا ہوں۔ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میری رگ و پے میں آپ نے محبت کے دہکتے ہوئے انگارے بھر دیئے ہیں، میری عقل و خرد پر آپ نے اپنے حُسنِ جہاں سوز کی بجلیاں گرائی ہیں۔ مجھ میں اب بھلے بُرے، چھوٹے بڑے کا احساس باقی نہیں رہا۔ میرے سر میں صرف ایک سودا، صرف ایک دُھن سمائی ہوئی ہے، آپ کی محبت آپ کی قربت، آپ کا رحم و کرم۔ میں دُنیا میں طالب ہوں صرف آپ کی نگاہِ التفات کا، صرف آپ کی محبت کا۔ اگر آپ نے مجھے ٹھکرا دیا، میری شریکِ حیات نہ بن سکیں تو یاد رکھئے میں دنیا کو ٹھکرا دوں گا یا یوں کہئے کہ دنیا مجھے ٹھکرا دے گی۔ میں اپنی آرزؤں کو اپنے دل کی گہرائیوں میں دفن کرنے سے پہلے اپنی زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کے طوفانی سمندر میں غرق کر دوں گا۔ میں آپ کے بغیر نہیں جی سکتا۔

سیفو۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو زرکویت، تم مجھے بہت عزیز ہو، میں تمہیں اپنے بچے کی طرح عزیز رکھتی ہوں۔ مگر یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ میں تم سے شادی کیونکر کر سکتی ہوں جبکہ تمہیں علم ہے کہ میں یونان کے جلیل القدر اور عالی مرتبت حکام نیز اراکینِ سلطنت کو ٹھکراتی رہی ہوں۔ یہاں تک کہ میں نے ایکبار یونان کی ملکہ بننے سے بھی صاف انکار کر دیا تھا۔ یونان کے بڑے بڑے شعراء اور ادبا جب یہ سنیں گے کہ میں نے ایک چھوٹے لڑکے سے شادی کر لی ہے تو وہ کیا کہیں گے، مجھ پر کتنا ہنسیں گے۔ میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ تم میری محبت میں حقیقتہً پاگل ہوتے جا رہے ہو۔ میں نے بارہا جب کر تمہاری دیوانگی دیکھی ہے۔ مگر میں نے تمہاری داستانِ محبت خود تمہارے منہ سے نہ سنی تھی۔ لہذا میں اب تک خاموش رہی۔ مگر اب یہ بات خاموشی اور چشم پوشی کی حد سے تجاوز کرتی جا رہی ہے۔ تم اس خام خیالی سے باز آؤ۔ یونان کی جلیل القدر شاعرہ اور بقول تمہارے اہلِ یونان کی محبت کی دیوی سیفو کس طرح ایک ننھے لڑکے سے شادی کر سکتی ہے جو اس عمر میں تو دس سال چھوٹا ہو۔ میں تمہاری دیوانگی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہندوستانی موسیقی میں بہت سے راگ اور راگنیاں روکھی پھیکی اور بے مزہ ہیں۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے آپس میں ایک آدھ سُر کا ہی فرق ہوتا ہے۔ اِن کو وہی لوگ فخر سے گاتے ہیں جن کو اپنی اُستادی کا دعوےٰ ہوتا ہے۔ مگر اس اُستادی کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ سننے والے اُن کی خاطر سے اُن کی محنت دیکھ کر مجبوراً اُن کی تعریف کر دیتے ہیں۔ ورنہ دراصل اُن کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ ایسے گانے کو یہ لوگ "پکّا گانا" کہتے ہیں گویا اُن کے نزدیک دوسری قسم کی چیزیں کم درجے کی ہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ مُشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ ایسی راگنیاں اور راگ ترک کرنے کے لائق ہیں۔ اُن کا عام پسند اور مروّج نہ ہونا اِس امر کی دلیل ہے کہ وہ کسی کام کے نہیں۔

بعض مغربی نقّادوں کا اعتراض ہندوستانی موسیقی پر یہ ہے کہ اس میں "ہارمنی" نہیں یعنی سنگت میں اس کے ساتھ بہت سے ساز نہیں ہوتے۔ یہ اعتراض ایک اصولی غلطی پر مبنی ہے۔ ہندوستانی موسیقی کا مقصدِ اعلیٰ ایک مستقل اور دیرپا اثر سامعین کے دلوں پر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ غُل مچانا اُس کا مقصد نہیں ہوتا۔ اِسی لیئے اُس کی سنگت میں جہاں تک مناسب معلوم ہوتا ہے ساز کم ہی رکھے جاتے ہیں اور وہ ساز بھی ایسے ہوتے ہیں جن کی آوازیں گانے والے کی آواز سے دب کر رہیں نہ یہ کہ اُس کی آواز پر غالب آجائیں اور گانے کے مضمون کو غارت کر دیں۔ ہاں جہاں کہیں غل مچانے کی ضرورت ہوتی ہے وہاں بہت سے سازوں سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ جیسے قوالی کی محفل میں۔ مگر یہ طریقہ عوام الناس کے مذاق کا ہے۔ البتہ اِس اعتراض کے دُور کرنے کے لیۓ جو طریقہ آرکسٹرا کا جدید نکالا گیا ہے وہ کوئی بُرا طریقہ نہیں۔ مگر یہ یاد رہے کہ یہ طریقہ صرف سازوں کے موسیقی ہی سے متعلق ہے۔ گانے والا آرکسٹرا کی سنگت میں کبھی نہیں گا سکتا۔

موسیقی ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں اِس قدر دخیل ہو گیا ہے کہ اب یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اِس کا سُننا جائز ہے یا ناجائز۔ گھر گھر میں ریڈیو لگا ہے جس کو بچّے بوڑھے اور مستورات سب سنتے ہیں۔ ہماری رائے تو اس کے متعلق یہ ہے کہ جہاں اس زمانے میں اور بہت سی بہانے کی باتیں علی الاعلان موجود ہیں وہاں ایک یہ بھی سہی۔ عقلمند کو عربی کے اس مقولے پر عمل کرنا چاہیئے "خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدِر"۔ موسیقی اصل بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں۔ یہ انسانی تفکّرات کا دُور کرنے والا، غم غلط کرنے والا، اور بعض صورتوں میں دل کو عبادت کی طرف راغب کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ ہندوستانی موسیقی اگر فی الحقیقت اعلیٰ درجے کا ہو، ایک حسین چیز ہے اور ایک مستقل لطف اور دلچسپی کا باعث۔ بلکہ اُن چند چیزوں کے سے ہے جن پر ہمارے ملک کو بجا طور سے فخر ہو سکتا ہے۔

سید نذیر حسین ناشاد

قطعات

(۱)

تیری ہر بات، بات ہے پیارے
فیصلہ تیرے ہات ہے پیارے
تو کہے دن تو رات بھی دن ہے
میں کہوں دن تو رات ہے پیارے

(۲)

تو اگر مہرباں نہیں، نہ سہی !
میں اگر شاداں نہیں، نہ سہی
دائمی موت ہی عطا فرما!
زندگی جاودان نہیں، نہ سہی

مجید لاہوری

جس طرح شاعری میں قصیدے غزل وغیرہ کی جُدا جُدا شکلیں ہیں، اُسی طرح موسیقی میں دُھرپد، خیال، ٹپہ، ٹھمری اور غزل کی ترکیبیں ہیں. اور سرگم اور ترانہ گویا راگ راگنیوں کی گردانیں ہیں۔ دُھرپد، خیال اور ٹپہ سنجیدہ گانوں کے لئے ہیں اور اُن کو سُن کر طبیعت تفکّر کی طرف مائل ہوتی ہے۔ غزل دادرے اور ٹھمریاں عاشقانہ جذبات کے لئے موزوں ہیں۔ دادرے اور قوالی کی طرزیں خاص طور سے موجبِ تفریح ہیں۔

موسیقی کا دوسرا جزو تال ہے۔ یہ گویا سروں کا ایک بندھا ہوا ضابطہ ہے جسے کسی حال میں توڑا نہیں جاسکتا۔ سُر اگر قاعدے سے ادا نہ کئے جائیں تو گانے والا "بے سُرا" کہلاتا ہے اور تال کی پابندی نہ رکھی جائے تو گانا "بے تالا" ہو جاتا ہے۔ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ تال اور سُر کے عیوب کو کان بالکل اِس طرح پہچان لیتے ہیں جس طرح مصرع اور شعر کا وزن سے گر جانا پہچان لیا جاتا ہے، اتنی بات ضرور ہے کہ تال کے پہچاننے کے لئے سُر سے زیادہ واقفیت کی ضرورت ہے جو اکتساب سے حاصل ہوتی ہے۔ تال کا پھیلاؤ بھی سُر کے پھیلاؤ سے کچھ کم نہیں۔ اِس کی قسمیں بھی جُدا جُدا اور پُر لطف کیفیت رکھتی ہیں۔ تال بھی شگفتہ اور افسردہ دو طرح کی ہوتی ہے۔ مثلاً دُھرپد، خیال، ٹپہ اور ٹھمری کی تال دبی دبی اور باوقار ہوتی ہے، اسی لئے افسردہ اور سنجیدہ ہوتی ہے۔ دادرے کی تال تیز اور چنچل ہوتی ہے، اس لئے وہ رقص پر آمادہ کرنے کی قوت رکھتی ہے۔

تال کا حساب علم الحساب کا سا ہے جس کو ہر وقت دھیان میں رکھنا پڑتا ہے اور اچھے اچھے گانے والے اِس حساب کو گاتے وقت بھول جاتے ہیں۔ شاعری کی جس قدر بحریں اُردو، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی میں پائی جاتی ہیں اُن سب کے موافق کوئی نہ کوئی تال ہے۔ تال میں ایک مقام سم کا ہوتا ہے۔ اِس مقام کے لئے یہ شرط لازمی ہے کہ گانے والا جب سانس لینا چاہے اور ٹھہرے تو اسی مقام پر آ کر ٹھہرے ورنہ گانے والے اور تال دینے والے کا ساتھ قائم نہ رہ سکے گا، اور سارا گانا بے مزہ ہو جائے گا۔

یوں تو محض تال اور سُر ہی موسیقی کا اثر رکھنے والی چیزیں ہیں مگر جب تک اُن کے ساتھ بول اور لفظ نہ ہوں اُن کی مثال ایسی ہے جیسی تصویر بے جان کی۔ مکمل اثر پیدا کرنے کے لئے سُر کی بھی ضرورت ہے تال کی بھی اور الفاظِ موزوں یعنی بولوں کی بھی۔ دوسرے الفاظ میں یہ سمجھئے کہ موسیقی کے لئے شاعری کی بھی ضرورت ہے۔ جس قدر اعلیٰ درجے کی شاعری ہوگی اُسی قدر موسیقی کا رنگ اُس پر کھلے گا۔

اچھی موسیقی کے لئے خوش گلوئی بڑی شرط ہے۔ بھدّے گلے سے زمزمہ تان اور خود سُر بھی خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہوتے۔ اور اُن کو سُن کر طبیعت مکدّر ہو جاتی ہے۔ شیخ سعدی نے ایک کریہہ الصوت گانے والے کو سُن کر ہی یہ کہا تھا کہ گر تو قرآں بریں نمط خوانی ببری رونقِ مسلمانی۔ حقیقت میں خوش گلوئی اتنی بڑی صفت ہے کہ گانے والے کی ساری قابلیت اور ہنر ایک طرف اور یہ ایک طرف۔

گانے والے کے لئے دوسری نہایت ضروری بات یہ ہے کہ وہ اشعار پر دُھن لگاتے وقت اِس بات کا خیال رکھے کہ جو مضمون میں گانا چاہتا ہوں وہ کس خاص دُھن میں اور کس خاص تال میں کامیابی کے ساتھ گایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ جیسا اوپر بیان کیا جاچکا ہے ہر دُھن اور تال کا مزاج جُدا جُدا اور اُس کی کیفیت مختلف قسم کی ہے۔ ہر مضمون پر ہر طرح کی دُھن اور ہر طرح کی تال لگائی نہیں جاسکتی۔ تفریحی گانے، غزل، ٹھمری اور دادرے کی طرزوں میں گائے جاتے ہیں۔ اور سنجیدہ اور تفکّر انگیز گانے دُھرپد، خیال اور ٹپہ کی طرزوں اور تالوں میں۔ بالفاظِ دیگر غم کے لئے غم کا مضمون، غم کی تال، اور غم کی راگنی کی ضرورت ہے، اور خوشی کے لئے خوشی کے مضمون، خوشی کی دُھن اور خوشی کی تال کی۔ جو گانے والا اِس نکتہ سے بے خبر ہے اُس کا گانا اثر سے خالی ہے۔ اِس نکتہ کو لکھنؤ کے بعض باکمال مرثیہ خوانوں نے جیسا سمجھا ہے ویسا شاید کسی نے نہیں سمجھا۔ یہ لوگ مضمون اور دُھن کی مطابقت کو خوب سمجھتے ہیں۔ یعنی جہاں بہاریہ مضمون ہوتا ہے وہاں اُس کے ساتھ "سوز" بھی بہاریہ ہوتا ہے۔ اور جہاں غم انگیز مضمون ہوتا ہے وہاں اُس کے ساتھ ویسا ہی "سوز" بھی ہوتا ہے۔ اِس نکتہ سے بڑے بڑے مشّاق گانے والے بے خبر ہوتے ہیں۔

گانے والے کے لئے ایک اور بات کی بھی ضرورت ہے۔ ہندی گانے یعنی دُھرپد، خیال، ٹھمری، ٹپہ وغیرہ اور مختصر ہوتے ہیں۔ ان میں غزل کی طرح زیادہ اشعار نہیں ہوتے۔ ان ہندی بولوں کی تکرار بار بار چاہے کتنے ہی ہنر کے ساتھ کی جائے طبیعت اُس کو سُن سُن کر مکدّر ہو جاتی ہے۔ اِس لئے گانے والے کو چاہیئے کہ وہ اپنے گانے میں مختلف مگر مناسبِ موقع اشعار یا دوہے شامل کرتا رہے تاکہ ایک ہی طرح کا رنگ بُرا اثر پیدا نہ کرے۔ دوسری ترکیب یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اصل چیز میں کہیں کہیں دوسرے راگ یا راگنی کا رنگ دکھایا جائے۔ یہ ذرا مشکل بات ہے مگر ہے کام کی۔

ہندوستانی موسیقی

فنِ تعمیر، فنِ بُت تراشی، فنِ مصوّری، فنِ شاعری اور فنِ موسیقی سب ملتے جلتے فن ہیں۔ سب حُسن کے مظہر ہیں اور جذبات کے محرک۔ ان میں سے فنِ شاعری اور فنِ موسیقی ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب ہیں۔ دونوں انسانی جذبات یعنی عشق و محبت، بیزاری و نفرت، ہمت و شجاعت، حبِ وطن اور حقیقت و معرفت کے ترجمان ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ موسیقی اِن جذبات کی ایک گونگی تصویر ہے اور شاعری اِن کی مُنہ بولتی تصویر۔ شاعری اور موسیقی دراصل لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر نامکمل اور ادھورے۔

موسیقی صرف دو چیزوں سُر اور تال سے مرکب ہے۔ سُر موسیقی کی جان ہے۔ چنانچہ گانے والے کو سب سے پہلے یہ سبق دیا جاتا ہے کہ وہ سُر کو قائم کرے۔ سچے سُر کی پہچان یہ ہے کہ روشن اور عمیق ہو جس کو سُن کر نیند آنے لگے، جو سب طرف سے توجہ کو ہٹا کر اپنی طرف مائل کرلے۔ جو قائم ہو کر یہ معلوم ہو کہ ایک چراغ روشن ہے، جس کی آواز میں گونج اور رس ہو، جو کانوں کو میٹھا اور پیارا لگے۔ گانے میں زمزمہ اور تان نہ ہو تو سیدھا سادہ روکھا پھیکا گانا ہے۔ غیر متمدن قوموں اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کا گانا ایسا ہی ہوتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ باوجود اِس قدر تہذیب و تمدّن اور ترقی کے جس کے ماننے میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا مغربی اقوام کا موسیقی روکھا پھیکا بے مزہ اور مبتدیانہ ہے۔ اِس موسیقی میں زمزمہ اور تان وغیرہ یا تو ہیں نہیں یا اُس درجے اور پایہ کے نہیں جن کو ہم جانتے ہیں۔ نہ اس میں سُروں کی ایسی ترکیب و ترتیب ہے جن سے کسی راگ یا راگنی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھِچ جائے۔ اِس موسیقی کو عمر بھر سُنیئے کبھی آپ کے ذہن میں اِس کے سروں کا باہمی رشتہ نہ آئے گا۔ اگر کوئی دُھن اتفاقاً بنتی ہوئی معلوم بھی ہو تو سمجھ لیجئے کہ ہندوستانی موسیقی کی خوشہ چینی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انگلستان کے مشہور ادیب چارلس لیمب سے جب پوچھا گیا کہ تم موسیقی (انگریزی موسیقی) سے کیوں بھاگتے ہو۔ تو اُس نے یہ جواب دیا کہ میرے پاس موسیقی سُننے کے کان ہی نہیں۔ یہی حال مشہور ڈاکٹر جانسن کا بھی تھا جن کو مغربی موسیقی اچھا نہ لگتا تھا۔ کاش یہ لوگ ہندوستانی موسیقی کو سُنتے تاکہ اُن کو معلوم ہوتا کہ یہ موسیقی انسانی جذبات کی کیسی ترجمانی کرتا ہے۔ مغرب کے مَردوں کا گانا تو سرے سے قابل ذکر ہی نہیں۔ وہاں کی خواتین بھی موسیقی کے مذاق سے بے بہرہ ہیں۔ یہ خواتین جب اپنی آواز کو لہراتی ہیں یا اُس میں درد پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو ہمارے کان عجب بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ یہی حال کم و بیش ایشیا کے دوسرے ملکوں کا ہے۔ اور مغربی موسیقی تو محض کرسمس ڈِسمس کے لئے موزوں ہے۔

ہندوستانی موسیقی سراپا درد ہے، جادو ہے، جذبات کا ایک سمندر ہے جو روتے انسان کو شگفتہ خاطر کردے۔ جو سنگدل سے سنگدل انسان کو رُلادے، اس کے دل کو موم کردے، اُس میں عشق و محبت کا جذبہ پیدا کردے، اور اُسے مرغِ بسمل کی طرح لوٹا دے۔ حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر ہندوستانی موسیقی کے موجدوں نے صرف چند سُروں سے راگ راگنی کی کیسی کیسی قسمیں ایجاد کیں اور اُن کو کس خوبصورتی کے ساتھ بلا جلا کر ایسا ٹھاٹھ تیار کیا جس کے سمجھنے کے لئے بھی ایک مدت درکار ہے۔ زمزمہ تو گلے کی ایک قدرتی ودیعت ہے تان ایک ایسی چیز ہے جو اچھے گلے میں بھی بلا کافی مشق کے پیدا نہیں ہوتی۔ سچی تان کی تعریف یہ ہے کہ سُر میں ڈوبی ہوئی ہو اور اُس کا ایک ایک "دانہ دانہ" الگ الگ روشن ہو۔ صحیح تان جب کسی گلے سے نکلتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجلی کوندگئی یا کوئی تیز رفتار ہلکی پھلکی ریل گاڑی "زن" سے نکل گئی۔

سُر اپنے مزاج کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ اثر رکھتے ہیں۔ بھاری سُر سنجیدہ و افسردہ، اور تیکھے سُر شگفتہ ہوتے ہیں۔ مگر شگفتہ سُر بھی باوجود شگفتہ ہونے کے خدا جانے کیوں درد پیدا کرتے ہیں۔ پچھلی رات اور صبح سویرے کی راگ راگنیاں نہایت افسردہ اور درد انگیز ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن میں مایوسی، دکھ اور تکلیف کے مضامین بہت کھِلتے ہیں۔ صبح سے شام تک کی چیزوں میں بعض شگفتہ اور بعض افسردہ ہیں۔ شام کی چیزیں نہایت افسردہ اور بیراگ سندھیا پوجا اور عبادت کے مضامین کے لئے موزوں ہیں۔ شام کے بعد آدھی رات تک کی چیزیں عموماً شگفتہ اور اس کے بعد کی افسردہ ہیں۔ وقت کی پابندی گانے کا سماں باندھنے میں امداد کرتی ہے۔ مگر باکمال گانے والے کے لئے وقت کی قید نہیں بشرطیکہ اُس کا دل گاتے وقت گواہی دے اور گانا اُس کے دل اور اُس کی روح سے نکلے۔

ستّر سالہ۔ بھیا ہم تو کچھ ہی کہے اب بھی فلالین کی پتلون ڈانٹے ٹینس کا بلا ہلانے میں لطف آتا ہے۔ کھیلتے نہیں مگر پہنچ تو جاتے ہیں۔ بیس سال ہوئے کہ کھیلنا شروع کیا، دس سال ہوئے کہ چھوڑ دیا مگر ......

بہتّر سالہ۔ جی ہاں

چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہ جائے

ستّر سالہ۔ یوں ہی سہی مگر بندہ نواز اب بھی کبھی کبھی ایک دو دسٹ نہیں تو دو چار game تو ضرور ہو ہی جاتے ہیں۔

اسّی سالہ۔ اس پر یہ خیال کہ شباب کی آرزو نہ ہو۔ بڑے نٹ کھٹ ہو۔

ستّر سالہ۔ وہ تو محض فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے آپ کے تجربہ سے مستفید ہونے کے لئے ذکر چھیڑا تھا ورنہ ردّی کی ٹوکری کی امانت بننے کو کس کا جی چاہتا ہے۔

بہتّر سالہ۔ واللہ اگر کوئی نوجوان ہماری باتیں سُن لے تو بے اختیار کہہ اُٹھے کہ یہ پیر فرتوت بھی کس قدر نابالغ ہیں۔

اسّی سالہ۔ نوجوانوں کی ایسی تیسی۔ برسوں ہی میں اپنے پوتے کو للکار چکا ہوں کہ خبردار جو تم نے یہ سمجھا کہ ہم تم سے کم ہیں۔ صرف یہ فرق ہے کہ ہم محسوس تو سب کچھ تمہاری طرح کرتے ہیں مگر اظہار کم کرتے ہیں۔ زبان رُکتی ہے، پاؤں لڑکھڑاتے ہیں مگر دل کی دھڑکن وہی ہے۔ وہ بے حیا دبی زبان سے کہنے لگا "داداجان کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیجئے"! اس قدر غصہ آیا کہ لاٹھی مارنے کو جی چاہا۔ نالائق کہیں کا

بہتّر سالہ۔ سخت نالائق۔

ستّر سالہ۔ بدلگام مُنہ پھٹ۔ مجھے بھی غصہ آرہا ہے۔ یہ کہنا تھا کہ سب کھانسنے لگے۔ ایک منٹ تک کھانسی جاری رہی۔ اُگالدانوں کا استعمال ہُوا، رومال سے ہونٹ پونچھے گئے، گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ تو بھئی خدا حافظ خدا حافظ کہہ کر ستّر سالہ اور بہتّر سالہ رخصت ہونے کے لئے اُٹھے۔ پھر کچھ کھانسے۔ اسّی سالہ نے کہا "آج ہوا میں کچھ خنکی زیادہ ہے"۔

کوٹھی کے صحن میں نوجوان لڑکے اور خاتونیں ہلکے کپڑوں میں بھاگ دوڑ کھیل کود شور و غل میں مشغول قہقہے پر قہقہے لگا رہے تھے۔ بڈھوں نے سب کچھ دیکھا مگر یہ اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ گلابی سے موسم میں موٹے موٹے کوٹ، اس پر کھانسی اور باتیں جوانی کی گویا زندگی کی بدترین (Tragedy) کے وہ غلام ایکٹر تھے۔ اس غلامی کے سوا اور اب کسی قابل نہ تھے۔ ڈاکٹروں سے مدد نہ لینے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔

"فلک پیما"

فلک پیما کا خط

اُوپر کا مضمون پہلے عنوان کے بغیر موصول ہُوا تھا راقم الحروف نے عنوان لکھنے کے لئے مسودہ دوبارہ حضرت فلک پیما کی خدمت میں بھیجا تو عنوان کے ساتھ اُن کا یہ دلچسپ خط ملا چونکہ اس میں اوپر کے خیالات کی مزید تشریح ہے اس لئے میں نے اسے یہاں شائع کردینا مناسب سمجھا۔

ڈیر حامد علی خاں صاحب تسلیم۔ لیجئے عنوان لکھ دیا ہے۔

اخلاقی طور پر میرا ایمان یہ ہے کہ اچھے وہ ہیں جو جوان مرجائیں۔ بڑھاپے میں شباب کا ماتم، خود اپنے مرحوم شباب کا ماتم زندگی کا تاریک ترین پہلو ہے وہ نمازیں جو وصل حور کی نیت سے ادا کی جاتی ہیں ڈاکے اور قتل سے کم نہیں۔

ملک الموت سے اور اس کے رفیقوں (ڈاکٹروں اور طبیبوں) سے مُنہ چھپاتے پھرنا بدترین بے حیائی ہے۔ جب چلنے کا وقت آئے تو انسان کے لئے جلد چل دینا ہی اولیٰ ہے۔ ایک ایک کے کنگ کرکے قبر کی منزل کو طے کرنا ایک قسم کا دیوانہ پن ہے یہ وجہ ہے کہ بہت کم [illegible] گرتے ہیں۔ شہد میں گُھس کر جانے والی [illegible] سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

مَلک المَوت سے گُریز

جوانی ڈھل جانے کے بعد جو خوش نصیب ہیں وہ تو جلد ہی کسی مشہور طبیب کی گولیوں کی مدد سے یا کسی لائق ڈاکٹر کے انجیکشن کے زور سے چین سے قبریں پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں مگر جن کمبختوں کو گولیوں اور ڈاکٹروں سے ضد ہو وہ بہت مشکل سے مرتے ہیں۔ سالہا سال تو ورزش کرتے کرتے ختم کر دیتے ہیں۔ ورزش کے ساتھ کم کھاتے اور لمبے سانس کی عادت ڈالتے ہیں۔ کچھ سال ان گہرے سانسوں میں نکال دیتے ہیں۔ آخر میں گوشت چھوڑ کر اخروٹ، انڈے اور ٹماٹو پر گزارا کرتے ہیں۔ بالکل ہار جائیں تو چند سال دہی کھاتے کھاتے بسر کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر کی فیس ماتے ہیں، قسائی کا بل چٹ کر جاتے ہیں اور اگر پنشن یافتہ ہوں تو ملک کے خزانے پر مُردار خواروں کی طرح ڈٹے رہتے ہیں۔ چل پھر نہ سکیں مگر زندہ ضرور رہتے ہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ کمزور اور ناکارہ ہوتے جاتے ہیں مگر یہ ضرور کہیں گے "پہلے سے بہت بہتر ہوں" "اخروٹ اور انڈے بہت مفید ثابت ہو رہے ہیں" "دہی نے تو گویا مجھے از سرِ نو جوان کر دیا" وغیرہ۔ (طبیب اور ڈاکٹر نہ ہوں تو ہندوستان کی زہریلی آب و ہوا میں بھی اسّی نوّے سے پہلے شاید ہی کوئی مرے)

ستّر سالہ۔ (مصنوعی دانتوں کو چمکاتے ہوئے) واللہ مجھے تو جس دن سے دواؤں سے نفرت ہوئی ہے زندگی کا لطف آگیا ہے۔ کھاتا کم ہوں، سوتا کم ہوں مگر توانائی پہلے سے دونی ہے

بہتّر سالہ۔ بجا درست، یقین جانو کہ یہ کمبخت کھانسی نہ ہو تو میری صحت اُس سے جو آج سے دس سال پہلے تھی کہیں بہتر ہے۔

اسّی سالہ۔ تم کل کے لونڈے صحت کی قدر کیا جانو۔ اب بھی دو میل روزانہ صبح کی سیر جاری ہے اور اشتہا کا یہ حال ہے کہ احتیاط کا تقاضا نہ ہو تو چار انڈے کھا جاؤں اور ڈکار تک نہ لوں۔

ستّر سالہ۔ (اسّی سالہ کو مخاطب کر کے) حضرت اور سب کچھ تو سمجھ میں آگیا مگر یہ تو فرمائیے کہ شباب کی آرزو دل سے کیوں نہیں جاتی؟

اسّی سالہ۔ صاحب ہوش کی لو۔ یہ آرزو سو سال تک دو سو سال تک نہ جائے گی۔ جب تک جان ہے شباب کی آرزو ہے۔ زندگی کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ شباب جائے مگر شباب کی آرزو نہ جائے۔

ستّر سالہ۔ میں تو دل سے چاہتا ہوں کہ یہ آرزو نہ ہو۔ انسان اس قید سے آزاد ہو کر کوئی عقل کا کام کرے۔

بہتّر سالہ۔ یہ گئی تو مرے ع مرد چوں پیر شود حرص جواں تر گردد۔

ستّر سالہ۔ میرے دماغ پر تو واضح ہوتا جاتا ہے ؎

بہ شرب و کباب و رنگِ خضاب
باز ناید گذشتہ برنائی

بہت چاہتا ہوں کہ شباب اور شباب کی داستانیں قطعی محو ہو جائیں مگر دل نہیں مانتا۔

اسّی سالہ۔ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ دل دانا ہے دماغ محض پاگل ہے۔ اب تک کرکٹ کے میچ، میچ کے بعد کی چائے، چائے میں پہلو والی سیمیں بدن کا مسکرانا یاد آتا ہے۔ ہم تو خیر کیا تھے ہمارے پروفیسر صاحب کی باچھیں کھلی جاتی تھیں اور یہ ساٹھ سال کا قصہ ہے۔ کالج جس کا اب بھی جی نہ چاہتا ہو کہ وہی میچ ہو، وہی چائے ہو اور پروفیسر ... ہو۔ جماعت میں وہ ہماری غیر حاضری لگاتا تھا۔ چائے کے موقع پر ہم اس کی غیر حاضری کے متمنی ہوا کرتے تھے۔

بہتّر سالہ۔ کیا بات کہہ گئے ہو اُستاد۔ مگر بُرا نہ مانو تو ہم سے یہ آج کل کے ٹینس کھیلنے والے چھوکرے کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ آنکھیں سینکنے کے لئے چائے کے محتاج نہیں۔ چست چالاک خاتونوں کے ہجوم میں دندناتے پھرتے ہیں۔ نہ تھی ہمارے وقت میں ٹینس ورنہ ہم بھی یہ لطف اٹھاتے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جو ایک جوہر قابل بننے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ genius کے دماغ میں جو جنون ہوتا ہے وہ سرفراز ہو کر اُسے وہاں لے جاتا ہے جہاں دوسری ہستیاں چاہے کتنی ہی قابلیت کی مالک کیوں نہ ہوں ہرگز نہیں پہنچ سکتیں۔ جنون تازیانے کا کام دیتا ہے اور اس بنا پر وہ دنیا کی وسعتوں کو تنگ خیال کرتا ہے، اور اپنے لئے ایک نئی دنیا آباد کرتا ہے۔ بڑے بڑے سائنس دانوں، آرٹسٹوں اور شاعروں کی شہرت کا باعث بھی mania یا جنون ہی ہوتا ہے۔

اِن حالات کے مطالعہ کے بعد ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ دماغی عوارض بیشتر حالات میں ایک عام یعنی اوسط درجے کے انسان کی دماغی قوتوں کو گھٹا دیتے ہیں اور اُسے سوسائٹی کے ناقابل کر دیتے ہیں، لیکن بعض حالتوں میں چند شخصیتوں کو جو خاص دماغی ساخت اور بہت قابلیت سے بہرہ ور ہوتی ہیں۔ جوہر قابل بنانے میں ایک نمایاں حصّہ لیتے ہیں، بشرطیکہ وہ عوارض اتنے طاقت ور نہ ہو جائیں کہ بجائے فائدہ کے نقصان ہو۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ اُدھر جنون نے شدت اختیار کی اور اِدھر وہ صاحب بالکل پاگل ہو گئے اور ان کا بلند مطمحِ نظر دہیں کا دہیں رہ گیا۔

رشید۔ اے۔ انور

عکسِ فرواودوش

موت ہے اک طویل ٹھنڈی رات
زندگی روزِ حبس ہے یکسر
تیرگی شب کی بڑھتی جاتی ہے
چھائی جاتی ہے ایک مدہوشی
زندگی سے میں تنگ آیا ہوں

سرِ بالیں ہے اک عجیب درخت
جس سے چھنتی ہے پھیکی پھیکی ضو
ایک بلبل جوان خوش الحان
اُس پہ الفت کے گیت گاتا ہے
جن کو سپنوں میں بھی میں سنتا ہوں

(ہائینے)

مترجمہ طالب شیرازی

اس لئے ہمیں یہ دیکھ کر بالکل حیرت نہیں ہونی چاہیئے کہ یہ بنی نوع انسان جن کو جوہر قابل (Genius) کے نام سے پکارا جاتا ہے اپنی ذہنی ساخت میں بھی ایک طرح کا غیر معمولی تنزل رکھتے ہیں۔ وہ بہت ذی حس ہونے کے علاوہ دیگر دماغی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ہاں یہ بالکل ممکن ہے کہ حکیمانہ یا فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے ایک جوہر قابل کو عوام سے بلند اور امتیازی حیثیت حاصل ہو لیکن اس بات پر اصرار کہ ایک جوہر قابل حیاتیاتی کا نقطۂ نظر سے بہت بلند فہم و ادراک کا مالک ہوتا ہے، علم سائنس کی بھاری اور عریاں حقیقتوں کے سامنے کچھ وقعت نہیں رکھتا۔

جوہر قابل ایک خاندان میں یا مربوط خاندانوں کے مجموعے میں آہستہ آہستہ نشوونما پاتا ہے، ایسے اعلیٰ خاندان جن میں لائق آدمیوں کی افراط ہوتی ہے۔ (جیسا کہ سر فرانسس گالٹن نے بہت تحقیق اور جستجو کے بعد ثابت کیا ہے) جوہر قابل کی ترقی کا پہلا زینہ ہیں۔ لیکن جوہر قابل پر اس بات کا بذات خود کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ جواہر قابل کی زندگیوں کے حالات پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ جس خاندان میں کوئی جوہر قابل پیدا ہوا وہ پہلے پہل بدقسمت گنا گیا، کیونکہ شروع ہی سے اس کے اپنے خویش و اقارب سے تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں اور چونکہ ہر کوئی اپنی عقل کے مطابق اسے پرکھتا ہے اس لئے اس کی حرکات و سکنات ان کو بہت عجیب اور اکثر بیہودہ نظر آتی ہیں، لیکن وہ اپنے لئے ایک بالکل مختلف ماحول پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، دوسرے تو اپنی سوسائٹی کے قوانین پر عمل پیرا ہوتے ہیں لیکن وہ انہیں چیزوں کو بالائے طاق رکھتا ہے اور رسم و رواج کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے لئے نئے قوانین مرتب کر لیتا ہے، دوسروں کی قابلیت یا علمیت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں محو ہوتا ہے۔

علم حیات کا مطالعہ کرنے سے یہ حیران کن حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ جواہر قابل کی نسل بہت جلد غائب ہو جاتی ہے اور گویا خود قدرت ہی کے ایک بہت آسان قانون کے ماتحت ایسا ہوتا ہے، مثلاً بہت سے جواہر قابل نے شادی نہیں کی یا اگر کی تو بے اولاد رہے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن میں شہوانی جذبات کا فقدان تھا یا کچھ برگشتۂ جنس یعنی Perverts تھے جن میں شہوانی جذبات کی شدت موجود تھی انہوں نے اولاد پیدا کرنے سے گریز کیا۔ اگر کسی کے اولاد ہوئی بھی۔ تو ناکارہ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پہلی ہی پشت میں اتنا تنزل اس بات کی دلیل ہے کہ قدرت کا نظام بے قاعدہ ہے اسی طرح ہم خاص طور پر بالکل یہی بات بڑے بڑے حکمرانوں کی اولاد میں دیکھتے ہیں کہ ناخوشگوار مریضوں اور تنزل پذیر شخصیتوں کی کثرت ہونے لگتی ہے، ایک جوہر قابل کے خاندان میں اس طرح کا زوال اس سے اگلی ہی پشت میں ظاہر ہو جاتا ہے جس سے وہ خود تعلق رکھتا ہے، اور عموماً ضعیف الدماغ شخصوں کی صورت میں۔ اور پھر ایک جا خاندانوں کا زوال تو حیران کن تیزی سے ہوتا ہے، گوئٹے، بائرن، بی تھوون، بیک اور فاربک کے خاندان اس بات کا بین ثبوت ہیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جواہر قابل اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک بہت اعلیٰ اور باہنر خاندان تنزل پذیر ہونے لگتا ہے، اگر بہت سی سوانح عمریوں کا مطالعہ کریں، تو پتا چلتا ہے، کہ ادراک اور جنون میں ایک فطری رشتہ قائم ہے اور پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جوہر قابل کے لئے بہت موزوں وقت وہی ہوتا ہے، جب ایک باکمال خاندان زوال کی طرف مائل ہوتا ہے، یہ تنزل کی طرف رجحان جو قدرت کی طرف سے ہوتا ہے قابل افسوس تو ضرور ہے لیکن یہ ایسا ضروری اور فطری امر ہے جس سے بچنا محال ہوتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ کیا دماغی امراض ایک جوہر قابل کے لئے ضروری ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ کیا Genius اور جنون ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ یا یہ کہا جائے کہ کیا جنون ہی کی وجہ سے ایک غیر معمولی قابلیت کا انسان جوہر قابل بنتا ہے؟ تو ان سوالوں کا تسلی بخش جواب ملنا ابھی مشکل ہے، کیونکہ سائنس دانوں میں اس بارے میں بھی بہت اختلاف ہے۔ تاہم [illegible] دیکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دماغی عوارض کا اعلیٰ درجے کی قابلیت سے براہِ راست کوئی واسطہ نہیں ہے کیونکہ بہت سی ایسی ہستیاں بھی ہو گزری ہیں جن کا دماغی توازن تو درست نہ تھا لیکن اس بات کے باوجود بلند پایہ قابلیت کی مالک تھیں اور بے شمار ایسی ہستیاں بھی ہوتی ہیں جو قابل تو بے شک ہوتی ہیں لیکن ان میں وہ کمی ہوتی ہے

کسی مجمع میں اپنے آپ کو کیسے سنبھالے گا۔ لیکن وہی روسو انقلابِ فرانس میں سب سے آگے تھا۔

جوانی میں دونوں طبائع۔ ایک وہ جو ادراک وفہم کا سرچشمہ ہے اور دوسری وہ جس کی بنا پر وہ سوسائٹی کو چھوڑ دینے پر مجبور رہتا ہے ایک ہی چیز سے پیدا ہوتی ہیں اگر ایک گل ہے تو دوسری خار۔ لیکن دونوں ایک ہی شاخ پر پیدا ہوتی ہیں اور یہ ایسی حقیقت ہے جو جواہرِ قابل خود بھی تسلیم کرتے ہیں۔ بسمارک نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ کہا تھا کہ میں پرشیا کا یا تو سب سے بڑا آوارہ شخص ہوں گا، یا سب سے بلند مرتبہ آدمی۔ تسلر کو لیجئے عنفوانِ شباب میں دماغی توازن بالکل قائم نہیں تھا۔ یہی حالت ہزاروں اور ناصحیح الدماغ شخصوں کی اوائلِ عمر میں ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تمام تسلر تھے۔ ہر ایک جوہرِ قابل جنونی ہو سکتا ہے لیکن ہر ایک جنونی جوہرِ قابل نہیں ہو سکتا۔

عام طور پر وہ کونسی ہستی ہوتی ہے جو سیاسی وعقلی تاریخ میں انقلابات اور فیصلہ کن تحریکات پیدا کرتی ہے۔ کیا وہ ایک معمولی آرام طلب اور عیش پرست ہستی ہوتی ہے جو اُن انقلابی حادثات سے فائدہ اٹھا کر اپنی خودغرضانہ خواہشات کو پورا کرتی ہے؟ یا وہ ایسی شخصیت ہوتی ہے جو طبی نقطۂ نظر سے ذہنی اور جسمانی صحت کی مالک ہوتی ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ ذہنی یا جسمانی صحت سے مراد یہ ہے کہ دل کو اطمینان ہو اور کسی قسم کی دماغی یا جسمانی تکلیف نہ ہوتی ہو۔ جس شخص کا دماغ رنج وفکر اور غم کی عدم موجودگی میں درست حالت میں ہو اور وہ خوب سمجھتا ہو کہ قوانین کے ماتحت کیسے زندگی بسر کرنا ہے تو وہ کسی صورت میں نہ تو شاعر ہی ہوگا نہ کسی انقلاب میں حصہ لے گا۔ اور نہ کسی جنگ میں شرکت کرے گا۔

سیاسی اور عقلی تاریخ میں انقلاب برپا کرنے والے ہرگز ذہنی یا بدنی حالت میں مکمل طور پر صحت ور نہ تھے۔ اُن میں کوئی نہ کوئی دماغی کمزوری ضرور موجود تھی۔ کیونکہ ایک انسان صرف دماغی توازن نہ ہونے کی حالت ہی میں اپنے ماحول سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ جو باتیں ہم بعض انقلابی شخصیتوں میں دیکھتے ہیں وہ ہمیں ان کے زمانے میں پاگلوں کے ہسپتالوں (Mental Hospitals) میں نظر آتی ہیں۔ اِن پاگلوں میں بھی وہی علامات ہوتی ہیں اور ایسے بے شمار اشخاص ماہرانِ تجزیۂ نفسی (Psychoanalysts) کے پاس بغرضِ علاج لائے جاتے ہیں۔

اگر ہم بہت مشہور جواہرِ قابل کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت اور واضح ہو جائے گی۔ اب ہمارے سامنے ایسے اشخاص ہیں جو غیر معمولی عقل کے مالک تھے لیکن وہ بھی انقلابی شخصیتوں کے مانند ناصحیح الدماغ تھے۔ ان میں مشہور محققین اور انقلابِ فرانس کے چیدہ چیدہ لیڈر شامل ہیں۔ مثلاً روسو، میرابیو اور رابس پیری وغیرہ رابس پیری کا باپ مالیخولیا کا مریض تھا اور خود رابس پیری عصبی امراض میں مبتلا تھا۔ میرابیو ایک خطر پسند آدمی تھا جس کا عہدِ جوانی ذہنی تکالیف میں گذرا اور بعد ازاں مالیخولیا کا شکار ہو گیا۔ روسو فلاسفر جو عقل وفہم میں پہلی دونوں ہستیوں سے کہیں بڑھ کر تھا وہ بہت سخت دماغی امراض میں مبتلا تھا۔ ان واقعات کو دیکھ کر ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ دماغی بیماریوں کے مریض اپنی قوم کی کایا پلٹنے میں ایک نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایک وقت میں کسی ملک کی عقلی فضا پُرسکون ہو اور سوسائٹی کا نظام عمدہ اور ٹھیک چل رہا ہو تو ایسے پاگل لوگ جو بینک میں آوارہ پھرتے ہیں بالکل بے ضرر اور بے اثر ہوتے ہیں لیکن ذرا ہوا کا رُخ بدل جائے اور سوسائٹی کے نظم ونسق میں فرق آ جائے اور عوام قعرِ مذلت میں گرنے پر مائل ہو جائیں تو پھر یہی پاگل اور آوارہ لوگ صفِ اوّل میں آن کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسے اڑے وقت میں یہی لوگ کام آتے ہیں۔ دنیا ان کے سامنے سرِ خم کر دیتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ انقلابی شخصیتیں دنیا میں صرف ایسے وقت میں آتی ہیں جب ان کی اشد ضرورت ہوتی ہے بالکل غلط ہے۔ ایسی ہستیاں تو ہر وقت اور دنیا کے ہر تختے پر موجود ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا اثر وقت وقت پر منحصر ہے، ایک وقت میں عوام انہیں پاگل کہتے ہیں، لیکن دوسرے وقت میں انہیں جواہرِ قابل اور مشاہیر کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

ان حالات کو دیکھ کر کیا ہمیں لانبروسو کے مقولہ کو مان لینا چاہیئے کہ ادراک اور جنون لازم وملزوم ہیں؟ یقینی طور پر نہیں۔ لیکن ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے جوہرِ قابل عوام سے بڑی حد تک مختلف ہوتا ہے، ایسے انتہائی درجے کے اختلاف حیاتیات میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ عوام کے برخلاف ان کی جسمانی بناوٹ میں ناپائنداری ہوتی ہے یعنی انحطاط کی طرف بہت زیادہ رجحان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں عام رسم ورواج بھی ان کے لئے تکلیف دہ چیز ہوتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جواہر قابل کا خود اپنے متعلق کیا خیال ہے۔ فلاسفر شوپنہار مختصر لیکن خشک الفاظ میں کہتا ہے: "کہ جوہر قابل اوسط درجے کی فہم کی نسبت جنون کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے اس پر طرہ یہ کہ بہت سے جواہر قابل جنون اور پاگل پن کو ایک غیر معمولی انسان کے دماغ کا جزو اعظم یا جزو لازم سمجھتے ہیں۔ اس مسئلہ کو ٹھیک طور پر جاننے کے لئے ہمیں پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اس بات میں سچائی کہاں تک ہے۔ اول تو ہم مختلف سوانح عمریوں کا مطالعہ کر کے بڑی آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں کہ کتنے جوہر قابل اوائل عمر ہی میں یا بعد میں پاگل ہو گئے تھے۔ (تمام مثالیں یورپین جواہر قابل ہی کی آئیں گی کیونکہ ہندوستانی جواہر قابل کے حالات زندگی کا تجزیۂ نفس Psychoanalysis میری نظروں سے نہیں گزرا) فلاسفروں میں سے روسو، نیٹشے، سائنس دانوں میں سے گالٹن، نیوٹن، رابرٹ میر اور فیلڈ مارشل بلوشر۔ شعرا اور مصنفین میں ٹاسو، کلینٹ، ہولڈرلین، سی۔ ایف۔ میر، لیناؤ، موپساں، سٹرنڈبرگ اور فان گف جیسی ہستیاں اس بات کی شاہد ہیں۔ ان کے علاوہ مائیکل انجیلو، بائرن، گرل پارزر اور پلاٹین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مانا کہ بالکل صحیح الدماغ ہونا بہت اچھا ہے لیکن یہ بات بذات خود فائدہ مند نہیں۔ صحیح الدماغ اس کو کہنا چاہئے جس کے جذبات اور احساسات میں مکمل توازن ہوتا ہے اور دماغ Nervous Complex سے مبرا ہوتا ہے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ تسکین قلب یا دماغی اطمینان اور متوازن جذبات دنیا میں بڑے بڑے کارناموں کی آگ بھڑکانے سے عاری ہوتے ہیں۔ اُدھر جنون ایک طرح کی بدقسمتی تو ضرور ہے لیکن بہت دفعہ یہ انسان کو آسمان شہرت پر چمکاتی ہے۔

آپ نے اکثر سنا ہوگا اور حیران ہوئے ہوں گے کہ کیوں ایک جوہر قابل کی زندگی میں ایک لامتناہی کشمکش جاری رہتی ہے۔ مثلاً شروع ہی سے اس کے اساتذہ کو اس کے متعلق غلط فہمی ہوتی ہے بلکہ اس کے والدین بھی اس کو بدقسمت اور بیوقوف خیال کرتے ہیں اور اس کے آشنا اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ کیوں اس کی قدر نہیں کی جاتی اور کیوں اُسے اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملتا۔ ان باتوں کی تہ میں کیا راز ہے۔ وہ کیوں اپنی تمام زندگی رنج و فکر، تلخی و بے آرامی کے بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ اس کا ماحول جو عوام سے پُر ہوتا ہے بڑی حد تک اس بات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ عوام اس کی مافوق العادت فطرت کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اور اس کی عمیق گہرائیوں تک پہنچنے سے عاری۔ علاوہ ازیں جوہر قابل کی تکلیفات کی ایک وجہ اور بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک اوسط درجے کے دماغ کا انسان اپنے دنیاوی کاروبار کو اچھی طرح نباہ سکتا ہے اور خاص کر مشکلات کا اچھی طرح سامنا کر سکتا ہے اور خوب جانتا ہے کہ دنیا میں کیسے رہنا ہے اور ایک خوش و خرم طبیعت کے ساتھ دنیا میں کامیاب رہتا ہے۔ لیکن برخلاف ایسی شخصیت کے ایک جوہر قابل جو صحت درکھلانے کے باوجود بھی کسی نہ کسی اعصابی مرض میں ضرور مبتلا ہوتا ہے۔ ایسے نہیں رہ سکتا۔ ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں جو بہت کشمکش کے بعد کسی حد تک بنا ہنے کی قوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ ہاں صرف گوئٹے اور شلر ایسی ہستیاں ہوئی ہیں۔

کوئی انسان بھی جو بظاہر تو صحیح الدماغ نظر آتا ہے لیکن حالات سے اپنی مسلسل تطبیق کرنے سے قاصر ہے، ہرگز صحیح الدماغ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ طبی نقطۂ نگاہ سے پیہم ناکامیاں اور لاانتہا مایوسیاں اور ایک کشمکش سے نکل کر دوسری میں پڑنا ایسی باتیں ہیں جو یقیناً ایک جنونی حالت کا بیّن ثبوت ہیں۔ مائیکل انجیلو اور فادربک کی ہستیاں اس بات کی شاہد ہیں۔

مختصراً اگر جواہر قابل کی دردناک زندگیوں کو صحیح طور پر سمجھنا ہے تو ہمیں ان کو دو پہلوؤں سے دیکھنا پڑے گا۔ ایک پہلو تو ہے ان کا ماحول یعنی اوسط درجے کی فہم کے لوگ جن کے ساتھ ان کا براہ راست تعلق رہتا ہے اور جو اپنے دنیوی فرائض بڑی اچھی طرح سے سرانجام دیتے ہیں اور اپنی قوت مدافعت کے بل پر صدمات سے غیر متاثر رہتے ہیں۔ دوسرا پہلو ہے اُن جواہر قابل کی اپنی شخصیتیں۔ جو برخلاف اپنے ماحول کے بہت زیادہ حساس، جنونی، تیز طبیعت اور تطبیق سے عاری ہوتی ہیں۔ ان کے دل صدمات سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور لاانتہا شکوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ بڑے بڑے مصلحین (Reformers) بہت شرمیلے، حساس اور تنہائی پسند ہوتے رہے ہیں۔ وہ برخلاف دیگر اشخاص کے صدمات کو بہت زیادہ محسوس کرتے تھے۔ یقیناً یہی حالت دوسرے جواہر قابل کی ہوتی ہے ان کے دماغ میں [illegible] [illegible] بتدریج [illegible] کے لئے ایک کشمکش واقع رہتی ہے جسے عوام نہیں سمجھ سکتے۔ وہ [illegible] آپ کو [illegible] سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ بالکل یہی حالت روسو اور [illegible] کی تھی۔ [illegible]

نفسیات اور جوہرِ قابل

یوں تو مختلف مصنّفین نے جوہرِ قابل (Genius) کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کی کافی کوشش کی ہے یا کر رہے ہیں۔ لیکن اس حیاتیاتی مسئلے کا سائینٹیفک مطالعہ موجودہ زمانے میں ڈاکٹر لانبروسو (اٹلی کا ایک مشہور ڈاکٹر جو پاگلوں کا علاج کیا کرتا تھا) اور سر فرانسس گالٹن دونوں کی نفسیاتی تحقیق سے شروع ہوا اگرچہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جداگانہ طریق پر چلے ہیں اور دونوں کے نظریئے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ میں اپنے اس مقالے میں صرف ڈاکٹر لانبروسو ہی کے نقطۂ نظر کو مفصل بیان کروں گا۔ اور سر فرانسس گالٹن کے نظریئے کو آیندہ کسی قسط میں پیش کروں گا۔

ڈاکٹر لانبروسو نے جوہرِ قابل اور دماغی عوارض میں گہرا تعلق ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بہت بحث ہوتی رہی ہے۔ اُس کے انکشاف کو اب تجزیۂ نفس کی سوسائٹی (Psychoanalytical Society) نے بھی درست قرار دیا ہے کریشمر نے جو جرمنی کا بڑا ماہرِ نفسیات ہے لانبروسو کی اُس منقطع تحقیق کو از سرِ نو شروع کیا۔ جس پر اب تک صرف فرائیڈ (Freud) اور ایڈلر (Adler) نے تھوڑا بہت لکھا ہے کریشمر نے اُس عمارت کو نئے سرے سے مضبوط اور مستحکم کیا ہے جو اب تک صرف قیاسات کی بنیادوں پر کھڑی تھی۔ اور لانبروسو کی مُردہ تحقیق کو نئی زندگی بخشی ہے یعنی اُس نے سائینٹیفک طریقے پر طبیعت اور قوائے جسمانی کے آپس میں گہرے تعلق پر روشنی ڈالی اور اِسی بنیاد پر اپنی مشہور کتاب (Physique and Character) لکھی۔ کریشمر نے یہ کتاب نہایت عمدہ طریقے پر لکھی ہے۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ اس کتاب میں جرمن نظریئے بہت کم ہیں۔ اس لئے انگریزی ادب سے واقفیت رکھنے والوں کے لئے بہت مفید، پُر از معلومات اور دلچسپ ثابت ہوئی ہے۔ جواہرِ قابل کے متعلق اس کے بہت سے ذاتی نظریئے بھی ہیں۔ مثلاً وہ بہ یک جنبشِ قلم تمام مشہور خواتین کو جواہرِ قابل کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ کوئی عورت genius نہیں ہو سکتی اور اگر کوئی اِس قابل ہے بھی کہ اُسے genius کا درجہ دیا جائے تو صرف اِسی بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بجائے عورت کے مرد تصوّر کرتی ہے۔ یعنی اس کے آرٹ میں نسوانیت بالکل مفقود ہوتی ہے۔ پھر ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ یہ ایک عجیب امر ہے کہ جنہوں نے جواہرِ قابل پر کتابیں لکھی ہیں وہ ہمیشہ آرٹسٹوں اور صحیفہ نگاروں ہی کو لیتے ہیں اور بڑے بڑے انجینیروں اور منتظمینِ تجارت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی زندگیوں کا مطالعہ بھی بہت اہم اور ضروری ہے۔ معلوم نہیں کریشمر کا پہلا نظریہ کہاں تک درست ہے۔ تاہم اُس نے لانبروسو کی تحقیق کو بڑی حد تک کامیاب اور درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے یہ مضمون لکھتے وقت کریشمر کی مشہور کتاب (The Psychology of Men of Genius) سے کافی مدد لی ہے اور اس کتاب میں اُس نے لانبروسو کے نقطۂ نظر کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے۔

ڈاکٹر لانبروسو موجودہ زمانے کا پہلا شخص ہے جس نے کہا کہ ادراک اور جنون میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس کے بعد تعلیم یافتہ طبقے میں اِس موضوع پر بہت بحث ہوتی رہی اور عجیب و غریب قیاس آرائیاں بھی ہوتی رہیں۔ جن کا ماحصل یہ نکلا کہ موجودہ تجزیۂ نفس کی سوسائٹی کے سوا جنون اور فہم و ادراک کے باہمی رابطہ کو اور کوئی بھی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عوام اس رابطہ کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے لیکن یہ کہنا کہ اِن دو چیزوں میں سرے سے اتحاد ہی نہیں ہے سراسر غلط ہے کیونکہ ایک جگہ یونانی فلاسفر ارسطو نے بھی کہا ہے کہ مشہور شعراء، آرٹسٹ اور سیاست دان عموماً مالیخولیا یا جنون کا شکار ہوتے رہے ہیں اور خاص کر مشہور شعراء پر تو اس کا بہت اثر ہوتا ہے اور پھر ہوش میں آنے پر کہتے ہیں کہ کوئی آسمانی قوت ان کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتی ہے اور زبردستی یہ الفاظ نکلواتی ہے۔ مثلاً مرزا غالبؔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

حکیم ارسطو نے اس بات پر بھی بہت زور دیا تھا کہ کوئی ایسا جوہرِ قابل پیدا نہیں ہوتا جس کے خاندان کی کسی پشت میں پاگل پن کا شائبہ نہ تھا ہو۔ گذشتہ چند سالوں میں ماڈزلے (Maudsley) نے بھی اِس بات کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے اور پیسکل (Pascal) نے بھی اِسی بارے میں کہا ہے کہ جوہرِ قابل کے انتہائی درجے میں اور جنون میں کوئی فرق نہیں ہے۔ گویا اِن سب کے نزدیک ایک جوہرِ قابل کو پاگل پن یا جنون کے معیار پر پُورا اُترنا پڑتا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

امر موجب اطمینان ہے کہ بائیسکل کے عام سوداگروں نے ہند سائیکل کی مضبوطی اور نفاست کی تعریف کی ہے۔ چیف انسپکٹر آف سپلائز نے بھی ان بائیسکلوں کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں قابلِ اطمینان قرار دیا ہے۔

جنگ کی وجہ سے کارخانے کے لئے مشینوں کے حصول میں کچھ دقت پیدا ہو رہی تھی لیکن غنیمت ہے کہ اس موقع پر حکومتِ ہند نے بھی غالباً اپنی آئندہ ضروریات کے لحاظ سے سٹر برلا کی مدد کی اور انہیں انگلستان اور امریکا سے ضروری مشینوں کی درآمد کے سلسلے میں کچھ آسانیاں بہم پہنچائی ہیں۔

برطانی ہوائی سلسلۂ حمل ونقل کی کامیابی

اب سے کچھ عرصہ پہلے ہوائی جہاز کا سفر بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا لیکن گزشتہ چند سال میں یورپی ممالک کے محکمہ جاتِ پرواز نے بہت ترقی کی ہے اور اب ہوائی جہاز ڈاک اور مسافروں کے حمل ونقل کے سلسلے میں بہت مفید کام کر رہے ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ گزشتہ سال برطانوی ہوائی ڈاک کے ذریعے سے جو خط بھیجے گئے اُن میں سے ایک خط بھی ضائع نہ ہوا۔ ان ہوائی خطوں کی تعداد (ایک کروڑ چھتیس لاکھ) کو مدِنظر رکھا جائے تو یہ کامیابی بہت قابلِ تعریف معلوم ہوتی ہے۔ ان خطوں میں جنگی قیدیوں اور اُن کے رشتہ داروں کے خط بھی شامل تھے۔

ڈاک کے علاوہ گزشتہ سال چار ہزار مسافروں نے برطانوی ہوائی جہازوں پر ساڑھے سات لاکھ میل کا مجموعی سفر طے کیا اور لطف یہ ہے کہ جنگ یا موسم کی خرابی کے باوجود پرواز کے نظامِ اوقات میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔ اسی نظامِ اوقات پر ۱۹۳۹ء سے لے کر اب تک باقاعدہ عمل ہو رہا ہے۔ تمام دورانِ جنگ میں انگلستان پرتگال اور ممالکِ متحدہ امریکا کے درمیان ہوائی سلسلۂ رسل ورسائل برابر قائم رہا ہے۔

ہندوستان میں چاول کی کاشت کی وسعت

سنہ ۲۱-۱۹۴۰ء کے مقابلے میں سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں ہندوستان میں چاول کی کاشت کے رقبے میں ایک فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں چاول کی فصل کے کل زیرِ کاشت رقبہ ۶۹۱۹۵۰۰۰ ایکڑ تھا۔ سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں یہ رقبہ ۶۹۹۸۲۰۰۰ ایکڑ تک پہنچ گیا۔

ہندوستان میں ۱۴۷۰۰۰ ریڈیو سٹ

دسمبر ۱۹۴۱ء میں ۱۴۰۴۱۶ ریڈیو لائسنس جاری ہوئے۔ اس کے مقابلے میں دسمبر ۱۹۴۰ء میں جاری شدہ لائسنسوں کی کل تعداد ۷۳۲۲ تھی۔ دسمبر ۱۹۴۱ء سے زیادہ ریڈیو لائسنس ہندوستان میں اور کسی ایک مہینے میں بھی تقسیم نہیں ہوئے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء کے بعد اکتوبر ۱۹۴۱ء کا نمبر ہے۔ اس مہینے میں ۱۴۵۱۳ لائسنس تقسیم کئے گئے

دسمبر ۱۹۴۱ء کا مہینہ ہندوستانی ریڈیو کی تاریخ میں ایک اور لحاظ سے بھی اہم ہے یعنی اس مہینے میں سب سے زیادہ ریڈیو لائسنسوں کی تجدید کرائی گئی۔ یہ تعداد ۱۰۸۲۶ تھی۔ اس مہینے میں نئے جاری شدہ لائسنسوں کی تعداد ۵۱۷۳ کو پہنچی۔

دسمبر ۱۹۴۱ء کے خاتمے پر ہندوستان میں جاری شدہ ریڈیو لائسنسوں کی کُل تعداد ۱۲۱۱۷۴ تھی۔ اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۴۰ء کے خاتمے پر ان کی کل تعداد صرف ۱۱۹۱۴۷ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سنہ ۱۹۴۱ء میں ۲۷۰۲۴ ریڈیو لائسنسوں کا اضافہ ہوا

حامد علی خاں

سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جو گانے کو ایک بیکار تفریح سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھتے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ کوئی تفریح بجائے خود بیکار نہیں ہوتی بلکہ اکثر تفریحات انسانی صحت پر اچھا اثر ڈالتی ہیں۔ اس سلسلے میں گانا نہایت مفید قسم کی تفریح ہے۔ صبح کے وقت گانا صحت کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دن کے باقی حصوں میں بھی جب وقت ملے گانا فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ بہت لوگوں کو یہ تو معلوم ہوگا کہ گہری سانسیں لینے کی ورزش بہترین ورزشوں میں سے ہے مگر یہ علم بہت کم لوگوں کو ہوگا کہ اس ورزش کا بہترین طریقہ گانا ہے۔ صحت حاصل کرنے کے لئے جب گایا جائے تو یہ ضروری ہے کہ پورے جذبے کے ساتھ گایا جائے۔ گانا دل میں زندگی کا ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔

بعض ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اکثر جسمانی اور روحانی بیماریوں کا سبب غلط طریقۂ تنفس ہے۔ اگر یہ درست ہے تو گانا صحت کے لئے بے حد مفید ہے کیونکہ یہ انسان کو صحیح طریقِ تنفس سکھاتا ہے۔

جو لوگ گا سکتے ہیں وہ ان لوگوں کے طرزِ عمل پر بہت حیران ہوتے ہیں جو اپنی اس قدرتی استعداد کو بڑھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ جب ہم اپنی دوسری صلاحیتوں کی ترقی چاہتے ہیں تو آخر آواز کی اصلاح کیوں نہ کی جائے۔ یہ درست ہے کہ ہر شخص اعلیٰ درجے کا گویا نہیں بن سکتا لیکن تاہم آواز کی قدرتی بھی تربیت ہو سکے اس کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ گانے کا مشغلہ نہ صرف بہت اچھی تفریح ہے بلکہ ایک مفیدِ صحت ورزش بھی ہے۔

دیہاتی کتب خانے

ہندوستانی ریاستوں کی پسماندگی اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ جب کسی ریاست میں ترقی کے کچھ آثار نظر آتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ کوچین کے وزیرِ اصلاحِ دیہات نے حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ ریاست کی حکومت دیہاتی کتب خانوں کے رواج کی خاص طور پر سرپرستی کرے گی۔

جبری ابتدائی تعلیم کے بہت سے حامی اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ دیہاتی لڑکوں کو مدرسے سے نکلنے کے بعد پڑھنے کے لئے کوئی کتاب نہیں ملتی۔ اور وہ بہت کم عرصے میں سب پڑھا لکھا بھول جاتے ہیں۔ جب نتیجہ یہ ہو تو پھر اس جبری تعلیم کو تضیعِ اوقات اور تضیعِ دولت کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی تعلیم جس کے اثرات مدرسہ چھوڑنے کے بعد مفقود ہو جائیں بیکار ہے۔ حامیانِ اصلاحِ دیہات کو جبری تعلیم کے ساتھ اس بات کا انتظام بھی کرنا چاہئے کہ فارغ التحصیل دیہاتی طلبہ بعد میں بھی تعلیمی ماحول میں رہ سکیں اور یوں نہ صرف اُن کی پڑھنے کی استعداد قائم رہے بلکہ ترقی کرے اور اُن کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا رہے تاکہ تعلیم کا اصل مقصد پورا ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ابتدائی تعلیم کے مراکز کے ساتھ آسان اور عام پسند کتابوں اخباروں اور رسالوں کی مفت بہم رسانی کا انتظام بھی ہونا چاہئے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دیہات میں عوام کے لئے کتب خانے اور مطالعہ خانے قائم کر دیئے جائیں۔

کوچین کے وزیر نے اپنی حکومت کے جس فیصلے کا اعلان کیا ہے وہ بہت قابلِ تعریف ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ کوچین کی دیہاتی رعایا حکومت کے اس فیصلے کی قدر و قیمت کو سمجھتی ہے اور پورے تعاون پر آمادہ ہے۔ کاش برطانوی ہندوستان اور دوسری ہندوستانی ریاستیں بھی اس معاملے میں کوچین کی تقلید کریں۔

ہندوستانی بائیسکل

ہندوستان کی تجارت "تحفظ" سے عموماً محروم رکھی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اب تک بائیسکل جیسی معمولی چیز بھی بنا کر بازار میں نہیں لا سکا۔ گزشتہ جنگ میں ہندوستان کی بعض مصنوعات کو قدرۃً تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان مصنوعات کی حد تک ہندوستان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا کپڑے اور جوتے کی تجارت اُسی زمانے میں چمکی تھی۔ موجودہ جنگ نے پھر ہندوستان کی تجارت کے لئے ویسا ہی تحفظ پیدا کر دیا ہے۔ اگر ہندوستان سرمائے سے اتنا محروم نہ ہوتا جتنا کہ ہے تو اب بہت زیادہ اشیاء کی تجارت ہندوستان کے ہاتھ میں آ سکتی تھی۔ بہرحال جو چند سرمایہ دار ہندوستان میں ہیں اُن کو اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

ہمیں مسرت ہے کہ بمبئی کے ایک بڑی ہی برادر نے موقع شناسی سے کام لے کر بمبئی میں "ہند سائیکلز لمیٹڈ" کے نام سے بائیسکلوں کا ایک کارخانہ کھول دیا ہے۔ اس کارخانے کی بائیسکلیں اب فروخت ہونے کے لئے تیار ہیں اور کالبادیوی کی تجارتی منڈی میں پہنچ گئی ہیں۔

[illegible] نئے طریقوں کے مطابق قائم کیا گیا ہے۔ اس بائیسکل کے تقریباً تمام پرزے بمبئی میں تیار ہوتے ہیں [illegible]

جہاں نما

مادام چیانگ کائی شیک اور ہندوستانی خواتین

۸ مارچ ۱۹۴۲ء کو چنکنگ میں عورتوں کا بین الاقوامی دن منایا گیا۔ اس موقع پر مادام چیانگ کائی شیک نے جو پیغام بھیجا اُس میں اُنھوں نے ہندوستانی عورتوں کا خاص طور پر ذکر کیا اور چینی عورتوں کو یقین دلایا کہ ہندوستانی عورتوں میں قوتِ عمل کی کمی نہیں اور اُن کی قوتِ برداشت قابلِ تعریف ہے۔

ہندوستان کے قیام کے دنوں میں مادام چیانگ کائی شیک نے "آل انڈیا وِمنز ایسوسی ایشن" کے اجلاس میں شرکت کی تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے چینی عورتوں کو بتایا کہ جب میں نے چینی عورتوں کے مصائب کا ذکر کیا تو بہت سی ہندوستانی عورتیں آبدیدہ ہو گئیں۔

اسی سلسلے میں مادام چیانگ کائی شیک نے ہندوستان کی بعض سربرآوردہ عورتوں کا ذکر کیا اور کہا:۔

میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں کہ میں مسز سروجنی نائیڈو، مسز وجیا لکشمی پنڈت اور بیگم شاہنواز سے ملی۔ ان میں سے ہر خاتون قابلِ تعریف اوصاف سے متصف اور بجائے خود نمایاں شخصیت کی مالک ہے۔ مسز نائیڈو ایک بہت بڑی کانگرسی رہنما ہیں۔ میں زندگی کے مسائل کے متعلق اُن کی گہری واقفیت سے بہت متاثر ہوئی۔ مسز پنڈت آل انڈیا وِمنز ایسوسی ایشن کی صدر اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی بہن ہیں۔ وہ ایک قابل، حسین اور ذی وقار خاتون ہیں۔ اُن میں وہ تمام نسوانی اوصاف موجود ہیں جن کی قدر کی جاتی ہے۔ بیگم شاہنواز ایک بڑی لیڈر ہیں اور جب میں اُن سے مصروفِ گفتگو تھی تو مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک خاتون جنرل سے باتیں کر رہی ہوں۔ انھوں نے کہا کہ پنجاب کی عورتوں کی خدمات پنجاب کے مردوں سے کسی طرح کم نہیں۔ ان چند عورتوں کے متعلق جو کچھ میں نے کہا ہے اُس سے آپ کو جدید ہندوستان کی عورتوں کی عمومیت کی قابلیت، ذہانت اور سیرت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہندوستانی خواتین جفاکش اور مستقل مزاج ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اگر انہیں موقع ملے تو وہ آزادی کی جد و جہد میں بہت مفید حصہ لے سکتی ہیں۔

ہوائی سفر کا مستقبل

مسٹر لیزلی رنسیمن ڈائرکٹر جنرل برطانی محکمۂ پرواز نے جو تھائی لینڈ سے بھاگ کر لندن پہنچے ہیں یہ اندازہ کیا ہے کہ مستقبلِ قریب میں ہوائی سفر کے وسائل کی ترقی برطانیہ سے دنیا کے اہم مقامات کے فاصلوں کو بہت گھٹا دے گی۔

مسٹر رنسیمن کا خیال ہے کہ آئندہ برطانیہ سے ہندوستان، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کا سفر علی الترتیب بیس، تیس اور پچاس گھنٹوں میں طے ہو سکے گا۔

برطانیہ سے ہندوستان کے راستے آسٹریلیا پہنچنے کے لئے ہوائی جہازوں کو قاہرہ، کراچی، کلکتہ، سنگاپور، ڈارون اور سڈنی کے مقامات پر ٹھہرنا ہوگا لیکن کسی جگہ دو گھنٹے سے زیادہ رُکنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

گاؤ اور صحت مند بن جاؤ

انسان کی بعض ذہنی خصوصیات اُس کی زندگی اور صحت کے قیام کے لئے ڈاکٹروں کے اندازے سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ بہت

فہرستِ مضامین

جلد ۴۱ — "ہمایوں" بابت ماہِ مئی ۱۹۴۲ء — نمبر ۵

[illegible]

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۳

قواعد

۱- "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔
مسودے کا نہایت صاف اور خوش خط ہونا مضامین کی قبولیت کی پہلی شرط ہے۔

۳- دِل آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۴- جواب طلب امُور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع
یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بصُورتِ دیگر دفتر "ہمایوں"
خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیئے جائیں گے۔

۵- "ہمایوں" کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ
جانی چاہیئے۔ اِس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ صرف قیمتہً مِل سکتا ہے۔

۶- منی آرڈر اور خط و کتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو چٹ پر پتے کے
اُوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہیئے۔ بصُورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی۔

۷- چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ۔

مینیجر "ہمایوں"

۲۳- لارنس روڈ لاہور

مطبوعات

فنِ شاعری: پروفیسر عزیز احمد صاحب ایم اے آنرز (لندن) استاد انگریزی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے اس نام سے ارسطو کی کتاب بوطیقا (Poetics) کا ترجمہ کیا ہے اور انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے اسے شائع کیا ہے۔ ارسطو کی یہ کتاب ادبی تنقید پر دنیا کی غالباً پہلی کتاب ہے یہ کتاب بلاشبہ دنیا بھر کے ادبی اور تنقیدی نظریوں پر اثر انداز ہوئی ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے نقادوں نے اس کتاب کی خوشہ چینی کی ہے۔ یورپ میں ادبی تنقید بہت ترقی کر چکی ہے لیکن آج بھی یہ کتاب ہر نقاد کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ پیشِ نظر ترجمہ بہت صاف سلیس اور بامحاورہ ہے۔ ابتدائی تینتیس صفحات عزیز احمد صاحب نے تمہید کے لئے وقف کئے ہیں جو بہت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ قیمت عہ انجمن ترقی اردو دہلی سے طلب کیجئے۔

تاریخِ بہمنی (منظوم): یہ کتاب ابوالفتح ضیاء الدین محمد المعروف بہ سید محمد حسین بن سید اشرف الحسینی کی فارسی تاریخ کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ مصنف نے پہلے پہل یہ ترجمہ نواب سالار جنگ کے عہدِ وزارت میں نواب خورشید جاہ کی سرپرستی میں شائع کیا تھا اب یہ دلچسپ تاریخی نظم انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے شائع کی ہے۔ قیمت عہ

انشائے داغ: حضرت احسن مارہروی (مرحوم) نے اپنے استاد حضرت داغ دہلوی کے خطوط کا یہ مجموعہ اپنی زندگی میں مرتب کیا تھا لیکن افسوس کہ انہیں خود اس کی اشاعت کا موقع نہ مل سکا۔ اب یہ کام انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے کیا ہے۔ ابتدا میں حضرت احسن کا فاضلانہ دیباچہ ہے اس کے بعد ۱۶۲ صفحات حضرت داغ کے خطوط کے لئے وقف ہیں۔ یہ خطوط نہ صرف اس لحاظ سے پڑھنے کے قابل ہیں کہ ان کا لکھنے والا اردو کا ایک بہت بڑا شاعر ہے اور ان سے اس کی زندگی اور سیرت کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی قابلِ مطالعہ ہیں کہ یہ تحریریں گوناگوں ادبی و لسانی معلومات کا مخزن بھی ہیں۔ خطوط کی ترتیب سے حضرت احسن مرحوم کا سلیقہ اور تجربہ نمایاں ہے اس کے علاوہ اکثر خطوط کے ساتھ حضرت احسن کے تشریحی حواشی نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہیں۔ قیمت عہ

دیوانِ جوشش: جوشش عظیم آباد کے مایہ ناز شاعروں میں سے ہیں۔ افسوس کہ اب تک اُن کا کلام چھپ نہ سکا تھا اب قاضی عبد الودود صاحب نے اُن کا دیوان ۱۶ صفحے کے ایک مفصل دیباچے کے ساتھ مرتب کیا ہے اور انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے اسے شائع کیا ہے۔ دیباچے کے علاوہ تقریباً پونے تین سو صفحات دیوان کے لئے وقف ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

کوئی اس غم کدے میں اپنی غم خواری نہیں کرتا — دیا ہے ایک کو دل وہ بھی دل داری نہیں کرتا
تجلی تیری یا رب برقِ عقل و ہوش ہے لیکن — مجھے تو روشناسِ شعلۂ ادراک کر دینا

قیمت عہ پتا انجمن ترقی اردو دہلی

علم الاقوام: یہ کتاب سر جرالف ایبرن فلیس نے انجمن ترقی اردو کی فرمائش پر لکھی تھی اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ علم الاقوام پر اس سے پہلے اردو یا کسی اور ہندوستانی زبان میں کوئی کتاب موجود نہیں۔ نہ صرف اس لحاظ سے بلکہ اپنی جامعیت اور کثرتِ معلومات کے لحاظ سے بھی زیرِ نظر کتاب بہت قابلِ قدر ہے۔ دوسری جلد میں ایک خاص حصہ ہندوستانی اقوام کے لئے وقف ہے۔ قیمت جلد اول عہ جلد دوم عہ۔ پتا: انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔

ہماری غذا: مصنفہ ڈاکٹر رابرٹ میکریسن سی۔ آئی۔ ای، ایم۔ ڈی، ڈی۔ ایس۔ سی، ایل ایل ڈی، آئی۔ ایم۔ ایس وغیرہ مترجمہ سید مبارز الدین احمد صاحب رفعت۔ بہ نظرِ ثانی ڈاکٹر غلام دستگیر صاحب نشتی فاضل ایم بی بی ایس رکن دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی۔ یہ کتاب ہر اس شخص کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے جو صحت کی قدر و قیمت سے واقف ہو۔ اردو میں علمِ غذا پر ایسی جامع اور فاضلانہ کتاب شائع کر کے انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے اہلِ ملک کی بہت مفید خدمت انجام دی ہے۔ قیمت عہ

ہماری قومی زبان: اردو زبان کے متعلق ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے خیالات کا یہ مجموعہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے شائع کیا ہے۔ تعصب کے اس دور میں جب اہلِ ملک کا ایک حصہ مشترک زبان کو چھوڑ کر ایک فرسودہ زبان کو اختیار کرنے پر زور دے رہا ہے سر تیج بہادر کے یہ خیالات اُن کی اصابتِ رائے اور بلند خیالی کی دلیل ہیں۔ امید ہے کہ ہر وہ شخص جو اردو زبان کے صحیح درجے سے واقف ہونا ضروری سمجھتا ہے اور جو زبان کے متعلق موجودہ متعصبانہ اور گمراہ کن خیالات سے اپنے دل کو پاک کرنا چاہتا ہے اس کتاب کا مطالعہ اپنا فرض سمجھے گا۔ قیمت ۸

حیوانی دنیا کے عجائبات: مولفہ پروفیسر عبد البصیر خاں صاحب شعبۂ حیوانیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ اس کتاب میں ہوا، پانی اور جنگل کے جانوروں کے متعلق بے حد دلچسپ معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اندازِ بیان اور زبان صاف اور سلیس ہے۔ بچوں اور بوڑھوں کے لئے یکساں مفید اور دلچسپ ہے۔ حجم ۱۵۰ صفحات۔ قیمت عا۔ پتا: انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔

سید عبد اللطیف پرنٹر پبلشر نے [illegible] پریس [illegible] لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں [illegible] لاہور سے شائع کیا۔

عشق کا حال بیسوا جانیں ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

[illegible]ں کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا ہمارے اکثر نوجوان شریف زادوں کے دل بہلانے کے لئے ایک طوائف سے آنکھیں چار کرنے کے بعد گری۔ اُن کے جنسی شعور نے ایک طوائف کی آغوش [illegible]ں آنکھیں کھولیں بیوی محض خاندان چلانے کا ذریعہ رہ گئی۔ لیکن اُن کی جذباتی دُنیا کی مالک طوائف بن گئی۔

عشق و محبت کا تعلق شاعری اور ادب سے ہے وہ ظاہر ہے خصوصاً ایسے دور میں جبکہ شاعری صرف نشاط اور تفریح کا ذریعہ تھی۔ وہی طوائف جو ہماری معاشرت میں ہمارے عشقیہ جذبات کی تنہا مالک بن چکی تھی ہمارے ادب کی بھی معشوق بن گئی۔ اگر آپ قدرے ادب کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے افسانوں، مثنویوں اور غزلوں کے معشوق میں طوائف کا کردار اور اُس کے خدوخال بخوبی نمایاں ہیں۔ معشوق کا ہرجائی پن اور بے وفائی، رقیبوں کا ہجوم، کبھی ظلم و ستم کبھی لگاوٹ کی باتیں، شوخی اور طراری، ناز و غمزے یہ ہو بہو ایک طوائف کی تصویر آنکھ کے سامنے لے آتی ہے۔ اکثر شاعر اور ادیب جو کچھ کہتے یا لکھتے تھے اس میں اسی معاشرت کا خاکہ نظر آتا ہے۔ آج کل کے پڑھنے والے اُن کے کلام پر اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ مبتذل، رکیک اور مخرب اخلاق ہے لیکن وہ اپنی نظر کافی دور تک نہیں لے جاتے کیونکہ یہ قصور شاعروں اور ادیبوں کا نہیں ہے بلکہ اس دور کی معاشرت کا ہے جس کے وہ نمائندہ تھے۔

طوائفوں کے ساتھ عشق و محبت کے جذبات وابستہ ہونے کی وجہ سے ہمارے ادب پر ایک اثر اور بھی پڑا۔ طوائف ظاہر ہے کہ ایک پیشہ ور عورت ہوتی ہے اُس سے پاک محبت کی اُمید کرنا حماقت ہے ایسی حالت میں محبت پر ہوس پرستی کا غالب آ جانا لازمی تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ہمارے ادب میں جس محبت کا ذکر ہے اُس پر جنسی رنگ غالب [illegible] پرچھائی ہوئی ہے محبت کی وہ نغمے جہاں دو دل ایک ذہنی اور جذباتی آویزش کی وجہ سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اس کے نغمے ہمارے ادب میں سنائی نہیں دیتے۔ ہماری عشقیہ شاعری زیادہ تر معاملہ بندی پر ختم ہو جاتی ہے اور چونکہ اس زمانے کی ساری کائنات عشقیہ شاعری ہی ہے لہذا ہمارے ادب میں ایسے شاہکار نہیں ملتے جن کو دوسری زبانوں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔

طوائفیں معاشرت کا یہ راز بھی بخوبی سمجھ گئی تھیں کہ کسی مرد کے دل پر ایک مدت تک قابو رکھنے کے لئے محض اس کی جنسی آسودگی ہی کافی نہیں بلکہ اس میں تہذیب، خوش سلیقگی، شیریں زبانی، حسن کی آرائش اور نشست و برخاست کے جملہ آداب کو کافی دخل رہتا ہے۔ لہذا اُن کی یہی کوشش رہتی تھی کہ وہ مردوں کے لئے محض سامانِ عشق ہی نہ ہوں بلکہ ایک حد تک ان کے واسطے نشاط اور تفریح کا سامان بھی مہیا کریں اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لئے انہیں اپنی تعلیم و تربیت کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔

مرزا محمد ہادی صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب "امراؤ جان ادا" میں جو کہ طوائف کی ہی سوانح عمری کہی جاتی ہے ان تمام باتوں کا ذکر ہے جو ایک طوائف کو سیکھنا پڑتی تھیں۔ رقص اور موسیقی میں تو وہ اتنی ماہر ہوتی تھیں کہ اس فن کو انہوں نے بالکل اپنا ہی لیا تھا۔ شعر و سخن سے بھی ذوق ہونا لازمی تھا۔ بعض طوائفیں اُس زمانے کے شاعروں میں بھی شریک ہوتی تھیں۔ پوشاک میں بھی تراش خراش ہی نکالتی تھیں اور اپنے وقت کے فیشن کی موجد ہوتی تھیں۔ خاص خاص طوائفوں تک ایسے ویسے آدمی کی رسائی آسان نہ تھی۔ جس طرح کہ برطانوی امراء کے لڑکے اپنی تعلیم پر جلا دینے کے لئے یورپ کی سیاحی کے لئے بھیجے جاتے تھے اُسی طرح ہمارے رئیس زادے آدابِ محفل سیکھنے کے لئے کسی مشہور طوائف کے سپرد کئے جاتے تھے۔ گویا ایک طوائف کا مکان تہذیب کا ادارہ تھا۔ خاندانی طوائفوں کی زبان ادبی اعتبار سے مستند سمجھی جاتی تھی۔ رئیسوں کے لئے جہاں ان ریاست برقرار رکھنے کے لئے گھوڑے گاڑی، مصاحب وغیرہ ضروری تھے وہاں کسی نہ کسی طوائف سے وابستگی بھی لازمی تھی۔ اس معاشرت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ادب میں تصنع اور تکلف حد سے زیادہ دخیل ہو گیا جس سے ادب بھی ایک طوائف بن کر رہ گیا۔ وہی ظاہری حسن، وہی آرائش اور نمائش، وہی حسین لباس لیکن فطری جذبات کی وہی کمی۔ ہمارے اشعار کے الفاظ حسین جملے چست اور بندشیں دلکش لیکن مصنوعی جذبات کے حامل اور بے روح۔

طوائفوں نے ہمارے چند مخصوص اصنافِ سخن کو رائج اور مقبول بنانے میں بھی بہت بڑا حصہ لیا۔ گزشتہ زمانے میں نہ تو اتنے تعلیم یافتہ لوگ تھے اور نہ اتنے اخبار اور رسالے [illegible] اور نہ [illegible] شعراء کی شہرت کا دار و مدار صرف مشاعروں کی کامیابی پر یا کسی مشہور خوش گلو طوائف کا ان کی غزل کسی صاحبِ ذوق شہزادہ یا رئیس کی محفل میں گا دینے پر تھا۔ شاعر اپنی معراج [illegible] اور حاصلِ زندگی یہی سمجھتا تھا کہ اس کی شہزادوں کے دربار تک رسائی ہو جائے تا کہ عمر بھر روٹیوں کا سہارا ہو جائے۔ نسیم لکھنوی کے بارے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ شاہزادے کے دربار میں ایک طوائف نے اُن کی غزل جس کا مطلع ہے ؎

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی کیا یہ دُنیا عاقبت بخشائے گی

گائی ہی تھی بادشاہ اس کو سن کر بہت محظوظ ہوئے اور پوچھا کہ نسیم کون ہیں اور اس طرح نسیم کا دربارِ اودھ میں پہلے پہل غائبانہ تعارف ہوا۔ ایسی صورت میں وہ اصنافِ سخن جن کو موسیقی سے خاص لگاؤ تھا زیادہ رائج اور مقبول ہو گئیں۔ غزل کا اور اصنافِ سخن سے مقبولیت میں اس قدر زیادہ بڑھ جانے کا بڑی حد تک راز یہی ہے کہ وہ گائی [illegible] [illegible] کا بھی ایک حد تک اثر تھا۔

[illegible] جس طرح شاہانِ اودھ کے زمانہ میں مرثیوں کے فروغ پانے میں طوائفوں کی سوز خوانی کا بھی ایک حد تک اثر تھا۔ [illegible]

محفلِ ادب

اُردو ادب پر طوائفوں کا اثر

گزشتہ دَور کے حالات اور واقعات تو تاریخ سے بخوبی معلوم ہو جاتے ہیں لیکن وہ واقعات کیوں رونما ہوئے، اور وہ کون سی باتیں تھیں جو پس پردہ اُن واقعات کی ذمہ دار تھیں، اُس کے لئے تاریخ کے صفحات کافی نہیں ہوتے۔ اور ہمیں اُس دور کے تمدن اور معاشرت کا بھی جائزہ لینا پڑتا ہے۔ ہمارے لئے اُس زمانہ کے ادب کا گہرا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور اگر ایک دَور کا ادب بغور دیکھا جائے تو اس زمانے کے لوگوں کے احساسات اور خیالات، اُن کی رسوم اور عقیدے، اُن کے ذہنی اور جذباتی رُجحانات سب کا عکس اور تصویر صاف اور نمایاں نظر آتی ہے۔ کیونکہ ادب کے لئے ناممکن ہے کہ وہ زندگی سے متاثر نہ ہو۔ کسی شاعر یا ادیب کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔ اس لئے یہ سمجھنے کے لئے کہ اردو ادب پر طوائفوں نے کیا اثر ڈالا ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ سمجھ لیں کہ ہماری معاشرت میں طوائفوں کی کیا جگہ تھی۔

قدرت نے جہاں عورت کو جسمانی اعتبار سے مرد سے کمزور بنایا ہے، وہاں اُسے حیات کی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک فوقیت بھی دی ہے۔ وہ اپنے جسم ہی کو ذریعۂ معاش بنا سکتی ہے، اور جہدِ زیست کی بازی میں ایسے داؤں پر لگا سکتی ہے۔ عورت کا اوّلین پیشہ یہی تھا اور آج بھی جب کہ عورت مرد کے بہت کچھ ہمدوش آگئی ہے، اُس کے لئے زیست کی مشکلوں کو آسان بنانے کا اس سے بہتر دوسرا طریقہ نہیں۔ مختلف ملکوں میں اس جسم فروشی کے طریقے مختلف ہیں، اور مختلف مذہبوں نے مختلف رسموں کے حسین لباس پہنا کر اور شادی کا پاک اور مقدس نام دے کر اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہر ملک میں آج بھی بہ کثرت ایسی عورتیں ہیں جو بغیر کوئی حسین نقاب پہنے ہوئے بالاعلان اپنا اوّلین پیشہ کر رہی ہیں۔ اکثر ملکوں کے جھوٹے اور مصنوعی تمدن نے انہیں معاشرت کا جزو قبول کرنے سے گریز کیا ہے لیکن ہندوستان کے جس دَور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت کی معاشرت میں اُن کی ایک اہم اور مستقل جگہ تھی۔

اُنیسویں صدی میں شمالی ہندوستان کے اُس حصّے میں جہاں اُردو رائج تھی مسلمانوں کا راج تھا، دہلی میں شاہانِ مُغلیہ تھے اور لکھنؤ میں شاہانِ اودھ۔ سیاسی اقتدار یا فوجی طاقت دونوں میں سے کسی کو نصیب نہ تھی، کیونکہ دونوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے باجگذار اور نمک خوار تھے۔ ایسی صورت میں جبکہ شاہی خزانے بھرے ہوئے تھے اور لوگوں کے پاس باپ داداؤں کی چھوڑی ہوئی دولت کافی تھی شہزادوں رئیسوں اور امیروں کا عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے سوائے دوسرا کام نہ تھا۔ روز نئے سامانِ نشاط اور تفریح کی ضرورت ہوتی تھی ایسی صورت میں اربابِ نشاط کی خاص قدر ہونا لازمی تھا۔ لیکن جس وجہ سے کہ وہ ہماری معاشرت پر چھائی ہوئی تھیں اس کی بنا محض امراکی عیاش مزاجی نہ تھی بلکہ پردہ کی رسم۔

پردہ ہندو اور مسلمان دونوں میں نہایت سختی سے رائج تھا۔ کسی رئیس شریف زادے کو اپنی ماں اور حقیقی بہن کو چھوڑ کر کسی اور عورت کو جو کہ خادمہ یا نیچ قوم نہ ہو دیکھنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ شادی حالانکہ صغیرسنی میں ہو جاتی تھی لیکن اس میں اُس کی پسند کا کوئی سوال نہ تھا، کیونکہ شادی کے بعد ہی بیوی کی صورت دیکھنا نصیب ہوتی تھی۔ شادی دراصل دو خاندانوں کے خوشگوار تعلقات کو مستحکم اور استوار بنانے کے لئے کی جاتی تھی نہ کہ دو دلوں کا تقاضا پورا کرنے کے لئے۔ یہی وجہ تھی کہ شادی کرنے والے افراد کی طبیعت، سِن، اخلاق یا رجحانات کا کوئی خیال نہ کیا جاتا تھا۔ اکثر خاوند اور بیوی کی عمر میں کافی فرق ہوتا تھا۔ شادی کے بعد بھی بیوی سے اختلاط برتنے کی اجازت نہ تھی۔ بڑوں کے سامنے خاوند کی مجال نہ تھی کہ بیوی سے ہنس کر بول سکے۔ بیوی کی قدم قدم پر نند بھاوجیں پاسبانی کرتی تھیں۔ اور اگر اس نے اشارةً یا کنایةً خاوند سے ملنے کا شوق ظاہر کیا تو وہ بے حیا قرار دی جاتی تھی۔ گویا ہماری معاشرت میں خاوند بیوی کا کسی کے سامنے ایک دوسرے سے کسی قسم کا اظہارِ محبت کرنا بُرا اور مذموم سمجھا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں نہ تو جوان لڑکا جس کے دل میں ہزاروں ارمان ہوتے تھے محبت کا کوئی مناسب تقاضا کر سکتا تھا اور نہ ایک رسم کی پابند اور سہمی ہوئی کم عمر نادان لڑکی اُس کا کوئی مناسب جواب دے سکتی تھی۔

لیکن انسانی فطرت کو نہ رسم تبدیل کر سکتی ہے اور نہ مذہب قید کر سکتا ہے۔ بھوک اور پیاس کو چھوڑ کر عشق انسان کی فطرت کا سب سے زبردست تقاضا ہے۔ کسی تندرست نوجوان کو محض ایک روحانی ہم آہنگی کا حسین خواب دکھا کر تسکین نہیں دی جا سکتی۔ ہماری معاشرتی فطرت کا صرف بیان تک یہ ہوا کہ اس نے عشق و محبت کے جنسی لوازم کو گھروں سے نکال دیا۔ اس نے ازدواج میں لذت اپنی بیویوں سے نہ پاکر ان باتوں کو حسن سے …

عشق کا حال بیسوا جانیں ——— ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا ہمارے اکثر نوجوان شریف زادوں کے دل پر پہلی کلی ایک طوائف سے آنکھیں چار کرنے کے بعد گری، اُن کے جنسی شعور نے ایک طوائف کی آغوش میں آنکھیں کھولیں، بیوی محض خاندان چلانے کا ذریعہ رہ گئی، لیکن اُن کی جذباتی دُنیا کی مالک طوائف بن گئی۔

عشق و محبت کا جو تعلق شاعری اور ادب سے ہے وہ ظاہر ہے خصوصاً ایسے دَور میں جبکہ شاعری صرف نشاط اور تفریح کا ذریعہ تھی۔ وہی طوائف جو ہماری معاشرت میں ہمارے عشقیہ جذبات کی تنہا مالک بن چکی تھی ہمارے ادب کی بھی معشوق بن گئی، اگر آپ غور سے ادب کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے افسانوں، مثنویوں اور غزلوں کے معشوق میں طوائف کا کردار اور اس کے خدوخال بہ خوبی نمایاں ہیں۔ معشوق کا ہرجائی پن اور بے وفائی، رقیبوں کا ہجوم، کبھی ظلم و ستم، کبھی لگاوٹ کی باتیں، شوخی اور طراری، ناز و غمزے یہ ہو بہو ایک طوائف کی تصویر آنکھ کے سامنے لے آتا ہے۔ اکثر شاعر اور ادیب جو کچھ کہتے یا لکھتے تھے اس میں اسی معاشرت کا خاکا نظر آتا ہے۔ آج کل کے پڑھنے والے ان کے کلام پر اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ مبتذل، رکیک اور مخرب اخلاق ہے لیکن وہ اپنی نظر کافی دور تک نہیں لے جاتے کیونکہ یہ قصور شاعروں اور ادیبوں کا نہیں ہے بلکہ اس دَور کی معاشرت کا ہے جس کے وہ پروردہ تھے۔ طوائفوں کے ساتھ عشق و محبت کے جذبات وابستہ ہونے کی وجہ سے ہمارے ادب پر ایک اثر اور بھی پڑا۔ طوائف ظاہر ہے کہ ایک پیشہ ور عورت ہوتی ہے اُس سے پاک محبت کی اُمید کرنا حماقت ہے ایسی حالت میں محبت پر ہوس پرستی کا غالب آجانا لازمی تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہمارے ادب میں جس محبت کا ذکر ہے اُس میں جنسی ترغیب و نفسانیت چھائی ہوئی ہے محبت کی وہ نفسیں جہاں دو دل ایک ذہنی اور جذباتی آویزش کی وجہ سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اس کے نغمے ہمارے ادب میں سنائی نہیں دیتے۔ ہماری عشقیہ شاعری زیادہ تر معاملہ بندی پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ اس زمانے کی ساری کائنات عشقیہ شاعری ہی ہے لہذا ہمارے ادب میں ایسے شاہکار نہیں ملتے جن کو دوسری زبانوں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔

طوائفیں معاشرت کا یہ راز بھی بخوبی سمجھ گئی تھیں کہ کسی مرد کے دل پر ایک مدت تک قابو پائے رکھنے کے لئے محض اس کی جنسی آسودگی ہی کافی نہیں بلکہ اس میں تہذیب، خوش سلیقگی، شیریں زبانی، حسن کی آرائش اور نشست و برخاست کے جملہ آداب کو کافی دخل رہتا ہے لہذا اُن کی یہی کوشش رہتی تھی کہ وہ مردوں کے لئے محض سامان عشق ہی نہ ہوں بلکہ ایک حد تک ان کے واسطے نشاط اور تفریح کا سامان بھی مہیا کریں اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لئے انہیں اپنی تعلیم و تربیت کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ مرزا محمد ہادی صاحب رسوا کی معرکۃ الآرا کتاب "امراؤ جان ادا" میں جو کہ طوائف کی ہی سوانح عمری کہی جاتی ہے اِن تمام باتوں کا ذکر ہے جو ایک طوائف کو سیکھنا پڑتی تھیں۔ رقص اور موسیقی میں تو وہ اتنی ماہر ہوتی تھیں کہ اس فن کو انہوں نے بالکل اپنا ہی لیا تھا۔ شعر و سخن سے بھی ذوق ہونا لازمی تھا۔ بعض طوائفیں اُس زمانے کے شاعروں میں بھی شمار ہوتی تھیں۔ پوشاک میں بھی تراش خراش ہی نکالتی تھیں اور اپنے وقت کے فیشن کی موجد ہوتی تھیں خاص خاص طوائفوں تک ایسے ویسے آدمی کی رسائی آسان نہ تھی۔ جس طرح کہ برطانوی اُمراء کے لڑکے اپنی تعلیم پر جلا دینے کے لئے یورپ کی سیاحی کے لئے بھیجے جاتے تھے اُسی طرح ہمارے رئیس زادے آداب محفل سیکھنے کے لئے کسی مشہور طوائف کے سپرد کئے جاتے تھے۔ گویا ایک طوائف کا مکان تہذیب کا ادارہ تھا۔ خاندانی طوائفوں کی زبان ادبی اعتبار سے مستند سمجھی جاتی تھی رئیسوں کے لئے جہاں شان ریاست برقرار رکھنے کے لئے گھوڑے گاڑی مصاحب وغیرہ ضروری تھے وہاں کسی نہ کسی طوائف سے وابستگی بھی لازمی تھی اس معاشرت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے ادب میں تصنع اور تکلف حد سے زیادہ دخیل ہو گیا جس سے ادب بھی ایک طوائف بن کر رہ گیا۔ وہی ظاہری حسن، وہی آرائش اور نمائش، وہی حسین لباس، لیکن فطری جذبات کی وہی کمی۔ ہمارے اشعار کے الفاظ حسین جملے چست اور بندشیں دلکش لیکن مصنوعی جذبات کے حامل اور بے روح۔

طوائفوں نے ہمارے چند مخصوص اصناف سخن کو رائج اور مقبول بنانے میں بھی بہت بڑا حصہ لیا۔ اگرچہ اس زمانے میں نہ تو اتنے تعلیم یافتہ لوگ تھے اور نہ اتنے اخبار اور رسالے نہ [illegible] تھیں اور نہ ریڈیو، شعر کی شہرت کا دار و مدار صرف مشاعروں کی کامیابی پر یا کسی مشہور خوش گلو طوائف کا ان کی غزل کسی صاحب ذوق شہزادہ یا رئیس کی محفل میں گا دینے پر تھا۔ شاعر اپنی معراج شہرت اور حاصل زندگی یہی سمجھتا تھا کہ اس کی شہزادوں کے دربار تک رسائی ہو جائے تاکہ عمر بھر روٹیوں کا سہارا ہو جائے۔ نسیم لکھنوی کے بارے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ شاہ اودھ کے دربار میں ایک طوائف اُن کی غزل جس کا مطلع ہے ؎

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی ——— کیا یہ دُنیا عاقبت بخشائے گی

گا رہی تھی بادشاہ اس کو سن کر بہت محظوظ ہوئے اور پوچھا کہ نسیم کون ہیں اور اس طرح نسیم کا سارے دربار اودھ میں پہلے پہل غائبانہ تعارف ہوا۔ ایسی صورت میں وہ اصناف سخن جن کو موسیقی سے خاص لگاؤ تھا زیادہ رائج اور مقبول ہو گئیں۔ غزل کا اور اصناف سخن سے مقبولیت میں اس قدر زیادہ بڑھ جانے کا بڑی حد تک راز یہی ہے کہ وہ گانے کے [illegible] تھی۔

نیز سب سے زیادہ لکھنؤ ہی کی طرح شاہان اودھ کے زمانہ میں مرثیوں کے فروغ پانے میں طوائفوں کی سوز خوانی کا بھی ایک حد تک اثر تھا۔ گو اس کی اصل وجہ شاہان اودھ اور ان کے درباریوں کا مذہب شیعہ تھا لیکن جو خاص صنف سخن اس معاشرت کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی ریختی ہے۔ ریختی دراصل ایک طوائف کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرتی ہے اور غالباً ایک طوائف [illegible] اس صنف سخن کے [illegible] نے تصویروں کے ذریعے [illegible] کرنے کی کوشش کی ہے [illegible] کے سامنے ایک نیم [illegible]

محفلِ ادب

اُردو ادب پر طوائفوں کا اثر

گزشتہ دَور کے حالات اور واقعات تو تاریخ سے بخوبی معلوم ہو جاتے ہیں لیکن وہ واقعات کیوں رونما ہوئے، اور وہ کون سی باتیں تھیں جو پس پردہ اُن واقعات کی ذمہ دار تھیں، اُس کے لئے تاریخ کے صفحات کافی نہیں ہوتے۔ اور ہمیں اُس دور کے تمدّن اور معاشرت کا بھی جائزہ لینا پڑتا ہے۔ ہمارے لئے اُس زمانہ کے ادب کا گہرا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور اگر ایک دَور کا ادب بغور دیکھا جائے تو اس زمانے کے لوگوں کے احساسات اور خیالات، اُن کی رسوم اور عقیدے اُن کے ذہنی اور جذباتی رُجحانات سب کا عکس اور تصویر صاف اور نمایاں نظر آتی ہے۔ کیونکہ ادب کے لئے ناممکن ہے کہ وہ زندگی سے متاثر نہ ہو۔ کسی شاعر یا ادیب کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بالکل علیٰحدہ ہو جائے۔ اس لئے یہ سمجھنے کے لئے کہ اُردو ادب پر طوائفوں نے کیا اثر ڈالا ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ سمجھ لیں کہ ہماری معاشرت میں طوائفوں کی کیا جگہ تھی۔

قدرت نے جہاں عورت کو جسمانی اعتبار سے مرد سے کمزور بنایا ہے، وہاں اُسے حیات کی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک فوقیت بھی دی ہے وہ اپنے جسم ہی کو ذریعۂ معاش بنا سکتی ہے، اور جہدِ زیست کی بازی میں اسے داؤں پر لگا سکتی ہے۔ عورت کا اوّلین پیشہ یہی تھا اور آج بھی جب کہ عورت مرد کے بہت کچھ ہمدوش آگئی ہے اُس کے لئے زیست کی مشکلوں کو آسان بنانے کا اس سے بہتر دوسرا طریقہ نہیں۔ مختلف ملکوں میں اس جسم فروشی کے طریقے مختلف ہیں، اور مختلف مذہبوں نے مختلف رسموں کے حسین لباس پہنا کر اور شادی کا پاک اور مقدس نام دے کر اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہر ملک میں آج بھی بہ کثرت ایسی عورتیں ہیں جو بغیر کوئی حسین نقاب پہنے ہوئے بالاعلان اپنا اوّلین پیشہ کر رہی ہیں۔ اکثر ملکوں کے جھوٹے اور مصنوعی تمدّن نے انہیں معاشرت کا جزو اقبال کرنے سے گریز کیا ہے لیکن ہندوستان کے جس دَور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت کی معاشرت میں اُن کی ایک اہم اور مستقل جگہ تھی۔

اُنیسویں صدی میں شمالی ہندوستان کے اُس حصّہ میں جہاں اُردو رائج تھی مسلمانوں کا راج تھا۔ دہلی میں شاہانِ مُغلیہ تھے اور لکھنؤ میں شاہانِ اودھ سیاسی اقتدار یا فوجی طاقت دونوں میں سے کسی کو نصیب نہ تھی۔ کیونکہ دونوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے باجگذار اور نمک خوار تھے۔ ایسی صورت میں جبکہ شاہی خزانے بھرے ہوئے تھے اور لوگوں کے پاس باپ داداؤں کی چھوڑی ہوئی دولت کافی تھی شہزادوں رئیسوں اور امیروں کا عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے سوائے دوسرا کام نہ تھا۔ روز نئے سامانِ نشاط اور تفریح کی ضرورت ہوتی تھی ایسی صورت میں اربابِ نشاط کی خاص قدر ہونا لازمی تھا۔ لیکن جس وجہ سے وہ ہماری معاشرت پر چھائی ہوئی تھیں اس کی بنا محض امرا کی عیاش مزاجی نہ تھی بلکہ پردہ کی رسم۔

پردہ ہندو اور مسلمان دونوں میں نہایت سختی سے رائج تھا۔ کسی رئیس شریف زادے کو اپنی ماں اور حقیقی بہن کو چھوڑ کر کسی اور عورت کو جو کہ خادمہ یا ... قوم نہ ہو دیکھنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ شادی حالانکہ صغیر سنی میں ہو جاتی تھی لیکن اس میں اُس کی پسند کا کوئی سوال نہ تھا، کیونکہ شادی کے بعد ہی بیوی کی صورت ... نصیب ہوتی تھی۔ شادی دراصل دو خاندانوں کے خوشگوار تعلقات کو مستحکم اور استوار بنانے کے لئے کی جاتی تھی نہ کہ دو دلوں کا تقاضا پورا کرنے کے لئے۔ یہی تھی کہ شادی کرنے والے افراد کی طبیعت، سِن، اخلاق یا رجحانات کا کوئی خیال نہ کیا جاتا تھا۔ اکثر خاوند اور بیوی کی عمر میں کافی فرق ہوتا تھا۔ شادی کے بعد بھی ... سے اختلاط بڑھنے کی اجازت نہ تھی، بڑوں کے سامنے خاوند کی مجال نہ تھی کہ بیوی سے ہنس کر بول سکے بیوی کی قدم قدم پر نند بھاوجیں پاسبانی کرتی تھیں۔ اور اگر ... نے اشارۃً یا کنایۃً خاوند سے ملنے کا شوق ظاہر کیا تو وہ بےحیا قرار دی جاتی تھی۔ گویا ہماری معاشرت میں خاوند بیوی کا کسی کے سامنے ایک دوسرے سے کسی قسم کا اظہارِ محبت کرنا بُرا اور مذموم سمجھا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں نہ تو جوان لڑکا جس کے دل میں ہزاروں ارمان ہوتے تھے محبت کا کوئی مناسب تقاضا کر سکتا تھا ... ایک رسم کی پابند اور سہمی ہوئی کم عمر نادان لڑکی اُس کا کوئی مناسب جواب دے سکتی تھی۔

لیکن انسانی فطرت کو نہ رسم تبدیل کر سکتی ہے اور نہ مذہب قید کر سکتا ہے بھوک اور پیاس کو چھوڑ کر عشق انسان کی فطرت کا سب سے زبردست تقاضا ہے کسی تندرست نوجوان کو محض ایک روحانی ہم آہنگی کا حسین خواب دکھا کر تسکین نہیں دی جا سکتی ہماری سماج کا خلافِ فطرت بیا ... یہاں تک کا ہوا کہ جس نے عشق و محبت کے جنسی لوازم کو گھروں سے نکال دیا اُس نے بازاروں میں نشوونما پائی بیویاں لے ... اِن باتوں کو جن سے خواہشات مشتعل ہوتی ہیں ترک کر دیا انہوں نے کوشش کی کہ وہ بیبیاں بن جائیں، وہ فطرت سے اپنے بارے میں کنے لگیں

اصغر کی یاد میں

تقریباً دو مہینے ہوئے اصغر کی امی نے کہا بہتر ہے کہ اصغر کی نظموں کا مجموعہ ہی چھاپ دیا جائے۔ ادھر میں پونے دو سال سے اس بات کا خواہش مند رہا کہ اصغر کی سوانح عمری لکھوں لیکن اُن وجوہ سے جن کا بار بار ذکر کرنا بہت تکلیف دہ ہے ایسا نہ کر سکا۔ میں نے کہا یہ تو معمولی بات ہے، پندرہ سولہ انگریزی کی نظمیں ہیں، ان پر دو تین صفحے تو دیباچے کے طور پر دو ایک دن میں ہی لکھ لوں گا اور یہ شائع کر دی جائیں گی، آخر صرف عزیزوں اور چند دوستوں کے حلقے میں ان کی اشاعت ہو گی اور بس! اصغر کی کتابوں میں سے ایک کتاب Poems of [illegible] Mind Own میرے پاس تھی، میں نے اُٹھا کر اُس کا پہلا صفحہ پڑھا تو خیال آیا کہ قلم برداشتہ کچھ لکھنے سے پہلے ذرا پھر اصغر کے کاغذات پر ایک نظر تو دوڑا لوں، وہ حالات جن میں یہ نظمیں لکھی گئیں انہیں پھر دیکھ لوں اور یاد کر لوں!

اس یاد نے دامن پکڑ لیا۔ میں نے دو چار ورق اُلٹے دو چار کاپیاں دیکھیں دو چار چیزوں پر نگاہ ڈالی لیکن ایک چیز دوسری چیز کی طرف لے گئی، ایک چیز دوسری سے زیادہ اہم اور کم از کم اپنی جگہ انوکھی نظر آئی۔ اور پھر میرے لئے ایک ایک فقرہ ذرا سی چیز انتہا درجہ دلچسپ دلسوز اور بے پناہ ثابت ہوئی۔

اس جانکاہ مشغلے کا تعجب ہے کہ ایک پہلو نہایت حیات بخش نکلا۔ میں نے اصغر کی تمام چیزوں کتابوں کاپیوں کاغذات اور خطوط وغیرہ کو لیا، اُس کی تمام تصنیفات اور مکتوبات کو گہری نظر سے دیکھا۔ ان کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے میں نے ایک چھوٹی سی کاپی میں اُس کی مختصر زندگی کا ایک نقشۂ واقعات بنانا شروع کیا اور سنہ وار ان واقعات کو قلم بند کیا۔ بالخصوص اُس کی انگلستان کی زندگی کو میں نے اُس کے خطوط کے ذریعے سے اور اُس کے تین چار مہینے کے روزنامچوں کی مدد سے گویا اس طرح مرتب کر لیا کہ وہ مجھے چلتا پھرتا نظر آنے لگا۔ پونے دو سال کی خاموشی کے بعد وہ گویا پھر بولنے تقریر کرنے بحث کرنے مسکرانے اور ہنسنے کھیلنے لگا۔ اُس کی موت نے میری آنکھوں کے سامنے زندگی کا لباس پہن لیا۔ کچھ ایسا معلوم ہوا گویا ہم نے خود ہی اُس کی کتابِ حیات کو تہ کر کے رکھ دیا تھا، اب جو اسے کھولا تو وہ کھلتی گئی اُس کے صفحے صفحے پر جیتی جاگتی تصویریں گویا بولنے اور مسکرانے لگیں۔ موت نے اُس کی زندگی کو ختم کیا نہ کیا ہم نے اُسے ختم شدہ سمجھ کر بالکل مُردہ کر دیا۔ اب جو اُسے بلایا تو وہ بولی، اُسے ہلایا تو وہ ہلی، اُس میں اتنی جان پڑ گئی کہ کئی جانداروں میں اُس سے آدھی بھی نہیں ہوتی۔ سچ ہے جو ایک بار جیئے یا جی اُٹھے اُسے موت بھی مُردہ نہیں کر سکتی، اُس کی زندگی فنا بھی ہو جائے تو فنا نہیں ہو سکتی، وہ زندہ ہے ہمیشہ زندہ، وہ خود رُکتا ہے تو دوسرے کو حرکت میں لے آتا ہے، وہ وقت کے گزرے ہوئے لمحے کی مانند ہے جس کے بل پر گزرنے والے اور آنے والے لمحات کا انحصار ہے، کل سے آج پیدا ہوا اور آج سے پھر کل پیدا ہو گا، "تھا" نہ ہوتا تو "ہے" ہیچ تھا اور "ہو گا" فضول! یہی حال مرنے والوں کا ہے اور پھر بعض بعض مرنے والے تو ایسے ہو گزرے ہیں کہ ایک زمانہ گزرنے پر بھی لاکھوں زندہ لوگوں سے ہزار گنا بڑھ چڑھ کر زندہ و تابندہ ہیں!

کم از کم ہمارے لئے یعنی اُن سب کے لئے جو اصغر کو جانتے تھے جو اسے اچھی طرح سمجھتے تھے وہ مر نہیں سکتا، وہ آیا جیا اور چلا گیا لیکن وہ جی گیا بہت کچھ تھوڑی سی زندگی میں! اگر ہم اُس کے ساتھ انصاف کریں انسان کے ساتھ زندگی کے ساتھ قانونِ قدرت کے ساتھ انصاف کریں تو باوجود ہزار رنج و غم کے باوجود اُس ٹیس کے اُس چبھن کے اُن نمگین تیروں کی بارش کے جو ایک محبت کرنے والے دل کو ہمیشہ اپنا نشانہ بناتے ہیں باوجود ان ہزار آفتوں کے ناممکن ہے کہ اگر ہم دیانت داری اور حقیقت بینی سے کام لیں تو ہمیں ایک ایسی دلکش ہستی کے مرنے پیچھے بھی اُس کی یاد سے دلی خوشی محسوس نہ ہو۔ کیا کوئی سچا دل محسوس کر سکتا ہے اس گناہ گارانہ بات کا اظہار کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اگر اسے اتنا جلد مرنا تھا تو بہتر تھا کہ وہ پیدا ہی نہ ہوتا! ہرگز نہیں، بعض پھول جلد مرجھانے کے لئے ہوتے ہیں بعض پیاری کلیاں کھلنے سے بہت پہلے ہی کملا جاتی ہیں اور کیوں نہ کملائیں! اس دنیا کی ہوا اُن کی بہار کو برداشت نہیں کر سکتی، آنکھیں دیر تک اُن کے وجود کی تاب نہیں لا سکتیں پھر کیا قصور ہے نہ دنیا والوں کی آنکھیں ہی چندھیا جاتیں کائنات خود لپک کر اُس انوکھے وجود کو جلد اپنے پہلو میں چھپا لیتی ہے۔ اصغر ایک ایسا جلد چھپنے والا ستارہ تھا۔ ستارہ چھپ گیا لیکن جن آنکھوں نے اُسے دیکھا اُن میں ابھی روشنی باقی ہے!

بشیر احمد

ایک نامعلوم قوت کی ہیں بزم آرائیاں — مہر و مہ کے آشیا نے یہ ستاروں کے محل
آدمی کا تجربہ خود ہے فریبِ وہم و ہوش — کون کہہ سکتا ہے ہر قانونِ فطرت کو اٹل
عقلِ اوّل، علت و معلول، جوہر اور عرض — چند لفظوں سے کیا میں نے مسائل کو ہے حل
کس قدر محکم ہے میری قوتِ نقد و نظر — زندگی تو زندگی ہے، کانپ جاتی ہے اجل

فلسفی ہی صرف بن سکتا ہے دُنیا کا امام
ہے یہی منشاء ابد کا اور تقدیرِ ازل

شاعر:—

میرا اِک اک شعر ہے، نغمہ گر و نغمہ نواز — میں اگر چاہوں تو بج سکتے نہیں چنگ و رباب
وہ مصوّر جس کی دُنیا پھول، پتّوں کے نقوش — وہ سمجھ سکتا نہیں بے تابیٔ رُوحِ گلاب
فلسفی اسباب کی ہے بحث میں اُلجھا ہُوا — اُس کے ذہن و فکر کی منزل ہے دیوانے کا خواب
سینۂ گیتی کی دھڑکن مجھ کو دیتی ہے پیام — رُوحِ مستقبل کی لرزش مجھ سے کرتی ہے خطاب
نبضِ ہستی پر ہیں میری انگلیاں رکھی ہوئی — گرمیٔ دل سے مری قائم ہے دُنیا کا شباب
مجھ کو کرتے ہیں اشارے شعر کہنے کے لئے — ڈوبنے والے ستارے، ٹوٹنے والے حباب
کیا کہوں، کس سے کہوں، کیونکر کہوں اے ہم نشیں! — میری چشمِ شوق نے دیکھا ہے کس کو بے نقاب!

سچ کہا ہے "شاعری جزویست از پیغمبری"
میری فطرت پر ہوئی نازل محبت کی کتاب

[فضا میں پُر جلال لرزش پیدا ہوتی ہے]

صوتِ سرمدی:—

کیا یہاں آتے ہو تم زور آزمائی کے لئے — خود فروشی، خود فریبی، خودستائی کے لئے
شعر، نغمہ، فلسفہ اور صنعتِ صورت گری — صرف ہوتے ہیں جہاں میں خودنمائی کے لئے
اِس جہاں کے اہلِ دانش اور اربابِ ہنر — جھوٹ کا پربت بنا دیتے ہیں رائی کے لئے
دانشِ علم و ہنر کی سعیٔ پیہم کا مآل — یا بُرائی کے لئے ہے یا کمائی کے لئے
صرف تقویٰ ہے ترازِ و عظمتِ کردار کی — ہے یہی معیار انساں کی بڑائی کے لئے
آپ اپنے "آرٹ"، کو تکلیفِ آرائش نہ دیں — ہم بہت کافی ہیں اِس اپنی خدائی کے لئے

آدمی بارِ خدائی کو اُٹھا سکتے نہیں
بُلبلے، ساکن سفینے کو چلا سکتے نہیں

آواز سُننے کے بعد:—

[مُغنّی، مُصوّر، فلسفی اور شاعر بے اختیار سجدے میں گر جاتے ہیں]

ہوش سے جاتے رہے، چلتی زبانیں رُک گئیں
آرٹ کی نازک جبینیں بہرِ سجدہ جُھک گئیں

ماہر القادری

دانش وہنر کی بزمِ مشورت

مُغنّی:—

جب یہاں کچھ بھی نہ تھا اُس وقت بھی موجود تھی ۔۔۔ روحِ موسیقی جسے انجیل کہتی ہے کلام[1]
شہپرِ جبریل کی پرواز میں نغمہ ہے بند ۔۔۔ لوگ سمجھے ہی نہیں، اب تک مغنی کا مقام
وہ صدائیں آج بھی دیباچۂ اخلاق ہیں ۔۔۔ جن سے نکلا "اَشرَقَ البَدرُ علینا"[2] کا پیام
دستِ ماضی میں ہے سازِ ابتدا دانتھا ۔۔۔ کاش مُڑ کر دیکھ سکتے رہ روانِ تیز گام
دل میں جذب و سوز کا طوفان ہونا چاہیئے ۔۔۔ ساز کی گت پر بھی ہو سکتی ہیں تیغیں بے نیام
"نے" کو سُن کر "پیرِ رومیؒ پردۂ محمل گرفت"[3] ۔۔۔ بو علی بیٹھا ہُوا سوچا کیا، علم کلام
جو نہ آئے وجد میں دولاب[4] کی آواز پر ۔۔۔ ایسے کافر دل پہ ہے واللہ موسیقی حرام

صورِ اسرافیل میں ہے زندگی بھی موت بھی
سازِ ہستی کے ہیں دو پردے "تمام و ناتمام"

مُصوّر:—

پیکرِ آدم بنایا کس نے آب و خاک سے ۔۔۔ میں یہ کہتا ہوں کہ قدرت خود ہے پہلا بُت تراش
"اَحسنِ تقویم"[5] کے سانچے میں ڈھل کر آدمی ۔۔۔ بن گیا قدسی صفت، شبنم فشان و برق پاش
"پھول کانٹے، بلبل و طاؤس و قمری، زاغ و چرغ ۔۔۔ یہ جہاں ہے خوب اور ناخوب تصویروں کا تاش
ڈال سکتی ہے مری صنعت گری ہر شے میں جاں ۔۔۔ شمع کا اشکِ چکیدہ ہو کہ پروانے کی لاش
دم بخود ہیں سب مرے موئے قلم کے سامنے ۔۔۔ خوشۂ انگور ہو یا سیبِ ایرانی کی قاش
یہ جہاں، نقّاشِ فطرت کا ہے وہ نقشِ عجیب ۔۔۔ راز تھا جس کو کیا ذوقِ خود آرائی نے فاش
حسن کی رنگینیوں سے سلب کر سکتا ہے رُوح ۔۔۔ میری نازک انگلیوں کا اِک ذرا سا ارتعاش

میں کہ نقّاشِ ازل کا رازدارِ خاص ہوں
میرے رُتبے کو سمجھ سکتا کوئی دُنیا میں کاش

فلسفی:—

میں نے غور و فکر سے کھولے ہیں وہ عقدے تمام ۔۔۔ منحصر ہے جن پہ یہ دُنیائے اسباب و علل
اُس جگہ ہے توسنِ تخئیل میرا گرم رو ۔۔۔ جس جگہ تقدیر کے بازو بھی ہو جاتے ہیں شل
مجھ سے پوچھو کس طرح پیدا ہوئی ہے کائنات ۔۔۔ بزمِ ہستی "جنبشِ اوّل"[6] کا ہے ردِّ عمل

---

[1] مُقدس انجیل کی مشہور آیت۔ [2] جب حضرت پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے تو مدینہ میں داخل ہوتے وقت آپ کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا، مدینہ کی معصوم کمسن لڑکیاں ترانہ گا رہی تھیں۔
اشرق البدرُ علینا۔ من ثنیاتِ الوداع۔ وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر چاند نکلا ہے۔
[3] مثنوی مولانا روم کا پہلا شعر بشنو از نے چوں حکایت می کند۔ از جدائی ہا شکایت می کند [4] کسانیکہ ایزد پرستی کنند۔ بر آوازِ دولاب مستی کنند۔
[5] لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (قرآن پاک) [6] First Motion

سکون وحضورِ قلب کا مضحکہ اُڑ وائے! تعلیم و تربیت کا تو سامان ہی کیا ہوتا ہے اور تعلیم، وہ بھی موجودہ تعلیم؟
اُف اس کا دل اُٹھتے بیٹھتے پکار پکار کر کہتا ہے کہ ع

من نکردم شما حذر بکنید!

کلرک کی زندگی کے بہترین دن تالاب کے مینڈک کی طرح دفتر کی چار دیواری میں بسر ہوتے ہیں، اسی لئے جب وہ بے چارہ باہر کی دُنیا میں آتا ہے تو غضب کا معصوم انجان، مظلوم ومسکین سا نظر آتا ہے۔ نظر کیا آتا ہے اس کی حالت ہوتی ہی ایسی ہے۔ ملک میں کچھ ہی ہوا کرے اس کی بلا سے۔ سماج میں نہ اس کی کوئی جگہ نہ اس کی کوئی آواز۔ اس کا وجود بیرونِ دفتر نہ کسی شمار میں نہ قطار میں۔ وہ تو جب داخلِ دفتر ہوتا ہے تو صبح ہوتی ہے اور جب وہاں سے نکلتا ہے تو شام، بلکہ شاید یوں کہئے کہ اس کے دفتر جانے کے لئے سویرا ہوتا ہے اور اس کے گھر لوٹنے کے لئے اندھیرا!

آخر گردشِ لیل ونہار کلرک کی پچپنویں سالگرہ کی شام بھی لے آتی ہے جب یہ امن پسند سپاہی، جسے نہ زندگی میں کوئی خراجِ تحسین دیتا ہے اور نہ مرنے پر فہرستِ مجروحین ومقتولین میں نام آنے کی نوبت آتی ہے، تھک کر اپنے ہتھیار ہاتھ سے دھر دیتا ہے اور جب دن ڈگڈگیوں رہ جاتا ہے تو دنیا دیکھتی ہے کہ ایک ضعیف جس کے سر پر ملبا خیر سحر بکھری ہوئی ہے، جس کی آنکھیں مفلس کے چراغ کی طرح بجھی بجھی سی نظر آتی ہیں، اُسی بڑے صاحب کے دفتر کی عمارت سے لڑکھڑاتا ڈگمگاتا ہوا نکل رہا ہے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں ایک کاغذ ہے، دوسرا ہاتھ رعشہ براندام اُس ہار سے کھیل رہا ہے جو اس کے گلے میں کسی ستم ظریف نے ہنگامِ رخصت ڈال دیا ہے۔ وہ ہار کے پھولوں کی تازگی پر تبسم کی سعیٔ نامشکور کرتا ایسا سنجیدہ چلا آ رہا ہے جیسے کوئی غم نصیب کسی چہیتے کی میّت کو کاندھا دیتا چلے۔ کیا خبر یہ اس کے رنگین خوابوں اور خوں گشتہ تمناؤں اور خاک شدہ آرزوؤں ہی کا جنازہ ہو جسے وہ خود تنِ تنہا لئے جا رہا ہو!

سامنے سڑک پر کالج کے طلبہ کے مشاعرے کا پوسٹر لگا ہُوا ہے جسے وہ بوڑھا کھڑے ہو کر پڑھنے لگتا ہے ع

بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ہوئی

اور . . ر . . ر. . . ـ، دفعتہً ہارن کی کریہہ آواز، بریکوں کی دلدوز چیخ اُسے چونکا دیتی ہے، ایک کار سائیں سے گزر جاتی ہے، بوڑھا سہم کر قریب کے کھمبے سے بے تابانہ چمٹ جاتا ہے اور رفتارِ زمانہ سے گھبرایا ہُوا سا پوسٹر کے آخری بول پڑھنے کے لئے مُڑ مُڑ کر دیکھنا چاہتا ہے!

اگلے روز صبح کو اخباروں میں اشتہار نکلتا ہے:-

"ضرورت ہے ایک نوجوان گریجویٹ کی ایک کلرک کی اسامی کے لئے، جگہ مستقل، مشاہرہ معقول"

فضل احمد صدیقی

ہی صحیح علم رہتا ہے کہ کب نشتر زنی کرے اور کب تھانہ دار صاحب کے زخموں پر پھائے رکھے۔ وہ دفعہ ۱۹۲ کا ماہر، ۲۸۲ کا حافظ بات بے بات رپٹ لکھنے کا مشاق اس کا قلم اس درجہ رشوت اور ہے داں کہ خدا کی پناہ وہ چاہے تو اپنی نوکِ قلم سے انسان کو بے دھڑک پھانسی کے تختے پر لٹکوا دے اور چاہے تو چند نقطوں کے ہیر پھیر سے سنگین سے سنگین مقدمات حرفِ غلط کی طرح ختم کرا دے۔ یہ لفبر قانون ایک روشن چوکی پر ایک ڈیسک کی آڑ لئے تھانہ کے صدر دروازہ کے سامنے بیٹھا رہتا ہے اور ہر آئندہ و روندہ کی صلاحیت درج کرتا رہتا ہے اس کا ہر کام للٰہی طریق پر ہوتا ہے یعنی جو دے اس کا بھی بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔

کلرک گھٹے تو محرر چنگی ہو جائے اور بڑھے تو ہیڈ کلرک بن جائے ہیڈ کلرک اک کہنہ مشق پختہ کار اور مکمل کلرک کا نام ہے اور عام کلرکوں میں اس کا درجہ ایسا ہی ہے جیسے سنپولیوں میں کالے کا۔ اس کے ہاتھ میں بین بادشاہزادی کے قصہ کی طرح تمام دفتر کی جان ہوتی ہے۔ وہ بولتا کم ہے سنتا زیادہ ہے، وہ دیکھتا نہیں نوٹ کیا کرتا ہے۔ اگر اس کی راہ میں آئینہ رکھ دیا جائے تو اس کی نیچی نگاہ میں ہزاروں فتنے نکلیں۔ وہ اہلِ دفتر کا کاتبِ تقدیر ہوتا ہے اور اکیلا کراماً کاتبین سے زیادہ کام کر لیتا ہے کیونکہ محکمہ جزا و سزا بھی اسی کے مشورہ کا محتاج ہوتا ہے۔ اس کا سینہ رازوں کا مدفن ہوتا ہے جس میں دفتر کے سب خرد و کلاں کے اعمال نامے بند رہتے ہیں (وہ اعمال نامے جن کے دم تحریر کوئی اور آدمی نہیں ہوتا) اس کا دماغ عمرو عیار کی زنبیل جس میں سرخ اور نیلی پنسلیں، آلپین، چاقو، "ضروری" اور "اشد ضروری" کی پرچیاں اور صدہا کاغذات کے پلندے ہمہ وقت بھرے رہتے ہیں۔ اس سے نپٹنے کے لئے توفیقِ الٰہی کا شاملِ حال ہونا ضروری ہے وہ مشتِ بعد از جنگ پر اعتماد کامل رکھتا ہے اور ہمیشہ کلۂ حریف ہی کو ٹھیک نشانہ بناتا ہے۔

شاعر کی طرح ہیڈ کلرک بھی جس قدر بوڑھا ہو گا اس کی کلرکی جوان ہوتی جائے گی۔ وہ جتنا پرانا ہو گا اتنا ہی خرانٹ اور گرگِ باراں دیدہ ہو گا۔ سنا ہے کہ کسی پی ڈبلیو۔ ڈی کے دفتر میں سڑک کوٹنے کا آہنی رولر خریدا گیا، اس کی خریداری اور تحویل وغیرہ کے کاغذات مکمل تھے اس کے استعمال، حمل و نقل کی مثل بھی پوری تھی۔ دو برس کے بعد معلوم ہوا کہ عفریت پیکر رولر کہیں چوری چلا گیا۔ اس کی گمشدگی کی اطلاعات پولیس اور صدر دفتر سب جگہ پہنچیں تفتیش مکمل ہوئی اور مجبوراً سراغ نہ ملنے پر مثل داخل دفتر کر دی گئی۔ ایک روز گھر والی نے ہیڈ کلرک صاحب سے یونہی پوچھ لیا:۔ "اے ہے وہ نامراد رولر ملا بھی جس کا اتنا فضیحتا ہو رہا ہے؟" ہیڈ کلرک صاحب شانے ہلا کر استفہامیہ انداز میں بولے:۔ "اور خریدا کس مسخرے نے تھا؟"

اسٹیونز کے قول کے مطابق شادی اور موت سے کسی کو مفر نہیں۔ کلرک کی زندگی کے بھی دو لازمی پہلو شادی اور موت ہوتے ہیں۔ شادی اس کے گھر والے کر دیتے ہیں، موت کا سامان دفتر میں ہو جاتا ہے بلکہ اوّل الذکر کو آخر الذکر کی دلیلِ قطعی سمجھنا چاہئے۔ اور اس درمیانی وقفے میں کہ اس کی روح پرواز کرے قضا و قدر کو چند نئی ارواح کے نازل کرنے کا بہانہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ کلرک کی بیوی بہتر اپنے احساسِ برتری اور اس کے احساسِ کمتری کو قائم رکھنے میں چندے کامیاب رہتی ہے لیکن اس کے دفتری کثیف پلندے اس لطافتِ حیات کا خون کر دیتے ہیں چنانچہ کلرک کی جوانی اور بڑھاپے میں محض آمد و آورد کا سا فرق رہتا ہے۔ بچوں کا دخل در معقولات اور خود اس کے مصروف و غیر منضبط اوقات، یعنی اس کی صبح خیزی اور دیر واپسی جو ہمیشہ دیر آید درست آید کی سخت تضحیک و تکذیب سی بنی رہتی ہے، اور دیگر مختلف اسباب مل کر توازنِ طاقت کو توڑ دیتے ہیں اور بسا اوقات کلرک کے گھر میں سیاسی تعطل کی صورت قائم رہتی ہے۔ عوارض و مصارف، قرض، قرض، امجت و ملازمت سب کے درمیان ایک کشاکش شروع ہوتی ہے اور انجام کار کسی ایک فریق کو داعیٔ فنا کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔ بالعموم یہی سخت جان ہوتا ہے جو مانجھا لے جاتا ہے تاکہ بقیۂ معصوم بچوں کو پیپیاں بجا بجا کر بہلاتا پھرے اور جلسوں اور عیدگاہوں میں پہنچ پہنچ کر دیگر آسودگانِ ہستی کے

[illegible]

دفتر کے چپراسیوں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں، دفتر کے مستقل و منہمک کلرک اپنے اپنے سنہری روپہلی چشموں کے نظر فریب پردے آنکھوں پر سے ہٹا ہٹا کر آنے والے کا جائزہ لے رہے ہیں، گویا پرانے اسیرانِ قفس ایک نو گرفتار کے پر و بازو دیکھ رہے ہیں۔ وہ سب اپنے اپنے قلم ڈیسکوں پر دھر کر تھکی ہوئی انگلیوں کو آرام دینے کے لئے یا واقعی وفورِ جذبات سے ہاتھ مل رہے ہیں۔ جیسے سب کے عضلات میں سرد مہریٔ زمانہ نے آج پہلی بار دل شکن ارتعاش پیدا کیا ہے! با ایں ہمہ جہاں تک نو وارد کا تعلق ہے اس کی چال اب سے کچھ دیر پہلے تک مرغِ بسمل کی تڑپ تھی لیکن اب وہ ایک فاتحانہ تفاخر کے ساتھ اپنے "پروانۂ تعیناتی" کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے کہ دیکھوں دونوں طرف اِس ورق کے تصویریں ہیں یا یہ محض سامنے کی چیز ہے؟ کون بتائے، اس نے کیا دیکھا اور کیا سمجھا؟

نو وارد میں ایک عظیم الشان تبدیلی نظر آنے لگی ہے۔ بظاہر مراد آباد میں کوئی مُردہ زندہ ہو گیا ہے لیکن اے وائے کسی کو کیا خبر کہ اُس کو قوتِ لاہوت کی فراغت مستعار دے کر اس کا عطرِ زندگی کھینچ لینے کی تیاریاں ہو رہی ہیں گویا اب وہ دفتر دفتر نہیں ہے۔ قنوج ہے قنوج اُس گُل نورس کے لئے۔ اِس غریب کو کیا معلوم کہ وُہ اب دیکھتے ہی دیکھتے اِنسان سے کلرک بنایا جا رہا ہے کلرک! اور یہ کون بتائے کہ اسے کرسی پر نہیں بٹھایا جا رہا ہے بلکہ اُسے ایک پیکرِ حساس سے ایک مشینی پُرزے کی صورت میں ڈھال کر ایک محدود جگہ کے اندر پھنسایا اور فِٹ کیا جا رہا ہے جہاں دھنسے پھنسے وہ مخصوص و مقررہ نوع کی حرکت ضرور کرتا رہے گا لیکن اُس کھانچے سے باہر نہیں نکل پائے گا بلکہ گھس گھسا کر وہیں ختم ہو جانے کی آزادی اُسے ہمہ وقت حاصل رہے گی!

تو یہ ہے شاندار آغاز اُس کلرک کا، اب انجام تک بھی نظر ڈالا چاہئے تاکہ دیکھیں کیا گذرے ہے کیا ہونے تک!

کلرک کا مسکن اُس عظیم الشان سیڑھی کے، آخری سے پہلے ڈنڈے پر ہوتا ہے جو اوپر نائب شاہ سے شروع ہو کر نیچے کی طرف نشتر ہزار مدارج طے کرتی ہوئی چپراسی پر آ کر ختم ہوتی ہے۔ اِس سیڑھی پر اوپر والے کچھ اس قرینہ سے اچھوائے بیٹھتے ہیں کہ سارا زور نیچے کی طرف کو رہے۔ یعنی ایک عریض و بسیط کوہِ گراں کا بار ایک چوہے کی کمر پر ٹکا ہوتا ہے، مگر واہ رے سخت جانی، اس بے جان کا دم نکلنے میں بعض اوقات پوری ایک چوتھائی صدی لگ جاتی ہے اور وہ جینے کے دھوکے میں مُدتوں سسکتا ہے! با ایں ہمہ لطف یہ ہے کہ جب کبھی کیبنٹ کارندے کلہاڑیاں اور رندے لئے اِس سیڑھی کو ٹھونک بجا کر دیکھنے آ نکلتے ہیں تو باوجود سب سے نیچے کی طرف ہونے کے سب سے زیادہ اُچھال اور جھٹکے بالعموم اسی ڈنڈے پر محسوس ہوتے ہیں جس پر اِس کلرک کی رہائش ہوتی ہے چنانچہ اکثر اِس کا مسکن شاخِ آشیاں کی طرح شبانہ روز لرزتا رہتا ہے اور جب یہ باعثِ ناتوانی دِہ سنبھل نہیں پاتا تو مُنہ کے بل گر پڑتا ہے اور مزید لطف یہ کہ اِس اُکھاڑ پچھاڑ، اِس پیمائش و مساحت کے اصطلاحی نقشے بہت پہلے سے اسی کمبخت کے ہاتھوں تیار کرائے جاتے ہیں، گویا اپنے قتل نامے پر سب سے پہلے دستخط اسے ہی کرنا ہوتے ہیں اور اس کی رگِ گلو پر نشان اِسی کے ہاتھوں سے لگوایا جاتا ہے!

کلرک کی یہ ناقدری و بے نصیبی اُسے بے ادب بنا کر چھوڑتی ہے۔ اُس کی ہر ادا میں ایک قسم کی روسی خشونت اور فراریت سی پائی جاتی ہے وہ خدا و ندانِ تہذیب و ادب کے سامنے ایک دہریے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ زمانہ اُس کے عبوسی ماحول کا خالق ہو کر اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو وہ بھی زمانہ و ابنائے زمانہ کے سب لگے بندھے رسوم و رواج کاٹتا ہوا چلتا ہے۔ مثلاً لباس ہی پہنے گا تو ایسی بے دردی سے کہ کپڑا اتنگ رو دے۔ یعنی شیروانی زیبِ تن کرے گا تو اس کے بٹن بھاڑ سے کھول دے گا، کوٹ پہنے گا تو اُسے کُتّے کے کفن کی طرح لٹکائے لٹکائے پھرے گا، پاجامہ فرمائے گا تو اُس کے پائینچے سمت نما کے سے اشارے دیتے ہوئے چلیں گے، یا دھوتی باندھے گا تو اُسے کھڑکی دار بگڑی بنا کر چھوڑے گا: یا پھر ڈبل زین کے پتلون پہنے بیچ سڑک پر ڈبل مارچ کرتا ہوا سویرے ہی سویرے بھلے آدمیوں میں سے بلا تکلف گذر جائے گا۔ ڈھٹائی اِس قدر بڑھ جائے گی کہ اسٹیشنوں پر اور کچہری عدالتوں کے

[illegible] ([illegible])

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ([illegible])

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ނިމި

[illegible]

قبروں کے کتبے

قبروں کے کتبے دراصل زندگی ہی کے ایک رُخ کی تصویر ہیں۔ اِن میں بارہا مرنے والوں کی زندگی کا خُلاصہ بیان ہوتا ہے یا ان کے متعلق اُن کے عزیزوں کی کسی حسرت کا اظہار۔

کتبہ نگاری اپنی جگہ ایک علیحدہ فن ہے جس کے بنیادی اصول دو ہیں۔ اختصار اور لطافت۔ وجہ یہ ہے کہ لوحِ مزار پر کوئی لمبی کہانی بیان نہیں ہوسکتی اور اگر ہو بھی سکے تو اس میں وہ اثر نہیں آتا جو دل پر تیر بن کر لگے۔ اسی طرح کتبے کے مضمون میں کوئی لطیف نکتہ ضرور ہونا چاہئے جس سے پڑھنے والے کے دل پر غم کے علاوہ ایک ذہنی سُرور بھی طاری ہو سکے۔ بہترین کتبہ وہی ہے جو کسی لطیف نکتے کو مختصر اور بلیغ عبارت میں ادا کرے۔

ہمارے بیان کا سب سے زیادہ پُرمغز اور لطیف ذریعہ شاعری ہے، یہی وجہ ہے کہ کتبے عام طور پر شعروں کی شکل میں ملتے ہیں۔ زبان کی بلاغت اور ذہن کی چمک دمک کے لحاظ سے دو قومیں ایسی گزری ہیں جن کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، قدیم یونانی اور اہلِ ایران۔ اسی لئے دُنیا کے بہترین کتبے پہلے یونانی اور پھر فارسی زبان میں ملتے ہیں۔ اِس وقت ہمیں یونانیوں کی کتبہ نگاری سے سروکار نہیں ہے، ہم فارسی اور اُردو سے کچھ نمونے لیں گے۔

سب سے پہلے فارسی کا ایک کتبہ سنئے جس میں زندگی کے عروج و زوال کی عبرت ناک داستان صرف دو مصرعوں میں بڑی لطافت سے بیان کی گئی ہے۔ یہ کتبہ سلطان الپ ارسلاں کی زندگی پر ایک تبصرہ ہے۔ الپ ارسلاں کی سلطنت ترکستان سے لے کر بحیرۂ روم تک پھیلی ہوئی تھی۔ وُہ ایک عظیم الشّان معرکے میں فتح حاصل کرکے واپس آرہا تھا کہ اتفاقاً اپنے ہی ایک قیدی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ مرنے سے پہلے اُس کی زبان سے یہ لفظ نکلے: "آج صبح اپنے قطار در قطار لشکر کو دیکھ کر میرا دل غرور سے بھر گیا تھا، مجھے یہ خیال آیا تھا کہ دُنیا کی کوئی طاقت میرا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ لیکن دن ڈھلنے سے پہلے خدا نے اپنے ایک کمزور اور حقیر بندے کے ہاتھ سے میرے غرور کو خاک میں ملادیا۔" الپ ارسلاں کا مزار مرو میں ہے اور اس کی لوح پر جو شعر لکھا ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے ؎

تم نے دیکھا کہ الپ ارسلاں کا سر بلند ہوتے ہوتے آسمان پر پہنچ گیا
لیکن مرو میں آؤ تاکہ اُسی الپ ارسلاں کا سر خاک میں ملا ہوا دیکھو۔

اصل شعر یوں ہے ؎

سرِ الپ ارسلاں دیدی ز رفعت رفتہ بر گردوں؛
بہ مرو آ تا بہ خاک اندر سرِ الپ ارسلاں بینی!

اب ایک اور قبر کا کتبہ سنئے جو بادشاہوں کو عبرت کا درس دینے کے بجائے نوجوانی کی محبّت اور اُس کی حسرت آمیز یاد کا مُرقّع پیش کرتا ہے۔ انارکلی کے حُسن و جمال کی داستان سب نے سن رکھی ہے، کس طرح شہزادۂ سلیم نے اُس سے اور اُس نے شہزادے سے دیوانہ وار محبّت کی، کس طرح اکبر کے شاہی جلال نے بھڑک کر انارکلی کو پل بھر میں بھسم کردیا۔ اس کے بعد برسوں گزر گئے شہزادۂ سلیم شہنشاہ جہانگیر بن گیا۔ ایک دن لاہور میں اُس نے اچانک انارکلی کی بے نام و نشان قبر کو دیکھا تو دل بے چین ہوگیا۔ ایک عالی شان مقبرہ بنوا کر انارکلی کی تربت پر یہ شعر لکھوایا ؎

کاش، ایک بار پھر میرے محبوب کا چہرہ مجھے نظر آئے!
آہ! اگر ایسا ہوسکے تو میں قیامت تک اپنے پروردگار کا شکر بجالاتا ہوں

آہ گر من باز بینم روئے یارِ خویش را　　تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سوداگر نے کہا۔ "لیکن اس کا علاج تمہارے لئے آسان ہے تم یہاں سے اُٹھ کر کہیں اور جا سکتے ہو۔" گویّے نے جواب دیا "بے شک لیکن یہی علاج ضرورت ہو تو تم بھی کر سکتے ہو۔ میرا پیشہ قانوناً جائز ہے اس کے ذریعے سے روپیہ پیدا کرنے میں مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"پیشہ؟" سوداگر کو پیشہ اور روپیہ کا نام سُن کر غصہ آنے لگا۔ "اس کو تم پیشہ کہتے ہو کہ تمام دن گلا پھاڑ پھاڑ کر چند فرسودہ اور بیکار نظمیں بار بار گاتے ہو اور شام تک دو چار آنے پیدا کر لیتے ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میری ایک دن کی آمدنی کس قدر ہے؟"

گویّے نے پھر بھی تحمل سے جواب دیا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ میری آمدنی تم سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے اگر میں وہ ذرائع استعمال کروں جو ایک تاجر کرتا ہے۔ یعنی دو چہرے اور تین ہاتھ۔؟"

تاجر نے کہا "تم بڑے بدتمیز ہو۔!"

گویّے نے جواب دیا "یہ امر بحث کے مضمون سے تعلق نہیں رکھتا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ میرا پیشہ تمہارے پیشے سے بہتر ہے کیونکہ تمہارا کام انسان کو یاد رکھنے پر مجبور کرتا ہے اور میرا کام اس کے افکار بھلا دیتا ہے"

یہ بحث اس طرح جاری تھی اور خدا جانے کب تک جاری رہتی (مثل ہے کہ ایک جاہل مزدور کئی من وزن کا پتھر چند منٹ میں ہٹا سکتا ہے لیکن دو عقلمند کئی چاند گذر جائیں ایک لفظ کے معنی پر متفق ہونے میں نہیں آتے) اگر ایک ناگہانی واقعہ ظہور میں نہ آجاتا۔

شہنشاہ چین نانگ دی کا زمانہ تھا جو رعایا کے مقدمات میں انصاف کرنے کے لئے مشہور ہے۔ وہ خود اتفاق سے بازار میں سے گذر رہا تھا۔ اس نے ایک مکان سے دو آدمیوں کے آپس میں زور زور سے بحث کرنے کی آواز سُنی اور پالکی رُکوا کر صورتِ حال دریافت کی۔ جب دونوں طرف سے سن چکا تو کہا "یہ اختلاف کوئی نئی بات نہیں۔ بہت پُرانا ہے۔ اور ہم خود اس کا فیصلہ کرتے لیکن آزادی کا زمانہ آرہا ہے اور عوام کی رائے کو ایک شخص کی رائے سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا فیصلہ بھی عام رائے سے ہوگا۔ لہذا احکام جاری کر دئے جائیں کہ فلاں روز اتنے بجے شہر کے فلاں چوک میں سن کیاؤ اپنی بہترین نظم گا کر سنائے گا اور ٹھیک اُسی وقت دوسرے چوک میں وانگ پاؤ ــــ کہو وانگ پاؤ تم کیا کرو گے؟ اچھا یوں سہی کہ وانگ پاؤ کل آنے والوں میں دُونیاں اور چونیاں تقسیم کرے گا۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہماری رعایا کی زیادہ تعداد کس کی قدر زیادہ جانتی ہے"

وانگ پاؤ بول اُٹھا "واہ کیا انصاف ہے شہنشاہ سلامت! حضور سے بڑا منصف دنیا بھر میں دوسرا کوئی نہیں"

یہ اس لئے کہ وانگ پاؤ کو پورا یقین تھا کہ اسی کی فتح ہوگی۔ سن کیاؤ نے بادشاہ کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔

چند روز بعد جب مقررہ وقت آیا تو سن کیاؤ والے چوک میں صرف دو آدمی دکھائی دیتے تھے۔ ایک اندھا فقیر جو راستہ بھ[ول] گیا تھا اور ایک موٹا بنیا جس کے پالکی والے یہ سُن کر کہ دوسرے چوک میں دونیاں بٹیں گی اسے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ لیکن وانگ [پاؤ] والے چوک میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ چوک میں سے جو بازار نکلتے تھے وہ بھی کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ راستہ بند ہو گیا تھا اور خود [illegible] بھی اسی چوک میں موجود تھا۔

چوک کے ایک کنارے چبوترہ بنا کر قالین بچھا دئے گئے تھے اور ایک سونے کی کامدار مخملیں بڑی چھتری کے سایہ میں باد[شاہ] بیٹھا تھا۔ سوداگر وانگ پاؤ اس کے قریب ہی خوش و خرم کھڑا لوگوں کے انبوہ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ شاہی محل سے گھنٹہ بجنے کی آوا[ز] آئی۔ بادشاہ نے وانگ پاؤ کو بُلایا۔ وہ مسکراتا ہوا سامنے حاضر ہو کر آداب بجا لایا۔ بادشاہ نے کہا۔

"وانگ پاؤ وقت آگیا ہے اور بہت سے لوگ جمع ہیں۔ اب تم اپنے پیشے کے سن کیاؤ کے پیشے سے بہتر ہونے کا ثبوت دو۔"

"غریب نواز؟" وانگ پاؤ حیرت سے بولا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

بادشاہ نے کہا "اب اپنے غلاموں کو بلاؤ! اور دونیاں چونیاں تقسیم کرنا شروع کرو۔ بہت آدمی ہیں دیر لگے گی۔ ایسا نہ ہو شام [illegible]"

وانگ پاؤ نے کانپتے کانپتے جواب دیا "لیکن حضور وہ تو فرضی شرط تھی۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ کس کی طرف زیادہ آدمی جمع ہوتے [ہیں]"

بادشاہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آیا اور گذر گیا کیونکہ احساس کا اظہار بڑے آدمیوں کے لئے معیوب سمجھا جاتا ہے اور اس نے [illegible]

"یہ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں نہیں وانگ پاؤ۔ عوام الناس کے ہاتھ میں ہے کہ وہ کیا سمجھے۔ ان تمام لوگوں کے چہروں کی طرف [illegible]

سن کیاؤ

(ملکِ چین کی ایک کہانی)

وانگ پاؤ، سوداگر اپنے گدیلوں سے بھرے ہوئے آرام دہ کمرے میں بیٹھا۔ پرندوں کے گھونسلوں، مچھلی کے پروں، مینڈک کی ٹانگو اور اس قسم کی اور لذیذ ترین غذاؤں کے کاروبار سے منافع کا حساب کر رہا تھا کہ ایک بھکاری گانے والے کی آواز نے اس کے دل خوش ک خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ گانے والا سوداگر کی کھڑکی سے باہر سڑک پر ایک درخت کے ساتھ سہارا لگا کر بیٹھ گیا تھا اور ایک چھو سی پیالے کی شکل کی آدمی ڈھولک کو زور زور سے بجا کر اس کے ساتھ گذشتہ زمانے کے منظوم قصے الاپ رہا تھا۔

سوداگر نے تنگ آ کر اپنے پاس رکھے ہوئے، لٹکی ہوئی رکابی کی شکل کے آہنی گھنٹے کو اس کی چھوٹی سی موگری سے بجایا۔ اور نوکر حاضر ہوا تو اس سے کہا کہ "یہ شخص جو درخت کے نیچے بیٹھا گا رہا ہے اس کو سمجھاؤ اور اگر ضرورت ہو تو موٹے ڈنڈے سے یقین دلاؤ کہ ہمارا غریب خانہ اس کی آواز کے بہشتی سُروں کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس لئے وہ کسی اور جگہ نقل مکان کر کے لوگوں کے دلوں کو لبھائے"

نوکر جب واپس آیا تو اس کے چہرے پر مالک کے حکم کو کامیابی سے بجا لانے کی فاخرانہ جھلک نہ تھی۔ اس نے کہا کہ فقیر نے مجھ سے ڈنڈا چھین لیا۔ میرے سر سے اپنی ڈھولک کو کئی دفعہ بجایا اور بدستور گاتا رہا۔

وانگ پاؤ نے کہا "تو اس کو غریب خانہ کے اندر تشریف لانے کی زحمت دو تا کہ مناسب خاطر تواضع کی جائے"۔

یہ تجویز کامیاب ہوئی اور تھوڑی دیر میں گویا نوکر کے ساتھ اندر آ گیا۔ وہ نوجوان سا تھا اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے لیکن چہرے پر غو فکر کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے گلے میں دھاگے کے ذریعے سے گتوں پر لکھی ہوئی پانچ سات نظمیں لٹک رہی تھیں جن میں سے ہ ایک کا غالباً مختلف موقعوں پر گایا جانا مناسب ہوگا۔ پاؤں ننگے تھے اور ہاتھ میں ڈھولک تھی۔ اس نے اپنا نام "سن" بتایا اور خاندان کا نام ک

سوداگر نے ایسے رعب دار لہجے میں جس سے چھوٹے آدمیوں کو مخاطب کیا جاتا ہے کہا "تسلیم سن کیاؤ صاحب۔ میری سمجھ میں بات نہیں آئی کہ آپ اپنی شیریں آواز میرے غریب خانے کے باہر بلند کرنے پر کیوں مُصر ہیں؟"

سن کیاؤ نے انکسار کے ساتھ آنکھیں نیچی کر کے جواب دیا "کیونکہ غریب نواز نے مجھے اپنے محل کے اندر طلب نہیں فرمایا تھا۔ اب میں حاضر ہوں اور آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کے معزز کانوں کو محظوظ کرنے کے لئے تیار ہوں"۔ ان الفاظ کے ساتھ گویا قالین پر بیٹھ گیا اور ڈھولک پر دو چار ہاتھ زور زور سے لگائے۔

سوداگر جلدی سے بولا "براہِ کرم اپنی مسلّمہ قابلیّت کو لگام دیجئے۔ آپ نے میرے سوال کو سمجھنے میں غلطی فرمائی۔ میں نے یہ دریافت کیا تھا کہ آپ نے میرے نوکر کے نہایت ادب سے منع کرنے کے باوجود میرے غریب خانے کے باہر گانا بجانا کیوں جاری رکھا؟"

گویے نے جواب دیا "شاید آپ کے پیغام کی باریکی میں نہ سمجھ سکا۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ بھوکے کے لئے کباب کی سیخ سے پیٹ کسی حسینہ کے پیار سے چٹکی لینے کی بہ نسبت زیادہ تسکین دہ ہوتا ہے۔ اس لئے اے عظیم الشان پیٹ والے تاجر صاحب واضح ہو کہ گو یہ گھر آپ کا ہے۔ باہر کی سڑک میری ملکیت ہے"۔

"یہ کیونکر؟" سوداگر نے پوچھا

گویے نے جواب دیا "اسی طرح جیسے یہ محل تمہارا ہے۔ کیونکہ میں وہاں رہتا ہوں۔"

وانگ پاؤ نے کہا "بے شک تمہارے جواب میں ایک نکتہ ہے۔ لیکن صرف ان لوگوں کے لئے جن کا کام بال کی کھال نکالنا اس کو تسلیم کرتے ہوئے میں یہ پوچھتا ہوں کہ تمہیں کیا حق ہے کہ اپنے مکان میں اتنا شور مچاؤ کہ مجھے اپنے مکان میں رہنا دشوار ہو جا"

گویے نے جواب دیا "وہی حق جو تمہیں حاصل ہوتا ہے جب کسی اپنے سے بھی زیادہ بڑے پیٹ والے کی خاطر تواضع کرنے کو تم باجے گاجے سے محلّے بھر کو سر پر اٹھا لیتے ہو"۔

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

([illegible])

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

(٢)

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

(٣)

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

(٤)

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

(١)

[illegible]

میں کبھی یونہی کچھ بڑا آدمی بن گیا تو سب سے پہلے اِس "دیکھئے صفحہ فلاں" کے خلاف آواز بلند کروں گا کہ کسی کو کیا حق ہے کہ ایک پیارے پیارے افسانے یا مضمون کا تِکّا بوٹی کرکے رکھ دے۔ اور پھر جیسا کہ بعض مصنفین نے کہا ہے ـــ (بہت سے آج کل بھی کہتے ہیں) کہ افسانے جگر کے ٹکڑے ہوتے ہیں، اِن میں بھی جان ہوتی ہے اور (دروغ بر گردنِ راوی) افسانہ نگار کی رُوح کا حصّہ ہوتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا ہوتے ہیں تو اِس صورت میں تو یہ ایک اچھا خاصا جُرم بن سکتا ہے۔ اگر قانونی جُرم نہیں تو کم از کم "روحانی جرم" یا "افسانوی جُرم" تو ضرور ہی ہو سکتا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ لوگ میری اِس اپیل کو سر آنکھوں پر لیں گے۔ اور وہ دن دُور نہ ہوگا جب "دیکھئے صفحہ فلاں مردہ باد" اور "دیکھئے فلاں صفحہ ہائے ہائے" کے نعرے بچّے بچّے کی زبان پر ہوں گے۔ پھر افسانے سالم چھپا کریں گے، مسلسل ہوں گے اور پڑھنے والوں کو ہرگز یہ مُشکلات پیش نہ آئیں گی۔

جب تک اس قسم کا قانون نہیں بنتا سمجھ لیجئے کہ یہ "دیکھئے فلاں صفحہ" بھی کہیں نہیں جانے کا، اور اسی طرح مدّتوں تک ہمارے سینوں پر مونگ دلے گا۔

ایک تجویز ہے! وُہ یہ کہ اگر ضرور ہی ایک افسانے کو کئی حصّوں میں تقسیم کرنا منظور ہے، اور اس کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا تو اس خشک سے فقرے کی جگہ اچھے اچھے فقرے بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں دیکھئے نا یہ سخت سا نادر شاہی حکم بار بار اچھا نہیں لگتا۔

جہاں مضمون کا کوئی حصّہ ختم ہوتا ہو وہاں ملائم الفاظ میں پڑھنے والے سے درخواست کی جائے کہ چونکہ اس صفحے پر جگہ تھوڑی تھی اور دوسرے صفحے سے نیا مضمون لازمی طور پر شروع ہونا تھا اس لئے اگر وُہ مناسب سمجھے تو فلاں صفحہ کھول لے۔ یا کوئی اچھا سا فقرہ لکھ دیا جائے۔ مثلاً

"اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو کم از کم فلاں صفحہ ہی کھول لیجئے۔" یا

"گستاخی معاف! کیا آپ ہمارے لئے فلاں صفحہ نہ کھولیں گے؟" یا

"صفحۂ فلاں کو ملاحظہ فرما کر مدیر و منیجر رسالۂ ہذا و عملۂ متعلقۂ رسالۂ ہذا و فاضل مضمون نگار ـــ سب کو ممنون فرمایئے۔ شکریہ!"

شفیق الرحمٰن

بچّہ سو رہا تھا

وُہ سوتے سوتے رونے لگا

ماں نے اُسے دایہ کی گود سے چھینا۔ اور اپنی آغوش میں لے لیا۔ اُسے

میٹھی میٹھی لوریاں دے کر سُلا دیا۔

بچّہ پھر رونے لگا

اب خُدا نے اُسے ماں کی گود میں سے چھین کر بہشت میں حُوروں کی

گود میں سُلا دیا

بچّہ اب بھی سو رہا ہے!

(انگریزی)

چاند شرما

مُلزم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اُس نے قلانچ بھری، برساتی نالے کو پھلانگ گیا اور لپک کر سامنے کی اونچی دیوار پر چڑھ گیا۔ بھاری بھر کم سپاہی پھاند نہ سکا اور وہیں رُک گیا ملزم دل کھول کر ہنسا، اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلّا کر بولا کہ

باقی دیکھئے صفحہ فلاں پر

دل پر بدستور ڈر طاری ہے، صفحہ تلاش کرتے وقت آخری فقروں کو دل میں دہرایا جا رہا ہے۔ بقیہ حصہ مل جاتا ہے۔ ایک دفعہ اور آخری فقرہ پڑھا جاتا ہے ـــــ ہاں تو ملزم زور سے ہنسا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلّا کر بولا کہ "خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے۔" لاحول پڑھتے ہیں، یہ کیا تماشا ہے؟ کہاں تو سہمے بیٹھے تھے اور کہاں کچھ ہنسی سی آجاتی ہے۔ ملزم کانسٹیبل سے کہہ رہا ہے کہ "نمبر خریداری کا حوالہ دیجئے،" کیا بات بنی؟

دوبارہ دیکھتے ہیں کہ کہیں غلط تو نہیں پڑھ لیا ـــــ خاصی چھان بین کے بعد پتا چلتا ہے کہ واقعی کچھ اور پڑھ لیا ہے۔ اب جو افسانے کو پڑھتے ہیں تو وہ مُلزم کا پُرلطف فقرہ بھولتا ہی نہیں۔ ہنسی ہے کہ زبردستی آرہی ہے۔ چلو افسانہ ختم۔

اب کوئی سنجیدہ سا مضمون لے بیٹھتے ہیں۔ سقراط پر مقالہ ہے صاحب، خوب ہے! دفعتہً پتا چلتا ہے کہ سقراط واقعی بہت بڑی ہستی تھا اور اب تک ہم بالکل اندھیرے میں رہے ہیں جو ہم نے اُس عظیم الشان رُوح پر کبھی فاتحہ تک نہ پڑھی، اپنی بے بضاعتی پر افسوس ہونے لگتا ہے۔

پھر سقراط کو زہر دیئے جانے کا واقعہ آتا ہے، دل پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ چہرہ لمبا ہو جاتا ہے، مسکراہٹ (ملزم کے فقرے والی مسکراہٹ) ـــــ جی تو اُس کی شکنیں دُور ہو جاتی ہیں، یک لخت انکشاف ہوتا ہے کہ دُنیا فانی ہے، یہاں سب کو مرنا بھی ہے۔ فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں "سقراط نے پہلے تو اپنے دشمنوں کو بڑے سکون کے ساتھ دیکھا، اُس کے پُرنور چہرے کا جلال کئی گنا بڑھ گیا تھا، وہ بالکل ہراساں نہ تھا، دشمنوں کا پتا پانی ہو چلا تھا، سقراط نے ایک چھینک ماری اور کہا شکر ہے اب پھر وہ گرجتی ہوئی آواز میں بولا کہ ـــــ

باقی دیکھئے صفحہ فلاں پر

جلدی سے کھول کر پڑھا۔ ہاں تو صاحب سقراط نے گرجتی ہوئی آواز میں اپنے دشمنوں سے کہا کہ "اگر آپ سالنامہ مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو چندہ سالانہ پیشگی بھیج دیجئے"۔ جھنجلا اُٹھے! یہ کیا مصیبت ہے۔ پھر وہیں پہنچے۔ اس مرتبہ بڑی احتیاط سے سب کچھ دیکھا، پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے ایسے وقت میں۔ پھر آہستہ سے وُہ صفحہ کھولا۔ اب جو پڑھتے ہیں ـــــ سقراط نے گرجتی ہوئی آواز میں اپنے دشمنوں سے کہا کہ "ہمیشہ عبداللہ سگریٹ پیا کرو" تو بھنّا کر رسالہ پٹخ دیا۔ اگر محض اتنا ہی ہو کہ "دیکھئے فلاں صفحہ" کے ساتھ اُس صفحے پر صرف اُسی مضمون کا بقیہ حصہ ہو تو کوئی بات بھی ہے۔ اب ایک ہی صفحے پر تین چار چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مضامین کے ہیں، چند بیش قیمت نصیحتیں خریداروں کو دی گئی ہیں۔ ایک آدھ اشتہار بھی ہے۔ اب بتایئے کیا پڑھیں اور کیا نہ پڑھیں! یا تو یوں ہو کہ "کھولئے صفحہ ۱۹ دیکھئے وسط کا حصہ ڈھونڈیئے دوسرا کالم اور پڑھیئے وہاں سے ـــــ!"

میرے خیال میں اس چیز کا محض ایک فائدہ ہے۔ کسی یونہی سے افسانے کو پڑھتے پڑھتے جب نہایت خشک حصہ آجائے اور جی چاہے کہ بھئی پھینکو اسے ایک طرف۔ تب ضمیر ڈانٹتا ہے کہ خبردار! یہ آرٹ کی توہین ہے، اگر اتنے ہی بیزار تھے تو شروع کیوں کیا تھا، اب شرافت اسی میں ہے کہ اسے لفظ بلفظ پڑھ کر ختم کرو۔ اُس وقت انسان بہانے ڈھونڈنے لگتا ہے اور سب سے معقول بہانہ ایک ہے ـــــ جہاں متواتر "دیکھئے فلاں صفحہ" آجائے وہاں ایک پڑھنے والے آرٹ کے شیدائی کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ بے شک رسالے کو انگیٹھی میں ڈال دے، یا اگر گرمیاں ہوں تو کھڑکی سے باہر پھینک دے۔ اور اگر ضمیر ذرا سا بھی بولے تو اُلٹا اُسے ہی ڈانٹ دے کہ "تجھے شرم نہیں آتی؟"

لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ جب میں اسمبلی میں پہنچوں گا تو یہ کروں گا، اگر ڈکٹیٹر بن جاؤں تو یہ منوا کر ہٹوں گا، اگر لیڈر بن گیا تو یُوں سے یُوں ہو جائے گا۔ مجھے تو یہی دُھن ہے کہ اگر میں کسی روز اتفاق سے بڑا آدمی بن گیا (واضح ہو کہ میں اپنے چھ فٹ قد پر قانع ہوں۔ اور بڑے آدمی سے میرا اشارہ طول و عرض کی جانب ہرگز نہیں ـــــ!) جی! تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر

دیکھئے صفحہ فلاں پر

خیر صاحب! جلدی جلدی وہ صفحہ کھولا جاتا ہے۔ دل میں وہ فقرہ گونجتا رہتا ہے ـــــ میں کس طرح تمہیں سمجھاؤں کہ ـــــ میں کس طرح تمہیں سمجھاؤں کہ ـــــ

آگے آتا ہے ـــــ "کہ میں خود "اصلی یاقوتی" کے استعمال سے مستفیض ہو چکا ہوں۔ دُنیا بھر کے ڈاکٹر میرے مرض کو تپ دق بتاتے تھے۔ میں بالکل ہڈیوں کی مالا بن گیا تھا اور اب میں بفضلِ خُدا قابلِ رشک صحت کا مالک ہُوں ـــــ!"

طبیعت میں اُلجھن سی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کیا ہو گیا؟ اس کا افسانے سے تو کوئی تعلق نہیں۔ اظہارِ محبت سے "اصلی یاقوتی" کا کیا واسطہ؟ لاحول ولاقوۃ! یہ تو کوئی اشتہار تھا۔

صفحات کی جانچ پڑتال جو کی جاتی ہے تو بڑی کوفت ہوتی ہے۔

بعض اوقات افسانہ پڑھتے پڑھتے اِس آنے والے "خطرے" سے دل اچانک دھڑکنے لگتا ہے، کہ کہیں پڑھتے پڑھتے یک لخت ہی یہ "حادثہ" پیش نہ آ جائے اور جہاں افسانے کا کوئی بڑا دلچسپ حصّہ آتا ہے اُس وقت تو بس "جل تُو جلال تُو آئی بلا کو ٹال تُو" کی قسم کا ورد شروع ہو جاتا ہے کہ "اے پاک پروردگار تُو مشکل کُشا ہے، بس کہیں "دیکھئے فلاں صفحہ" نہ بیچ میں آ ٹپکے۔ اور اگر قسمت میں یونہی لکھا ہے تو یہ ذرا دیر میں آئے، جب یہ دلچسپ حصّہ ختم ہو لے"۔

کتنی ہی مرتبہ مسلسل ناکامیوں سے دل بیزار ہو گیا ہے، اور ان لگاتار بیزاریوں نے مجھے افسانوں کے معاملے میں ایک حد تک قنوطی بنا دیا ہے۔ افسانے کی سُرخی دیکھتے ہی میرے دل میں بے ثباتیٔ عالم کا نقشہ پھر جاتا ہے ـــــ میں چپکے سے کہتا ہوں کہ "ہائے اے پیارے افسانے! کون جانتا ہے کہ کہیں تیرا حشر بھی وہی نہ ہو جو میں نے اتنے افسانوں کا ہوتے دیکھا"۔

میں نے کیسے کیسے جتن کئے ہیں، کیا بتاؤں آپ کو۔ مثلاً یہ کہ سب سے پہلے افسانے کی سُرخی سے لے کر اختتام تک سارے صفحات کا جائزہ لینا شروع کر دیا، اگر افسانے میں "دیکھئے فلاں صفحہ" کہیں نہیں (یہ نعمت بہت شاذ ہے) تو فوراً ہی کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ اُس افسانے کو جلد جلد پڑھ لیا، ایسے خوش نصیب لمحات پر بارہا میں نے خوشی کے آنسو بہائے ہیں۔ لیکن جلد ہی پونچھ ڈالے کیونکہ ایسی خوشی دیرپا نہیں ہوتی اور اگلے افسانے میں ضرور کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اُن افسانوں کا انتخاب ہوتا ہے جن میں "دیکھئے صفحہ" دو مرتبہ ہو یا زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ! جلدی سے دو اُنگلیاں اُن صفحات میں رکھ لیں اور روانی قائم رکھنے کے لئے اِدھر آخری بیرے کو دو تین مرتبہ پڑھ لیا اور پھر بڑی پُھرتی سے (جس کی مشق کافی دیر میں ہوتی ہے) بقیہ حصّہ نکالا اور جلدی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ یوں کرتے وقت اکثر بلند آواز سے پڑھنا پڑا ہے۔

اور جن افسانوں میں "دیکھئے صفحہ" پانچ چھ مرتبہ ہو، تو اُنہیں زندگی کے صرف اُن لمحات کے لئے وقف کر رکھتا ہوں جب انسان افسانہ پڑھے بغیر نہ رہ سکے اور افسانہ نہ پڑھنے کی صورت میں خطرناک نتائج برآمد ہونے کا اندیشہ ہو۔

آپ یقین کیجئے کہ کئی مرتبہ میں نے ایسے افسانے بھی دیکھے ہیں جن میں "افسانہ" کم ہوتا ہے اور "دیکھئے صفحہ فلاں" زیادہ! یہ تو میں نے محبّت کی کہانیوں کا ذکر کیا ہے، علمی مضامین اور ڈراؤنے افسانے بھی اس "دیکھئے صفحہ" کی دست بُرد سے نہیں بچتے۔

اب مثال کے طور پر کسی سُراغ رسانی کے افسانے کو لیجئے۔

"اندھیری رات تھی، بارش نے سوچ رکھا تھا کہ آج ہی برسوں گی، قبرستان کا منظر ـــــ ہوا کے تھپیڑے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آج کوئی بہت بڑی مصیبت ٹوٹنے والی ہے"

ـــــ یہ پڑھ کر دل پر تھوڑا سا خوف ضرور طاری ہونے لگتا ہے اور خصوصاً اگر اندھیری رات میں مضمون پڑھا جائے اور ساتھ بارش بھی ہو رہی ہو ـــــ

"ملزم بھاگا، اُس کے پیچھے پیچھے کانسٹیبل تھا۔ اس قسم کے تعاقب کا اتفاق کانسٹیبل کو کبھی نہ ہُوا تھا۔ ملزم کے پاؤں میں گویا پہیے لگے ہوئے تھے۔ کانسٹیبل نے چلّا کر کہا "بدمعاش آدمی تو بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ میں سیٹی بجاتا ہوں ابھی سینکڑوں سپاہی تجھے گھیر لیں گے۔

"دیکھئے صفحہ فلاں"

آرام کرسی پر بیٹھ کر (بلکہ لیٹ کر) کوئی دلچسپ افسانہ پڑھا جا رہا ہے، کچھ معلوم نہیں چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔ کمرے میں جو آہٹ ہے تو قالین پر کُتا پھر رہا ہے یا بلّی، یا کہیں وہ کمبخت مالی کی بکری ہی تو نہیں۔

یہ بھی معلوم نہیں کہ اب کیا بجا ہے، اور کتنے بجے سے کالج کا گھنٹہ شروع ہو گا (یا کب سے شروع ہو چکا ہے) اور ابھی ابھی جو جلتا ہُوا سگرٹ پھینکا تھا وہ کہیں قالین ہی پر تو نہیں رہ گیا۔ آنکھیں کچھ مُندی مُندی سی ہیں، پڑھ رہے ہیں، کچھ خواب سے دیکھے جا رہے ہیں۔ ایک داستانِ محبت ہے کہ سامنے کھلی ہوئی ہے۔ دل میں یہ شبہ یقین میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے کہ واقعی دُنیا میں محبت بھی کوئی بڑی شدید قسم کا جذبہ ہے اور جسے کسی سے محبت ہو جائے اُس جیسا خوش قسمت آس پاس نہیں ملتا۔ یہ چیز خدا کی دین ہے۔ جسے خدا محبت عطا فرماتا ہے تو بس چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔ تلاش کرنے پر تو یہ ملتی نہیں لیکن اگر چمٹ جائے تو کمبل کی طرح پیچھا نہیں چھوڑتی۔ آہا ہا ہا — مُنہ میں پانی بھر آتا ہے!

خیالات بھی افسانے کے کرداروں کے ساتھ ساتھ گھوم رہے ہیں۔ جب دردناک حصہ شروع ہوتا ہے تو مُنہ لٹک سا جاتا ہے، آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے ہیں، ایک آدھ سرد آہ بھی کھینچ لی جاتی ہے۔ ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی بُخار چڑھے گا۔ اور پھر جب محبت کی فتح کا وقت نزدیک آتا ہے تو آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے، چہرے پر مُسکراہٹ آجاتی ہے، سر کسی نامعلوم تال پر ہلنے لگتا ہے، طبیعت میں جوش پیدا ہو جاتا ہے، کسی سے لڑ پڑنے کو جی چاہتا ہے — غرضکہ اسی طرح افسانے کی ایک ایک سطر کے ساتھ پینترے بدلے جاتے ہیں — ! انہی خیالات میں مدہوش ہوتے ہیں کہ ایک زوردار کڑاکے کے ساتھ بجلی گرتی ہے، ایک زبردست طوفان آتا ہے، اور چلا جاتا ہے پھر آنکھوں کے سامنے ایک خلاء چھا جاتا ہے — ایک وسیع خلاء! خیالات منتشر ہو جاتے ہیں، روح پر ایک عجیب سی بے چینی مُسلّط ہو جاتی ہے۔

یہ سارا سلسلہ کچھ اس طرح مُنقطع ہو جاتا ہے جیسے سینما ہال میں فلم یک لخت ٹوٹ جائے! نیچے لکھا ملتا ہے "باقی دیکھئے صفحہ فلاں پر"۔ اُس وقت دل پر کیسی کیسی قیامتیں گزر جاتی ہیں، ہم اپنے آپ کو کس قدر مظلوم سمجھتے ہیں، دُنیا بھر کے ستائے ہوئے — دُنیا بھر کی ہمدردی کے مستحق!

خدایا کیا سے کیا ہو گیا؟ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

لیکن قہرِ درویش برجانِ درویش، سب کچھ سہنا پڑتا ہے، اور "صفحہ فلاں" کھول کر پھر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں لیکن اس مرتبہ وہ جوش و خروش ہرگز باقی نہیں رہتا۔

بعض اوقات تو ایسے موقعوں پر نہایت وحشیانہ خیالات آنے لگتے ہیں کئی مرتبہ ہونٹ دبا دبا کر رکے گئے جاتے ہیں۔ اور ایسے ایسے منصوبے باندھے جاتے ہیں جن کا ذکر کرنا خالی از خطرہ نہ ہو گا۔

مثلاً ایک دل ہلا دینے والا خونچکاں افسانہ پڑھ رہے ہیں۔

ہیروئن نے پیار سے کہا "یوں ٹال مٹول کرنے سے فائدہ؟ میں ہمیشہ سچے انسان کو پسند کرتی ہُوں، آپ جو مجھ سے کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں اس کی وجہ دریافت کرنا چاہتی ہُوں — جو کچھ معاملہ ہے خُدا کے لئے صاف صاف بتا دیجیے!"

ہیرو نے کہا "آہ! یوں کہوں تو بھی مشکل، دُوں کہوں تو بھی مُشکل — تم مانو گی نہیں!"

ہیروئن بولی "یہ آپ میں اتنی تبدیلی آ کیسے گئی — التجائیں کر رہی ہوں پھر بھی آپ نہیں بتاتے۔"

ہیرو بولا "اچھا تو سُن لو صاف کہے دیتا ہوں — لیکن کیا خاک بتاؤں — دکھانتا ہے! — اچھا لو سُنو — میں کس طرح تمہیں سمجھاؤں کہ — "

والمیک

مصنفِ رامائن

اے والمیک شاعرِ عہدِ قدیمِ ہند — روشن ہے تیرے فکر سے اب تک حریمِ ہند
تیری نوا میں گم ہے بہشتِ نعیمِ ہند — تیرے نفس سے عطر فشاں ہے نسیمِ ہند
افکار کو ثبات ہے تن بے ثبات ہے
تو خاک میں بھی مل کے بقیدِ حیات ہے

صد ہا برس ولادتِ عیسیٰ سے پیشتر — تھے اہلِ بزم تیری زیارت سے بہرہ ور
صدیاں ہوئیں کہ تو نے جہاں سے کیا سفر — موجود آج تک ترے اشعار ہیں مگر
تیرے چمن کا رنگ بھی اب تک ہے بو بھی ہے
مثلِ مسیح زندۂ جاوید تو بھی ہے

لکھی ہے تو نے رام کی رودادِ زندگی — قائم ہے جس پہ ہند کی بنیادِ زندگی
آباد جس سے ہے شہرِ آبادِ زندگی — جس سے نشاط گیر ہیں ناشادِ زندگی
گر رام بے نظیر ہے تو بے عدیل ہے
رامائن اس بہشت کی حورِ جمیل ہے

اسلوب دلفریب ہے بندش ہے شاندار — اشعار کا شمار ہے اک لاکھ دس ہزار
تیرا قلم ہے یا ہے کلیدِ درِ بہار — گم ہیں تری نواؤں میں صحرا و کوہسار
ہندوستاں کا بلبلِ شیریں سخن ہے تو
ہومر کی طرح شاعرِ عصرِ کہن ہے تو

تو گلفروشِ ہند کے عہدِ بہار کا — میں داستاں سرا ستمِ روزگار کا
تو گوہرِ منیرِ یمِ بے کنار کا — میں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار کا
آزاد تھی فضائے چمن تیرے عہد میں
آنکھیں مری کھلی ہیں غلامی کے عہد میں

تھا لالہ زارِ ہند میں دورِ مئے طرب — آلامِ روزگار سے ناآشنا تھے سب
عشرت کی صبح و شامِ مسرت کے روز و شب — واقف نہیں تھے نامِ غلامی سے تیرے لب
میں منزلِ نشاط سے بیگانہ ہوں ہنوز
پابندِ راہ و رسمِ غلامانہ ہوں ہنوز

پاتا ہوں ہر نگاہ سے فرمانِ دور باش — ضربِ الم سے شیشۂ خاطر ہے پاش پاش
ہر ایک رگ میں نشترِ حسرت کی ہے خراش — پھر بھی ہے تیرے نقشِ قدم کی مجھے تلاش
میری زباں میں زور نہ بندش میں زور ہے
فریاد کی پکار ہے نالوں کا شور ہے

اس حال میں یہ شوق ہے اے بحرِ بیکراں — اردو میں تیری نظم کا مفہوم ہو بیاں
بے بال و پر ہے فکر تو بے کیف ہے زباں — منظور ہے مجھے دلِ مردہ کا امتحاں
خونِ جگر سے پریم کا بوٹا ہرا کروں
اپنے وطن کا حقِ محبت ادا کروں

اصغر حسین خاں نظیر

"دیکھئے صفحہ فلاں"

آرام کرسی پر بیٹھ کر (بلکہ لیٹ کر) کوئی دلچسپ افسانہ پڑھا جا رہا ہے، کچھ معلوم نہیں چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔ کمرے میں جو آہٹ ہے [illegible] قالین پر کتا پھر رہا ہے یا بلی، یا کہیں وہ کمبخت مالی کی بکری ہی تو نہیں۔

یہ بھی معلوم نہیں کہ اب کیا بجا ہے، اور کتنے بجے سے کالج کا گھنٹہ شروع ہوگا (یا کب سے شروع ہو چکا ہے) اور ابھی ابھی جو جلتا ہوا [illegible]رٹ پھینکا تھا وہ کہیں قالین ہی پر تو نہیں رہ گیا۔ آنکھیں کچھ مُندی مُندی سی ہیں، پڑھ رہے ہیں، کچھ خواب سے دیکھے جا رہے ہیں۔ [illegible] داستانِ محبت ہے کہ سامنے کھلی ہوئی ہے۔ دل میں یہ شبہ یقین میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے کہ واقعی دُنیا میں محبت بھی کوئی بڑی شدید [illegible]م کا جذبہ ہے اور جسے کسی سے محبت ہو جائے اُس جیسا خوش قسمت آس پاس نہیں ملتا۔ یہ چیز خدا کی دین ہے۔ جسے خدا محبت عطا [illegible]تا ہے تو بس چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ تلاش کرنے پر تو یہ ملتی نہیں لیکن اگر چمٹ جائے تو کمبل کی طرح پیچھا نہیں چھوڑتی۔ آ ہا ہا ہا [illegible] میں پانی بھر آتا ہے!

خیالات بھی افسانے کے کرداروں کے ساتھ ساتھ گھوم رہے ہیں۔ جب دردناک حصہ شروع ہوتا ہے تو مُنہ لٹک سا جاتا ہے، آنکھوں [illegible] آنسو اُمڈ آتے ہیں، ایک آدھ سرد آہ بھی کھینچ لی جاتی ہے۔ ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی بخار چڑھے گا۔ اور پھر جب [illegible]بت کی فتح کا وقت نزدیک آتا ہے تو آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے، چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی ہے، سر کسی نامعلوم [illegible] پر ہلنے لگتا ہے، طبیعت میں جوش پیدا ہو جاتا ہے، کسی سے لڑ پڑنے کو جی چاہتا ہے ــــ غرضیکہ اسی طرح افسانے کی ایک ایک [illegible]طر کے ساتھ پینترے بدلے جاتے ہیں ــــ! انہی خیالات میں مدہوش ہوتے ہیں کہ ایک زوردار کڑاکے کے ساتھ بجلی گرتی [illegible]، ایک زبردست طوفان آتا ہے، اور چلا جاتا ہے پھر آنکھوں کے سامنے ایک خلاء چھا جاتا ہے ــــ ایک وسیع خلاء! خیالات [illegible]تشر ہو جاتے ہیں، روح پر ایک عجیب سی بے چینی مسلط ہو جاتی ہے۔

یہ سارا سلسلہ کچھ اس طرح منقطع ہو جاتا ہے جیسے سینما ہال میں فلم یک لخت ٹوٹ جائے! نیچے لکھا ملتا ہے "باقی دیکھئے صفحہ فلاں پر"۔ اُس وقت دل پر کیسی کیسی قیامتیں گزر جاتی ہیں، ہم اپنے آپ کو کس قدر مظلوم سمجھتے ہیں، دُنیا بھر کے ستائے ہوئے ــــ دُنیا بھر [illegible] ہمدردی کے مستحق!

خدایا کیا سے کیا ہو گیا؟ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

لیکن قہرِ درویش برجانِ درویش! سب کچھ سہنا پڑتا ہے، اور "صفحہ فلاں" کھول کر پھر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں لیکن اس [illegible]ہ وہ جوش و خروش ہرگز باقی نہیں رہتا۔

بعض اوقات تو ایسے موقعوں پر نہایت وحشیانہ خیالات آنے لگتے ہیں کئی مرتبہ ہونٹ دبا دبا کر مُکے کسے جاتے ہیں۔ اور ایسے [illegible]سے منصوبے باندھے جاتے ہیں جن کا ذکر کرنا خالی از خطرہ نہ ہوگا۔

مثلاً ایک دل ہلا دینے والا خونچکاں افسانہ پڑھ رہے ہیں۔

ہیروئن نے پیار سے کہا "یوں ٹال مٹول کرنے سے فائدہ؟ میں ہمیشہ سچے انسان کو پسند کرتی ہوں، آپ جو مجھ سے کھنچے کھنچے [illegible]ے رہتے ہیں اس کی وجہ دریافت کرنا چاہتی ہوں، ــــ جو کچھ معاملہ ہے خدا کے لئے صاف صاف بتا دیجیے!"

ہیرو نے کہا "آہ! یوں کہوں تو بھی مشکل، دُوں کہوں تو بھی مشکل ــــ تم مانو گی نہیں!"

ہیروئن بولی "یہ آپ میں اتنی تبدیلی آ کیسے گئی ــــ التجائیں کر رہی ہوں پھر بھی آپ نہیں بتلاتے۔"

ہیرو بولا "اچھا تو سن لو صاف کہے دیتا ہوں ــــ لیکن کیا خاک بتاؤں ــــ دکھ لگتا ہے! ــــ اچھا تو سنو ــــ میں کس طرح [illegible]ہیں سمجھاؤں کہ ــــ"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس کی آرزو یہ ہوتی کہ کسی دن کوئی سائیکل والی اس بھیڑ میں ایسی گھر جائے کہ اسے مدد کی ضرورت پڑے۔ اس وقت کوئی راہی اگر اس حسینہ کی مدد کرے تو کیا وہ شکریہ کا مستحق نہیں ہو سکتا؟ یہ کہ شکریہ کی شکل کیا ہوگی، اور اس سے اسے کیا حاصل ہوگا، یہ بات یہیں ختم ہو جائے گی یا اس کا کوئی انجام بھی ہوگا، اس لمبے چوڑے سوچ بچار میں وہ کبھی نہیں پڑا تھا۔ وہ ایسے کسی واقعہ کا منتظر فقط اس لئے تھا کہ اس خدمت سے لاہور میں کم از کم ایک عورت کو تو یہ احساس ہو جائے گا کہ مرغوب بھی اس دنیا میں موجود ہے، ورنہ بیسیوں جوان نگاہیں، بیسیوں سڈول جسم، بیسیوں ہی بجلیاں اسکی آنکھوں کے سامنے کوند جاتیں، مگر بے پروا، ناواقف، مغرور جیسے وہ کوئی مٹی کا ڈھیر ہے یا کوئی پرچھائیں۔ کبھی وہ یہ بھی سوچتا کہ کیا دنیا کی لذتوں میں اس کا اتنا بھی حصہ نہیں کہ کوئی ایک منٹ کے لئے اسے ایک ذی روح انسان جان کر اس کی طرف توجہ سے دیکھ لے۔ مانا وہ غریب ہے، وہ سوٹ نہیں پہن سکتا، وہ شکل صورت کے لحاظ سے بھی کچھ ایسا ممتاز نہیں، معمولی نوجوان ہی سہی مگر کیا معمولی نوجوانوں کا زندگی پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ کیا وہ اس لائق بھی نہیں کہ کوئی آوارہ نگاہ اسے ایک بار ہی غور سے، دلچسپی سے دیکھ لے۔ بس ایک بار کوئی رس بھری مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں سما جائے۔ ایک دفعہ ہی کوئی اسے شکریہ، کہہ کر مسحور کر دے۔ کیونکہ مرغوب کی اب یہ حالت تھی کہ ہر جوان لڑکی اس کے لئے جاذبِ نظر اور ہر ہنسی اس کے لئے برق پاش تھی۔ بعض دفعہ تو وہ صبح ساڑھے نو بجے کی تجلیات سے اتنا متاثر ہو کر آتا کہ سارا دن اس کا دماغ شل سا رہتا۔

مگر یہ عجیب بات تھی کہ جب بھی وہ ان بھرے ہوئے گول کولہوں کو لچکتا اور ان سفید یا گندمی ٹخنوں کو چمکتا دیکھتا تو اسے یہ خیال نہ آتا کہ یہ جوان لڑکیاں اور عورتوں کی طرح گوشت پوست کی بنی ہوئی ہیں، اوروں کی طرح کھاتی پیتی ہیں، اور اپنے گھروں میں معمولی انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتی ہیں۔ اس نے کسی نوجوان غیر عورت سے ابھی تک بات ہی نہ کی تھی۔ اس کے لئے وہ ایک نئی مخلوق تھیں اور اک نئی دنیا میں رہتی تھیں جس کا تصور اس کے قیاس کی بات نہ تھا۔ کیا ایسے سینوں میں کوئی کسک بھی پیدا ہو سکتی ہے، کیا یہ مطمئن حسین چہرے کسی درد سے بے تاب بھی ہو سکتے ہیں، یہ مسئلہ نہ اس کے ذہن میں آیا نہ اس نے اس کے کسی پہلو پر کبھی غور ہی کیا تھا۔ اسے اپنی امیدوں اور آرزوؤں کی صحیح غایت بھی معلوم نہ تھی۔ ہر وقت اک موہوم سا ہیجان، ایک جذباتی دھند بن کر اس کے دماغ پر چھایا رہتا تھا اور اسی دھند میں اپنے تخیل کی مدد سے وہ کچھ سنہری اور ارغوانی نقوش قائم کرتا رہتا۔

جب کبھی اسے اپنی ماں کی علالت کا شدید احساس ہوتا تو وہ باہر نکل جاتا اور اِدھر اُدھر گھوم کر واپس گھر آجاتا۔ وہ چاہتا کہ قرض لے کر ہی اپنی ماں کا علاج کسی اچھے ڈاکٹر سے کرائے مگر اس کی ماں کبھی رضامند نہ ہوتی۔ اسے ڈاکٹروں پر اعتماد نہ تھا۔ اگرچہ مرغوب کو یہ کبھی یقین نہ آیا کہ اس کی ماں واقعی ڈاکٹری علاج کو برا سمجھتی ہے کیونکہ بچوں کی بیماری میں اس کی ماں ہمیشہ ہسپتال کی دوا استعمال کر لیتی۔

اس کی بہن ہر وقت کچھ سیتی پروتی رہتی۔ ان کے پاس ایک پرانی مشین تھی اور اس کی بہن نے محلے والیوں کے کپڑے سی سی کر خاصی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی بہن محلے والیوں کے کپڑے اُجرت پر سیتی ہے اگرچہ اس کی ماں نے اس بات کو مرغوب سے ہمیشہ چھپانے ہی کی کوشش کی۔ اب اسی بہن کی شادی کا سوال درپیش تھا، چیزیں اس قدر مہنگی تھیں، سونا غریب پہن ہی نہیں سکتے تھے، پھر بھی برات کا خرچ تھوڑا بہت جہیز، معلوم نہیں کتنا روپیہ خرچ ہوگا۔ الٰہی! یہ روپیہ کہاں سے آئے گا! اسے بھی شبہہ تھا کہ اس کی ماں انہی فکروں سے ماندی رہتی ہے۔

جب بھی وہ گھر سے نکلتا، انہیں خیالات کو لئے نکلتا۔ مگر دس منٹ چلنے کے بعد جب وہ اس سڑک پر پہنچتا تو ایک ایک کر کے گھر کے تمام افکار اس کے دماغ سے اُتر جاتے۔ کبھی وہ اس فرو گذاشت سے پشیمان بھی ہوتا اور اکثر ارادہ کرتا کہ اس بے فائدہ تفریح کو ترک کر دوں گا مگر نہ جانے کیوں دوسرے ہی دن اس کے قدم غیر شعوری طور پر اسی جانب پلٹ جاتے۔ اور وہ پھر اسی کی سی اک نئی امنگ، ایک نئی تڑپ، اک نئی شکست سے دوچار ہو جاتا۔

سہ پہر کو جب وہ پانچ بجے دفتر سے نکلتا تو اور کلرکوں کے ہمراہ رسمی گفتگو کرتا واپس گھر چلا آتا۔ اس کا کوئی دوست نہ تھا، نہ کسی نے کبھی اس سے دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اور نہ وہ خود ہی کسی سے خلوص کا متوقع ہوتا۔ سیاسی مسئلوں سے اسے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ لڑائی کی خبریں البتہ وہ ضرور غور سے سن لیتا اور اگر کوئی اس سے رائے طلب کرتا تو انگ

ایک چھوٹی سی بات

مرغوب حسبِ معمول نو بجے کھانا کھا کر دفتر جانے کے لئے گھر سے چل پڑا۔ پیدل جانے کے لئے اسے فقط بیس منٹ درکار تھے مگر اس کا راستہ کچھ عرصے سے ایسا طویل ہو گیا تھا کہ وُہ دس بجنے میں پانچ منٹ ہی پر دفتر پہنچ سکتا۔ نہ اس سے کوئی پوچھتا کہ وہ راستہ کاٹ کر ایسی سڑک سے کیوں گذرتا ہے جس پر لڑکیوں کے دو ہائی اسکول واقع ہیں، نہ اس نے خود کسی کو یہ بتانا ضروری سمجھا تھا۔ یہ اس کا اپنا راز تھا جسے وُہ دل کے کانپتے ہوئے پردوں میں چھپائے رکھتا۔ بیس منٹ کے لئے ہر روز مرغوب اس سڑک پر سے آہستہ آہستہ دل کو تھام تھام کر گذرنا۔ اس کے لئے یہ سڑک اِک کم و بیش ہموار خطّۂ خاک نہ تھی جس پر تانگوں، موٹروں اور سائیکل والیوں کا ہجوم ہو، اس کے لئے سوگز کا یہ قطعہ اس کی اپنی غربت، اس کی ماں کی مسلسل بیماری اس کی بہن کی شادی کے مصارف کے سلسلے میں پریشانی، اس کے چھوٹے بھائی کی فیس ادا کرنے کی مشکلات کا نعم البدل تھا۔

اس سڑک پر وہ کبھی تانگے والوں کا شور نہ سنتا، اس کے کان اکثر موٹروں کے ہارن سے بے خبر ہوتے۔ اسے یہاں کبھی کوئی میٹھا مترنم قہقہہ، کوئی بے ربط جملہ یوں سنائی دیتا جیسے کسی پازیب کی جھنکار! ایک آدھ غلط انداز نظر، دو ایک متحرک شعلے، کوئی تیز چھپلتی ہوئی نظر یا کوئی موہوم سا مژدہ یہاں اسے ہر روز نصیب ہو جاتا جس کا اثر وہ دن بھر اپنے بدن کے ریشے ریشے میں سرایت کرتا ہوا محسوس کرتا۔ ورنہ سارا دن لفافوں پر پتے لکھتے رہنا یا ڈاک درج کرتے رہنا کس کی خوشی کا باعث ہو سکتا ہے؛ چنانچہ اس سے غلطیاں بھی ہوتیں، ہیڈ کلرک صاحب اس سے خفا بھی ہو لیتے، مگر اس کے دماغ میں صبح کی جاں بخش آوازیں اور اس کے دل میں کسی کے ہنستے ہوئے ہونٹ محفوظ ہوتے اور اس بخیل کی طرح جو اپنی پونجی کو کھول کر ایک ایک روپیہ پھر سے گن کر صندوقچی میں روز بند کرتا ہو، وہ ایسی باتوں کی سلگتی ہوئی یاد دن میں کئی بار تازہ کر لیتا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کے تخیل میں کچھ شعریت ہے بھی کہ نہیں۔ اس کی تعلیم بھی ایسی زیادہ نہ تھی انٹرنس پاس کرتے ہی ملازمت کی تلاش میں رات دن ایسے سرگرداں رہنا پڑا تھا کہ اسے جوانی کے طویل خیالات کا زیادہ تجربہ ہی نہ ہوا تھا۔ اور نہ اسے اوّل اوّل فرصت ہی ہوتی تھی کہ وہ اپنے جذبات کا تجزیہ کرنے یا اپنی تھکن کو کسی روحانی تسکین سے دور کرنے کی کوشش کرے۔ جیسے یہ معلوم نہ ہو کہ شام کو جب وہ جگہ جگہ پھر کر مایوس گھر واپس آئے گا تو اسے پیٹ بھر کھانا بھی نصیب ہو گا یا نہیں، اسے دماغی آسائش کا خیال کم آتا ہے۔ اگرچہ وہ دن اب دُور رہ گئے تھے مگر ان کا اثر اس کے احساسات میں ابھی تک موجود تھا۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ دنیا کی نعمتوں میں اس کا بھی حصّہ ہے۔ اسے یہی ڈر ہوتا کہ کہیں کسی ناگہانی حادثے کی وجہ سے اس کی ملازمت نہ چھن جائے۔ کہیں یہ ۵۴ روپے جو پانچ سال کی ترقیوں کے بعد اسے اب ملتے تھے یک لخت اس سے لے نہ لئے جائیں۔ ان پانچ برسوں میں اسے ایک ہی خواب کئی بار بعینہٖ ایک ہی صورت میں دکھائی دیا تھا کہ وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ہے اور اس کا ہیڈ کلرک جو کبھی اس سے نرمی کے ساتھ پیش نہیں آیا تھا، رحم کی نظر سے اسے دیکھ رہا ہے اور دوسرے کلرک بھی کبھی کبھی اس کی طرف ہمدردانہ نگاہ ڈال لیتے ہیں۔ اس کے سامنے میز پر کاغذ کا ایک ورق پڑا ہے جس پر دو تین سطریں ٹائپ کی ہوئی ہیں اور اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے، اس کے کندھوں پر منوں بوجھ پڑا ہے اور اس کا دماغ سوچنے سے عاری ہے۔

اس کی عمر اب چوبیس سال کی تھی۔ چھ سال ہوئے اس کا باپ تپ محرقہ سے مر گیا تھا تو اُس بےچارگی کی حالت میں اس کے چچا نے ان کے لئے دو سال تک ۱۵ روپے ماہانہ مقرر کر دیا تھا۔ اسی چچا کی ایک لڑکی سے اس کی ماں نے مرغوب کی منگنی دو سال ہوئے کر دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ زینب کے سانولے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں اور اسی چیچک کی وجہ سے ایک آنکھ میں کچھ نقص بھی واقع ہو گیا ہے مگر اسی چچا نے مصیبت کے وقت ان کے خاندان کی مدد کی تھی۔ زینب کی عمر اب اٹھارہ سال کی تھی ۔۔۔ ایک دفعہ زینب کی ماں نے اشارۃً کہہ بھی دیا تھا کہ لڑکی اب جوان ہو گئی ہے۔

[illegible] آنے پھر جانے کیوں مرغوب کو صبح کے وہ بیس منٹ بہت عزیز معلوم ہوتے ۔۔۔

[illegible]

تھی۔ یعنی یہ قالین دو سوا دو سال میں ختم ہوتا تھا۔ بیگم نے کہا۔
یہ پھٹے ہوئے کپڑوں والے کشمیری کتنے ہوشیار ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے باوجود یہ اپنی غربت اور جُوؤں سے نجات نہیں پا سکتے؛
میں نے کہا، تم سُن نہیں رہی تھیں، وہ زمیندار اُس دن کیا کہہ رہا تھا کہ اکبر نے جس علاقے کی زمین کا مالیہ معاف کر دیا تھا وہاں کے لوگوں کو اب اس قدر مالیہ دینا پڑتا ہے کہ وُہ بے چارے اپنی زمین مفت چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ خدا جانے یہ درست ہے یا نہیں۔ زمیندار کا تو بیان تھا کہ آئینِ اکبری میں یہ واقعہ درج ہے کہ اکبر نے جب اس علاقے کی پتھریلی زمین کو دیکھا تو اُس نے کہہ دیا کہ یہاں اگر میری رعایا میں سے اگر کوئی بسے تو وہ میرا ویران ملک آباد کرتا ہے۔ لہذا اُس سے مالیہ نہیں لینا چاہئے۔ پھر یہ لوگ مفلس نہ ہوں تو کیا ہوں۔ آخر کشمیر میں بستے ہیں،

ہم سامانِ سفر باندھ کر امیرا کدل سے راولپنڈی کے لئے بس میں سوار ہوئے۔ کشمیر اپنی تمام دلکشیوں اور رعنائیوں سمیت ہماری نظروں سے آہستہ آہستہ اوجھل ہونا شروع ہو گیا۔ شام کے قریب ہم کوہالہ پہنچ گئے۔ یہ کشمیر کی سرحد تھی۔ بس والے نے موٹر میں پانی ڈالا۔ سواریوں نے بھی ہاتھ مُنہ دھویا۔ بس اب تیز رفتاری سے راولپنڈی کی طرف بڑھنے لگی۔ دو زرد رو کشمیری بچے مَیلی کچیلی شلواریں پہنے ہوئے قمیص کے بغیر بس کو چلتا دیکھ کر بس کے پیچھے دوڑنے لگے۔ وُہ دونوں چلا رہے تھے۔
'سلام، اک پونسہ بخشش۔ سلام، اک پونسہ بخشش۔ سلام......'
بس آگے بڑھتی گئی اور معصوم آوازیں انجن کے شور میں جذب ہو کر خاموش ہو گئیں۔ بچے چند قدم دوڑ کر رُک گئے۔
تھکے ہوئے مسافر سوچ رہے تھے۔

کیا یہی کشمیر ہے؟

محمد باقر

اشارات

آ گئی کچھ وقت سے پہلے ہی شام
اور یہ طوفانِ ابر و باد یہ کالی گھٹا
دیکھتے ہی دیکھتے ہر سو اندھیرا چھا گیا
ہو رہا ہے روزِ روشن کا تہ و بالا نظام
کون جانے اب سحر ہو یا نہ ہو
کیا خبر وہ دور جو اُٹھتا ہے دھندلا اور مبہم سا غبار
پیش خیمہ ہے نئے طوفان کا
یا اُسی جا ختم ہو جائے گا یہ طوفان بھی
حشر برپا ہے مرے دل میں امید و بیم کا
بن گئی ہے اک عذابِ مستقل اب زندگی
ہو چکا ساری تمناؤں کا خوں
پھر بھی تیرا انتظار
آج کی شب تو کروں گا میں ضرور

م۔ ا۔ کلیم

کی وجہ سے اپریل سے ستمبر کے آخر تک یہ پھول باغ کو رشکِ جنت بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھولوں کی کیاریوں سے پرے دونوں طرف باغ میں سیب، ناشپاتی، آلوچہ، آلو بخارا اور کئی طرح کے پھلوں کے درخت ہیں۔ بہار اور اواخرِ بہار تک یہ درخت پھلوں سے لدے کھڑے رہتے ہیں۔ اور کشمیر کا بہترین پھل انہی درختوں سے حاصل ہوتا ہے۔ فواروں اور نہر کی روانی سے لذت اندوز ہوتے ہوئے ہم نے تمام تختوں کی سیر کی۔ نہر کے دونوں طرف متمول غلام اپنی "نصف بہتروں" کے ساتھ اُن روشوں پر آجا رہے تھے جہاں کسی زمانے میں صرف شہنشاہوں اور اُن کی بیگمات کے قدم ہی پڑتے تھے۔ رعایا اور پھر غلام رعایا کی یہ سربلندی مضحکہ خیز سی تھی۔ ایک قدیم سنگین مدوّر نشست سے ایک ساری پوش کا پاؤں پھسلا تو فرطِ غیظ سے جھنجلا کر میاں سے بولیں۔

"دیکھئے یہ کتنے بدتمیز تھے اس کے بنانے والے۔ یہ نہیں سوچا کہ اس قدر صاف جگہ پر کوئی چل کیسے سکتا ہے۔ آخر جو یہاں آکر بیٹھتا ہوگا وہ چل کر ہی تو آتا ہوگا"

میاں نے ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "بیگم آپ کا خیال کسی حد تک درست ہے۔ لیکن میرا خیال ہے آپ کے پھسلنے کی اصلی وجہ آپ کا اونچی ایڑی کا جوتا ہے۔ میں نے کہا نہیں تھا آپ ہائی ہیل پہن کر نہ چلیں۔"

میرے جی میں ایک دفعہ تو آئی کہ آگے بڑھ کر کہہ دوں "حضور اس کے بنانے والے اتنے بدتمیز نہیں تھے جتنے آپ ہیں۔ یہ نشستیں بیگمات کے لئے تھیں کہ وہ یہاں بیٹھ کر باغ اور ڈل کا نظارہ کر سکیں اور جب وہ ان نشستوں پر بیٹھنے کے لئے آتی تھیں اُس وقت ان کے لئے روشوں پر کمخاب بچھائی جاتی تھی اور نشستوں پر قالین۔ پھر اُن کے جوتے پاؤں کو کبڑا کر دینے والے نہیں ہوتے تھے جس سے وہ آسانی سے چل بھی نہ سکتی ہوں اور نہ فرنگی کی نقل کا انہیں اس قدر شوق تھا کہ وہ اپنے خوبصورت جوتوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے گاہ دبیگاہ اونچی ایڑی کے جوتے استعمال کرتیں۔ اگر فرنگی کی نقل ہی کرنا ہے تو سیر کے لئے چھوٹی ایڑی کے جوتے پہنا کیجئے۔ اور گھر سے دری ان نشستوں پر بچھانے کے لئے اٹھا لایا کیجئے کیونکہ مغلئی قالین تو اب آپ اپنے پاس رکھنے سے رہے"

لیکن بیگم نے روک دیا۔ کہنے لگیں "آپ بے طلب مشورہ دے کر مفت میں پٹ جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ اپنی رائے اپنے آپ تک محفوظ رکھئے۔ یہ آزاد لوگوں کی تعمیرات ہیں۔ غلاموں کا شعور ان تعمیرات کے صحیح استعمال تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ آپ کیوں سر کھپاتے ہیں"

میں چپ رہا۔ نشاط سے فارغ ہو کر ہم گھومتے ہوئے شالامار پہنچ گئے۔ یہاں بھی نمائشی افراد کا وہی اژدہام تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ شالامار کی بارہ دری کے سامنے تمام فوارے چھوٹ رہے تھے اور ان فواروں سے بجلی کی رنگین روشنی سے مختلف رنگوں کا جو پانی اوپر اُچھلتا اُس سے قوس قزح کا سماں بندھ جاتا۔ شالامار میں پھولوں کی وہ کثرت اور زیبائش نہیں جو نشاط میں ہے لیکن وسطی نہر اور فواروں کا منظر بدرجہا زیادہ خوشنما ہے۔ ہم شام تک شالامار میں گھومتے رہے اور وہاں سے سیدھے سری نگر کی نمائش کو چلے گئے۔ یہ نمائش سری نگر میں ستمبر کے وسط یا اواخر میں ہر سال لگتی ہے اور یہاں صرف کشمیر کی مصنوعات رکھی جاتی ہیں۔ نمائش ایک محدود سے میدان میں لگتی ہے لیکن اس قدر خوبصورت انتظام شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ دُکانیں نہایت قرینے سے سجائی جاتی ہیں اور خالی جگہ گہرے رنگ کے سبزے اور پھولوں سے سجا دی جاتی ہے۔ نمائش میں گھومتے پر چاندی، لکڑی، بید، کپڑے، اون، پتھر اور کاغذ کا بنا ہوا جو سامان دیکھا تو کشمیریوں کی دستکاری دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ تمام چیزیں اتنی دلکش اور اس قدر نفاست سے تیار کی گئی تھیں کہ ہر ایک چیز کو دیکھ کر داد دینی پڑتی تھی۔ تمام چیزوں کی تفصیل دینا ناممکن ہوگا لیکن سری کرن فیکٹری کی بنی ہوئی چھ سو روپے کی ایک اونی شال اور اسی کارخانے کے ایک قالین کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں ایک انچ میں تین ہزار سے کچھ زائد STITCH تھے۔ نفیس قالینوں کے بننے میں ایران تمام دنیا سے سبقت لے گیا ہے لیکن یہاں اس وقت ہمارے سامنے کشمیری اُس قالین کو بن رہے تھے جو ایران کے نفیس ترین قالین سے زیادہ نفیس تھا۔ اس قالین کا بنا ایک گز تھا اور تین کاریگروں کی روزانہ بُنت کی رفتار ڈیڑھ انچ کے قریب

باقی تھے۔ سکّہ کھن سے جو گرا تو تعویذوں کا نگہبان جو مقفل دروازے کے اندر سنگِ مرمر کے فرش پر سو رہا تھا، سکّے کی جھنکار سے جاگ کر بِھُو کے شیر کی طرح سکّے کی طرف لپکا۔ اُس کا سکّے کو پکڑنا تھا کہ میرا ناخواندہ سبز پوش رہنما کفِ دردہاں ہو گیا۔ سکّے پر تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی لیکن سبز پوش کے لئے مصیبت یہ تھی کہ وہ مقفل دروازے کے اندر نہ جا سکتا تھا۔ نگہبان کا نظریہ یہ تھا کہ سکّہ اُسے خدا نے اماموں کی وساطت سے بھیجا تھا اس لئے وہ اُس کا واحد مالک تھا لیکن رہنما بار بار میری طرف اِشارہ کر کے اس سے کہہ رہا تھا کہ یہ سکّہ مجھے فاتحہ پڑھانے کے عوض اُسے دیا گیا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھُلنے کا وقت ہو گیا۔ نگہبان نے اندر سے دروازہ کھولا۔ مَیں نے تعویذوں کی زیارت کی اور باہر نکلا تو دیکھا کہ نگہبان اور رہنما دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ دونوں نے مجھ سے انصاف کی درخواست کی۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ اس طرح بیکار جھگڑا کرنے کی بجائے یہ بہتر ہو گا کہ وہ دونوں سکّے کو برابر برابر تقسیم کر لیں۔ لیکن وُہ اس پر رضامند نہ ہوئے۔ دفعتہً مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے نگہبان سے کہا کہ وہ سکّہ مجھے دے دے اور میں انصاف کر دوں گا۔ جُوں ہی نگہبان نے سکّہ میرے ہاتھ پر رکھا میں نے سکّے کو جیب میں ڈال لیا۔ وُہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو کر حیرت سے میری طرف تکنے لگے۔ میں نے کہا:-

"یہ سکّہ میں نے نہ تو فاتحہ پڑھانے کے عوض دیا ہے اور نہ خدا نے اِس سکّے کو بھیجا ہے۔ میں نے یہ سکّہ اماموں کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے انہوں نے اسے قبول نہیں کیا جو یہ تم جیسے جھگڑالو آدمیوں کے قبضے میں آ گیا ہے۔ لہٰذا میں اپنی پیشکش کو واپس لیتا ہوں"

یہ کہہ کر میں آگے بڑھنے لگا تو دونوں چلّانے لگے کہ انہیں میرا پہلا فیصلہ منظور ہے۔ یعنی وہ دونوں پچیس پچیس فلس لینے کے لئے تیار ہیں۔ مَیں نے خود ہی دونوں کو پچیس پچیس فلس دے دیئے۔ اور رہنما نگہبان کو گھورتا اور کچھ بڑبڑاتا چلا گیا۔ میں یہ سوچتا ہُوا روضہ سے باہر نکل آیا کہ اِن رہنماؤں اور نگہبانوں کی حیثیت چیلوں اور گِدھوں سے کچھ ہی مختلف ہے۔

اُسی طرح کا ایک منظر اس وقت کشمیر میں میرے سامنے تھا اور میں نے مندرجہ بالا واقعہ بیگم کے سامنے دہرایا۔ بیگم کہنے لگیں۔ "کاظمین میں کم از کم آپ کو یہ تو یقینی طور پر معلوم تھا کہ وہاں دو امام مدفون ہیں۔ لیکن نلی میں یہ جو تین انچ لمبا بال آپ کو نظر آ رہا ہے اس کی صحت کے متعلق آپ کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ حضرت صاحب کی ریشِ مبارک کا یہ بال اِن عبا پوش "مہوسوں" کے قبضے میں آ گیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ مت پوچھئے۔ یہ کشمیر ہے"!

اور ہم روتے ہوئے مردوں اور عورتوں کو چھوڑ کر شکارے میں بیٹھ کر واپس آ گئے۔

تعطیلات ختم ہونے کو آ گئیں۔ سری نگر اچھا خاصا سرد ہو گیا تھا۔ کشمیریوں نے اپنی کانگڑیاں پیٹ کو گرم رکھنے کے لئے سنبھال لی تھیں۔ شالی کی فصل کٹ جانے سے زمین اُجڑی اُجڑی سی نظر آتی تھی۔ بیگم نے کہا۔ ہم اگلے اتوار کو یہاں نہیں ہوں گے۔ اِس اتوار کو نشاط اور شالامار کو آخری بار ایک مرتبہ ضرور دیکھنا چاہئے۔ نشاط اور شالامار میں ہر اتوار کو میلہ لگتا ہے لیکن یہ میلہ حضرت بل والے لوگوں کا نہیں۔ یہ اُن لوگوں کا میلہ ہوتا ہے جن کی امارت کشمیر کی غربت کا مُنہ چڑانے کے لئے ہر سال بیرونِ کشمیر سے آ کر کشمیر کی پھٹی ہوئی گدڑیوں اور چِھچھڑوں والے لباسوں کے سامنے اپنی نمائش زرق برق معطّر ساریوں اور سوٹوں کی شکل میں کرتی ہے۔ ہم مکان سے نکل کر پیدل چلتے ہوئے نشاط تک پہنچ گئے۔ راستہ موٹروں، تانگوں اور بسوں سے پٹا پڑا تھا۔ ان کے علاوہ باغ کے شائقین ڈل کے راستے شکاروں اور ہاؤس بوٹوں میں بیٹھ کر آ رہے تھے۔ نشاط اور شالامار کشمیر میں باغ پسند مغلوں کی یادگاروں میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ نشاط کے عین سامنے جھیل ڈل اپنی محدود لیکن خوشنما وسعت کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے۔ نشاط کے سات تختے ہیں اور ہر تختہ دوسرے تختے سے نسبتہً بلند ہے۔ باغ کے عین وسط میں ایک نہر جاری ہے جو ساتوں تختوں کو سیراب کرنے کے علاوہ اُن فواروں کو بھی چلاتی ہے۔ جو اس نہر کی گذرگاہ کے بیچوں بیچ لگائے گئے ہیں۔ نہر کے دونوں جانب پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ جہاں نوروز کے دنوں میں کے خوبصورت ترین پھول کشمیری باغبانوں نے نہایت قرینے سے لگا رکھے ہیں۔ موسم موافق ہونے

کی صدا بلند ہوئی۔ اور سب لوگوں نے اپنی جیبیں ٹٹولنی شروع کر دیں۔ منبر کے قریب جو لوگ تھے اُنہوں نے فوراً پیر کے ہاتھ میں چاندی کے سکے دینے شروع کئے اور پیر نے ہر ایک سکہ دینے والے گاہک کی آنکھوں پر نلی کا پیندا لگاتا۔ پیندے کو آنکھوں سے چھونے لوگ پیچھے ہٹنے شروع ہوئے۔ چاندی کے سکے والوں کے بعد تانبے کے سکے والوں کی باری آئی۔ جو لوگ زیادہ سکے اُن کی آنکھوں پر بار بار نلی لگائی جاتی۔ جو لوگ پیسہ یا دھیلا دیتے اُن کو صرف ایک بار لمس کا شرف بخشا جاتا۔ جب سے فراغت ہو گئی تو نلی اندر عورتوں کے لئے بھیج دی گئی۔ لیکن عورتوں کو ناپاک سمجھ کر نلی کو چھونے کی اجازت نہ دی گئی۔ چاندی یا تانبا دے کر صرف قریب سے نلی کو دیکھ سکنے کی مجاز تھیں۔ ہم دُور کھڑے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ منبر کے پیر کے گماشتے نے ہماری دلچسپی کو بھانپ کر ہمارے پاس آکر کہا :-

"آپ بال نہیں دیکھی۔ زیارت کرو گی؟"

ہم نے کہا "ہم نے زیارت کر لی ہے"

ایسا معلوم ہوتا تھا پیر کا گماشتہ بال دکھانے کے لئے ہمارے ساتھ سودا کرنا چاہتا تھا۔ سادہ لوح کشمیریوں کی عقیدت ایک بال کے لئے یہ احترام دیکھ کر اقبال مرحوم یاد آ گئے۔ ؎

شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن

پھر خیال آیا کہ بت شکن مسلمانوں کے ایسے بت ساری دُنیا میں موجود ہیں۔ اقبال مرحوم نے شاید صرف ہندوستان کے حالات ہو کر اپنے جذبات کو قلمبند کیا تھا لیکن مجھے دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ایسی مثالیں کثرت سے نظر آئیں۔ بغداد میں رہتے ہم ایک دن کاظمین جانے کا اتفاق ہوا۔ کاظمین عراق کے چار اہم متبرک مقامات میں سے ایک ہے اور بغداد سے بس میں دو (پیسے) میں کاظمین پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں دو امام (غالباً امام موسےٰ اور امام محمد تقی) پہلو بہ پہلو مدفون ہیں۔ میں کاظمین کے عالی شان کا طواف کر رہا تھا کہ ایک سبز پوش میرے پیچھے پڑ گیا۔ وُہ ٹوٹی پھوٹی اُردو بول سکتا تھا اور میری رہنمائی پر مصر تھا۔ مَیں نے اُسے کہا کہ یہاں فارسی اور عربی میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وُہ مَیں پڑھ سکتا ہوں اور سمجھ سکتا ہوں۔ علاوہ ازیں میرے پاس رہنمائی کی کتابیں ہیں لیکن وُہ کسی طرح نہ ٹلا اور رہنمائی کا خیال ترک کرنے پر جب وُہ یہ اصرار کرنے لگا کہ میں اماموں کے تعویذ کا بوسیدہ غلاف کا ایک ٹکڑا اُس سے خرید لوں تو میں نے اپنی نجات اسی میں سمجھی کہ میں فاتحہ پڑھنے لگوں۔ چنانچہ میں ایک کے پاس بیٹھ کر فاتحہ پڑھنے لگا۔ یہ بلائے بے درماں بھی میرے ساتھ گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد جب میں لگا۔ تو سبز پوش نے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے پھر بٹھا لیا اور کہنے لگا۔

"مَیں نے تمہیں فاتحہ پڑھایا ہے۔ اِس لئے میری اُجرت ملنی چاہئے"

میں نے کہا "فاتحہ تو میں نے خود پڑھا ہے۔ تم نے تو نہیں پڑھایا۔ البتہ مَیں اس طرح تم سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا اُس میں مَیں کامیاب نہیں ہوا۔ اب تمہیں اُجرت کاہے کی دوں"

سبز پوش بولا "امام کے مزار پر خالی ہاتھ نہیں آنا چاہئے۔ اگر مجھے کچھ نہیں دیتے تو امام کی نذر تو دو!"

بے بسی کے عالم میں مَیں نے جیب سے دس فلس کا سکہ نکالا۔ لیکن سبز پوش نے فوراً میرا ہاتھ جیب میں دھکیلتے ہوئے واپس کر "امام کی نذر چاندی کا سکہ ہونا چاہئے۔ دس فلس سے کام نہیں چلے گا"

میں نے ایک لحظہ تامل کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ چاندی کا سب سے چھوٹا سکہ میرے پاس پچاس فلس کا تھا اور اس بارہ آنے کی رقم کو خواہ مخواہ کیوں ضایع کیا جائے۔ اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں راہِ فرار ملے تو بھاگ نکلوں لیکن ایک تو میرے دربان کے پاس رکھے ہوئے تھے دوسرے میں نے ابھی تک محرابوں کی عبارت کو نقل نہیں کیا تھا اور تصویریں بھی نہیں اس لئے جبراً و قہراً پچاس فلس کا سکہ جیب سے نکالا اور مقفل دروازے کے اندر اماموں کے تعویذوں کے اوپر لڑھکا پوش میرا مُنہ دیکھتا رہ گیا۔ تعویذوں کا دروازہ ایک معین وقت پر روز کھلتا ہے اور ابھی اِس دروازے کے کھلنے میں

پہلگام میں شدید اور مسلسل بارشوں نے جب ناک میں دم کر دیا تو بیگم کی تجویز پر ہم سری نگر اُتر آئے۔ دو چار دن ہاؤس بوٹ میں دریائے جہلم کے اوپر گذارے۔ پھر نشاط کے قریب ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ جمعہ کا دن تھا۔ ہمارا کشمیری ملازم اُسلے کپڑے پہن کر آیا۔ اُس کے گذشتہ سال کے کپڑے اُتار نے پر ہم نے اظہارِ تعجب کیا تو اُس نے بتایا کہ اُس روز "حضرت بل" کا میلہ تھا اور وہاں جانے کے لئے اُس نے لباس تبدیل کیا تھا۔ مزید پوچھنے پر معلوم ہؤا کہ ہمارے مکان کے سامنے ڈل کے اُس طرف ایک گاؤں 'حضرت بل' کے نام سے مشہور تھا جہاں یہ میلہ ہر سال لگتا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم بھی شکارے میں بیٹھ کر 'حضرت بل' جا اُترے۔ حضرت بل میں راستے کے دونوں طرف کھانے پینے کی چیزوں کی دُکانیں تھیں۔ پھل اور مٹھائیاں نئی نئی قسم کی نظر آئیں۔ راستے میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ مرد، عورتیں، بچے کیڑوں کی طرح چل رہے تھے۔ شکارے سے اُترتے ہی ہم نے بھی اپنے آپ کو ہجوم میں گھسیڑ دیا۔ خیال یہ تھا کہ اِس طرح ہم بھی وہاں پہنچ جائیں گے جہاں یہ ہجوم جا رہا تھا۔ لاہور اور اِسی نوع کے دیگر شہروں کے مہذب ترین اور متمدن سے متمدن ہجوم میں بیوی اور بچی کو اس طمانیتِ قلب سے داخل کرنے کی جرات کبھی نہ ہوتی جس اطمینان سے ہم اس ہجوم میں گھس گئے تھے۔ کشمیری بوسیدہ اور بودار کپڑوں میں ملبوس تھے لیکن بچوں، جوانوں، بوڑھوں اور عورتوں کے اِس بے پناہ ہجوم میں کیا مجال جو کوئی آدمی کسی کے ساتھ چھو بھی جائے۔ لاہوری بابوؤں اور کالجیئیوں کی ہا و ہو سے یہ ہنگامہ سراسر خالی تھا۔ سارے میلے کے اژدہام پر ایک مقدس فضا چھائی ہوئی تھی۔ چلتے چلتے ہم ایک وسیع میدان میں پہنچ گئے۔ یہاں نسبتاً زیادہ آسانی سے حرکت کی جا سکتی تھی اور یہیں آ کر اس میلے کی غایت بھی معلوم ہوئی۔

اِس وسیع میدان کے ایک طرف ایک مقبرہ سا بنا ہؤا تھا اور اس مقبرے کے سامنے ایک کشمیری پیر عبا پہنے ہوئے ایک منبر کے سب سے اونچے زینے پر کھڑا تھا۔ اُس کے ارد گرد دو تین اور حواری تھے اور اِن کے سامنے صحن میں کشمیری مردوں کا بے پناہ ہجوم دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے ہوئے زار زار رو رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی منبر پر سے ایک عبا پوش دوڑتا ہؤا ہماری طرف آیا اور ہمیں کشاں کشاں مقبرے کے ایک تاریک دروازے کی طرف لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے مجھے روک دیا اور بیگم اور ناہید کو جوتے اُتار کر آگے بڑھنے کے لئے کہا۔ دونوں خواتین آگے بڑھنے کے لئے تو تیار تھیں لیکن جوتے اُتار کر غلیظ فرش پر چلنے کے لئے آمادہ نہ ہو سکیں۔ اِس لئے اندر جھانک کر واپس مُڑنے لگیں تو پیر نے کہا :۔

'ابھی تھوڑی دیر میں حضرت بل یہیں آئے گی۔ عورتیں یہیں دیدار کرے گا'

میں نے پوچھا 'اور حضرت بل باہر بھی جائے گی'

کشمیری بولا 'ابھی باہر جائے گی۔ مردوں کے پاس۔ عورتیں یہیں دیکھے گا۔ مرد باہر دیکھیں گی۔ تم بی بی جی کو اندر جانے دو۔ اور خود باہر چلو'

میں نے "بی بی جی" سے بہتیرا کہا لیکن بی بی جی تو ایک طرف ناہید بھی اپنے موزوں کو گندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اِس لئے ہم اِس دروازے سے لَوٹ کر پھر صحن میں مردوں کے مجمع میں جا کھڑے ہوئے۔ کشمیریوں کی آہ و بُکا دفعتہً بند ہو گئی اور سناٹے کے بعد ہجوم نے منبر کی طرف یورش کر دی۔ ہم بے تابی سے 'حضرت بل' کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہے تھے اور کوشش کرنے کے باوجود یہ اندازہ نہیں لگا سکے تھے کہ 'حضرت بل' کسی پیر کا نام ہے یا کسی متبرک بلی کو کہتے ہیں۔ اتنے میں منبر پر کھڑے ہوئے پیر نے ہاتھ اُوپر اُٹھایا اور ایک شیشے کی نلی اُس کے ہاتھ میں نظر آئی۔ اِس نلی کا اُوپر کا سرا بند تھا اور نیچے کی طرف چاندی کا ایک روپے کے برابر گول سٹینڈ لگا ہؤا تھا۔ قریب ہونے سے نظر آیا کہ شیشے کی نلی میں تین انچ کے قریب ایک لمبا بال محفوظ ہے اور سارے کشمیر کو۔ یہاں جمع کرنے کا موجب یہی بال ہے۔ جو روایتہً حضرت محمدؐ کا بال ہے۔ اور اِسی بال کے نام پر گاؤں کا نام 'حضرت بل' ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہؤا کہ اِس بال کو سال میں صرف ایک مرتبہ ایک بند کمرے سے نکالا جاتا ہے اور اُس روز یہ میلہ منعقد ہوتا ہے۔ کشمیری عوام کشمیر کے ہر کونے سے اِس بال کی زیارت کرنے کے لئے آتے ہیں اور اِس سعادت کو اپنے سال بھر کے گناہوں کا کفارہ سمجھتے ہیں۔ پیر نے نلی کو ہوا میں بلند کیا تو ہر طرف سے

یا نبی! یا رسول!

اس لئے وہیں رک گیا معلوم ہوا کہ بے چارہ بے دم ہو کر پہاڑ پر پڑا ہوا تھا۔ میرے لئے اب مزید نیچے اُترنا دشوار ہو گیا کیونکہ یہاں ہر ایک انچ کی چڑھائی حد درجہ تکلیف دہ تھی اور جتنا زیادہ میں نیچے اترتا اُتنی ہی زیادہ وقت سے پھر مجھے اوپر چڑھنا تھا۔ یکایک میرے ذہن میں ایک تجویز آئی۔ میں نے قلی کو پکارا اور کہا تم مجھ تک پہنچ جاؤ تو میں ضروری سامان لے کر آگے بڑھ جاؤں گا۔ اس پکار نے قلی پر جادو کا اثر کیا اور وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر کے بعد وہ میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے کیمرے اُس سے لے لئے اور باقی سامان اُس کے پاس چھوڑ کر پھر پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ ساتھی دور نکل کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ گرتا پڑتا میں بھی اُن کے پاس جا پہنچا۔ وُہ سب ٹلین جھیل کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر اونچی اونچی پہاڑیوں کی فصیل کے درمیان شفاف نیلگوں پانی کی ایک جھیل تھی۔ جس میں لٹکتے ہوئے گلیشیروں پر سفید براق عکس پڑ رہا تھا۔ گلیشیروں اور جھیل پر نظر پڑتے ہی سارے راستے کی تھکان رفع ہو گئی۔ جھیل کے گرد گھومتے ہوئے کچھ دور گلیشیروں کے قریب پہنچنے کی بھی کوشش کی لیکن برف پر چڑھنے کا مناسب سامان پاس نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے زیادہ اوپر چڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور کچھ تصویریں لے کر واپس چلے آئے۔

راستے میں قلی بدستور اُسی حالت میں لیٹا ہوا تھا جس حالت میں مَیں اُسے چھوڑ کر گیا تھا۔ پارٹی کے لوگ اُسے دیکھ کر ناراض ہونے لگے کہ اُس نے جو دام چکائے تھے اُن کے عوض میں اس نے پورا کام نہیں کیا۔ کیونکہ یہ ٹھیک ٹلین تک ساتھ نہیں پہنچا تھا۔ کچھ لوگوں کی یہ رائے تھی کہ اُسے بارہ آنے کے بجائے صرف آٹھ آنے دیئے جائیں۔ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے ہم پتھروں والے پہاڑ کے دامن تک پہنچ گئے۔ یہاں چشموں کے پاس سبزہ زار میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ پاس ہی ایک گوجر کا جھونپڑا تھا۔ گجروں نے لذیذ دودھ گرم کر کے دیا۔ چھاچھ اور مکھن سے تواضع کی اور واپسی پر ہمیں نہایت کم قیمت پر مُرغیاں اور انڈے دے دیئے۔ گجروں سے خرید و فروخت کر کے ہم نے نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ اب کے حمید نے نئے کرتب دکھائے چیل اور دیودار کے درختوں کے نیچے پہاڑ کی ڈھلان پر چیل اور دیودار کے سوکھے پتوں کا فرش بچھ رہا تھا۔ ہم اس پر بمشکل چل سکتے تھے لیکن حمید نے اِن پر بیٹھ کر پھسلنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بطخ پانی پر تیر رہی ہے۔ وہ ہر ایک ڈھلان کی چوٹی پر بیٹھ جاتا اور آن کی آن میں درختوں سے بچتا بچاتا پہاڑ کے دامن تک پہنچ جاتا۔ ایک دو اور حضرات نے بھی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن ایک کا تو سر ایک درخت سے ٹکراتے ٹکراتے بمشکل بچا اور جب یہ حضرات گیند کی طرح لوٹتے پوٹتے نیچے پہنچے تو دیکھنے والے ہنس ہنس کر زمین پر لوٹ رہے تھے۔ خیریت یہ گذری کہ کسی کے چوٹ نہ آئی۔ ورنہ CLIMBING کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ واپسی پر چار گھنٹے کی مسافت پینتالیس منٹ میں طے ہوئی۔ حمید کے خیمے پر پہنچ کر قلی کی اُجرت پر پھر بحث شروع ہو گئی۔ زیادہ لوگوں کی رائے تھی کہ اُس کی اُجرت میں سے کچھ وضع کر لیا جائے۔ اُدھر قلی کا بخشیش کے لئے تقاضا تھا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ بخشیش کے بغیر اُس کی پوری اُجرت دے دی جائے۔ میں نے کہا :۔

" آپ اِس کو تمام دن کی اُجرت بارہ آنے دینے سے ہچکچا رہے ہیں۔ لیکن غور کیجئے کہ ایلپس کی چڑھائی اِس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں لیکن وہاں ایک گائیڈ محض آپ کے ساتھ رہنے کے عوض ایک پونڈ روز کا آپ سے وصول کرتا ہے۔ اور اِس بے چارے نے تو گدھے کا بوجھ اُٹھا رکھا تھا "

ایک صاحب بولے " قبلہ آپ ایلپس کا ذکر کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات نہیں چلتی "

میں نے کہا " کیوں۔ یہاں کے مزدور انسان نہیں "

انہوں نے جواب دیا " مزدور انسان تو ہیں لیکن یہ کشمیر ہے "

میں خاموش ہو گیا۔ رات کو خیمے میں لیٹے ہوئے مجھے کئی دفعہ قلی ایک بڑے پتھر کے ساتھ بے جان ہو کر لیٹا ہوا نظر آیا۔ اُس کی نیم وا آنکھوں کے سامنے بارہ آنے ناچتے اور وہ بوجھ کی زیادتی کے سبب ایک قدم بھی اوپر نہ چڑھ سکتا اور اُسے ایسے محسوس ہوتا جیسے یہ بارہ آنے کبھی اُس کے ہاتھ نہ آئیں گے۔ ناامیدی سے پھر اُس کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور اُس کا بوجھ اُس کے سر کو سینے پر نہوڑا دیتا۔ یکایک ایک کرخت آواز یہ کہہ کر اُسے آگے بڑھنے پر مجبور کرتی۔

" مزدور تم انسان تو ہو لیکن کشمیری ہو "

ہوٹل میں نسبتاً خاموشی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد لیٹے تو عجیب پُرلطف سا سکون اور آسودگی محسوس کی۔ معاً لاہور یاد آگیا۔ چند لمحوں میں ذہن تمام دنیا کی سیر کر گیا۔ لاہور کی گرمی، خاکساروں کے مظاہرے، حکومت کے اعلانات، انسانی زندگی پر پابندیاں، یورپ کی جنگ، انسانوں کی ہلاکت، انسان اور درندوں کا فرق، لاہور کی گلیوں میں خون کی ارزانی، مسجدوں کے ٹوٹے ہوئے دروازے، ہٹلر کی فتوحات اور نہ جانے کون کون سے خیالات بے ربطی سے دماغ میں چکر لگاتے رہے اور پھر سلسلۂ خیالات منقطع ہونے لگا تو امیر اکدل کے فقیر کی صدا کانوں میں گونجنے لگی اور یہ سوچتے سوچتے سونے لگا

کیا یہی کشمیر ہے ؟

دوسرے دن اُٹھے ہمیں پہلگام جانا تھا۔ رختِ سفر باندھا۔ قریب ہی بس کا اڈا تھا۔ بس پر سوار ہوئے اور چند میل پہاڑی مسافت طے کر کے پہلگام پہنچ گئے۔ خیمہ اور ضروری سامان کرائے پر لے کر لاری پورے کے ایک زمیندار کی زمین میں اخروٹوں کے درختوں کے نیچے خیمہ نصب کر دیا۔ گھومنے نکلے تو معلوم ہوا کہ لاہور کے کالجوں کے پروفیسر بیشتر یہاں آباد ہیں۔ چلتے چلتے مرزا حمید مل گئے۔ کہنے لگے ٹلین چلو گے۔ میں نے پوچھا وہ کیا بلا ہے۔ کہنے لگے۔ غالباً بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک جھیل ہے۔ CLIMBING کرنے کا شوق ہو تو میرے ساتھ کل ٹلین چلو۔ وہاں HANGING GLACIERS (لٹکتے ہوئے گلیشیر) بھی ہیں۔ یہ دعوت سُن کر میرے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ سوٹزرلینڈ، ایلپس اور موں بلانک (MOUNT BLONC) یاد آ گئے۔ پھر مرزا حمید جیسے شیر افگن کی معیت تو صد درجہ دلکش تھی۔ وعدہ کر لیا۔ علی الصباح کچھ پھل، دودھ میں پکی ہوئی روٹیاں اور شہد کے سینڈوچ تھیلے میں باندھ کر حمید کے خیمے میں جا پہنچا۔ حمید نے خیمہ بائی سرن کو جانے والے راستے کے سرے پر لگا رکھا تھا۔ بائی سرن سے آگے ایک پگڈنڈی ٹلین کے پہاڑ کے دامن تک جا رہی تھی۔ دو چار اور طالب علم شریک ہو گئے اور ایک کشمیری قلی بارہ آنے کے عوض ہماری برساتیاں، سامانِ خورونوش اور کپڑے اُٹھانے پر رضامند ہو گیا۔ مختصر سا قافلہ صبح سات بجے بائی سرن کو روانہ ہوا۔ بعض دوست تو چند فرلانگ ہی چل کر ہانپنے لگے۔ چیل اور دیودار کی گھنی چھاؤں اور سرد ہوا کے باوجود دشوار گزار چڑھائی نے ہموار میدانوں میں چلنے والوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ حمید سب سے آگے سب کی ہمت بندھا رہا تھا۔ ہر دو ہزار فٹ کی بلندی پر ایک وسیع میدان ملتا جہاں بیٹھ کر ہم دم لے لیتے۔ ورنہ باقی علاقہ سبزے اور درختوں سے اٹے ہوئے پہاڑوں پر مشتمل تھا۔ اکثر پسینہ پسینہ ہو جاتے لیکن چند منٹ کے لئے رُکتے تو اِس قدر تازہ دم ہو جاتے جیسے برسوں آرام کیا ہو۔ ساڑھے بارہ کے قریب پہاڑ کے اُس دامن تک پہنچ گئے جہاں سے آگے سارا راستہ صرف پتھر ہی پتھر تھے اور ایک انچ کے محیط سے لے کر سو سو گز کے محیط کے چھوٹے بڑے مختلف شکلوں کے پتھر ٹلین جھیل اور ہمارے درمیان حائل تھے۔ ان پتھروں پر سے ایک پُرشور نالہ پہاڑ کے دامن میں آ کر گر رہا تھا۔ اور یہاں قدرت نے مختلف رنگوں کے پھول اُگا کر پہاڑ کو صحنِ چمن بنا رکھا تھا۔ قریب ہی نہایت شیریں پانی کے دو ایک چشمے تھے۔ سفر کی آخری اور کٹھن منزل طے کرنے سے بیشتر ہم نے کچھ پھل کھایا اور پانی پینے کے بعد مرزا حمید سے پتھروں پر CLIMBING کرنے کے لئے ہدایات لیں اور قلی کو ساتھ لے کر چڑھائی شروع کر دی۔ یہ راستہ نہایت خطرناک تھا۔ نالے کا شور اور پتھروں کی پھسلن پر سیدھی چڑھائی مستزاد تھی۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں پر پاؤں کسی نہ کسی طرح جما لیتے لیکن بڑے بڑے پتھروں پر قدم رکھتے ہوئے یہ خوف لاحق رہتا کہ یہ پتھر پھسل کر اپنے اوپر نہ آ پڑے یا اپنے ساتھ ہمیں دُور نیچے کسی گھاٹی میں نہ لے جائے۔ خدا خدا کر کے آدھا راستہ طے کیا تو برف کے ایک گلیشیر تک پہنچ گئے۔ پیاس سے دم نکل رہا تھا۔ گلیشیر پر بیٹھ کر پیاس بجھانے کے لئے برف توڑ توڑ کر کھائی۔ پھر اُوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ اب چڑھائی تقریباً سیدھی دیوار کی طرح تھی۔ حمید تو ہرن کی طرح چھلانگیں بھرتے ہوئے جا رہے تھے۔ ہم رینگتے ہوئے پیچھے پیچھے چڑھ رہے تھے قلی سب سے پیچھے تھا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو قلی ایک بڑے پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دو تین دفعہ اُس کا نام لے کر پکارا لیکن صدائے برنخاست۔ آخر کچھ ناراضی کا اظہار بھی کیا لیکن قلی اپنی جگہ سے ہلتا ہی نہ تھا۔ میں سمجھا شاید اُس کے دل کی حرکت بند ہو گئی ہے۔ اس لئے میں نے پھر نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ بیس گز فاصلہ رہ جانے پر قلی کی نیم وا آنکھوں کی چمک سے اُس کے زندہ ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔

سلہ: یہ مضمون [illegible] جولائی [illegible] کو وصول ہوا۔ "ہلال"

اون	۸
ریشم	۹۰
مصنوعی ریشم	۲۰
ربڑ	۹۸
لکڑی کا گوندا	۳
پٹرولیم	۹
پتھر کا کوئلہ	۹
مینگنیز	۲۰
لوہا	۵
فولاد	۲
تانبا	۵
سیسا	۷
جست	۴
ٹین	۶۲
ایلومینیم	۴
کروم	۱۱
چاندی	۹
سونا	۹

ربڑ کے متعلق یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ اس میں سے ۵۹ فی صدی برطانوی ایشیا میں ہے اور ۳۷ فی صدی ولندیزی ایشیا میں۔ یہی دونوں یورپی ملک ایشیا کے ٹین کے جزوِ اعظم کے بھی حصہ دار ہیں۔ جہاں تک غیر ملکی تجارت کا تعلق ہے ایشیا کا درآمد و برآمد دونوں میں صرف ۱۵ فی صدی حصہ ہے۔ ایشیا میں سیاسی غلامی کے علاوہ آبادی کی کثرت اور خام پیداوار اور اشیائے خوردنی کی جو قلت آپ نے دیکھی ہے اُس کی موجودگی میں ایشیا کے افلاس پر کوئی تعجب نہیں ہو سکتا۔ یہ حالت یاس انگیز ہے اور یہ اُس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک اِس برِاعظم کے سیاسی اور اقتصادی حالات میں انقلاب پیدا نہ

دنیا کی بڑی بڑی کتابوں کا ترکی میں ترجمہ

آج کل جب تمام دنیا ایک خوفناک جنگ کی آگ میں جل رہی ہے ترکی تدبر کسی نہ کسی طرح اپنے ملک کو جنگ کے ہمہ گیر شعلوں کی لپیٹ سے بچائے ہوا آرہا ہے اور مصطفیٰ کمال مرحوم کے عہد میں ترکی نے ترقی کی طرف جو قدم بڑھائے تھے وہ برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔

یہ اطلاع باعثِ مسرت ہے کہ ترکی حکومت نے حال میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی کتابوں کا ترکی زبان میں ترجمہ کرایا جائے۔ وزارتِ تعلیم نے ایسی کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے جن کا ترکی میں ترجمہ کرایا جائے گا۔ اِن کتابوں میں ہومر، گوئٹے، بالزاک، سوفاکلیز، ایراسمس، میکیاویلی، شیکسپیئر، مولیئر اور دوسرے بڑے بڑے مصنفوں کی تصنیفات شامل ہیں۔

اِسی سلسلے میں بعض نسبتاً زیادہ عام پسند کتابوں کے ترجمے بھی کرائے جائیں گے اور بہترین ترجموں کے لئے انعام دیئے جائیں گے۔ ایسی کتابوں میں "پرائیڈ اینڈ پریجوڈس"، "وُدرنگ ہائٹس"، "ٹام جونز" اور "ہلکبری فن" بھی شامل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ [illegible] سے پہلے ترکی زبان میں یورپ کی کسی ادبی کتاب کا ترجمہ نہ ہوا تھا۔ اور اُس کے بعد ایک ایسا زمانہ بھی رہا جب ترکی زبان میں تنہا مغربی کتاب "رابنسن کروسو" تھی۔

حامد علی خاں

جہاں نما

ایشیا کا افلاس

پانچوں برّاعظموں میں ایشیا کی نمایاں ترین خصوصیت اِس کا افلاس ہے۔ علاوہ دوسرے اسباب کے اِس افلاس کا سب سے بڑا سبب ایشیائی ممالک کی غلامی ہے۔ ترکی، افغانستان، (شاید) سعودی عرب اور جاپان کو چھوڑ کر ایشیا کی کوئی قوم اُن معنوں میں آزاد نہیں ہے جن معنوں میں موجودہ جنگ سے قبل یورپی ممالک آزاد تھے۔ ایشیا کے تقریباً ہر خطّے پر یورپ کا کوئی نہ کوئی ملک مسلط ہے۔ بعض اَور برّاعظم بھی یورپی نسلوں کی دراز دستیوں کا شکار ہوئے لیکن وہاں اِن نسلوں نے آخر اپنا وطن بنالیا اَور وہاں کی دولت یورپ میں پہنچنے کے بجائے وہیں صرف ہوئی۔ لیکن ایشیا میں مغربیوں کا طریق کار الگ رہا ہے۔ ایشیا کے کسی ملک کو یورپ کی کسی قوم نے اپنی نوآبادی نہیں بنایا اَور اِس برّاعظم کا خزانہ مسلسل لُٹ کر باہر جاتا رہا ہے۔

ایشیا کے افلاس کا ایک اَور بڑا سبب اِس برّاعظم کی کثیر آبادی ہے۔ سوویٹ روس کی آبادی کو خارج کرنے کے بعد ایشیا کی کُل آبادی ۱۱۳۴۰۰۰۰۰۰ ہے۔ یہ تعداد دُنیا بھر کی آبادی سے ۵۳ فی صدی کی نسبت رکھتی ہے۔ اِس میں سے ۳۶۸۰۰۰۰۰۰ افراد برطانی قبضے میں ہیں اَور ۶۸۰۰۰۰۰۰ پر ہالینڈ مسلط ہے۔ جاپان کے ماتحت ۳۲۰۰۰۰۰۰ غیر جاپانی ایشیائی ہیں۔ فرانس ۲۴۰۰۰۰۰۰ ایشیائیوں پر حکمران ہے۔ ۱۰۰۰۰۰۰ پر پرتگال کا قبضہ ہے۔ ۵۰۰۰۰۰۰ باشندے یورپی حکم برداریوں میں ہیں۔ چین کی آبادی ۴۵۰۰۰۰۰۰ ہے لیکن سیاسی آزادی کے لحاظ سے وہ بھی بہت بدحال ہے۔

غلامی سے قطع نظر بھی یہ آبادی بجائے خود ایشیا کے رقبے کے لئے دوسرے برّاعظموں کی نسبت سے بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ جیسا اس سے پہلے کہا جاچکا ہے روس کو چھوڑ کر ایشیا کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا ۵۳ فی صدی ہے۔ اِس ۵۳ فی صدی آبادی کو رہنے کے لئے دنیا کے رقبے میں سے صرف بیس فی صدی حصّہ ملا ہے۔ اتنی آبادی کے لئے یہ زمین دنیا کے دوسرے خطّوں کے معیار کے پیشِ نظر بہت کم ہے۔ مثلاً آسٹریلیا ہی کو لیجئے۔ اِس کی آبادی صرف ۱۱۰۰۰۰۰۰ ہے مگر اِس کا رقبہ ہندوستان سے جس کی آبادی ۴۰۰۰۰۰۰۰۰ ہے دُگنا ہے۔ کینیڈا کی آبادی بھی صرف ۱۱۰۰۰۰۰۰ ہے لیکن اِس کا رقبہ ہندوستان کے مقابلے میں دُگنے سے بھی زیادہ ہے۔ جاپان کی آبادی ۷۳۰۰۰۰۰۰ ہے لیکن جس رقبے میں جاپانی محدود ہیں وہ آسٹریلیا اَور کینیڈا کے ۱/۲۰ ویں حصّے سے کچھ ہی زیادہ ہے۔

لطف یہ ہے کہ آسٹریلیا اور امریکا کے برّاعظموں میں اَور بعض دوسرے ایسے ملکوں میں جہاں آبادی کم اور زمین نسبتہً بہت زیادہ ہے ایشیائیوں کو داخلے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ باقی دنیا کے مقابلے میں ایشیا گنجان آبادی کا شکار ہوگیا ہے۔ آبادی کی اِس کثرت کی وجہ سے یہاں کا معیارِ زندگی پست ہوجانا اگرچہ قدرتی ہے مگر یہ افلاس ایشیائیوں کی فردِ جرائم میں شامل کیا جاتا ہے۔

غلامی، کثرتِ آبادی اَور قلّتِ رقبہ کے علاوہ دنیا کی خام پیداوار اور دھاتوں میں ایشیا کا نسبتہً قلیل حصّہ بھی اس برّاعظم کے افلاس کا ایک بڑا سبب ہے۔ ذیل کے نقشے سے اِس حقیقت کی وضاحت ہوگی۔

پیداوار	ایشیا کا حصّہ فی صدی
چاول	۹۰
گیہوں	۹
جَو	۱۳
مکئی	۷
شکر	۳۳
چائے	۹۶
تمباکو	۳۲
روئی	۲۳

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ اپریل ۱۹۴۲ء

جلد ۱۴ — نمبر ۴

ضروری اطلاع:- جواب طلب امور کے لئے پتا لکھا ہوا جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے پتا لکھا ہوا ٹکٹ [illegible] ضروری ہے۔ [illegible] کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کئے جائیں گے۔

[illegible]
[illegible]

یادگار عالیجناب حضرت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

قواعد

۱- ہمایوں بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی، ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کیے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ایک آنے کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کیے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور [illegible] صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہیے۔
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لیے ایک آنے کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے [illegible]

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجیے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... ادب ... [illegible]

[illegible] ... کریں گے نیز ذکر کتاب ... [illegible]

[illegible] ... ہے کہ ان مضامین میں ... [illegible]

[illegible] تاجران کتب لاہور

[illegible] ... ایک مدت سے ... [illegible]

[illegible] ... فرزند مسٹر ... نے ان کی ... [illegible]

[illegible] ... امید ہے کہ ... [illegible]

[illegible] ... ایک ... [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کریں گے نیز [illegible] کتاب [illegible]

[illegible] بڑی خوبی یہ ہے کہ ان مضامین [illegible]

[illegible] تاجران کتب لاہور

[illegible] بہت سے مسلمان انگریزی [illegible]

[illegible] قابل فرزند مسٹر عبد الحمید نے اس کی [illegible]

[illegible] امید ہے کہ یہ اخبار مسلم لیگ [illegible]

[illegible] اخبار کو ہر [illegible]

[illegible] اقبال صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible] لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی [illegible]

[illegible]

سے پاک ہے۔ انہوں نے نہایت غیر جانبدارانہ انداز میں خاندانِ بنی امیہ کی تاریخ لکھی ہے۔ واقعات کی چھان بین میں بڑی محنت اور دقتِ نظر سے کام لیا گیا ہے اور جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے جابجا ان کے حوالے دئے ہیں۔ ان کا ماخذ زیادہ تر عربی مؤرخین کی کتابیں ہیں اور اگرچہ ان میں سے بعض کتابیں اپنے مذہبی تعصب کے لئے بدنام ہیں لیکن شاہ معین الدین احمد نے ان سے صرف واقعات کی حد تک استفادہ کیا ہے اور شیعہ سنی کے جھگڑوں سے قطعاً متاثر نہیں ہوئے۔ زبان سادہ اور اندازِ بیان دلکش ہے۔ کاغذ۔ کتابت طباعت عمدہ قیمت چار روپے۔ پتہ:۔ دار المصنفین اعظم گڑھ "ن"

گل و بلبل۔ یہ کتاب جنابِ صادق قریشی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان افسانوں میں کوئی نئی بات نہیں۔ وہی عشق و محبت کے پرانے قصے ہیں جو ہزار بار دہرائے جاچکے ہیں۔ صادق قریشی ایک نوجوان ادیب ہیں اور ان کے بعض تنقیدی مضامین راقم کی نظر سے گزرے ہیں۔ اگر وہ افسانوں کے بجائے تنقیدی ادب پر توجہ دیں تو اردو کی زیادہ خدمت کریں گے۔ زیرِ نظر کتاب میں آٹھ افسانے ہیں۔ اور آٹھوں کا موضوع عشق ہے اور عشق بھی زیادہ تر ناکام عشق! زبان شستہ اور صاف ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ ان افسانوں میں عریانی کا عیب نہیں۔ کتابت۔ طباعت عمدہ قیمت ایک روپیہ۔ پتہ۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز تاجرانِ کتب لاہور "ن"

ایسٹرن ٹائمز۔ یہ ہفتہ وار اسلامی انگریزی اخبار ایک مدت تک فیروز سنز لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوتا رہا ہے۔ اب مولوی محبوب عالم مرحوم ایڈیٹر پیسہ اخبار کے قابل فرزند مسٹر عبدالحمید نے اس کی ملکیت اور ادارت اپنے ہاتھ میں لی ہے۔ نئے دور کے پہلے ہی پرچے سے ترتیب و مضامین میں بہت ترقی نظر آتی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ اخبار مسلم لیگ کے خیالات کی نشر و اشاعت کے لئے پنجاب میں بہت مفید کام کرے گا۔ مسلمانوں کا قومی فرض ہے کہ اس اخبار کو ہر ممکن مدد دیں تاکہ یہ جلد ایک اچھا اسلامی روزنامہ بن سکے۔ حجم ۱۶ صفحات چندہ ۵ر سالانہ۔ پتہ:۔ دفتر ایسٹرن ٹائمز لاہور "ح"

ماہنامہ اضطراب بنارس۔ یہ رسالہ مسعود اختر جمال صاحب کی ادارت میں بنارس سے نکلتا ہے۔ زیرِ نظر نمبر میں جو سالنامہ ۱۹۴۲ء ہے۔ اچھے اچھے تنقیدی مضامین۔ افسانے اور نظمیں درج ہیں۔ زیادہ تر لکھنے والے نوجوان ہیں۔ ادارہ بھی نوجوانوں پر مشتمل ہے اور جس سلیقہ سے پرچہ مرتب کیا گیا ہے اس کے لئے وہ داد کے مستحق ہیں۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی اور وہ یہ کہ تین سو صفحات کے اس سالنامہ میں اسی صفحات کے مضامین نظم و نثر پرانے ہیں اور دوسرے رسائل سے نقل کئے گئے ہیں۔ کاغذ کی گرانی کے پیشِ نظر اسی صفحات کو اس طرح ضائع کرنا نہایت بیجا اسراف ہے اور کسی طرح بھی جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ چندہ سالانہ پانچ روپے رعایتی تین روپے سالنامہ کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ پتہ:۔ دفتر اضطراب پانڈے حویلی بنارس "ن"

دیپک۔ یہ ماہوار اُردو رسالہ جناب ادجن دیو صاحب بی اے کے زیرِ ادارت لاہور سے نکلتا ہے۔ چندہ تین روپے سالانہ ہے جس میں دو خاص نمبر بھی دئے جاتے ہیں۔ مضمون مفید اور پُراز معلومات ہیں۔ زیرِ نظر پرچے میں (دسمبر ۱۹۴۱ء) راجہ نریندر ناتھ اور گوکل چند کے مضامین بھی شامل ہیں۔ اگر سرورق پر نسیم بکڈپو کی تصویر نہ ہوتی تو بہتر تھا کیونکہ اس سے دیپک پر کسی گھٹیا فلمی رسالے کا شبہ ہوتا ہے۔ پتہ:۔ دفتر دیپک قطب روڈ لاہور

زندگی۔ یہ ماہوار اُردو رسالہ امرتسر سے زیرِ ادارت ولایت صاحب شمر شائع ہوتا ہے۔ سیاسی اور قومی مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ رسالہ قابلِ مطالعہ ہے۔ چندہ سالانہ عہ۲ر پتہ:۔ دفتر زندگی۔ اکالی مارکیٹ امرتسر "ح"

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے نیو کمرشل پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۳ جین مندر روڈ لاہور سے شائع کیا

مطبوعات

[illegible]

[illegible] ... قیمت مجلد ... پتہ - مطبع انوار احمدی الٰہ آباد (یوپی)

[illegible] ... پتہ - اُردو اکیڈمی پنجاب [illegible]

[illegible]

غالب کے [illegible] ... پتہ - مکتبہ اشاعت اُردو [illegible]

[illegible] مصطفےٰ الکمال [illegible]

[illegible]

ہمایوں فروری ۱۹۳۲ء

یہ زمانہ کے درباری نقشہ ہماری "غزل" کا سرمایۂ حیات تھا۔ غزل کا بھی اور غزل گو کا بھی۔

چنانچہ شعرا کا معشوق بھی لقب تھا۔ وہی "رقیب" وہی "دربان" وہی طوق الفت، مسکون اقتدار شخصی ا۔

ادب اور فن کی سرپرستی انہیں درباروں میں ممکن تھی عوام اس قابل نہ تھے کہ شعرا کی قدر کر سکیں یا ان کو زندہ رکھ سکیں۔ طباعت اور علم [illegible] محصور تھا۔ (خواندگی چند مقررہ کتابوں تک محدود تھی)

اس دربار میں شاعر کی حیثیت بہت ادنیٰ تھی۔ اس کی جنس محض تفریح کا سامان بن سکتی تھی۔ چنانچہ غزل میں شاعر [illegible] عاشق ہوتا تھا اور بوالہوس رقیب کامیاب۔ ہوس، دنیاداری، آزادی کا دربار ایک طرف اور عشق، ادب، روحانی تحریکات دوسری جانب۔ ظاہر ہے کہ [illegible] دربار میں افادی قدریں زیادہ بلند مرتبہ تھیں اور ادب و فن محض تفریحی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر شاعر تفریحی دائرے سے باہر جانا چاہتا تو نا مقبول ہوتا تھا۔

یہ ہلکی پھلکی تفریحی غزل کی شاعری درباری فضا میں کامیاب ہوئی۔ چلتے ہوئے فقرے۔ اچھوتے ہوئے خیالات۔ چبھتی ہوئی [illegible] یہ تھا درباری غزل کا طرہ۔

مگر جب یہ دور بدلا جب دیسی نظام ٹوٹنے لگا۔ تو غزل نے بھی پلٹا کھایا۔ خود رئیسوں اور نوابوں کو جان کے لالے پڑ گئے۔ [illegible] اور متوسط طبقہ کے لوگ صاحبِ امر ہوئے اور پرانے حاکم نواب دیوالیہ ہونے لگے۔ طاقت کا توازن بدلا۔ اس میں کئی مورچے الٹ گئے۔ (نوابوں نے اپنے [illegible] کاٹ چھانٹ) بنانا شروع کیا۔ اور سب سے پہلے سب سے زیادہ غیر ضروری مدیعنی شعرا اور صناع خارج ہوئے۔ درباروں کے ساتھ درباری شاعری بھی مٹنے لگی۔

اس پر ستم یہ ہوا کہ نئے فرمانروا بدیشی تھے۔ ان کی زبان، ان کا ادب۔ ان کی معاشرت بالکل مختلف تھی۔ اور جب انہوں نے سیاسی استقامت کے بعد یہاں کے ادب کی طرف توجہ کی تو شاعری کے پہلے دربار میں جو لاہور میں منعقد ہوا "نظم" ظہور پذیر ہوئی۔ انگریزی شاعری کے "مضامین" اردو میں نظم ہونے لگے۔

مگر غزل مٹی نہیں۔ کیونکہ اس کی روایات بہت گہری تھیں اور اس کی بنیادیں فطرتِ انسانی میں پیوست تھیں۔

واضح رہے کہ غالب جو اس نئے دور میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ وہ درباری غزل سے طبعاً بغاوت کر چکا تھا صاف صاف کہتا ہے

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل		کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

غرض شاعر درباروں سے خارج ہو کر آزاد ہو گئے۔ نوابوں سے دور ہو کر وہ عام فطرتِ انسانی اور جذبات کے نزدیک آ گئے۔

چنانچہ حسرت کا تصورِ عشق نوابی نہیں ـــ انسانی ہے!ـــ

اس طرح "غزل" کو ایک نئی زندگی حاصل ہو گئی ـــ مگر یہ زندگی ایک نہایت معین اور محدود دائرے میں محصور ہے۔

(ڈاکٹر تاثیر)

جبری اختیار

حل ہو سکا نہ مسئلۂ جبر و اختیار

اس فکر میں ہر ایک پریشان کیوں ہے

ہر روح امر رب ہے

ہر اک فعل ہر [illegible]

[illegible]

مطبوعات

منتخبِ داغ۔ داغ کے کلام کا یہ انتخاب بڑی تقطیع کے ۴۷۰ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اس انتخاب کی خوبی کی ضمانت یہ ہے کہ اسے حضرتِ احسن مارہروی مرحوم نے مرتب کیا تھا جو داغ کے قابل ترین شاگردوں میں سے تھے ہمیں افسوس ہے کہ یہ انتخاب حضرتِ احسن مرحوم کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اسے شائع کرنے کی سعادت حضرتِ احسن کے فرزندِ رشید جنابِ سعید کے حصے میں آئی ہے۔ ابتدا میں سعید صاحب نے اپنے والدِ ماجد کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں اس کے بعد حضرت احسن مرحوم کا فاضلانہ مقدمہ شامل ہے۔

انتخاب کے متعلق اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ایک اچھے شاعر کے کلام کا انتخاب ایک اچھے شاعر اور نقاد نے کیا ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت نفیس ہے۔ حضرتِ داغ اور حضرت احسن کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ قیمت مجلد ۵ر :- پتہ۔ مطبع انوارِ احمدی الہ آباد (یو۔پی)۔

آج کا مصر۔ از محمد حسن الاعظمی صاحب پروفیسر مصری یونیورسٹی قاہرہ۔ ۱۷۲ صفحے کی اس مختصر با تصویر کتاب میں مصر کی قدیم و جدید تاریخ کے بیان کے بعد موجودہ حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سرسری معلومات کے لئے کتاب بہت اچھی ہے قیمت درج نہیں۔ پتہ:- اُردو اکیڈمی پنجاب لاہور

خرمن۔ یہ حیدرآباد کے نوجوان شاعر حضرتِ نظر کے کلام کا مجموعہ ہے۔ حضرتِ نظر ان نوجوان شعراء میں سے ہیں جن کا مستقبل کافی امید افزا نظر آتا ہے۔ اُن کے موجودہ کلام میں جوش اور ولولہ نمایاں ہے۔ نواب بہادر یار جنگ اور ڈاکٹر عبد اللطیف نے تعارف لکھا ہے۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ:- مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

غالب کے سو شعر۔ اے ایس حامد صاحب ملتانی نے غالب کے مختصر اُردو مجموعہ کلام میں بھی انتخاب کی گنجائش دیکھ کر یہ سو اشعار جمع کئے ہیں۔ غالب کا کلام ہر رنگ میں قابلِ مطالعہ ہے۔ قیمت ۲ر پتہ:- مکتبۂ اشاعتِ اُردو (ادب) ملتان

(۱) **عقائدِ اسلام** (۲) **پیارے نبی** (۳) **مصطفےٰ کمال**۔ یہ تینوں چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی اے ایس حامد صاحب ملتانی نے لکھی ہیں۔ ان کا موضوع ان کے ناموں سے ظاہر ہے سرسری معلومات کے لئے بہت اچھی ہیں۔ تینوں کتابوں کی قیمت دو دو آنے ہے۔ پتہ۔ مکتبۂ اشاعت اُردو (ادب) ملتان "ح"

ہمارا پنجاب۔ از شیخ عزت اللہ صاحب۔ اس کتاب میں پنجاب کا مختصر جغرافیہ اور تاریخ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اگر خوشامد کا رنگ نمایاں نہ ہوتا اور یونینسٹ پارٹی کی جا و بے جا تعریف میں غلو سے کام نہ لیا جاتا تو شاید یہ کتاب زیادہ مفید ہوتی۔ کاغذ کتابت طباعت عمدہ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

پتہ:- فرینڈز لائبریری لاہور "ن"

تاریخ اسلام (حصہ دوم) از شاہ معین الدین احمد ندوی۔ یہ خاندانِ بنی امیہ کی تاریخ ہے۔ خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے بعد خاندانِ بنی امیہ کی حکومت قائم ہوئی۔ تاریخ اسلام میں بنی امیہ کا دور جس قدر اہم ہے اسی قدر اس کے متعلق غلط فہمیاں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ اکثر شیعہ مؤرخین نے بنی امیہ سے انصاف نہیں کیا۔ اور محض یزید سے تعصب کی بنا پر سارے اموی خلفاء کی خوبیوں سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ شاہ معین الدین احمد صاحب کی تاریخ اس عیب

یہ نواب کے دربار کا نقشہ ہماری "غزل" کا سرمایۂ حیات تھا۔ غزل کا بھی اور غزل گو کا بھی۔

چنانچہ شعراء کا معشوق بھی نواب تھا۔ وہی "رقیب" وہی "دربان" وہی مطلق العنان، متلوّن المزاج شخص!۔

ادب اور فن کی سرپرستی انہیں درباروں میں ممکن تھی عوام اس قابل نہ تھے کہ شعرا کی قدر کرسکیں یا ان کو زندہ رکھ سکیں۔ طباعت اور عام تعلیم کا دائرہ مختصر تھا۔ (خواندگی چند مقررہ کتابوں تک محدود تھی)

اس دربار میں شاعر کی حیثیت بہت ادنیٰ تھی۔ اس کی جنس محض تفریح کا سامان بن سکتی تھی۔ چنانچہ غزل میں شاعر ہمیشہ بدنصیب اور نامراد عاشق ہوتا تھا اور بوالہوس رقیب کامیاب!۔ ہوس، دنیاداری، افادی کاروبار ایک طرف اور عشق، ادب، رومانی تحریکات دوسری جانب!۔ ظاہر ہے کہ نواب کے دربار میں افادی قدریں زیادہ بلند مرتبہ تھیں اور ادب و فن محض تفریحی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر شاعر تفریحی دائرے سے باہر جانا چاہتا تو نامقبول ہوتا تھا۔

یہ ہلکی پھلکی تفریحی غزل کی شاعری درباری فضا میں کامیاب ہوئی۔ چلتے ہوئے فقرے۔ اچھلتے ہوئے خیالات، پھبتی، طعن، ہوس کاری!۔ یہ تھا درباری غزل کا سرمایہ۔

مگر جب یہ دور بدلا جب رئیسی نظام ٹوٹنے لگا۔ تو غزل نے بھی پلٹا کھایا۔ خود رئیسوں اور نوابوں کو جان کے لالے پڑ گئے۔ ساہوکار، تاجر، کارخانہ دار، متوسط طبقہ کے لوگ صاحبِ امر ہوئے اور پرانے حاکم نواب دیوالیہ ہونے لگے۔ طاقت کا توازن بدلا۔ اور اس میں کئی دربار اُلٹ گئے! نوابوں نے اپنے اخراجات کاٹ بنانا شروع کیا۔ اور سب سے پہلے سب سے زیادہ غیر ضروری مد یعنی شعرا اور صناع خارج ہوئے۔ درباروں کے ساتھ درباری شاعری بھی مٹنے لگی۔

اس پر ستم یہ ہوا کہ نئے فرمانروا بدیشی تھے۔ ان کی زبان، ان کا ادب۔ ان کی معاشرت بالکل مختلف تھی، اور جب انہوں نے سیاسی استقامت کے بعد یہاں کے ادب کی طرف توجہ کی تو شاعری کے پہلے دربار میں جو لاہور میں منعقد ہوا "نظم" ظہور پذیر ہوئی۔ انگریزی شاعری کے "مضامین" اُردو میں نظم ہونے لگے۔

مگر غزل مٹی نہیں۔ کیونکہ اس کی روایات بہت گہری تھیں اور اس کی بنیادیں فطرتِ انسانی میں پیوست تھیں۔

واضح رہے کہ غالب جو اس نئے دور میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ وہ درباری غزل سے طبعاً بغاوت کرچکا تھا صاف صاف کہتا تھا ؎

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل   کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کیلئے

غرض شاعر درباروں سے خارج ہوکر آزاد ہوگئے۔ نوابوں سے دور ہوکر وہ عام فطرتِ انسانی اور جذبات کے نزدیک آگئے۔

چنانچہ حسرت کا تصورِ عشق نوابی نہیں — انسانی ہے!—

اس طرح "غزل" کو ایک نئی زندگی حاصل ہوگئی — مگر یہ زندگی ایک نہایت معیّن اور محدود دائرے میں محصور ہے۔

(ڈاکٹر تاثیر)

"نگار"

جبری اختیار

حل ہو سکا نہ مسئلۂ جبر و اختیار

اس فکر میں ہر ایک پریشان کب سے ہے

"ہر روح امرِ رب ہے" (صغریٰ موجبہ)

ہر اک فعل امرِ روح (کبریٰ کلیہ)

ثابت ہوا کہ!—

"فعل ہر اک امرِ رب ہے"

امجد (حیدرآبادی)

"سب رس"

محفلِ ادب

غزل اور اُس کا مستقبل

"غزل" سے مراد یا تو محض "یک قافیہ" کلام ہے۔ مگر قصائد اور نظمیں بھی یک قافیہ ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں۔

یا غزل سے مراد حسن و عشق کے مضامین ہیں۔ اور یہ غزل اور نظم میں مشترک ہیں۔ یا ان دونوں کا امتزاج یعنی یک قافیہ عشقیہ کلام ۔۔۔ یہ قصائد کی تشبیب میں اور نظموں میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور پھر مروجہ غزل میں غیر عشقیہ مضامین بھی ہوتے ہیں۔

میری رائے میں "غزل" کیلئے یک قافیہ ہونا ضروری ہے۔ یہ فنی وصف ہے اور اس کا دوسرا بنیادی وصف یہ ہے کہ مختلف اشعار میں منطقی تسلسل نہ پایا جائے۔ اشعار متفرق ہوں۔ مضمون کے اعتبار سے ۔۔۔ جب تسلسل ہوتا ہے تو ہم صراحت سے اسے مسلسل غزل یا قطعہ وغیرہ کا نام دیتے ہیں۔ گویا غزل کے لئے تسلسل غیر معمولی ہے! ۔۔۔ غزل کی ساخت میں یگانگت (برائے بحر و قافیہ) ہوتی ہے۔ اور مضمون متفرق ہوتے ہیں!۔

کیا یہ اوصاف ہماری تمام شاعرانہ ضروریات کے منافی ہیں۔ اور لازمی طور پر فنا پذیر ہیں؟

یک قافیہ اشعار دنیا کی شاعری میں ہر دور میں کہے گئے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ یہ انتظام بے کار ہو جائے۔ حسن و عشق کے مضامین کی عالمگیری بھی مسلمہ ہے فطرتِ انسانی حسن و عشق سے وابستہ رہی ہے اور رہے گی۔ اشعار میں منطقی تسلسل کا ہونا بھی کسی طرح طبعِ انسانی کے منافی نہیں۔ ہمارے احساسات اور جذبات کی رو عموماً غیر مسلسل اور غیر منطقی ہوتی ہے۔ اس لئے عدمِ تسلسل عین مطابقِ فطرتِ انسانی ہے آج کل تو نثر میں بھی (بالخصوص ناولوں میں) شعورِ انسانی کا اظہار اس طرح کیا جاتا ہے کہ خیالات آگے پیچھے چلے آتے ہیں۔ کبھی ماضی کبھی حال کبھی مستقبل میں اُچھلتے ہوئے سے! ۔۔۔ (James Joyce) اس انداز کا امام تھا اور شاید ہی کوئی جدید مصنف ہو جس پر اس کا اثر نہ ہو تو پھر یک قافیہ مگر غیر مسلسل اشعار یعنی غزل کے متعلق یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ صنف مٹنے والی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غزل مٹ نہیں رہی بلکہ جس نہج کی غزل داغ کے وقت تک مروج تھی وہ مٹ رہی ہے (داغ کے وقت تک بھی غزل کے دو وضع طریق تھے۔ نقاد دلی اور لکھنؤ سکول کا نام دے کر ان میں امتیاز کرتے ہیں)۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔

ہماری غزل درباروں کی پیداوار تھی۔ پٹے ہوئے نوابوں اور مٹے ہوئے رئیسوں کے درباروں کی! ۔۔۔ اس میں اسی قسم کے تاثرات کا اظہار ہوتا تھا جو اس فضا میں پنپ سکتے تھے۔

نواب صاحب کا دربار ہے۔ درباریوں کے جتھے ہیں جو توڑ جوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے رقیب ہیں۔ اور نواب کی توجہ، شاعر ہو یا کوئی اور پروردۂ سرکار ہو۔ ان لوگوں کی زندگی اور موت کا باعث ہے۔ نواب مطلق العنان ہے۔ جسے چاہا نوازا جسے چاہا ختم کر دیا۔ اور اس کے ہاں باریابی تک ایک مشکل مہم ہے۔ دروازے پر دربان ہیں!۔

[illegible]

تضمین

بر اشعارِ حضرتِ اقبالؒ

عشق کی تابش سے ہے دامنِ گُل چاک چاک
عشق کے جلووں سے ہے سینہ گناہوں سے پاک
عشق کے دم سے ہوئی عرش کی ہمسایہ خاک
"عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام"

عشق کے حلقے میں ہے جلوہ گہِ ہست و بُود
روز و شب و صبح و شام خاک و سپہرِ کبُود
بستہ مسائل کی ہے عشق کے دم سے کشود
"عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام"

ـــــ جگن ناتھ آزاد

غزل

کیا فرشتوں کی زباں پر بھی ترا نام نہ تھا
کیوں مجھے خلق کیا مجھ سے اگر کام نہ تھا
میں ہی اس عہد میں تھا خونِ تمنا کیلئے
موسمِ گل میں کوئی اور تہِ دام نہ تھا
اُف! یہ گھڑیاں کہ ترا درد ہے عنوانِ سخن
ہائے وہ دن کہ ترے درد میں آرام نہ تھا
بات کیا ہے کہ دگرگوں ہے جہاں کا انداز
تیرا جلوہ تو کسی رنگ میں بھی عام نہ تھا
آپ کو دردِ محبت کا یقیں کیوں آئے
وہ تو کاوش کی غزل تھی کوئی الہام نہ تھا [illegible]

کیوپڈ کا پہلا تیر

یہ کس کی یاد مجھ کو آرہی ہے؟

سحر کا وقت ہے نکلا ہے سورج
سہانے گیت شاما گا رہی ہے
کرن آکاش سے گنگا نہا کر
زمیں پر سیر کرنے آ رہی ہے
چلی ہیں وہ مہابن سے ہوائیں
مرے دل پر گھٹا سی چھا رہی ہے
یہ کس کی یاد مجھ کو آرہی ہے؟
کھلونے لائے ہیں میلے سے بھیّا
بہن سسرال سے وہ آرہی ہے
پتا بھی کھیت پر اب جارہے ہیں
وہ ماں اشنان کرکے آرہی ہے
وہی سکھیاں ہیں اور سکھیوں کے جلسے
طبیعت کیوں مری گھبرا رہی ہے؟
یہ کس کی یاد مجھ کو آرہی ہے؟
وہ پنگھٹ پر لگی ہے بھیڑ اب تک
پڑوسن لے کے گاگر جارہی ہے
نہیں پانی دیا تُلسی کو میں نے
وہ تُلسی دھوپ میں مُرجھا رہی ہے
نہیں لگتا ہے جی دھندوں میں گھر کے
مری جیون کلی کملا رہی ہے ـــــ
یہ کس کی یاد مجھ کو آرہی ہے؟
شفق سے ہوگئی ہے شام رنگیں

چند نظمیں اور چند غزلیں

افسانۂ ما

عاشقانِ خراب ہیں ہم لوگ
آپ اپنا جواب ہیں ہم لوگ

ہوش کھو کر بھی یہ نہ بھول سکے
کہ کہاں باریاب ہیں ہم لوگ

نگہِ ناز بھی اُٹھا نہ سکی
وہ حجاب الحجاب ہیں ہم لوگ

ہم کہاں اور کہاں فریبِ سکوں
سر بسر اضطراب ہیں ہم لوگ

ہر قدم پہ ہے اک جہانِ دگر
پرچمِ انقلاب ہیں ہم لوگ

ہم ہیں آزادِ ہر طلوع و غروب
برتر از آفتاب ہیں ہم لوگ

دل شکستہ سہی مگر پھر بھی
حاصلِ انتخاب ہیں ہم لوگ

جو حریمِ ازل میں گونجی تھی
اُس صدا کا جواب ہیں ہم لوگ

حسن سے شکوۂ حجاب بھی ہے
اور خود ہی حجاب ہیں ہم لوگ

چارہ سازی کرے گی کیا دُنیا
کہ شہیدِ عتاب ہیں ہم لوگ

ہوش اُڑ اُڑ گئے ہیں ساقی کے
وہ حریفِ شراب ہیں ہم لوگ

واعظِ شہر نے دُرست کہا
قابلِ اجتناب ہیں ہم لوگ

لاکھ ناکامیاں ہیں دامن میں
اور پھر کامیاب ہیں ہم لوگ

عشق اک خوابِ جاوداں ہے روشؔ
اور تعبیرِ خواب ہیں ہم لوگ

روش صدیقی

غزل

کچھ ضدوں کو رنگ دے کر شکلِ انساں کر دیا
دل لگی کی دل لگی، احساں کا احساں کر دیا

یوں اکارت مقصدِ تخلیقِ انساں کر دیا
اپنے دل کے راز کو مٹی میں پنہاں کر دیا

عبد اور معبود میں یہ فرق ہے بندہ نواز
اُس نے ہر شے کو چھپایا، میں نے عریاں کر دیا

اُن کو دل دے کر کشاکش مول لے لی مفت میں
زندگی کو موت سے دست و گریباں کر دیا

یہ سمجھ کر بھی کہ انساں میں ہے عزمِ جستجو
تو نے اپنا راز اپنے آپ عریاں کر دیا

ہم کو سرخوشؔ واسطہ بھی اب نہیں اُن سے مگر
آج اس ٹھنڈی ہوا نے دل پریشاں کر دیا

آغا سرخوش قزلباش دہلوی

اور میں اُسے کیا جانوں میری حیثیت اس کے ورثے کا ایک جزر ہے گی ــــ اے دور اندیش صیاد! تو نے ہی مجھے غلام بنایا۔ تو ہی مجھے آزاد کر دے۔

ایک بات اور سُن لے تو نے مجھے دنیا کے انسانوں سے روشناس کرایا۔ مجھے انسانی بولیاں سکھائیں۔ کچھ سبز دئے۔ لیکن مجھ کو بھی قربانی دینی پڑی آزادی کی ــــ اور بھینٹ چڑھانا پڑا اپنی قوتِ پرواز کو ــــ پھر بھی میں تیرا ممنون ہوں گڑگڑاتا ہوں کہ مجھے آزاد کر دے ــــ وعدہ کرتا ہوں کہ تیرا دل بہلاتا رہوں گا۔ اچھا ہونے تک تیرے درد کی دوا بنا رہوں گا ــــ لیکن اس پنجرے میں نہیں۔ بلکہ اس سامنے والی نیم کی ڈالی پر بیٹھ کر ــــ تو اپنا پلنگ اس ڈالی کے نیچے بچھوا لینا۔ اب تو چھوڑ دے ــــ

صیاد چپ رہ اور سنتی بھر کی جان۔ مجھی سے باتیں کرنی سیکھیں۔ اور مجھی سے بے منطقی گفتگو۔ میں تجھے آزاد نہ کروں گا۔ سُن لے۔ تو مجھے اُلو بناتا ہے۔ تجھے میں آزاد کر دوں اور خود بے بس ہو جاؤں۔ آزاد ہو کر تو میرا غلام بنا رہے گا؟۔ اور تجھے کیا تیری رفیقِ زندگی یاد نہ آئے گی۔؟

"تجھے کیا تیری رفیقِ زندگی یاد نہ آئے گی؟" طوطے کے ننھے ننھے کانوں نے سُنا ــــ اور پھر ــــ لگاتار "چھوڑ" "آزاد کر" کی رٹ نے صیاد کے کانوں کے پردے ہلا دیئے۔ سبز بازو ایک دم کھلے۔ ہلکا پھلکا نازک جسم ایک دم ہوا سے باتیں کرنے کیلئے اُڑا لیکن تیلیوں سے ٹکر ہوئی ــــ اور پھر جھولے سے اُلجھتا ہوا نیچے گرا ــــ پنجرہ ہل گیا۔ اور ساتھ ہی تپائی بھی۔ مریض صیاد کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ گڑھے دار رخساروں میں کچھ جھریاں بنیں۔ سوکھے ہوئے ہونٹ ایک دوسرے سے الگ ہوئے شاید وہ مسکراتے کو تھا۔ سبک سبز مخملی جسم پھر اُٹھا۔ پھر ٹکرایا۔ پھر گرا۔ لگاتار اُٹھتا رہا۔ ٹکراتا رہا اور گرتا رہا۔ دونوں کٹوریاں لڑھکتی رہیں ــــ اور پنجرے میں زلزلہ آ گیا ــــ ذرا سی دیر میں خوبصورت روئیں دار سبز پر کچھ پنجرے کی تیلیوں سے چپک گئے کچھ نیچے بکھر گئے۔ اور کچھ ہوا میں اُڑ گئے۔ غلام کی بے تابی نے مالک کو بے تاب کر دیا۔ اس نے ایک ہاتھ تپائی پر اور دوسرا پلنگ کی پٹی پر رکھا۔ سہارا لے کر کمر اُٹھائی۔ وہ بیٹھنا چاہتا تھا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ ضعف کی وجہ سے سنبھل نہ سکا۔ اور دھم سے پھر بستر پر گرا۔ ہاتھ دوا کی شیشیوں کو لگا اور شیشیاں زمین پر گر کر چکنا چور ہو گئیں۔ وہ زیادہ بے تاب ہو گیا۔ اور جھٹکے سے "بغاوت مت کر" کہتا ہوا بیٹھ گیا۔ دونوں کمزور ہاتھ پنجرے پر رکھ دیئے کہ کہیں پنجرہ لے کر نہ اڑ جائے باغی طوطا اٹھتا رہا ــــ ٹکراتا رہا ــــ گرتا رہا ــــ پنجرہ ہلتا رہا۔ آخری بار منہ کے بل گرا اور پھر نہ اُٹھا ــــ پنجرے میں ہر چیز خاموش تھی سوائے ہلتے ہوئے جھولے کے ــــ بیمار صیاد نے گھور گھور کر دیکھنا شروع کیا۔ گردن پر کھال نکل آئی تھی ــــ کئی جگہ سے کٹ گئی تھی ــــ سر چونچ کے مانند سرخ بن گیا تھا ــــ آنکھوں پر پردے تھے۔ آدھی زبان چونچ سے باہر نکلی پڑی تھی۔ پنجے کی چھوٹی چھوٹی انگلیوں پر چھوٹے چھوٹے زخم تھے۔ اور کٹوریوں پر خون کی ننھی ننھی بوندیں جم گئی تھیں ــــ غلام اب آزاد ہو چکا تھا ــــ صیاد گھنٹوں گھورتا رہا ــــ شام ہو گئی اور اندھیرا چھا گیا ــــ

ــــ صبح ہوئی اور اُجالا آ گیا ــــ اب پنجرہ خالی تھا اور پلنگ بھی ــــ

باقی کیرانوی (عثمانیہ)

[illegible]

[illegible]

ذودھ اُن کا دوھا، پیا، کہا لو   گوبر کے انہیں کا چوتہ پھینکو

(۲۴) جب کاتب اپنی عبارت یا مضمون میں ایک لفظ یا جملہ کا دوسرے لفظ یا جملہ سے جدا کرکے معنی واضح کرنے کے لئے ٹھیراؤ (وقفہ) کرتا ہے تو مبتدی کو عبارت کا مطلب آسانی سے سمجھ میں آتا ہے اس لئے رموز اوقاف کا استعمال ضروری ہے مثلاً موہن، سوہن اور رام آج سکول کیوں نہیں گئے؟

(۲۵) وُہ، یہہ کو اُنے اِنے بولنا غلط ہے مثلاً اُنے آیا، اِنے لایا وغیرہ

(۲۶) گائے کے بچے کو بچھڑا، بچھڑی کہتے ہیں لیکن ان کو پاڑا، پاڑی بولنا غلط ہے۔

(۲۷) بعض الفاظ کا تلفظ غلط ہوا کرتا ہے مثلاً مُکمّل (دوسرا میم مفتوح ہے) مُسَلسَل (دوسرا سین مفتوح ہے) وغیرہ

(۲۸) پنجاب میں بعض افعال کا استعمال بے محل ہوتا ہے مثلاً پھوڑنا، پھاڑنا، توڑنا، پھوٹنا، پھٹنا، ٹوٹنا وغیرہ

پانچ چھ سال کا ذکر ہے کہ بٹالہ (پنجاب) میں شارٹ ہینڈ سیکھنے کے لئے گیا ہوا تھا ایک دن میرے ہم جماعت نے کہا "لکڑی پھاڑنا" میں نے کہا کہ لکڑی پھاڑنا خلافِ محاورہ ہے کیوں کہ اُردو میں لکڑی پھاڑنا نہیں کہتے بلکہ لکڑی پھوڑنا کہتے ہیں۔ پھاڑنا کپڑے کے ساتھ لایا جاتا ہے مثلاً کپڑا پھاڑنا۔

(۲۹) لالٹین ایک عام فہم لفظ ہے لیکن بجائے اس کے دکن میں قندیل بولتے ہیں مثلاً

آزاد لکھتے لکھتے ہی آدھی تو ڈھل گئی   اور شمع لالٹین میں ساری پگھل گئی

پارسال لاہور میں مجھے ایک لالٹین لینے کی ضرورت داعی ہوئی مَیں نے ایک دُکان دار سے پوچھا کہ قندیل (لالٹین) کہاں بکتی ہے اُس نے متعجب ہو کر کہا کہ قندیل کیا چیز ہے؛ پھر میں نے لالٹین کا نام بتایا تب کہیں ان کی سمجھ میں آیا

اسی طرح ڈاک خانہ کو ہمارے ہاں پٹہ خانہ بولا جاتا ہے تھوڑے دن کی بات ہے کہ لاہور وغیرہ سے دو تین پارسل آئے ہوئے تھے جن پر انگریزی میں (Patta Khana) پٹہ خانہ لکھا ہوا تھا۔ وجہ یہ کہ اس لفظ سے دوسرے مانوس نہیں ہمیں چاہئے کہ عام فہم الفاظ بولا کریں تاکہ غیر صوبہ میں جانے پر تبادلۂ خیالات میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ریاست حیدرآباد کے تمام دفاتر میں اُردو کا دَور دَورہ ہے لیکن تعجب اِس بات کا ہے کہ اکثر تعلیم یافتہ طبقہ غلط اُردو لکھا کرتا ہے۔ پس جن لوگوں نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے، ضرور ہے کہ وُہ صحیح اُردو بولنے کی فکر کریں تاکہ ہمارے دامن میں انوکھی بولی کا جو داغ لگا ہوا ہے وہ دُھل جائے اگر ہم وطن کی محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں اور اس کی ترقی کے خواہاں ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اُردو زبان سے پریم کریں اور زبان کی فصاحت اور یکسانی برقرار رکھنے کے لئے دکن کے غیر مانوس الفاظ اور غلط محاورات کو ترک کر دیں۔

جی۔ ابن ریڈی

تم پیار کرتے ہو دُشمن کی ہم ہیں مکر کرتے ہیں صحن کی — ہم بہت جگاتے ہیں ان کی تم اس کو آکے بجاتے ہو

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

آنے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور

(۱۳) ہمیں یا ہم کو۔ مجھے یا مجھ کو۔ تمہیں یا تم کو۔ تجھے یا تجھ کو کی بجائے ہمارے کو، میرے کو، تمہارے کو، تیرے کو بولنا غلط ہے۔

(۱۴) چھونا کی بجائے چھینا بولنا غلط ہے۔

نزاکت اُس گُلِ رعنا کی دیکھیو انشا — نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

(۱۵) کاچھ (دھوتی کا وہ حصہ جو پیچھے گھُرسا جاتا ہے) کی بجائے مرہٹواڑی میں کاشٹا اور تلنگانہ میں لنگوٹی کہتے ہیں۔

(۱۶) پردہ کے بجائے گوشہ بولنا غیر صحیح ہے مثلاً

اُس پردہ نشیں سے کوئی کس طرح بر آئے — جو خواب میں بھی آئے تو مُنہ ڈھانک کر آئے

(۱۷) کُتی، گدھی، بُڑھی کو کُتیا، گدھیا، بُڑھیا وغیرہ بولنا فصیح تر ہے۔

(۱۸) وہی، یہی، ہمیں، تمہیں وغیرہ کی بجائے وُہ ہی، یہہ ہی، ہم ہی، تم ہی لکھنا غلط ہے مثلاً

صورت وہی رنگِ رو وہی ہے — لہجہ وہی گفتگو وہی ہے

یہی حال دُنیا میں اس قوم کا ہے — بھنور میں جہاز آکے جس کا گھرا ہے

اور پنجاب میں اسی کو، انہیں کو کی بجائے اس ہی کو یا اس کو ہی، ان ہی کو یا ان کو ہی لکھتے ہیں جو غلط ہے۔

وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے — جہاں کی وراثت اُسی کو سزا ہے

دم اُن کا ہے دُنیا میں رحمت خُدا کی — انہیں کو ہے پھبتی خلافت خُدا کی

(۱۹) جس جگہ پر کوڑا ڈالا جاتا ہے اُس کو گھورا کہتے ہیں لیکن مرہٹواڑی میں اُکھنڈا اور تلنگانہ میں گھُرٹ کہتے ہیں۔

(۲۰) اکثر عبارت میں چونکہ اور اگرچہ کا استعمال بے محل ہوتا ہے اس لئے ان کا صحیح استعمال یوں ہے:۔

(۱) چونکہ آپ نے بُلایا تھا اس لئے میں آیا۔ (۲) اگرچہ میں نے رات دن محنت کی لیکن پاس نہ ہُوا۔

(۲۱) جلانے کی لکڑی کو ایندھن کہتے ہیں لیکن اس کے معنی میں لکڑی بولنا غلط ہے مثلاً

یہ پتھر کا ایندھن ہے جلوانے والا — جہازوں کو خشکی میں چلوانے والا

(۲۲) انگیٹھی کو مرہٹواڑی میں سگڑی اور تلنگانہ میں لوہے کا چُولہا بولتے ہیں جو غیر صحیح ہے مثلاً

کچھ لحافوں سے ابھی مُنہ کو نکالے ہیں پڑے — لیکن انگیٹھی کو پہلو میں سنبھالے ہیں پڑے

(۲۳) دُودھ دوہنا بولنے کی بجائے دُودھ نچوڑنا یا نکالنا کہنا خلافِ محاورہ ہے۔

جائے مثلاً یہ، جگہ وغیرہ

(۷) ماضی متعدی معروف کے افعال، فعل لازم کے قیاس پر بولنا اور لکھنا غلط ہے مثلاً

(مرد) میں روٹی کھایا ہوں   ہم رخصت لئے ہیں   وہ درخواست دئے ہیں وغیرہ

(عورت) میں کھانا کھائی ہوں   ہم کتابیں پڑھے ہیں   وہ کاغذ دی ہے وغیرہ

اس میں فعل، فاعل کے لحاظ سے نہیں لایا جاتا بلکہ فعل کا دارومدار مفعول پر ہوا کرتا ہے مثلاً

(مرد ہو یا عورت) میں نے روٹی کھائی   ہم نے کھانا کھایا   اُس نے کتابیں پڑھی ہیں۔

حسرت میں لگایا داغ تُو نے   لٹوائی بہار باغ تُو نے

ہم اِن افعال کو فعل لازم کے طریقے پر استعمال کر سکتے ہیں بشرطیکہ فعل کی شکل بدل دیں مثلاً

(مرد) میں روٹی کھا چکا ہوں   ہم رخصت لے چکے ہیں   وہ گھڑی دے چکا ہے

(عورت) میں کھانا کھا چکی ہوں   ہم کتابیں پڑھ چکے ہیں   وہ مٹھائی کھا چکی ہے

رُخ دیکھ چکی ہوں اب ترا میں   مُنہ دوسرے کو دکھاؤں کیا میں

نافہمی سے خوار ہو چکے ہو   اَب تو سیکھو کہ کھو چکے ہو

(۸) فعل ماضی متعدی معروف کی تذکیر و تانیث مفعول کے تابع ہوتی ہے مثلاً میں نے بمبئی دیکھی۔ لیکن اگر حرف مفعول کو کا استعمال کیا گیا ہو تو پھر یہ پابندی باقی نہیں رہتی جیسے مَیں نے بمبئی کو دیکھا۔

(۹) جس جملہ میں فعل مجہول ہو علامت کو کا لانا خلافِ محاورہ ہے مثلاً مجھے بُلایا گیا۔ ملزم کو رہا کیا گیا۔ اس کا صحیح طریقۂ استعمال یوں ہے۔ مَیں بُلایا گیا۔ مُلزم رہا کیا۔

(۱۰) عورتوں کے متعلق جو جملے برتے جاتے ہیں وہ غیر صحیح ہوتے ہیں مثلاً بیگم صاحب یاد فرماتے ہیں۔ لڑکیاں سکول جا رہے ہیں۔ اہل دہلی و لکھنؤ یوں کہتے ہیں جیسے بیگم صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔ لڑکیاں سکول جا رہی ہیں۔

جُھک جُھک کے بدن چُراتی آئیں   رُک رُک کے قدم بڑھاتی آئیں

پیارا جو نہ تھا تو کھو گئیں کیوں؟   بدراہ بھی آپ ہو گئیں کیوں؟

(۱۱) دستخط کا لفظ دست اور خط سے مرکب ہے یہ دونوں لفظ مفرد کی حالت میں مذکر بولے جاتے ہیں اور مرکب کی صورت میں جمع مذکر لیکن ہمارے ہاں دستخط واحد مؤنث استعمال کیا جاتا ہے مثلاً مَیں نے دستخط کی۔

(۱۲) تُم کے ساتھ جو افعال لائے جاتے ہیں وہ غیر صحیح ہوتے ہیں مثلاً تُم آتے ہیں، آ رہے ہیں، آئیں گے۔ آئے ہیں۔ ہوں گے۔ اس کے صحیح افعال یوں ہیں۔ تُم آتے ہو، آ رہے ہو، آؤ گے، آئے ہو، ہو گے مثلاً

اُردو زبان اور دکن کے غلط العام الفاظ

اُردو ہماری ملکی زبان ہے اور حیدرآباد دکن اس کے اوّلین گہواروں میں سے ہے لیکن حیدرآباد کے اکثر تعلیم یافتہ اپنی زبان کے مقامی اسقام کو دُور کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ قائم نے غالباً ایسی ہی خامیوں کو پیشِ نظر رکھ کر کہا تھا ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

اب ذیل میں دکنی زبان کے متعلق چند اسقام پیش کئے جاتے ہیں:۔

(۱) اُردو میں مرہٹی کے بعض ہندسے بولے جاتے ہیں مثلاً اُنچالیس (اُنتالیس) ترتالیس (تینتالیس) چوپن (چوّن) ترتر (تہتر) چوہتر (چوہتر) نود (نوے) وغیرہ

(۲) ٹھنڈ، ٹھاٹ، ٹھٹ، ٹھٹھا وغیرہ کی بجائے تھنڈ، تھاٹ، تھیٹ، تھٹھا وغیرہ بولنا غلط ہے۔ کیونکہ اُردو میں ٹھ سے بولا جاتا ہے بالعد الفاظ مرہٹی بھاشا کے ہیں۔

(۳) اُس، اُن کی کتابت میں الف کے بعد واؤ زیادہ کرکے اوس، اون لکھا جاتا ہے جو متروک ہو چکا ہے لہذا بجائے واو کے الف پر پیش دینا کافی ہے مثلاً

گُل کی جو خبر سنائی اُس کو گلشن کی ہوا سمائی اُس کو

(۴) کہا (कहा) اور کھا (खा) دو علیحدہ لفظ ہیں۔ اگرچہ ان کے تلفظ میں اختلاف ہے لیکن اس کے املا میں فرق نہیں رکھا جاتا مثلاً کہاتہ (کھاتہ) ساتہ (ساتھ) وغیرہ کو ہائے دوچشمی سے لکھنا صحیح ہے اور چُولہا (چُولہا) ننھا (ننہا) وغیرہ کو ہائے دوچشمی سے لکھنا غلط ہے لہذا ان ہردو کی کتابت میں امتیاز ضروری ہے (۹) "ہمایوں"

(۵) پاؤں، گاؤں وغیرہ بروزن جاؤں، آؤں صحیح ہیں لیکن ان کو بروزن جانوں، مانوں لکھنا غلط ہے۔

(۶) اسماء کے حرفِ آخر میں ہائے مختفی اور ہائے اصلی کے لکھنے میں امتیاز نہیں رکھا جاتا جس سے تلفظ میں غلطی ہونے کا امکان ہے۔

(ہائے مختفی) بھروسہ، دھوکہ، راجہ، ڈاکیہ وغیرہ

(ہائے اصلی) یہ، ہگہ، منہ، مینہ، وجہ، توجہ وغیرہ

ہندی الفاظ میں ہائے مختفی کی بجائے الف لکھنا چاہئے مثلاً بھروسا، دھوکا، ڈاکیا وغیرہ یا ہائے اصلی کے لکھنے میں نمایاں فرق رکھا

(نوٹ) صاحبِ مضمون نے بعض مقامی محاورات اور اُردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو غلط قرار دیا ہے۔ وہ ان میں سے اکثر کو ترک کر دینے کی تلقین کرنے میں حق بجانب ہیں مگر انہیں غلط کہنے کا حق نہیں رکھتے۔ "ہمایوں"

غلط فہمی

اے حسینہ، یہ مرے گیت نہیں تیرے لئے۔
میں کبھی ان میں مخاطب نہیں کرتا تجھ کو۔
اپنی رعنائی پہ نازاں کیوں ہے؟
جب کتب خانے کے زینے پہ تجھے ملتا ہوں،
یا سرِ راہ گذر سامنا ہوتا ہے مرا،
کھیلتی ہیں ترے چہرے پہ شفق رنگ حیا کی لہریں
آنکھوں آنکھوں میں تجھے چوم رہا ہوں جیسے۔
نیچی نظریں کئے تیزی سے گزر جاتی ہے۔
اور پھر دُور سے منہ موڑ کے تو
دیکھتی ہے مری جانب جیسے
تجھ کو رہ رہ کے مزہ دے یہ خیال
میری نظریں ہیں ترے جسمِ حسیں پر اب تک،
اور افزائشِ لذت کے لئے دیکھے تو۔
اپنی رعنائی پہ نازاں کیوں ہے؟
تو سمجھتی ہے مجھے عشق ہوا ہے تجھ سے،
اور مرے شعر مرے دل کے ہیں پیغام۔
چہ خوب!
کتنی دلکش ہے غلط فہمی تری!
اے حسینہ یہ مرے گیت نہیں تیرے لئے

محمد صفدر

غزل

پیارا سماں ہے پیاری رات
آؤ سناؤں دل کی بات
میں یہ سمجھا، آئے تم!
جوں ہی کھڑکا کوئی پات
چپکے چپکے روتا ہوں!
اکثر ساری ساری رات
لطف کے قابل میں نہ سہی
سیدھے منہ تو کیجے بات!
جی میں کیا ہے جانے کون
بول ہیں سارے قندونبات
اشکوں کا یہ عالم ہے
جیسے آئی ہو برسات
ساقی اور بھی اک ساغر!
باقی ہے اب تھوڑی رات
بھائی بھائی سب انساں
تیری ذات نہ میری ذات

سلیمان اریب

مائرن

میرا جرم ثابت ہو گیا اور مجھے سزائے موت دی گئی میری موت دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا لیکن ایک پادری کے سامنے میں وٹ پڑا اور میں نے اپنی جان بچا لی۔

اب یہ کھیل ختم ہو چکا ـــــ اب میں اس خدا کی گرفت سے نہیں بھاگ سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اب مجھے اس کا کوئی خوف نہیں!

اب مائرن بڑی دقت سے سانس لے رہا تھا اور اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ سننا مشکل تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُف اس کی صورت اس وقت کتنی بھیانک تھی!

میں نے کہا ـــــ "کیا تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟"

اُس نے جواب دیا "کچھ نہیں"

میں نے کہا "الوداع!" اور نہایت جلدی سے مکان سے باہر نکل آیا

(پاساں) "ناکامِ آرزو"

توارد

ناگن سے خطاب

چینی

کبھی یہاں چین خاندان کے باعظمت و جبروت بادشاہوں کے عظیم الشان خوشنما محلات تھے۔

آج ان محلات سے کیا باقی بچا ہے

صرف چند ٹوٹے پھوٹے کھنڈر

جہاں جھینگر بولتے ہیں

فارسی

آں شاہے کہ خویش را ہلاکو می گفت

وز کبر و منی حرف بہ ابرو می گفت

بر کنگرۂ سرائے او فاختہ

امروز نشستہ بود و کوکو می گفت

(میرزا طالب شیرازی)

"میں مائرن ہوں ------!"

میں یہ سُن کر کانپ گیا لیکن پھر کہا ...." ہاں سکول ماسٹر!"

اس نے آہستہ سے کہا "جی ہاں"

میں نے پوچھا "آپ یہاں کیسے آئے؟"

اس نے مشکل سے سانس لیتے ہوئے کہا ..." وقت بہت کم ہے، اور مجھے بہت کچھ اعتراف کرنا ہے، بہت کچھ کیونکہ آپ نے میری جان بچائی تھی!" اپنے سوکھے ہوئے ہاتھ سے اس نے اپنے بستر کی گھاس کا ایک تنکا اُٹھایا اور یوں کہنا شروع کیا:-

میں سچ سچ کہوں گا کیونکہ یہ ضروری ہے کہ یہ دُنیا چھوڑنے سے پیشتر میں اپنا راز کسی کو بتاؤں، ---- وہ میں ہی ہوں .... میں ہی! جس نے سب بچوں کی جان لی، صرف انتقام کے لئے،

سنئے! میں ایک دیانت دار شخص تھا، بہت دیانت دار، اپنا بیشتر وقت خدا کی عبادت میں صرف کرتا، ---- اچھے اور پیارے خدا کی عبادت میں جو حسن و پاکیزگی کی تخلیق کرتا ہے اور ہمیں درسِ محبت دیتا ہے، ---- جھوٹے خدا کی نہیں، جو قاتل ہے ---- ظالم، بے رحم سفاک اور جو زمین پر جبر و استبداد کی حکومت کرتا ہے! .... میں نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا تھا اور نہ کبھی کسی کو دھوکا ہی دیا -

جب میری شادی ہو گئی تو میرے تین بچے پیدا ہوئے، میں اُن سے محبت کرتا تھا .... اتنی ...... جتنی آج تک کسی باپ نے اپنی اولاد سے نہ کی ہو، ---- میں صرف ان کے لئے زندہ تھا، آہ میں کتنا احمق تھا! آہ! وہ تینوں مجھ سے چھین لئے گئے، کیوں؟ ---- کیوں؟ میں نے کونسا گناہ کیا تھا۔ جس کی پاداش میں میرے پیارے بچے مجھ سے چھین لئے گئے؟ ---- اُس دن سے میری فطرت بدل گئی، میرا دل بدل گیا ......

ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں پہلے ایک خواب دیکھ رہا تھا اور اب اُس خوابوں کی بستی سے کوسوں دُور ہوں .....

جناب! خُدا زندگی صرف اس لئے دیتا ہے کہ اُسے چھین لے، خُدا .... خُدا ایک قاتل ہے، ہر روز اُس کے دل بہلاؤ کے لئے کوئی نہ کوئی موت ضروری ہے، اسی لئے اس نے تمام بیماریوں کی طرح ڈالی ہے، ...... طاعون .... ہیضہ .... تپ دق .... چیچک اور نہ معلوم اور کیا کیا طرزِ ستم اِس ستم ایجاد نے ایجاد کی ہے؛

لیکن یہ بھی کافی نہیں ---- وہ اکثر قحط اور جنگ کی صورت میں عذاب نازل کرتا ہے، .... تاکہ وہ ہزارہا انسانوں کو خون و آتش میں تڑپتا ہوا دیکھے، ....

اس پر بھی اکتفا نہیں ---- اس نے ایسے انسان پیدا کئے ہیں جو دوسروں کا خون چوستے اور ان کی ہڈیاں تک چبا ڈالتے ہیں۔ لیکن خدا ان تمام چیزوں کو دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے .... اُف! ظلم! قہر! ...... اُف

تو جناب! میں نے بھی کچھ بچوں کی جان لی۔ ان کی جان لینے والا ان کا خالق نہ تھا بلکہ میں مائرن تھا .... مائرن!

اس نے کہا کہ کسی نامعلوم دشمن نے مجھ کو پھنسانے کے لئے یہ مٹھائی وہاں رکھ دی ہوگی۔ یہ بات قرینِ قیاس تو تھی لیکن اس کو کیا کیجئے کہ اس کی میز کی خاص دراز میں جہاں وہ اپنی نقدی رکھتا تھا ایک چھوٹی سی ڈبیا شیشے کے ٹکڑوں کی بھری ہوئی ملی۔ مائرن نے اس پر بھی اقبالِ گناہ نہ کیا بلکہ یہ ظاہر کیا کہ اس کے دشمن کی اُسے پھنسانے کی آخری کوشش ہے۔ لیکن "سینٹ بارلو" کے ایک دکاندار نے عدالت میں اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ مائرن نے اُس سے کئی دفعہ نہایت باریک سوئیاں خریدیں اور اس نے کئی ایسے گواہ بھی پیش کئے جنہوں نے مائرن کو اکثر سوئیاں وغیرہ خریدتے دیکھا تھا، کئی چھوٹے بچوں نے اس بات کی گواہی بھی دی کہ مائرن اپنے شاگردوں کو تمام مٹھائی اپنے سامنے کھلاتا تھا اور باقی ماندہ یک دم اکٹھی کر لیتا تھا،

ہر طرف سے پبلک نے یہ صدا بلند کی کہ اس جرم کی سزا سخت سے سخت ہونی چاہئے۔ آخر مائرن کی موت کا حکم سنا دیا گیا اور اس کی اپیل بھی نامنظور کی گئی۔ میرے باپ نے پہلے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ اپیل نامنظور ہوگی،

ایک دن جبکہ میں اپنے دفتر میں کسی کام میں مصروف تھا ایک بوڑھا پادری میرے پاس آیا، وہ نہایت غمگین دکھائی دیتا تھا، چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے کہا کہ اگر مائرن کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا تو یہ ایک بے گناہ کا قتل ہوگا اور پھر وہ بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا۔ بوڑھے پادری کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے

"یہ ایک بے گناہ کا قتل ہوگا"

اُس نے یہ الفاظ کچھ ایسے انداز میں کہے تھے گویا وہ ایک بے گناہ کی جان بچانا چاہتا ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ پیرس گیا، دوسرے دن ہم نپولین سوم شہنشاہِ فرانس کی خدمت میں حاضر ہوئے، میں نے تمام معاملہ شہنشاہ کے سامنے بیان کیا، اسی دوران میں دروازہ کھلا اور ملکہ داخل ہوئی۔ شہنشاہ نے تمام قصہ سننے کے بعد ملکہ سے مشورہ طلب کیا۔ ملکہ نے حالات سُن کر کہا "اس شخص کو ضرور معاف کرنا چاہیئے ...... ضرور، ..... کیونکہ وہ بے گناہ معلوم ہوتا ہے" پہلے تو شہنشاہ رضامند نہ ہوا لیکن جب ملکہ نے کہا کہ "ایک گناہ گار کو بخش دینا ایک بے گناہ کے قتل سے کہیں بہتر ہے" تو شہنشاہ نے موت کا حکم منسوخ کر دیا اور قیدِ سخت کا حکم دے دیا، کچھ عرصہ بعد میں نے سُنا کہ مائرن اپنے اعلیٰ کیریکٹر کی وجہ سے سرکاری ملازمت میں لے لیا گیا ہے، پھر کافی عرصہ تک میں نے اس شخص کے متعلق کچھ نہ سنا،

کچھ عرصہ بعد جب میں لِل میں موسم گرما بسر کر رہا تھا تو ایک شام مجھے ایک نوجوان پادری کا ملاقاتی کارڈ ملا۔ میں نے اسے اندر بُلایا

"آپ براہِ مہربانی تھوڑی دیر کے لئے میرے ساتھ چلیئے، ایک شخص جو چند لمحوں میں موت کا شکار ہونے والا ہے، آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے" جن دنوں میں منصف تھا، ایسے واقعات اکثر پیش آیا کرتے تھے، میں پادری کے پیچھے پیچھے ہو لیا، وہ مجھے ایک خستہ حال مکان میں لے گیا۔ خشک گھاس پر ایک نحیف و زار جسم ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہونے کی تیاری کر رہا تھا، اس کی گہری چمکتی ہوئی آنکھوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے،

اس نے نحیف آواز میں کہا "آپ مجھے پہچانتے ہیں؟"

میں نے آہستہ سے جواب دیا "نہیں"

مائرن

جن دنوں پیران زینی کے عجیب و غریب مقدمے کے متعلق ہر جگہ بحث ہو رہی تھی، سرکاری وکیل ایم آلیور نے ایک حیرت انگیز واقعہ سنایا، "میں تمہیں ایک حیرت انگیز واقعہ سناتا ہوں...... اس وقت میں پبلک پراسیکیوٹر تھا اور میرا باپ پیرس کا صدر،...... میرے پاس ایک عجیب مقدمہ آیا،...... ایم مائرن شمالی فرانس کے ایک گاؤں میں سکول ماسٹر تھا،..... وہ اپنی ذہانت اور شرافت کے باعث گرد و نواح میں بہت مشہور تھا،...... وہ ایک نہایت کم گو انسان تھا،...... اُس نے باٹسلن میں جہاں وہ سکول ماسٹر تھا ایک پری چہرہ لڑکی سے شادی کر لی، اس کے تین بچے پیدا ہوئے لیکن تینوں یکے بعد دیگرے تپ دق کا شکار ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے بچوں کو کھو کر اُس نے اپنی تمام محبت اپنے ہونہار شاگردوں کے لئے وقف کر دی ہے، وہ اپنی جیب سے روپیہ خرچ کر کے اپنے شاگردوں کے لئے کھلونے لاتا، ان ننھے بچوں کو کھانے پر مدعو کرتا اور انہیں نہایت عمدہ کیک اور مٹھائیاں کھلاتا، گاؤں کا ہر شخص اس نیک انسان کی نرمی اور رحمدلی کی تعریف کرتا، اچانک اس کے پانچ ہونہار شاگرد کسی نامعلوم بیماری کی وجہ سے مر گئے، کافی کوشش کی گئی کہ اموات کی وجہ معلوم کی جائے لیکن بے سود! کیونکہ بیماری کی علامات ہی کچھ عجیب قسم کی تھیں، بچوں نے پیٹ میں نہایت شدید تکلیف محسوس کی اور وہ کچھ کھا پی نہ سکے اور چند دنوں میں اس دردناک عذاب میں جان دے دی۔ اس کے بعد پورے ایک سال تک کوئی موت نہ ہوئی، پھر چار دن میں مائرن کے دو عزیز ترین شاگرد فوت ہو گئے۔ لاشوں کا پوسٹ مارٹم کیا گیا، مردہ بچوں کے جسم کے مختلف اعضاء میں شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پائے گئے، کہا گیا کہ دونوں بچوں نے کوئی ایسی چیز کھائی ہے جس میں بے احتیاطی کی وجہ سے شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مل گئے، معاملہ یہیں ختم ہو جاتا لیکن اتفاقاً مائرن کا نوکر بھی اُنہیں دنوں میں اُسی بیماری میں مبتلا ہو گیا، اور وہی شیشے کے ٹکڑے آپریشن کرنے سے اس کے جسم کے مختلف اعضاء میں ملے، آخر اُس نے اعتراف کیا کہ اس نے اپنے آقا کی وہ مٹھائی چرا کر کھائی تھی جو مائرن اپنے شاگردوں کے لئے لاتا تھا۔ عدالت کے حکم سے سکول ماسٹر کے گھر کی تلاشی لی گئی، ایک الماری میں کچھ کھلونے اور مٹھائی ملی، تمام اشیائے خوردنی میں شیشے کے چھوٹے ٹکڑے ملے ہوئے تھے، مائرن اُسی وقت گرفتار کر لیا گیا، لیکن اُس کے چہرے کی رنگت اور اس کے طرزِ تکلم سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے اس سنگین جرم کا ارتکاب نہیں کیا، جرم اتنا نمایاں تھا کہ اُس کو بے گناہ تصور کرنا ایک امر محال سا معلوم ہوتا تھا، لیکن جب اُس کی نیکی، رحمدلی اور نرمی کے واقعات سامنے آتے تو انسان یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر ایسے نیک دل انسان نے اتنے مکروہ فعل کا ارتکاب کس جذبہ کے ماتحت کیا اور اس پر طرّہ یہ کہ وہی لڑکے موت کا شکار ہوئے جو اس کے نزدیک عزیز ترین تھے اور جن پر وہ اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ صرف کرتا تھا،

اگر یہ مانا جائے کہ یہ اسی کا کام ہے تو ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ وہ دیوانہ ہو گیا ہوگا، لیکن مائرن اتنا عقلمند اور ذہین نظر آتا تھا کہ اس کو پاگل کہنا ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتی تھی۔

اصغر کی یاد میں

تعزلہ معلوم ہوا میرے نام ایک خط آیا: "ایک ایسے نو اُفتادہ مخلص کا سلام شوق قبول فرمایئے جس نے آج تک کوئی خط لکھ کر آپ کو زحمت مطالعہ تو نہیں دی مگر آپ کے نام کی محبت وہ اپنے دل میں جاگزیں پاتا ہے...... اِن دو دلوں کی کشش ہوتی ہے یا ہونا چاہیئے کہ یہ تو میرے تجربہ ایک غم زدہ دوسرے غم زدہ کا ہمدرد ہوا کرتا ہے..... مسلسل ایک سال سے ہمایوں میری آنکھوں کو نور بخش رہا ہے لیکن اس مجلۂ تاباں میں ایک تاریک باب ایسا بھی مستقل پاتا ہوں جس کے مطالعے نے میرے غم زدہ دل کی نگاہ میں دُنیا تاریک کر دی ہے اور ایک خلش بے پناہ برپا ہو رہی ہے جس کا اثر ایک ایک ہفتہ دل و دماغ پر مرتسم رہتا ہے۔ وہ باب ہے "اصغر کی یاد میں"۔ بھائی! ایسی نعمت کھو جانے پر آپ کی جو حالت ہو جائے وہ کم ہے..... وہ صدا ایک حقیقی مرثیہ ہوتی ہے اُس کا ہر حرف اپنے دامن میں ہزاروں نیر و نشتر پنہاں کئے ہوتا ہے...... میرا یہ کہنا تو دیوانہ کی بڑ ہو گی کہ صبر کیجئے...... مگر تاہم اس باب میں کچھ کہنا ضرور چاہتا ہوں...... انسان کی ترکیب کچھ اس انداز سے ہوئی ہے کہ وہ خود غرض اور خائن بن کر رہ گیا ہے۔ یہ بھی میرا وہ بھی میرا یہ اُس کا نعرہ ہے لیکن اگر وہ چشم بصیرت سے دیکھے تو اُس کا کچھ بھی نہیں حتّٰے کہ اُس کے اعضا، اُس کے خیالات، اُس کے عزائم بھی اُس کے نہیں بلکہ اُن کی مالک کوئی دوسری ہستی ہے یا اِس مشین کو حرکت میں لانے والا پرزہ کوئی اور ہے جو صرف اپنے منشا کے مطابق اُس کو چلاتا رہتا ہے اور جس قدر کام لینا مقصود ہوتا ہے اُس کی تکمیل کے بعد یہ مشین بند کر دی جاتی ہے........ اصغر مرحوم ایک خوش رنگ پودا تھا اس باغِ جہاں کا اور اُس کی حفاظت آبپاشی نیز پیراستگی کے لئے بشیر میاں مالی مقرر کئے گئے تھے۔ مالکِ باغ کی نگاہ میں وہ پودا کثیف دُنیا کے غبار آلود گلزار میں رہنے کے قابل نہ تھا، اُس کو یہاں سے اُٹھا کر جنّت الفردوس میں لگا دیا اور بشیر میاں کو اُس کی خدمات سے سبک دوش کر دیا۔ اور بشیر میاں کو ملال کا کیا حق؟ وُہ ملازم سے مالک کیوں بننا چاہتے ہیں؟........ اہلِ دُنیا اِس حقیقت کو نہ سمجھے تو خدا کو اُن کی دلجوئی کے لئے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْن کا ترانہ سنانا پڑا۔ بھائی اصغر ایسے اعلیٰ مقام میں مقیم ہیں جس کے مقابلے میں یہ نجس دُنیا جس میں اُسے رکھنے کے آپ متمنّی تھے ایک تاریک غار ہے پھر کیا آپ کو مطمئن نہ ہونا چاہئے کہ آپ کا لختِ جگر ایک ممتاز عہدے پر مامور ہے اور ایسے آرام کا حامل ہے جو آپ اُسے ہرگز نہ پہنچا سکتے تھے۔ یہی تو ہے نا کہ وُہ آپ کی آنکھ سے اوجھل ہے۔ آنکھ سے اوجھل تو جب بھی تھا جب آپ پنجاب میں تھے اور وہ انگلینڈ میں۔ بس آپ سمجھ لیجئے کہ مدّت قیام کچھ اور بڑھ گئی آج نہیں کل اُس سے ملاقات ہو گی...... یہ دُنیا گزشتنی و گزاشتنی ہے دل کو دوسری جانب متوجہ کیجئے خیال بانٹئے۔ آپ کے اور میرے ساتھ کوئی نیا کام نہیں ہُوا اس سے سخت سخت مثالیں دُنیا پیش کر چکی ہے"۔

(از نواده۔ بدایون)

ب و

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

ایک کوٹھری کے سامنے لے گئے۔ اس کوٹھری میں چار قیدی بند تھے۔ اور میں چاروں کو پہچانتا تھا کیونکہ یہ بھی کبھی اخبار نویسی کیا کرتے تھے۔ ان کے سامنے ردی کاغذوں کے بڑے بڑے ڈھیر پڑے تھے۔ اور یہ لوگ کاغذ پھاڑ پھاڑ کر کھا رہے تھے۔ ایک سپاہی کوڑا لئے ان کے سروں پر مسلط تھا اور جب کبھی کسی قیدی کا ہاتھ رُکتا تھا وہ زور سے ایک کوڑا اس کی پیٹھ پر جما دیتا تھا۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ یہ عجیب سزا ہے۔ ان کا جرم کیا ہے؟ سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا کہ یہاں کی سب سزائیں آپ کو عجیب معلوم ہوں گی۔ ان لوگوں کا جرم یہ ہے کہ یہ قوم فروشی کرتے تھے۔ قرآن کی آیت سے مقالہ افتتاحیہ شروع کرتے تھے اور قرآن کی آیت پر ختم کرتے تھے لیکن اصل متن میں شیطان کے کارندوں کی نہایت ذلیل اور گھٹیا خوشامد کرتے تھے۔ اب ان کی سزا یہی ہے کہ اپنے اپنے اخباروں کے پرانے فائل چباتے رہیں۔ اگلی کوٹھری میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کا استرے سے مونڈن سنسکار کیا گیا ہے اور دو سپاہی اسے ایک ٹب میں غوطے دے رہے ہیں۔ میں نے غور سے دیکھا تو پہچانا کہ قیدی ایک مشہور سیاستدان ہے۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ سے اس غریب کا گناہ پوچھا تو کہنے لگے کہ اس شخص کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ یہ صبح ایک اخباری بیان دیتا تھا۔ دوپہر کو اسے ایک دفعہ بلاتا تھا اور یہ اس سے اپنے اخباری بیان کے بالکل برعکس باتیں کرتا تھا۔ شام کو اخبار نویسوں کی ایک کانفرنس بلاتا تھا اور ان سے ان دونوں مواقع سے بالکل مختلف بات چیت کرتا تھا۔ میں نے کہا آپ اسے کیا سزا دے رہے ہیں؟ کہنے لگے اس ٹب میں بادام روغن ہے۔ دو سپاہی دس بجے صبح سے لے کر شام کے چار بجے تک تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اسے اس ٹب میں غوطے دیتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا اگر حافظہ کی کمزوری کا تدارک ہی مقصود تھا تو سر پر بادام روغن کی مالش کی ہوتی۔ فرمایا وہ علاج ہوتا سزا نہ ہوتی اور میں شفاخانہ کا انچارج نہیں بلکہ جیل خانہ کا سپرنٹنڈنٹ ہوں۔ آئیے اب آپ کو آگے لے چلیں۔ میں نے کہا شکریہ جو کچھ دیکھ لیا۔ وہی کافی ہے۔ اب مزید تاب نہیں۔ تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب نے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے رخصت لی اور مجھے اپنی کوٹھی پر لے آئے۔ کہنے لگے "آپ اب واپس جا کر کیا کریں گے؟ یہیں بس رہیے" میں نے کہا "نہیں مولوی صاحب میرے لئے مستقل طور پر ٹمبکٹو ہی کا ہو رہنا سخت مشکل ہے۔"

"کیوں آپ کے لاہور سے تو ہزار درجے بہتر ہے۔ ٹمبکٹو فردوس بر روئے زمین ہے فردوس بر روئے زمین ——۔"

"کچھ بھی ہو۔ میں تو وہیں رہوں گا جہاں میرے بھائی بہنیں اور دوست ہیں ان کے بغیر مجھے آپ کے فردوس کی زندگی منظور نہیں۔"

"اچھا تو دو چار مہینے تو اب یہاں ٹھہریئے نا آپ"

"یوں تو مجھے چھ مہینے ٹھہرنے میں بھی کوئی عذر نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میرا وقت کیسے کٹے گا۔ تم تو قبریں گنتے پھرو گے۔ تمہاری بیوی تمہارے مسودے ٹائپ کرے گی۔ میں کیا تمہارے بچے کو کھلایا کروں گا؟"

"یہ کچھ اتنا ناخوشگوار کام تو نہیں۔ اچھا تو بھائی صاحب کو یہاں بلا لیں پھر تو آپ ضرور ٹھہریں گے"

"کیا اچھی تجویز ہے۔ لیکن وہ آج کل ہیں کہاں؟"

"چیچو کی ملیاں"

گاڑی چیچو کی ملیاں کے ویران سٹیشن پر کھڑی تھی۔ ایک مسافر اسی موٹے پوری بیچنے والے سے پوچھ رہا تھا کہ یہ کونسا سٹیشن ہے اور وہ کہہ رہا تھا۔ "چیچو کی ملیاں بابو جی۔ چیچو کی ملیاں۔ میری گرما گرم پوریاں کھائیے۔ کبھی یہاں جنکشن تھا۔ بڑی رونق ہوتی تھی۔ اب تو دن میں صرف چار مرتبہ گاڑی آتی ہے سب خوانچے والے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ صرف میں اب تک یہیں ہوں۔ اور میں رہوں گا۔ خدا ایک مرتبہ کھا کر تو دیکھئے بابو جی! ہماری عمر یاد رکھو گے چیچو کی ملیاں کی پوری

تک تعلیم لازمی اور مفت ہے"

"تمہاری بیوی کام کہاں کرتی ہے؟"

"وہیں گھر میں۔ یہاں عورتیں نوکری نہیں کرتیں۔ بلکہ گھر کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ یوں وہ میرے کام میں ہاتھ بٹاتی رہتی ہے۔ میرے مسودے صاف کر دیتی ہے میرے خط ٹائپ کرتی ہے۔ گھر کا حساب رکھتی ہے۔ بس یوں سمجھو کہ میری سکرٹری ہے"

میں نے کہا "شیعہ ہے؟"

مولوی صاحب مسکرا کر بولے "آپ سے کس نے کہا؛ وہ تو عیسائی ہے"

میں نے کہا "خوب تم تو کہتے تھے کہ شیعہ، سنی کی شادی ہی نہیں ہو سکتی اور خود ایک عیسائی لڑکی سے بیاہ رچا لیا"

"میں نے کب کہا کہ شیعہ، سنی کی شادی نہیں ہو سکتی۔ میں نے تو اس وقت بھی یہی کہا تھا کہ مجتہد اجازت دے دیں تو شیعہ سنی کی شادی ہو سکتی

"تو یہاں کس مجتہد نے اجازت دی؟"

"یہاں مجتہد، علما، پادری کسی کو داخلے کی اجازت نہیں۔ اس لئے شیعہ، سنی، مسلم، عیسائی سب آپس میں شادیاں کر لیتے ہیں"

"تو اب تم مطمئن ہو کہ تمہاری شادی جائز ہے؟"

"فقہ میں اس کی کوئی ممانعت نہیں"

"شیعیان حیدر کرار کے پاس بھی کوئی فقہ ہے؟"

"آپ قانون ملک کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اس جگہ مذہبی اور فرقہ وارانہ بحث سخت ممنوع ہے۔ آپ نے حسب عادت شیعہ پر کوئی حملہ کیا تو میں سنیوں پر جوابی حملہ ضرور کروں گا۔ اور پھر ہم دونوں گرفتار کر لئے جائیں گے"

"اچھا خیر اس بحث کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ اس نیک بخت سے تمہاری ملاقات کیسے ہوتی؟" اب جو مولوی صاحب نے ساری داستان سنائی مجھے یاد آیا کہ یہ نورہ مشتر حسن وہی لڑکی ہے جس کی شادی انوار مولوی صاحب سے کرانا چاہتے تھے۔ اور میں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ شادی کے موقع پر اپنی طرف سے مولوی صاحب کو ایک موٹر بطور تحفہ دوں گا۔ میں نے کہا مولوی صاحب بتائیے آپ کیسی موٹر لینا پسند کریں گے

مولوی صاحب نے کہا "ایک موٹر تو میرے پاس ہے۔ دوسری موٹر میں رکھ ہی نہیں سکتا۔ حکومت کے خیال میں مجھے صرف ایک کی ضرورت ہے"

اتنے میں ایک سپاہی آیا اور مولوی صاحب سے کہنے لگا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب جیل آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اگر آپ جیل دیکھنا پسند کریں تو چلتے ہیں ورنہ میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کو اپنی معذرت کہلا بھیجتا ہوں۔ میں نے کہا چلئے جیل بھی دیکھیں۔ مولوی صاحب نے موٹر نکالا اور ہم دونوں جیل پہنچ گئے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب سے میرا تعارف کرایا گیا۔ بڑے تپاک سے ملے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے آپ کے ہاں کے اکثر قیدی میری تحویل میں ہیں۔ کہئے تو ان سے ملاقات کرا دوں؛ میں نے اشتیاق ظاہر کیا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب ہم دو

لیا تو واپس گھر کیسے پہنچوں گا؟ میں نے ایک ملازم سے کہا کہ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کُل بل کتنا ہوگا؟ وہ کچھ حیران سا ہو کر بولا "بل سے کیا مراد ہے آپ کی؟" میں نے کہا "کل پیسے کتنے خرچ ہوں گے؟" اب بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کہنے لگا "پیسے کاہے کے" میں نے کہا "تو کھانا مفت کھلاؤ گے کیا؟" وہ بولا "مفت نہیں۔ آپ اپنا کارڈ دکھائیے" میں نے کہا "کیسا کارڈ؟" وہ بولا "کھانے کا کارڈ" میں نے کہا "کارڈ وارڈ تو میرے پاس کوئی نہیں۔ تم پیسے لو اور کھانا دو" اس نے کہا "پیسوں کا یہاں چلن نہیں ہے۔" اتنے میں مینجر بھی آگیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کیا بات ہے۔ میں نے اسے سارا قصہ کہہ سُنایا۔ وہ کہنے لگا "افسوس ہے کہ آپ کو یہاں کھانا نہیں مل سکتا۔ اس جگہ کا دستور یہ ہے کہ ہر شخص کو حکومت کی طرف سے ایک کارڈ ملتا ہے جس پر اس کے کام اور پیشے کے اعتبار سے اس کے کھانے کی قسم، معیار اور مقدار درج ہوتی ہے۔ وہ کارڈ دکھاتا ہے اور اسے کھانا مل جاتا ہے" میں نے کہا "لیکن میں نقد پیسے دیتا ہوں" مینجر مسکرا کر کہنے لگا "یہاں پیسوں کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ حکومت ضرورت کی دوسری تمام چیزوں کے لئے بھی کارڈ جاری کرتی ہے۔ اس شہر میں روپے پیسے کا چلن نہیں۔ ہر شخص اپنی قابلیت و استعداد کے مطابق کام کرتا ہے اور حکومت اس کی قابلیت و استعداد کے مطابق اس کی تمام ضروریات مہیا کرتی ہے۔ آپ کام کیجئے آپ کو کھانا مل جائے گا۔ اور اگر آپ نے اسی طرح چاندی کے ان سکوں سے کام نکالنے کی کوشش کی تو بھوکے مر جائیں گے"

میں نے کہا "لیکن اجنبی شہر میں مجھے پہلے ہی دن کام کیسے مل جائے گا؟" وہ بولا "کیوں نہیں۔ فرمائیے آپ کیا کچھ کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا "انگریزی سے اُردو میں اور اُردو سے انگریزی میں روانی کے ساتھ ترجمہ کر سکتا ہوں۔ دونوں زبانوں میں برے بھلے مضمون بھی لکھنے پر قادر ہوں۔ نیوز ایڈیٹر کا کام بڑی اچھی طرح کر سکتا ہوں" وہ سوچ سوچ کر بولا "تو آپ جرنلسٹ معلوم ہوتے ہیں" میں نے کہا "جرنلسٹ کا لفظ تو مجھے قطعاً پسند نہیں۔ بہرحال آج کل میں یہی کام کر رہا ہوں" اس نے کہا "آپ کے پاس لائسنس ہے" میں نے کہا "میں قلم سے مضمون لکھتا ہوں۔ پستول سے نہیں" وہ بولا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہندوستان سے آئے ہیں۔ سُنا ہے کہ اس ملک میں ہر وہ شخص جو دوسرے تمام پیشوں میں ناکام رہ چکا ہو جرنلسٹ بن جاتا ہے تعلیم اور تجربہ کی مطلق کوئی قید نہیں۔" میں نے کہا "آپ نے مجھ پر ناجائز حملہ کیا ہے۔ میں پنجاب یونیورسٹی کا ایم اے ہوں اور مجھے صحافت کا اچھا خاصا تجربہ ہے۔" مینجر بولا "آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں نے آپ کی ذات کے متعلق کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے تو ہندوستان کی صحافت کا ذکر کیا تھا اور گستاخی معاف وہاں کے نظام تعلیم کے متعلق جو تھوڑا بہت میں جانتا ہوں اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اکثر لوگ ایم اے پاس کر لینے کے باوجود اَن پڑھ ہی رہتے ہیں۔ لیکن خیر اس قصہ کو چھوڑیئے۔ لائسنس کے بغیر آپ کو کسی اخبار کے دفتر میں جگہ نہ ملے گی۔ قلم پستول سے زیادہ خطرناک ہتھیار ہے اور یہاں کسی اناڑی کو قلم اُٹھانے کی اجازت نہیں" میں نے کہا "اچھا اس وقت تو کھانا کھلایئے۔ اس کے بعد جو گزرے گی سہہ لیں گے" مینجر کے لہجے میں سختی آگئی اور بولا "آپ مہذب طریقے پر بھیک مانگ رہے ہیں۔ یہاں بھیک مانگنا بہت بڑا جرم ہے" اب میرے لئے اس ہوٹل میں بیٹھ کر بیکار بحث کرنا بے سود تھا۔ اس لئے اُٹھ کر باہر چلا آیا۔ لیکن حیران تھا کہ کدھر جاؤں۔ بازار میں خوب چہل پہل تھی۔ ٹمبکٹو کے لوگ وجیہ، صحت مند، بشاش اور جامہ زیب معلوم ہوتے تھے۔ دکانیں بہت شاندار تھیں۔ بازار اتنا صاف تھا کہ کہیں کوڑے کرکٹ کا نام و نشان تک نہ نظر آتا تھا۔ میں ایسے ہی اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہا تھا کہ میری نظر اپنے ایک دوست مخفی پر جا پڑی۔ ان کا اصل نام تو کچھ اور ہے لیکن ہم انھیں پیار

کل سہ پہر کو میں ایک ایسی گاڑی پر سوار ہوا جو چیچو کی ملھیاں سے بھی گزرتی ہے۔ گرمی کی شدت کے باوجود میں نے رات کے سفر پر دن کے سفر کو محض اس لئے ترجیح دی کہ چیچو کی ملھیاں کے سٹیشن کو اچھی طرح دیکھ سکوں گا۔ لیکن گاڑی میں بیٹھتے ہی میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔ میرے ڈبے میں میرے علاوہ صرف دو لالہ صاحبان بیٹھے تھے اور وہ چیخ چیخ کر اس موضوع پر بحث کر رہے تھے کہ لڑائی کے بعد دنیا کا نظام کیا ہوگا؟ باتوں سے اچھے خاصے تعلیمیافتہ آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن ان کی میلی کھدر کی دھوتیاں۔ گریباں چاک کرتے۔ دو دو پیسے کی ٹوپیاں اور مٹی سے اٹے ہوئے چپل دیکھ دیکھ کر میں غصہ سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ان کا بس چلے تو ساری دنیا کو یہی لباس پہنا دیں اور میرا بس چلے تو انہیں ایک ایک کر کے کھڑکی کی راہ سے پلیٹ فارم پر دے ماروں۔ ان کے شور کے باوجود مجھے ضمیر کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی ـــــ "تمہیں چیچو کی ملھیاں سے زیادہ محبت ہے۔ انصاف سے کام لو۔ اللہ منصف مزاجوں کا دوست ہے جب تم دو شہروں سے یکساں سلوک نہیں کر سکتے تو اگر تمہیں چار شادیاں کرنی پڑ جائیں تو اپنی بیویوں میں مساوات کیسے قائم کرو گے؟ ابھی گاڑی چلنے میں کافی دیر ہے۔ اب بھی اتر جاؤ اور ٹمبکٹو پہنچنے کی کوشش کرو۔ جنگ کے شعلے لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہے ہیں۔ کیا عجب ٹمبکٹو بھی ان کی لپیٹ میں آ جائے؟ موقع کو غنیمت جانو اور فوراً ٹمبکٹو پہنچنے کی کوشش کرو۔ آج کا کام کل پر نہ ڈال .... اس کے علاوہ معلوم نہیں حضرتِ ضمیر نے اور کیا کچھ کہا لیکن سفر کے اختتام پر جب گاڑی رکی تو میں ٹمبکٹو کے پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ میرے پاس ٹکٹ تو سانگلا ہل کا ہے اور میں پہنچ گیا ہوں ٹمبکٹو۔ اگر ٹکٹ کلکٹر نے پکڑ لیا تو میرے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں کہ جرمانہ ہی ادا کر سکوں۔ ریلوے والوں نے مقدمہ بنا دیا تو پردیس میں کوئی ضمانت بھی دینے کو تیار نہ ہوگا۔ میں اپنے آپ کو کھڑا کوس ہی رہا تھا کہ بیٹھے بٹھائے ضمیر کی باتوں میں آ کر ناحق یہ مصیبت مول لی کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے خوف کے مارے جھرجھری لی اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سچ مچ ریلوے کا ایک افسر میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا لیکن پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہوں وہ خود ہی بڑی شائستگی سے بولا "کہاں جانا ہے آپ کو؟" میں نے کہا "بس ٹمبکٹو تک آیا ہوں۔" وہ بولا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ پہلی مرتبہ یہاں تشریف لائے ہیں۔" میں نے کہا "جی ہاں۔ برسوں سے ارادہ کر رہا تھا کہ کبھی اس طرف آؤں۔ مگر فرصت اب ملی۔" وہ مسکرا کر بولا "اچھا تو میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا "کسی اچھے اور سستے سے ہوٹل کا پتہ بتا دیجئے۔" اس نے مجھے بتایا کہ سٹیشن سے باہر نکلتے ہی آپ کو بس مل جائے گی۔ کنڈکٹر سے کہئے کہ آپ کو "کازموپالیٹن ہوٹل" اتار دے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سٹیشن سے باہر نکل گیا۔ میں اپنے جی میں اس حسنِ اتفاق پر بہت خوش تھا کہ اسے باتوں میں مجھ سے ٹکٹ پوچھنے کا خیال ہی نہ آیا۔

بس میں بیٹھ کر میں نے کنڈکٹر سے ٹکٹ مانگا تو اس نے کہا کہ یہ پبلک بس ہے۔ ٹکٹ وکٹ کی ضرورت نہیں۔ آپ جہاں کہیں گے آپ کو وہیں اتار دیا جائے گا۔ میں نے اپنے دل میں کہا یہ خوب انتظام ہے۔ لاہور میں تو یہ حالت ہے کہ ماڈل ٹاؤن پہنچنا چاہو تو بھی اڑھائی آنے دو اور اگر تین میل ادھر مسلم ٹاؤن میں اتر جانے کا خیال ہو تو بھی بس والا اڑھائی آنے ہی وصول کرے گا۔ بس والے نے مجھے ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ بڑی خوبصورت اور صاف ستھری عمارت تھی۔ ملازم خلیق و شائستہ اور چاق و چوبند۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے "مینو" منگوایا اور چند کھانے منتخب کئے۔ لیکن ان کے سامنے دام درج نہیں تھے۔ میں ڈرا کہ مسافر آدمی ہوں۔ اگر ان ہوٹل والوں نے کھانے کے بل ہی میں مجھے لوٹ

چاہیئے بلکہ اسے سرے سے خدا کے وجود ہی سے انکار ہے اور یہ نہ حیرت انگیز ہے اور نہ افسوس ناک۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ مذہب سے جدا ہو کر اخلاق ایک معاشرتی ضابطہ بن جاتا ہے ——— دنیوی، متغیر اور لچکدار ——— جس کی تعمیل لازمی نہیں نتیجۃً بدکاری بڑھ جاتی ہے مگر یہ ایک خوابِ پریشاں ہے اور حقیقت سے قطعی مختلف۔ الحاد سے زیادہ مذہب بداخلاقی کا مؤید اور پردہ دار ہے۔ مذہبی انسان گناہ بھی مذہب کی رو سے کرتا ہے۔ شرعی حیلوں کا نظام اسے گناہ کی پوری آزادی اور تحریک عطا کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل بے دینی میں انسان تہذیبی احکام وضوابط کے متعلق زیادہ موافق انداز اختیار کرتے ہیں۔ وہ انہیں توڑتے نہیں بلکہ حالات کے مطابق ان میں اصلاح کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

"غیب پر ایمان" مذہب کا مرکزی عقیدہ ہے۔ یہ وہ چول ہے جس کے گرد مذہب کی پوری مشینری حرکت کرتی ہے۔ اسے ہم بجا طور پر جان سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کے بغیر مذہب ایک مردہ اور فساد پذیر جسم ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں خدا قلب و مرکز کی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ بدھ مت میں بھی بانی کی ذات خدا کی قائم مقام بن گئی ہے۔ ہمارے زمانہ کا یہ سب سے بڑا انقلاب ہے کہ خدا پر یقین سائنس اور عقل کی ترقی کے متناسب زائل ہوتا جا رہا ہے۔ افق سے سورج بلند ہوتا ہے تو تاریکی بتدریج دور ہوتی جاتی ہے "ان دیکھی حقیقت" پر واقعی ایمان ہو بھی کیسے جبکہ سائنس اور عقل کا حکم ہے "جو نظر نہ آئے اسے رد کر دو" بے دینی کا یہ بڑھتا ہوا سیلاب ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے مذہبی مہاجنوں کے گلوں کی تنی ہوئی رگیں اس کی شاہد ہیں۔ بلاشبہ یہ ٹوری، آسمانی بادشاہت کے یہ وفادارانِ لم یزل، مسلسل اس کوشش میں ہیں کہ خدا کی مملکت کو اس کے باغیوں کے وجود سے پاک کرکے ہر جگہ خدا کے نام کا بول بالا کر دیں۔ وہ جاہل یا نیم تعلیم یافتہ عوام کو ہیبت زدہ یا بس میں کرنے کے لئے اپنے کم جوکس یا ان حریفوں کی سربریدہ نعشوں کو ہر گلی کوچہ میں گھسیٹتے پھرتے ہیں جن کی گھڑیاں آج سے کئی سال پہلے بند ہو چکی ہیں۔ لیکن خدا کے ان سپاہیوں کا یہ جنونِ انتقام یہ مسلسل اور جان توڑ کر لڑنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ میدان ان کے ہاتھ نہیں۔ وہ کمزور ہیں اور ایک ہاری ہوئی لڑائی میں مصروف محض اس توقع پر کہ شاید کوئی نقطہ رجعی مل جائے قسمت کوئی پلٹا کھائے۔ مگر ہماری اس دنیا میں جہاں قانونِ علّیت کا دور دورہ ہے معجزے مشکل سے وقوع پذیر ہوتے ہیں فرانس کے وزیرِ اعظم موسیو رینا ڈ اس کی شہادت دیں گے۔ موقع میدان اور باقاعدہ کارروائیوں پر نظر کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے

مرزا محبوب بیگ

جب پتہ محبت کرتا ہے تو وہ پھول بن جاتا ہے

جب پھول عبادت کرتا ہے تو وہ پھل بن جاتا ہے

ہم اس دنیا کو سمجھتے نہیں اور پھر کہتے ہیں کہ دنیا ہم کو دھوکا دیتی ہے

(ٹیگور)

ترجمہ از منظر بشیر

لر دیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ مؤخر الذکر کی تعداد نسبتاً بہت تھوڑی ہے اور بڑی اکثریت ان کی ہے جنہوں نے اپنی نظر کو اپنے نفس پر مرکوز کر کے حوالی کو دھندلا کر دیا ہے۔ معقولیت اس خود اندیشی کو معتدل بنائے گی صرف عقل ہی ہمیں یہ بتا سکتی ہے کہ اکثر و بیشتر ہمارے وقتی اور شدید رجحانات اور تہیجات ہماری مجموعی بھلائی کے معارض ہوتے ہیں۔ لہذا اس کے احکام کی تعمیل کر کے ہم نہ صرف اپنی مجموعی بھلائی کو محفوظ کرتے ہیں بلکہ انسانی مجموعی بھلائی کے لئے بھی کام کرتے ہیں۔

(۳) گناہ کا تصور پارینہ اور بیہودہ ہے۔ اور اس کے لئے تعزیری سزا بے ضرورت۔ لہذا جہنم اور جیل خانے نہ صرف بیکار بلکہ مرض آفریں ادارے ہیں۔ ہمیں انسانی فطرت کی زیادہ عمیق فہم حاصل کرنی چاہئے اور ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہئے کہ مدرسے اور علاج گاہیں پولیس اسٹیشنوں عدالتوں، اور جیل خانوں سے بڑھ جائیں انہیں کچل دیں۔

(۴) ضمیر ایک غیر عقلی قوت ہے۔ وہ نوع انسان کے عہد طفلی کی باقیات ہے جبکہ ان تہیجات کو جنہیں مفید مطلب نہیں بنایا جا سکتا تھا خبط کر دیا جاتا تھا۔ آج جب کہ ہم نے عقل کو تقویت دے لی ہے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بلا شبہ ہر انسانی بچہ آج کل وہی کرتا ہے جو نوع انسان نے اپنے بچپن میں کیا لیکن اگر ہم اپنے ان اخلاقی اصولوں کو جو ہمیں اپنی طفولیت میں ماحول کی اثر آفریں ہستیوں سے ملے اس کے اثر پذیر ذہن پر مرتسم نہ کریں بلکہ اس کی عقلی طور پر تربیت کر کے اس کے فطری بروز میں مدد دیں تو اسے ضعف عقل اور ترغیبات جرم سے بچانے کے ساتھ ساتھ اس کی تکمیل شخصیت میں بھی حصہ لیں گے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اہم جبلتوں کو ضبط کرنے سے زندگی کو سخت نقصان پہنچتا ہے اسی طرح گنہ گار ہونے کا احساس بھی مضر ہے۔ لہذا نیکی اس اہمیت کی مستحق نہیں جو ہم نے اسے غلطی سے دے رکھی ہے تکالیف آلام، اور سزائیں نہ لازمی ہیں اور نہ مستحسن۔ تہذیب نفس کے لئے ہمیں تربیت کے صحیح اصولوں پر عمل کرنا چاہئے کسی ایسی چیز کو منتخب نہیں کرنا چاہئے جس کے نقصانات اس کے فوائد سے بڑھ کر ہوں۔ ہزارہا سال کی پند و نصیحت اور دینداری کے باوجود نوع انسان اصلاح نفس سے کوسوں دور ہے۔ لاشخصی سائنسی قوتوں کو تباہ کن مقاصد کی بجائے مفید مقاصد کے لئے استعمال کرنے پر روایتی اخلاق ہمیں کبھی آمادہ نہیں کر سکتا۔ سراب کے پیچھے اس احمقانہ دوڑ کو اب ختم ہو جانا چاہئے عقل ہی ہمارے مقاصد کی تربیت کر سکتی اور ہمیں اپنے وسائل کے صحیح برتاؤ کی طرف لے جا سکتی ہے۔ وہی ہمیں انسانی وقت اور توانائی کے زیادہ کفایت پرور اور فائدہ بخش مصرف کی جانب توجہ دلا سکتی ہے اس لئے ان اسالیب کا غیر مشروط طور پر پیچھا کیا جانا ناگزیر ہے جنہوں نے اپنی بے سودی شک و شبہ سے پرے ثابت کر دی۔

(۵) اخلاق کا منبع فوق الفطرت نہیں۔ زیادہ صاف طور پر یہ کہ تہذیبی قوانین انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ انسانوں کی اغراض کی تکمیل کے لئے بنائے گئے ہیں عموماً اس چیز کو تسلیم نہیں کیا جاتا یعنی لوگ یہ نہیں مانتے کہ اخلاق اصلاً معاشرتی ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ انہیں خدا یا خداؤں کی منظوری حاصل ہے جو ان کے پیروؤں کے لئے اخلاقی نصیحتوں اور ممانعتوں کا ایک مجموعہ رکھتا ہے لیکن تقدس کی یہ جڑائی ہوئی مکمل حقیقت کی پردہ پوشی کرتی ہے نہ صرف باہم متصادم ہیں اور یوں ایک دوسرے کو کمزور کرتے ہیں بلکہ ان پر انسانی نقص، سہو اور رجحانات ٹھہرانا ہے۔ وہ یہی نہیں کہتا کہ ہمیں خدا پر اپنی خواہشوں کی کاٹھی نہیں رکھنی

کی قوت اور محبت کے ثبوتوں سے قائم اور مکمل ہوتا ہے۔ بچہ اس سے ڈرتا بھی ہے اور اس سے محبت بھی کرتا ہے وہ سزا یا سزا کی دھمکی کا مفہوم یہ لیتا ہے کہ باپ کو اس سے محبت نہیں رہی۔ اور یہ احساس ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ وہ ایک تردد اس میں پیدا کرتا ہے جس سے وہ ابتداء میں تو باپ کو اس کی موجودگی میں خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور غیاب میں کوئی پروا نہیں کرتا۔ لیکن پانچ سال کی عمر تک وہ باپ کو اپنے نفسی ساز و سامان کا ایک جزو بنا لیتا ہے یعنی یہ سیکھ جاتا ہے کہ باپ موجود نہ ہو تب بھی اس کی رضاجوئی مقدم ہے۔ وہ ان افعال سے بچتا ہے جو باپ کو پسند نہیں ہوتے اور وہ کام کرتا ہے جنہیں مؤخر الذکر کی پسندیدگی حاصل ہوتی ہے۔ تہیجات کی تسکین کا ترک اگرچہ تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن پسند یا محبت کیے جانے کے احساس سے اس میں ایک لذت بھی ملتی ہے جو اصلی تسکین کا بدل ہوتی ہے بالفاظِ دیگر یہ کہ ضمیر اور کردار پانچ سال کی عمر میں تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں ضمیر باپ کا فعل انجام دیتا ہے اور زندگی ہی میں اس سے جدا ہو جاتا اور سخت ترین جاتا ہے وہ مؤخر الذکر کی طرح انا پر اقتدار صرف کرتا ہے انا اُسے خوش رکھنا چاہتا ہے اور اس کی تحسین سے آرام اور سرزنش سے تکلیف محسوس کرتا ہے پھر اسے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ضمیر اس سے ناراض ہو یوں باپ کے محبت نہ کرنے کا تردد داخلی اور اخلاقی تردد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ جب ضمیر کے حکم پر کسی جبلتی تسکین کی قربانی دیتا ہے تو اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ جواب میں اس سے اور زیادہ محبت کی جائے گی۔ شایانِ محبت ہونے کا یہ شعور نکوکاری پر فخر کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اس طرح ضمیر کوئی خلقی قوت نہیں وہ سراسر ایک اکتسابی چیز ہے ـــــ تعلیم، تربیت، اور تہذیب کا نتیجہ۔ ضمیر کے متعلق یہ نفسی تحلیلی تحقیق کوئی نئی اور حیرت انگیز چیز نہیں۔ وہ نفسیاتی بنیاد پر آزاد خیال اہلِ قلم کے افکار کی ایک زیادہ مضبوط، منطقی، اور تجربی تائید ہے۔ اخلاقی قانون کے بارے میں بعضوں نے یہ کہا کہ وہ معاشرتی اغراض کی پیداوار ہے بعضوں نے یہ کہ وہ ایک موجود بالذات قانون ہے جس کا ادراک وجدان کرتا ہے اور بعضوں نے یہ کہ وہ ایک ذریعہ ہے کردار کے خارجی قاعدوں سے اپیل کرنے کی ضرورت یا زحمت سے بچنے کا۔ اسی طرح اخلاقی وجوب کے متعلق کسی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ بلحاظِ ماہیت جمالیاتی ہے کسی نے یہ کہ معاشرتی احساس اس کی بنیاد ہے کسی نے یہ کہ اس کی اصل سزا کا خوف یا صلہ کی امید ہے اور کسی نے یہ کہ وہ مطلق العنان حاکم کے ارادہ کا عکس ہے چنانچہ عمومیت میں وہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔

نئے اخلاق کے مضمرات ـــــــــ

اس نئے اخلاق کے مضمرات کیا ہیں؟

(۱) ہر اخلاقی نظریہ صرف ان سے اپیل کر سکتا ہے اور کرتا ہے جو اس سے دلچسپی رکھتے ہیں یعنی انسانوں کی بڑی تعداد اس کے حلقۂ اثر سے خارج ہوتی ہے۔ انسانیت کو اس طرح متعدد اور متصادم گروہوں میں تقسیم کر کے اس کی بدحالی میں اضافہ کرنا کسی طور سے خوش آئند اور ضروری نہیں۔ لہٰذا یہ توقع کہ اخلاقیات سے انسانی فلاح ممکن ہے لغو اور لاطائل ہے۔ ہمیں معقولیت کو اخلاق کے نعم البدل کے طور پر قبول کرنا چاہ[illegible]

(۲) انسان نہ بالکل خود پرست ہے اور نہ بالکل غیر پرست۔ وہ خود غرضی اور ایثار کا ایک پیچیدہ مرکب ہے۔ جہاں ایسے افراد ملتے ہیں دوسروں کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ میں رہنا چاہتے ہیں۔ وہیں ایسے بھی نایاب نہیں جو ذاتی مصالح اور اغراض کو دوسروں کی خاطر قربا[illegible]

کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ موخر الذکر کی تعداد نسبتاً بہت تھوڑی ہے اور بڑی اکثریت ان کی ہے جنہوں نے اپنی نظر کو اپنے نفس پر مرکوز کر کے حوالی کو دھندلا کر دیا ہے معقولیت اس خود اندیشی کو معتدل بنائے گی صرف عقل ہی ہمیں یہ بتا سکتی ہے کہ اکثر و بیشتر ہمارے وقتی اور شدید رُجحانات اور تہیجات ہماری مجموعی بھلائی کے معارض ہوتے ہیں۔ لہذا اس کے احکام کی تعمیل کر کے ہم نہ صرف اپنی مجموعی بھلائی کو محفوظ کرتے ہیں بلکہ انسانی مجموعی بھلائی کے لئے بھی کام کرتے ہیں۔

(۳) گناہ کا تصور پارینہ اور بیہودہ ہے۔ اور اس کے لئے تعزیری سزا بے ضرورت۔ لہذا جہنم اور جیل خانے نہ صرف بیکار بلکہ مرض آفریں ادارے ہیں۔ ہمیں انسانی فطرت کی زیادہ عمیق فہم حاصل کرنی چاہیئے اور ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہیئے کہ مدرسے اور علاج گاہیں پولیس سٹیشنوں، عدالتوں، اور جیل خانوں سے بڑھ جائیں انہیں کچل دیں۔

(۴) ضمیر ایک غیر عقلی قوت ہے۔ وہ نوعِ انسان کے عہدِ طفلی کی باقیات ہے جبکہ ان تہیجات کو جنہیں مفیدِ مطلب نہیں بنایا جا سکتا تھا ضبط کر دیا جاتا تھا۔ آج جب کہ ہم نے عقل کو تقویت دے لی ہے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بلاشبہ ہر انسانی بچہ آج کل وہی کرتا ہے جو نوعِ انسان نے اپنے بچپن میں کیا لیکن اگر ہم اپنے اُن اخلاقی اصولوں کو جو ہمیں اپنی طفولیت میں ماحول کی اثر آفریں ہستیوں سے ملے اس کے اثر پذیر ذہن پر مرتسم نہ کریں بلکہ اس کی عقلی طور پر تربیت کر کے اس کے فطری بروز میں مدد دیں تو اسے ضعفِ عقل اور ترغیباتِ جرم سے بچانے کے ساتھ ساتھ اس کی تکمیلِ شخصیت میں بھی حصہ لیں گے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اہم جبلتوں کو ضبط کرنے سے زندگی کو سخت نقصان پہنچتا ہے اسی طرح گنہ گار ہونے کا احساس بھی مضر ہے۔ لہذا نیکی اس اہمیت کی مستحق نہیں جو ہم نے اسے غلطی سے دے رکھی ہے تکالیف، آلام، اور سزائیں نہ لازمی ہیں اور نہ مستحسن۔ تہذیبِ نفس کے لئے ہمیں تربیت کے صحیح اصولوں پر عمل کرنا چاہیئے کسی ایسی چیز کو منتخب نہیں کرنا چاہیئے جس کے نقصانات اس کے فوائد سے بڑھ کر ہوں۔ ہزار ہا سال کی پند و نصیحت اور دینداری کے باوجود نوعِ انسان اصلاحِ نفس سے کوسوں دور ہے۔ لاشخصی سائنسی قوتوں کو تباہ کن مقاصد کی بجائے مفید مقاصد کے لئے استعمال کرنے پر روایتی اخلاق ہمیں کبھی آمادہ نہیں کر سکتا۔ سراب کے پیچھے اس احمقانہ دوڑ کو اب ختم ہو جانا چاہیئے عقل ہی ہمارے مقاصد کی تربیت کر سکتی اور ہمیں اپنے وسائل کے صحیح برتاؤ کی طرف لے جا سکتی ہے۔ وہی ہمیں انسانی وقت اور توانائی کے زیادہ کفایت پرور اور فائدہ بخش مصرف کی جانب توجہ دلا سکتی ہے اس لئے ان اسالیب کا غیر مشروط طور پر واپس لیا جانا ناگزیر ہے جنہوں نے اپنی بے سودی شک و شبہ سے پرے ثابت کر دی۔

(۵) اخلاق کا مبدء انسانی ہے آسمانی نہیں۔ زیادہ صاف طور پر یہ کہ تہذیبی قوانین انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ انسانوں کی اغراض کی تکمیل کے لئے بنائے گئے ہیں۔ عموماً اس چیز کو تسلیم نہیں کیا جاتا یعنی لوگ یہ نہیں مانتے کہ اخلاق اصلاً معاشرتی ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ انہیں خدا یا خداؤں کی منظوری حاصل ہے اسی لئے ہر مذہب اپنے پیروؤں کے لئے اخلاقی نصیحتوں اور ممانعتوں کا ایک مجموعہ رکھتا ہے لیکن تقدس کی یہ چادر اُن کی اصل حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کرتی تہذیبی قوانین نہ صرف باہم متصادم ہیں اور یوں ایک دوسرے کو کمزور کرتے ہیں بلکہ ان پر انسانی نقص، سہو، اور نسیان کے نقوش بھی مرتسم ہیں لہذا نیا اخلاق بہ اعتبارِ رُجحانات طبعانہ ہے۔ وہ یہی نہیں کہتا کہ ہمیں تقدیر اپنی خواہشوں کی کاٹھی نہیں رکھنی

کی قوت اور محبت کے ثبوتوں سے قائم اور مکمل ہوتا ہے۔ بچہ اس سے ڈرتا بھی ہے اور اس سے محبت بھی کرتا ہے وہ سزا یا سزا کی دھمکی کا مفہوم یہ لیتا ہے کہ باپ کو اس سے محبت نہیں رہی۔ اور یہ احساس ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ وہ ایک تردد اس میں پیدا کرتا ہے جس سے وہ ابتداء میں تو باپ کو اس کی موجودگی میں خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور غیاب میں کوئی پروا نہیں کرتا۔ لیکن پانچ سال کی عمر تک وہ باپ کو اپنے نفسی ساز و سامان کا ایک جزو بنا لیتا ہے یعنی یہ سیکھ جاتا ہے کہ باپ موجود نہ ہو تب بھی اس کی رضاجوئی مقدم ہے۔ وہ ان افعال سے بچتا ہے جو باپ کو پسند نہیں ہوتے اور وہ کام کرتا ہے جنہیں مؤخر الذکر کی پسندیدگی حاصل ہوتی ہے۔ تہیجات کی تسکین کا ترک اگرچہ تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن پسند یا محبت کئے جانے کے احساس سے اس میں ایک لذت بھی ملتی ہے جو اصلی تسکین کا بدل ہوتی ہے بالفاظِ دیگر یہ کہ ضمیر اور کردار پانچ سال کی عمر میں تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔ ضمیر باپ کا فعل انجام دیتا ہے اور زندگی ہی میں اس سے جُدا ہو جاتا اور سخت تر بن جاتا ہے وہ مؤخر الذکر کی طرح انا پر اقتدار صرف کرتا ہے انا اُسے خوش رکھنا چاہتا ہے اور اس کی تحسین سے آرام اور سرزنش سے تکلیف محسوس کرتا ہے پھر اسے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ضمیر اس سے ناراض ہو یوں باپ کے محبت نہ کرنے کا تردد داخلی اور اخلاقی تردد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ جب ضمیر کے حکم پر کسی جبلتی تسکین کی قربانی دیتا ہے تو اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ جواب میں اس سے اور زیادہ محبت کی جائے گی۔ شایانِ محبت ہونے کا یہ شعور نکوکاری پر فخر کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اس طرح ضمیر کوئی خلقی قوت نہیں وہ سراسر ایک اکتسابی چیز ہے ـــــ تعلیم 'تربیت' اور تہذیب کا نتیجہ۔ ضمیر کے متعلق یہ نفسی تحلیلی تحقیق کوئی نئی اور حیرت انگیز چیز نہیں۔ وہ نفسیاتی بنیاد پر آزاد خیال اہلِ قلم کے افکار کی ایک زیادہ مضبوط، منطقی، اور تجربی تائید ہے۔ اخلاقی قانون کے بارے میں بعضوں نے یہ کہا کہ وہ معاشرتی اغراض کی پیداوار ہے بعضوں نے یہ کہ وہ ایک موجود بالذات قانون ہے جس کا ادراک وجدان کرتا ہے اور بعضوں نے یہ کہ وہ ایک ذریعہ ہے کردار کے خارجی قاعدوں سے اپیل کرنے کی ضرورت یا زحمت سے بچنے کا۔ اسی طرح اخلاقی وجوب کے متعلق کسی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ بلحاظِ ماہیت جمالیاتی ہے کسی نے یہ کہ معاشرتی احساس اس کی بنیاد ہے کسی نے یہ کہ اس کی اصل سزا کا خوف یا صلہ کی امید ہے اور کسی نے یہ کہ وہ مطلق العنان حاکم کے ارادہ کا عکس ہے چنانچہ عمومیت میں وہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔

نئے اخلاق کے مضمرات ـــــ

اس نئے اخلاق کے مضمرات کیا ہیں؟

(۱) ہر اخلاقی نظریہ صرف ان سے اپیل کر سکتا ہے اور کرتا ہے جو اس سے دلچسپی رکھتے ہیں یعنی انسانوں کی بڑی تعداد اس کے حلقۂ اثر سے خارج ہوتی ہے۔ انسانیت کو اس طرح متعدد اور متصادم گروہوں میں تقسیم کر کے اس کی بدحالی میں اضافہ کرنا کسی طور سے خوش آئند اور ضروری نہیں۔ لہذا یہ توقع کہ اخلاقیات سے انسانی فلاح ممکن ہے لغو اور لاطائل ہے ہمیں معقولیت کو اخلاق کے نعم البدل کے طور پر قبول کرنا چاہئے

(۲) انسان نہ بالکل خود پرست ہے اور نہ بالکل غیر پرست۔ وہ خود غرضی اور ایثار کا ایک پیچیدہ مرکب ہے۔ جہاں ایسے افراد ملتے ہیں جو دوسروں کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ میں رہنا چاہتے ہیں۔ وہیں ایسے بھی نایاب نہیں جو ذاتی مصالح اور اغراض کو دوسروں کی خاطر قربان

محفوظ رہتے ہیں۔ یہ تجربات ایسے ہوتے ہیں جنہیں اخلاقی نقطۂ نظر سے ناپسند اور ضبط کر دیا جاتا ہے۔ یہ اخلاقی معیار جو محتسب کا کام کرتا ہے۔ خود بھی بڑی حد تک غیر شعوری ہوتا ہے۔ عدیم الشعور کا واحد فعل خواہش اور واحد اصول اصولِ مسرت ہے۔ وہ ہم میں سے ہر ایک میں شیر خوار بچہ، وحشی انسان، اور جانور کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور سوائے اس وقت کے جب کہ اسے کسی فنی ذریعہ سے روشنی میں لایا جائے وہ ہمیشہ شعور سے خارج (مگر مؤثر) رہتا ہے۔ یوں وہ ہماری رسائی اور استعمال سے باہر ہے۔ وہ ہمارے مدرکات پر عمل کرتا اور انہیں بدل دیتا ہے اور یہ بدلے ہوئے مدرکات قبل شعور سے ہو کر شعور میں بطور خیالات کے داخل ہوتے اور عمل میں خارج ہوتے ہیں۔ کسی چیز کا ارتکاب یا کسی چیز سے اجتناب ہم اصولِ مسرت کے بموجب کرتے ہیں یعنی عدیم الشعور کے زیر اثر جب اس طرح عدیم الشعور ہمارے ہر فعل، ہر خیال، اور ہر انتخاب پر اثر انداز ہوتا ہے تو ہم ان میں سے کسی کے بھی ذمہ دار نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں (ایک ایسا ہی نتیجہ میکڈوگل بھی اخذ کرتا ہے اس کے نظریہ کی رو سے ہماری فطرت کی بنیادی محرک قوتیں جبلتیں ہیں۔ ارادہ اس وقت تک حرکت میں نہیں آتا جب تک کہ کوئی جبلی محرک اسے استعمال کرے نہیں۔ لہذا ارادہ بے بس ہے سوائے اس کے کہ کوئی قوت جو ہماری شعوری نگرانی سے باہر ہے ہمیں اسے حرکت میں لانے کے قابل بنائے)۔

ضمیر کی ماہیت

برخلاف اخلاقی ذمہ داری کے اخلاقی ضمیر سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن اس کے بارے میں بعض امور قابلِ غور ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ اس کے تجربہ میں کوئی یکسانی نہیں۔ اس کے احکام نہ صرف قوموں کے ساتھ بلکہ افراد کے ساتھ بھی بدلتے جاتے ہیں۔ خودکشی کو ہم مذموم سمجھتے ہیں۔ لیکن "ابھرنے والے آفتاب" کی سرزمین کا ایک فرد جس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اخلاقی حس کے معاملہ میں ہم سے فروتر ہے ہاراکیری کو مستحسن جانتا ہے ہیروڈوٹس کی تصدیق کے بموجب قدیم مصری اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ پرہیزگار تھے۔ مگر پیسپرو کہتا ہے کہ وہ حقیقی بھائی اور بہن کے نکاح کو "بہترین نکاح" باور کرتے تھے حالانکہ ان کی ہمعصر اور ہمسایہ قومیں اسے ایک بہت برا فعل خیال کرتی تھیں۔ مثلاً حزقیال یہود کو اس قسم کے تعلقات پر سخت ملامت کرتے ہیں چینی جاپانیوں کی طرح آشنائی کو جائز سمجھتے ہیں حالانکہ ہم اس پر ضمیر کی ملامت محسوس کرتے ہیں۔ مالدار کا ضمیر اشتمالی طریق کار کو برا ٹھہراتا ہے مگر غریبوں کو معاشی طور پر لوٹنے کے متعلق اس سے کچھ نہیں کہتا۔ اسی طرح اشتمالی کا ضمیر سرمایہ داروں کے اعمال کو ناپسند کرتا ہے مگر کولاکوں کے شکار پر اسے برا بھلا نہیں کہتا۔ ضمیر ایک شخص سے یہ کہتا ہے کہ حملہ آور کا مقابلہ مت کرو اور دوسرے سے یہ کہ اپنے ملک کی مدافعت کرو جہاں تک ہو سکے۔

ان حالات میں یہ باور کرنا دشوار ہے کہ ضمیر خدا کی آواز ہے۔ ایک بے وقوف بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ خدا زمین کے ساتھ ساتھ رنگ بدلنے لگا۔ اپنے کام میں اس قدر بے سلیقہ، اناڑی، اور بے پرواہ ہوگا تو پھر ضمیر کا منبع کیا ہے؟ اس کی فہم کچھ دشوار نہیں چھوٹے بچے اخلاق کے پابند نہیں ہوتے یعنی اپنے بنیادی ہیجانات کے لئے داخلی رکاوٹیں نہیں رکھتے۔ بلکہ انہیں ہر وقت آزادی سے آسودہ کرتے ہیں (اور یہ دوسرا قابلِ غور امر ہے) اس زمانہ میں بچہ کے ماحول کی سب سے مقتدر اور با اثر شخصیت یعنی باپ اُس کے افعال کی دیکھ بھال کرتا، اس کی ناشائستہ حرکات پر اسے روکتا اور خلاف ورزی کی صورت میں اسے سزا یا سزا کی دھمکی دیتا ہے۔ بچہ پر باپ کا اثر اس کی نسبتہً بڑی جسامت، سزا دینے

یہی وجہ ہے کہ آئن اسٹائن جیسے ممتاز ترین ماہر طبیعیات کو ایڈنگٹن کے استنتاجات سے اختلاف ہے۔ اور دوسرے یہ کہ تحت جوہری اختیار بڑے پیمانہ کی جبریت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ لہذا جب جواہر کے بڑے مجموعے قوانین کے پابند ہیں تو نہ تجربتہً یہ ثابت ہے کہ انسانی مخوں کی حرکتیں برابر برابر کرنے کے اس عمل سے خالی ہیں جس کی وجہ سے اعدادیاتی قوانین بڑے اجسام کی حرکتوں پر منطبق ہوتے ہیں اور نہ عقلاً یہ قرین قیاس ہے کہ انسانی مخوں اور بڑے اجسام میں فرق اور امتیاز جائز ہے۔

سببی قوانین کی دریافت سائنس کا مغز ہے۔ یعنی سائنس ایسے قاعدے معلوم اور متحقق کرتی ہے جو ایک وقت میں واقع ہونے والے حوادث کو دوسرے وقت میں واقع ہونے والے حوادث سے ملاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر سائنس کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ ایک صورتِ حال عجیب طور پر دوسری صورتِ حال کو طے کرتی اور اپنی باری پر خود ایک مقدم صورتِ حال سے طے ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ طبیعیات کی جدید ترقیوں کے باوجود میکانیت سائنس دانوں کا عدیم التغیر اسلوب ہے۔ وہ تحقیق کے ہر میدان میں قوانین کی تلاش کرتے ہیں اور جہاں انہیں وہ دریافت نہیں کر سکتے اسے اپنے دائرہ سے خارج باور کرتے ہیں اور اس میں وہ راستی پر ہیں۔ نتیجۃً سائنٹیفک ذہنیت جبریت پسند ہوتی ہے وہ زندگی اور ذہن کے مظاہر پر اصولِ جبریت کو مسلّط کر کے عمل کی اخلاقی ذمہ داری کا مضحکہ اُڑاتی ہے۔ ہمارے رجحانات ہماری موروثی حیاتی استعداد اور ہمارے ماحول سے طے ہوتے ہیں اور ہمارا ارادہ ہمارے انہیں رجحانات کا معلول ہے لہذا ہم کسی کو کسی غلط کام کے کرنے پر الزام نہیں دے سکتے ملامت نہیں کر سکتے۔

جدید نفسیات (اور فعلیات بھی) اس ذہنی انداز کی تائید کرتی ہے۔

پنلات کی تحقیق اور فرائڈ کی تحلیلِ نفسی نے نفسیات میں اصولِ علّیت کے استقرار سے اس عام خیال کی تردید کر دی کہ نفسی یا ذہنی مظاہر پر سببی قوانین حاوی نہیں۔ یعنی نفسیات میں میکانیت کو دخل نہیں۔ اور اس طرح انہوں نے انسان کو "اس کے سب سے عزیز التباس" (جیسا کہ فرائڈ نے اختیار کو کہا ہے) سے محروم کر دیا۔ پہلے نظریہ کے بموجب دماغ ایک ایسا آلہ ہے جو جسم کے ہر حصّہ سے آنے والے تہیجات کی موجوں کو وصول کرتا ہے یہ تہیجات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ۱۔ اکسانے والے اور ۲۔ روکنے والے۔ اور ان میں باہم سدا عمل اور تصادم ہوتا رہتا ہے۔ ابتدائے حیات کے سیدھے سادے نقشہ کی جگہ بعد میں نئے خطوط یعنی غیر خلقی یا مصنوعی جوابی اعمال لے لیتے ہیں۔ یہ پورا عمل خود کار ہوتا ہے۔ ہم ان دماغی نقشوں کی تشکیل کے مطلقاً ذمہ دار نہیں نتیجۃً ہر وہ طریقہ جس کے بموجب دماغ کسی مہیّج کا جواب ادا کرتا ہے خود بخود طے ہوتا ہے۔ انسان کے دماغ حیوانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں لہذا ان کے لئے مہیجات بے حد اور متنوع ہیں اور ان مہیجات کے جوابات بڑی تیزی اور زود حسی سے ادا ہوتے ہیں یوں ہم میں تصنّع بہت پایا جاتا ہے۔ اور ہماری روشِ حیات کی توجیہ ہمارے جوابات کی اس بناوٹ سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

فرائڈ نہایت استقلال کے ساتھ فرد کے لئے آزادانہ انتخاب کے وجود سے انکار کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ ہر انسانی فعل پہلے اور بلا کسی عدیم الشعور سے طے اور متأثر کرتا ہے عدیم الشعور ذہنِ انسانی کا وہ حصّہ ہے جس میں ہمارے تمام گذشتہ تجربات (نسلی اور انفرادی دونوں) جمع ہیں

قاعدے نرم، لچکدار اور معقول ہو گئے۔ بلاشبہ ہمارے بہت سے اخلاقی قاعدے غیر عقلی ہیں لیکن وہ ہمارے اسلاف کے ٹیبوؤں کا معقول تر انتخاب ہیں

اختیار کا مسئلہ

یوں ٹیبو اور اخلاق میں ایک فرق ہے۔ اور ایک اہم فرق ہے لیکن وہ کسی طرح بھی بنیادی نہیں۔ برعکس اس کے ان کی یکسانی عمیق اور اساسی ہے۔ اور اسی لئے ضمیر کا مظہر دونوں میں ملتا ہے دونوں ضمیر کے احکام ہیں۔ دونوں میں ایک وجوب پایا جاتا ہے۔ دونوں کی تعمیل پر راستی کا احساس ہوتا ہے اور خلاف ورزی پر جُرم کا۔ راستی کے ساتھ تحسین اور جرم کے ساتھ سرزنش ہوتی ہے۔ یہ تحسین یا سرزنش بجا معلوم ہوتی ہے وہ کسی چیز پر منحصر نظر نہیں آتی بلکہ بدیہی محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح ضمیر تین باتوں پر دلالت کرتا ہے (۱) اخلاقاً درست اور نادرست کے درمیان تمیز پر (۲) اوّل الذکر کے کرنے اور مؤخر الذکر سے بچنے کے وجُوب پر اور (۳) پہلی صورت میں فخر کے اور دوسری صورت میں ملامت کے احساس پر۔ لیکن ہمیں پہلے اخلاقاً درست کام کرنے اور نادرست سے بچنے کی قوت سے بحث کرنی چاہیئے۔ جو اصطلاحاً ارادہ کہلاتی ہے۔

بلاشبہ فکرِ جدید کے بعض عناصر اختیار کی تائید میں ہیں لیکن ان کی آواز کہاوتی نقارخانہ کے طوطی کی صدا سے زیادہ نہیں۔ مانا کہ آج کل اس کمزور آواز کو ایک شور ایک ہنگامہ کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے مگر ایسا کرنے والوں کے خلوصِ نیّت پر شبہ کیا جا سکتا ہے یعنی وہ یا تو مذہبی اہلِ قلم ہیں جو اپنی سطوتِ رفتہ کو واپس لانا چاہتے ہیں یا پھر وہ مفکرین جو نمایاں مذہبی اور صوفیانہ رجحان رکھتے ہیں۔ تصوّریین کی بحثوں کا دارومدار انسانی شعور اور حقیقتِ مُطلق کے درمیان یکسانیت پر ہے زیادہ کھلے طور پر یہ کہ وہ یہ مانتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو موجود ہے ذہنی ہے اور وجودِ مطلق شعورِ ذات کے نمونہ پر ہے لیکن جدید شیئیتی فلسفہ نے (جس کے سربرآوردہ ترجمان مینانگ، مُور، رسل وغیرہ ہیں) ادراک کے مسئلہ پر جو گہری تنقیدی نظر ڈالی ہے اس سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اشیاء کا وجود کسی طرح ذہنِ مُدرک پر منحصر نہیں لہٰذا ذہن کی اصطلاحوں میں کائنات کی تعبیر یکسر غلط ہے اور جب بنیاد ہی ہل جائے تو سقف و محراب کیسے قائم رہ سکتے ہیں۔ یہی بات ان فلسفیانہ نظاموں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے جن کی بنیاد اس پر ہے کہ حیات ایک ناقابلِ تحویل تخلیقی، اور پُراسرار یا لامادی قوت ہے اور جو انسانوں کے لئے جذباتی طور پر اطمینان بخش اور گوارا ہیں۔ کیونکہ ماہرانِ خصوصی کی آج یہ متفقہ رائے ہے کہ زندہ مادّہ کے اعمال طبیعیات اور کیمیا میں تحویل ہو سکتے ہیں یہ کہ زندہ مادّہ اور مردہ مادّہ میں اصلاً کوئی فرق کوئی امتیاز نہیں اور یہ کہ کوئی زندہ کیمیائی جوہر نہیں کوئی خاص حیاتی عنصر نہیں جو مردہ مادّہ سے مختلف ہو اور کوئی خاص حیاتی قوت نہیں جو کارگہِ کائنات میں مصروفِ عمل ہو اسی طرح نتائجیت کے بنیادی تصوّرات پر رسل، مور، وغیرہ کی تنقیدیں انسانی تعصّبات کے لئے تباہ کن ثابت ہوئیں۔

نظریۂ مقادیر برقیات کی جدید ترقیوں کی روشنی میں ایڈنگٹن نے انسانی اختیار کو محفوظ کرنا چاہا ہے۔ لیکن اس کے اس مفروضہ پر کئی سخت اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں مثلاً یہ کہ جوہر کی مفروضہ آزادیٔ عمل تحقیق کے ایک دقیق ترین میدان کا ایک نہایت مبہم اور پیچیدہ مظہر ہے اور یہ کسی سائنس دان کے شایانِ شان نہیں کہ وہ تحمّل اور استقلال کو ہاتھ سے دے کر نئے قوانین کی دریافت سے ہاتھ اٹھا لے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مادّہ کے نئے تصوّرات کا موجودہ ناکافی علم بڑھے گا نہیں۔ ایسے قوانین معلوم ہو سکتے ہیں جو موجودہ بے استقلالی کی حالت کی توجیہ کر دیں

سے بھی جو اولیں واقعات کا عکس ہیں۔ ڈرامائی رسوم سے اساطیر پیدا ہوئے اور ڈرامائی رسوم جماعت سے ایک فرد کی لڑائی اور شکست کو پیش کرتے ہیں۔

طوطم (یعنی مرموز باپ) کو مارنے اور کھانے کی ممانعت، ایک ہی طوطمی جتھے کی عورتوں (یعنی مرموز ماؤں) کو جنسی طور پر استعمال کرنے کی ممانعت، اور آپس کے جھگڑوں کو قوت کے ذریعے طے کرنے کی ممانعت یہ چیزیں خاص اور بنیادی مثالیں ہیں ٹیبو کی۔ وہ نوعِ انسان کی بنیادی جبلتی خواہشوں (یعنی قتل، آدم خوری، اور محرمات کے ساتھ مباشرت) کی تسکین کو روکتی ہیں۔ ان غیر شعوری تہیجات کو ہر بچہ نئے طور پر اپنے ساتھ لے کر دنیا میں آتا ہے اور اخلاق اور تہذیب کی بلند عمارتیں انہیں کی ناآسودگی کی بناء پر استادہ و استوار ہیں اگر ان پر قیود اور بندشیں عائد نہ ہوں تو عمرانی زندگی ناممکن ہو جائے۔ انسیات دان کہتے ہیں کہ کسی وحشی قبیلہ میں ٹیبو کی شکست پر مجرم کو جب کوئی فوق الفطری سزا خود بخود نہیں ملتی تو اہلِ قبیلہ گہرے تردد اور تعلقِ خاطر کے ساتھ اور نہایت فیصلہ کن طریقہ پر مجرم کو کیفرِ کردار کو پہنچاتے ہیں کیونکہ اگر ٹیبو کی خلاف ورزی کرنے والا سزا سے بچ جائے تو پورے قبیلہ کی عافیت اور سلامتی کو نازک خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اگر ہم اس توہم کا سادہ زبان میں ترجمہ کریں تو یہ ہوگا: مثال متعدی ہوتی ہے اگر کوئی شخص ضبط شدہ خواہش کی تسکین حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو دوسروں کو بھی جرأت اور ترغیب ہوگی اور قبیلہ جبلتی ہواؤں کے جھونکوں میں پانی کے بلبلہ کی طرح نابود ہو جائے گا۔ فرائڈ نے ذہنی امتلاء والے عصبی فساد کے اعراض اور وحشیوں کے ٹیبوؤں میں جو موازنات دریافت کی ہے اس کی بناء پر ہم بے خطر یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ ضبط شدہ بنیادی خواہشیں (جو ٹیبوؤں کی مشہور خصوصیت یعنی لمس ترسی میں پائی جاتی ہیں) فنا نہیں ہوتیں اور اصلاح کی دسترس سے دور ہیں لہٰذا عدیم الشعور نے جو شیطان کی طرح بے شمار روپ بھر سکتا ہے نئے نئے نکاس ڈھونڈھ نکالے۔ یہ نئے نکاس ان نکاسوں کو مرموز کرتے تھے جنہیں روک دیا گیا لیکن ان نئے نکاسوں پر بھی احتراز حاوی ہو گیا اور پھر دوسرے نکاس ڈھونڈ لئے گئے جو اپنی باری پر پھر ممنوع قرار پائے ہر احتراز کو آئینی شکل دے دی گئی۔ ٹیبو کی نمایاں نامعقولیت کی بنیاد یہی ہے۔ طوطم نے باپ کی طرف کے انداز کی دو گرفتگی (ambivalence) کو قائم رکھا ہے اسے خاص خاص مواقع پر سب مل کر مارتے اور کھاتے ہیں اور عموماً سختی سے حرام عورتیں وقتی طور پر مباح ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان جشنوں اور ان کی لائی ہوئی بدمستیوں کے ختم ہو جانے کے بعد دوسرے اوقات میں طوطم کا احترام کیا جاتا ہے اسے بچایا جاتا ہے اور ایک ہی طوطمی جتھے کی عورتوں سے احتراز کیا جاتا ہے

متمدن قوموں کے اخلاقی قاعدے اور وحشی قبیلوں کے ٹیبو فی الاصل ایک ہیں۔ متمدنوں کے اسلاف کسی نہ کسی وقت تمدن ناآشنا اور ٹیبوؤں سے گرانبار تھے اور ان کے یہی ٹیبو ان کی اولاد کو وراثۃً ملے۔ اخلاق اور ٹیبو کی باہمی بنیادی اور اصلی مشابہت (دونوں ایجابی خواہشوں کی تسکین کو روکتے ہیں) کی وجہ یہی ہے۔ لیکن وحشت سے تمدن میں ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی میں بعض نئی باتیں داخل ہوئیں ہر وقت جماعت میں رہنے کی بجائے تنہائی کے ایسے موقعے دستیاب ہونے لگے جن میں فرد اپنی روح کے ساتھ خاموش گفتگو کر سکتا تھا۔ غول بیا[illegible] انفعال میں تبدیل ہوئی۔ تقلید نے جدت کے لئے جگہ خالی کی اور تخیلی زبان، آزادانہ بات چیت، تحریر اور صناعی (آرٹ) نے روح کے ساتھ اس خاموش گفتگو یا غور و خوض کو ترقی دی۔ شخصیت کی نشو و نما ہوئی شعوری حیات کے اعمال اہمیت اختیار کر گئے۔ نتیجۃً اخلا[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دوسرے یہ کہ اگر اقدار ارتقاء کی پیداوار ہیں
کے کانٹے سے زیادہ حقیقی نہیں صرف پھول کو دیکھنا اور کانٹے کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا نہیں چاہیئے۔
عالم کی تاریخی اسکیم میں ایک منصب ایک مقام رکھتے ہیں اور مزید ترقی کی سمت اور راہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے
کہ جہاں اقدار پائی جاتی ہیں وہاں ہمیں ایک زیادہ مؤثر اور عمیق وجود ملتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہم اقدار کو یہ اہمیت دیں۔ دنیا کو رنگین چشموں سے دیکھیں۔
قدر واقعہ نہیں۔ لہٰذا وہ کوئی مرکزی مابعد الطبیعی تصور نہیں۔ جب ہم کسی چیز کو قابلِ قدر قرار دیتے ہیں تو ہمیں ایک ذہنی تجربہ (ایک جذبی
اور طلبی تجربہ) ہوتا ہے جسے واقعہ سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور جو اس اعتبار سے ادراک سے مختلف ہے۔ اسے اصطلاحاً پسندیدگی (یا تعین
قدر کا عمل) کہا جاتا ہے۔ اس میں خواہش بطور ایک اہم اور بنیادی جزو کے شامل ہوتی ہے اور وہ لذت جو ہمیں اس کے ساتھ ملتی ہے اسی اہم اور بنیادی جزو کی تکمیل کا نتیجہ
ہے مگر یہ خواہش نفسی طور پر اندھی نہیں ہوتی کسی بقائی ضرورت سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ تمیز یافتہ ہوتی ہے لاشخصی ہوتی ہے یوں اقدار موضوعی اور اضافی ہیں وہ حقایق یا نیم حقایق
نہیں بلکہ یکسر ذہنی مصنوعات ہیں اسی لئے ٹرویلٹش اقدار کے ایک مستقل، غیر تاریخی، اور مجرد معیار کی دریافت کو سعیٔ لاحاصل کہتا ہے اور
اسی لئے لائب مان کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ "قدرِ مطلق" لغویت ہے۔ اقدار کی معروضیت اور مطلقیت کا سارا تصور ایک التباس ہے
ایک اصطلاحی غلط بیانی ہے ایک قسم کا مینڈک کا فلسفہ ہے۔

اقدار کی موضوعیت اور اضافیت کا یقین بے حد عام اور عالمگیر ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اقدار کا اختلاف خواہشات کا اختلاف ہے۔
اور خواہشات کا اختلاف ظاہر ہے کہ صحت اور خطا یعنی علم کے دائرہ سے باہر ہے یعنی ان کے بارے میں مجادلہ ہو سکتا ہے مباحثہ نہیں ہو سکتا۔
اس لئے کہ عقلی بحث شہادت کو مستلزم ہے جس کا اقدار کے بارے میں مکمل فقدان ہوتا ہے لہٰذا واحد طریق کار یہ ہے کہ لڑنے والے رنگروٹوں
کو زیادہ سے زیادہ بھرتی کریں۔

اور اس تحلیل کا انطباق جمال اور خیر پر ———
زیادہ صاف طور پر یہ کہ جمال اور خیر صفاتِ ثالثہ نہیں جیسا کہ الیگزینڈر انہیں کہتا ہے۔ وہ ہماری خواہشات کے اظہار ہیں۔ جب
ہم کسی چیز کو خوبصورت یا اچھا کہتے ہیں تو اس سے مطلب یہ نہیں ہوتا کہ خوبصورتی یا اچھائی مربعیت یا رنگ جیسی کوئی صفت ہے جس کا
ہم ادراک کرتے ہیں اور جو کوئی ذہنِ مدرک موجود نہ ہو تب بھی بدستور یا محلِ احساس کی حیثیت میں باقی رہتی ہے۔ فہم عامہ صحت پر ہے
جب یہ کہتی ہے کہ نقاشی اور بت تراشی کے کارنامے خاموش روحانی پیغام دیتے ہیں جب کہ تصویر خانے کھلے ہوتے ہیں۔ اور کوئی پیغام نہیں
دیتے جب کہ یہ عمارتیں بند ہو جاتی ہیں اصل میں کسی چیز کو خوبصورت یا اچھا کہنے سے ہماری مراد یہ اور صرف یہ ہوتی ہے کہ ہم اس چیز کو خوبصورت
یا اچھا پاتے ہیں یعنی تسکین بخش اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اسے ایسا ہی سمجھیں۔ اس موضوعیت کی مثالیں جمالیات اور اخلاقیات دونوں پر
بہت ملتی ہیں تصاویر سے سب یکساں لطف اندوز نہیں ہوتے۔ ایک شخص یا شے کو ایک دل کش پاتا ہے اور دوسرا اس میں کوئی جاذبیت محسوس
نہیں کرتا کلو پیٹرا کا حسن مارک انٹونی اور آگسٹس سیزر پر یکساں اثر نہیں کرتا۔ لیلیٰ کو چشم مجنوں سے دیکھنے کی شرط یہ ظاہر کرتی ہے کہ
دوسروں کو اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ حقیقت میں کوئی حسن عالم آشوب نہیں۔ ایسی ترکیبیں ایک فرد یا جماعت کی خواہ

اشارہ ہے نظریۂ اعیان کی طرف جس کی رو سے اشیائے محسوس یا مظاہر جتنی حقیقت ملتی ہے اعیان کے سبب ملتی ہے۔ یہ اعیان انسانی سعی کی غرض و مقصود اور علم کا موضوع ہیں۔ ان میں حق، جمال، اور خیر کے اعیان کو خاص اہمیت اور امتیاز حاصل ہے افلاطون ان کا ذکر بڑے احترام اور انتہائی صوفیانہ اور شاعرانہ زبان میں کرتا ہے وہ ان کے علم کے لئے روح کی خاص تربیت کی ضرورت پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ روح جب ان اعیان کا ——— جو غیر ذہنی ہیں ——— مشاہدہ کرتی ہے تو ”جاہئے“ پیدا اور منتج ہوتا ہے] کے علی الرغم محض منطقی امکانات کو چپکے سے بنیادی واقعیت میں تبدیل کر دیا اور نتیجۃً بالکل ناروا طور پر حقیقت کو ذہن کی چالاکی سے پیدا کیا۔ پُرانی افلاطونی روایت اور نئے فلسفۂ قدر میں فرق صرف کیفیت کے درجہ اور ترتیب کا ہے اور بعض قدری فلسفی خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے نظریات میں لفظ کے سوا نئی کوئی چیز نہیں اور یہ کہ وہ ایک بڑی فلسفیانہ روایت کو نئے انداز سے پیش کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں بعض اہم مسائل پر سرسری طور سے نظر کرنا ضروری ہے (۱) یہ کہ اقدار کتنی اور کونسی ہیں؟ (۲) یہ کہ قدر کا ایک عام نظریہ ممکن بھی ہے؟ (۳) یہ کہ کیا قدر حقیقت کی ماہیت کی کلید ہے؟ اور (۴) یہ کہ اس کی ماہیت کیا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ بنیادی اقدار تین ہیں حق، جمال، اور خیر۔ مذہب کا تعلق انہیں کی بقاء سے ہے۔ اس کے لئے کسی زاید قدر (”عظمت“) کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن جمال اور خیر کے ساتھ حق کو جگہ دینا میں (دہتوں کی طرح) سمجھتا ہوں کہ ایک غلطی ہے۔ ارسطو کی مابعد الطبیعیات کے متعلق ریوسٹن لکھتا ہے کہ وہ یہ مانتا تھا کہ ”شعری اور عملی علوم اشیاء کے اس پہلو سے بحث کرتے ہیں جو ان کی اصلیت سے مختلف ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ علوم کم و بیش ہمارے ارادہ پر منحصر ہوتے ہیں اور نظری علوم اس پہلو کو لیتے ہیں جو کم سے کم اپنی بنیادوں کے اعتبار سے ضروری ہوتا ہے اور جس کو کم و بیش کرنے کا ارادے کو مطلق اختیار نہیں ہوتا“ بالفاظِ دیگر یہ کہ صحیح بیان واقعہ کا بیان ہے اور واقعہ معروضی ہے نفسی حالت یا شخصی معاملہ نہیں مثل شعر یا جمال یا عملِ نیک کی طرف ہمارے ردِّ عمل کے۔ تثلیث کے ایک اقنوم کے اس طرح گر جانے کے بعد جمال اور خیر کو قدر کے تصور کے تحت جمع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے واضح اختلافات کی تہ میں ایک بنیادی بے بناوٹ وحدت ہو صرف اسی وقت ایک عام نظریۂ قدر کا ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بنیادی بے بناوٹ وحدت اقدار کو صفات قرار دینے سے حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اقدار ایسی صفات نہیں جو ہم سے بالکل علیحدہ خارجی طبیعی اشیاء میں بالاستقلال پائی جائیں یا جو یقینیات، خواہشات، جذبات، طلبات وغیرہ سے مختلف داخلی خصوصیت رکھتی ہوں۔ اگر انسان صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائے (مثلاً بڑے پیمانہ پر زہریلی گیس کے استعمال اور بمباری یا کسی فطری حادثہ سے) تو اخلاق اور فنونِ لطیفہ کا کوئی مفہوم نہ رہے گا۔ اقدار دراصل نفسیاتی خواص ہیں جنہیں فرد اپنی دلچسپی کی چیزوں کی طرف محوّل کرتا ہے اور وہ موضوعی یا ذہنی (ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں صفاتِ ثانوی کو موضوعی یا ذہنی کہا جاتا ہے بلکہ صحیح معنوں میں موضوعی یا ذہنی یعنی ذہن کی اور ذہن کے لئے) ہوں تبھی ایک عام نظریۂ قدر ممکن ہے۔

لیکن اگر قدر ذہن کی فعلیت ہو تو اسے کسی طرح حقیقت کی ماہیت کی کلید نہیں قرار دیا جا سکتا اور پھر یوں بھی اقدار کی معروضیت کے قائل (اگر اپنے اصولوں کے وفادار ہیں تو) اس سے انکار نہیں کریں گے کہ دنیا میں اقدار کے ساتھ ان کی اضداد (سلبی اقدار) بھی ملتی ہیں جو مساوی طور پر ایجابی ہیں۔ خیر اور جمال کی طرح شر اور قبح کو بھی اشیاء کے نظام میں ایک مستقل مقام کا ملنا ضروری ہے۔ اب یہ کہنا کہ حقیقت میں صرف جمال اور خیر کو بار ہے اصل سے شر اور قبح کی گنجائش نہیں ہماری خواہشات کی ایک بے جا رعایت ہے۔ گلاب کا پھول کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو اپنے پہلو

طریقوں سے حاصل کرتا ہے۔ بے لوث سے بے لوث اچھا کام بھی خود غرضی کے شائبہ سے پاک نہیں۔ منفعت اور شخصی مسرت کی خواہش ہمارے تمام افعال کی قوتِ محرکہ ہے۔ برخلاف اس کے مخالف دبستان (جس کی نمائندگی شافٹسبری، ہیوم، ایڈم اسمتھ، مِل وغیرہ کرتے ہیں) کی تعلیم یہ ہے کہ عالِ اخلاقی کے پیشِ نظر ہر وقت دوسروں کی مسرت ہوتی ہے اپنی نہیں۔ اس طرح ہماری سرشت ہی میں یہ بات داخل ہے کہ ہم سدا دوسروں کا دھیان رکھیں اور یہ اہتمام کریں کہ کہیں "ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو"۔ ان احساسات سے ایک خیال تشکیل پاتا ہے جو ہمارے کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن کانٹ کا پُرشکوہ فیصلہ یہ ہے کہ اپنی یا دوسروں کی بھلائی کی نیت سے جو بھی کام کیا جائے وہ اخلاقاً درست نہیں۔ اخلاقاً درست کام وہ ہے جو فرض کے احساس کے تحت انجام پائے خواہ اس سے کسی کو تکلیف ہی کیوں نہ پہنچے۔

اس طرح فلسفۂ اخلاق دو اجزا پر مشتمل ہے (۱) پہلا جزو ضابطۂ اخلاق ہے یعنی کردار کے قاعدے جو بیشتر سلبی ہوتے ہیں۔ ضمیر جو ان خارجی قاعدوں کی داخلی شکل ہے ان کی تعمیل کو کہتا ہے اور ارادہ انہیں عمل پذیر کرتا ہے اور (۲) دوسرا جزو مصداقِ خیر کا تعین ہے۔ خیر اخلاقیات کی بیخ و بن ہے۔ اخلاقی کردار اسی کو ترقی دیتا ہے لہذا پہلے اسی سے بحث کرنی چاہیئے

قدر کا تصور اور اس کی تحلیل

خیر سے وہ چیز مراد ہے جسے ہم اس کی اپنی خاطر پسند کرتے ہیں۔ اور اس کے عواقب کا لحاظ کئے بغیر پسند کرتے ہیں۔ یوں ہمارے سامنے دراصل مسئلہ قدر کا ہے جسے اگر ہم سمجھ لیں تو بہت سی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں۔

قدر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے ہمیں دلچسپی ہوتی ہے۔ بیشتر چیزوں کی ہم قدر اس لئے کرتے ہیں کہ وہ بعض دل پسند مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہیں مثلاً صحت کہ وہ پسندیدہ اس لئے ہے کہ زندگی سے کما حقہٗ لطف اُٹھایا جائے یا ثروت کہ وہ مرغوب اس لئے ہے کہ آرام اور دقعت یا تحسین حاصل ہو۔ مگر بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی ہم قدر ان کی اپنی خاطر کرتے ہیں یعنی وہ بجائے خود دل پسند مقاصد ہوتے ہیں۔ اسی لئے انہیں بنیادی اقدار کہا جاتا ہے۔

بعض قدری فلسفی (مثلاً میونسٹربرگ، وِنڈل بینڈ، رکرٹ، میئر وغیرہ) اقدار کو حقیقت کی ترتیبی اصل اور فلسفیانہ فکر کا خاص مبحث قرار دیتے۔ حقیقت سے اقدار کے رشتہ پر آئندہ سطروں میں نظر ڈالی جائے گی فی الوقت یہ کہنا کافی ہے کہ صرف سائنس ہی واقعات سے سروکار نہیں رکھتی بھی بہ حیثیت سائنسوں کا سرچشمہ ہونے کے ایک نظری مہم ہے یعنی واقعات سے بحث کرنا، حق کو مقصود جاننا اور ایک حد تک سائنس کے طریقے استعمال کرتا ہے وہ کبھی ان قدری نظریہ سازوں کے جھانسے میں آکر بنیادی اقدار کو بطور بدل کے قبول نہیں کرے گا۔ بلاشبہ فلسفہ سائنس کی طرح تدریجی اور تجربی نہیں (اچھا ہوتا اگر وہ ایسا ہوتا) وہ حوصلہ مند ہے اور ایک مکمل اور مربوط تصویرِ کائنات پیش کرتا ہے مگر واقعات کی تعبیریں اور مشاہدات کو خارج یا دفع نہیں کرتیں۔ لہذا شخصیت، تہذیب، اور معیار فلسفہ کا جزو ہو سکتے ہیں کل نہیں۔

وائٹ ہیڈ نے یورپی فلسفیانہ روایت کو افلاطونی فلسفہ کا حاشیہ کہا ہے اور یہ خیال اس کا قدریات (Axiology) کے بارے میں تو بالکل صحیح ہے۔ چنانچہ رلسی نے قدری فلسفیوں پر یہ بالکل بجا اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے اپنے پس منظر کی فضا اندازاً افلاطونی روا...

مسئلۂ اخلاق اور سائنس

انسانی سماج کے ہر مرحلے میں ایک درون نفسی قوت انسان کو مسلسل یہ بتاتی ہے کہ اس کے لئے اخلاقاً جائز کیا ہے اور ناجائز کیا اور یہ کہ وہ کب کسی خواہش کو بجا طور پر پورا کر سکتا ہے اور کب نہیں۔ یہ ایک باطنی آواز ہے ———— ایک تحکّم پسند اور عالی شان باطنی آواز، جو ہماری فطرت کی گہرائیوں سے بلند ہوتی ہے اسے ضمیر کہا جاتا ہے۔ ارسطو نے اسے روح کی آنکھ کہا ہے جس کے ذریعہ کردار کے اصولوں کا ادراک ہوتا ہے۔ اس کی تعریف ابیلارو نے یہ کی ہے کہ وہ خیر و شر میں تمیز کرنے کا ملکہ ہے (بعد میں شافسبری اور ہچیسن نے اسی تعریف کو اختیار کیا) اور بٹلر نے یہ کہ وہ افعال کو پسند یا ناپسند کرنے کی قوت ہے یہ ضمیر ہی ہے جو ایک متمدن نوجوان سے یہ کہتا ہے کہ جھوٹ بولنا بہت بری بات ہے اور یہ ضمیر ہی ہے جو آسٹریلیا کے ایک غیر متمدن نوجوان سے یہ کہتا ہے کہ رسوم داخلہ کے دوران میں بے حد بھوکا ہونے اور بڑے بوڑھوں کے ذریعہ پکڑے جانے اور سزا پانے کے خوف سے آزاد ہونے پر بھی مادہ ابوسم کو کھانا نادرست ہے ضمیر کے احکام واجب ہوتے ہیں۔ اس نظر کے بارے میں بعض کا یہ خیال ہے کہ ضمیر خدا کے احکام کی گونج ہے دوسرے جنہیں آسمان سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی زمین سے ہے یہ کہتے ہیں کہ اخلاقی قانون انسانوں کا بنایا ہوا ہے۔ وہ بعض اغراض کے تحت بنا ہے اور اس کا نفاذ ان اغراض کے ادراک اور ان پر روایاتی یا معاشرتی اصرار کے ذریعہ عمل میں آیا ہے۔ یوں ضمیر انسانوں کے شخصی اور معاشرتی اغراض سے تعلق رکھتا ہے اور یہی اس کے احکام کے وجوب کی وجہ ہے اخلاقاً درست کام کرنے اور نادرست کام نہ کرنے کی قوت ارادہ کہلاتی ہے۔ وہ روایتہً آزاد ہے اور یہ "اختیار" ہی کی بدولت ہے کہ متمدن نوجوان جھوٹ بولنے سے اور غیر متمدن نوجوان مادہ ابوسم کے کھانے سے احتراز کرتا ہے۔ عامل اخلاقی ضمیر کے احکام پر غور و خوض کرتا اور ان کی متابعت کر سکتا یا نہیں کر سکتا ہے متابعت پر اطمینان اور نامتابعت پر شرم یا پشیمانی کا احساس ہوتا ہے۔ بالارادہ اخلاقاً درست کام کرنے یا نادرست کام نہ کرنے یعنی ضمیر کے احکام کی پابندی پر ایک باطنی محرک ہمیں اکساتا ہے۔ وہ خواہش ہے اخلاقی کردار کے کسی پسندیدہ نتیجے کے حصول کی۔ یہ پسندیدہ نتیجہ اصطلاحاً خیر یا خیر برترین (Summum Bonum) کہلاتا ہے جھوٹ بولنے اور مادہ ابوسم کے کھانے سے پرہیز کرنے کا مقصود خیر برترین کا حصول ہے۔ یہ خیر برترین کیا ہے؟ کوئی کہتا ہے خدا کی معرفت، کوئی کہتا ہے حسن سے لطف اندوزی، کوئی کہتا ہے مسرت، کوئی کہتا ہے فرض، کوئی کہتا ہے تکمیل نفس، وغیرہ۔ خالص فلسفیانہ دائرہ میں یونانی فلسفیوں نے بالاتفاق مسرت کو خیر برترین مانا ہے البتہ اس کی تعبیریں انہوں نے مختلف کی ہیں۔ مثلاً فضیلت (سقراط، فلاطون، ارسطو، زینو) لذت (ارسٹپس، ابی قور) وغیرہ۔ ڈی کارٹ اور لائب نز بھی مسرت کو خیر برترین تسلیم کرتے ہیں مگر اپنے تصور میں انہوں نے ابی قور اور زینو کو ملا دیا ہے۔ ہوبز، ہیلوے تیوس، اسپنوزا، لاک، بنتھم، ہیوم، مل، ہیوک، مور وغیرہ افادیت کے قائل ہیں۔ فرض کو خیر برترین باور کرنے والوں میں کانٹ، کوہن، لپسز، ونڈل بینڈ، رکرٹ، نیلسن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں اور ہیگل، گرین، بریڈلے وغیرہ تکمیل نفس کو خیر برترین قرار دیتے ہیں۔ اس دبستان خیال میں جو "افادہ" کو اہمیت دیتا ہے اس مسئلہ پر کہ ہم مسرت کس لئے تلاش کرتے ہیں لوگ نمایاں طور پر دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں ہوبز کی طرح بہتیرے ماہرین اخلاق کا فتویٰ ہے کہ انسان صرف اپنی ہی فکر ہے اپنے ذاتی فائدہ ہی کا خیال ہے۔ اور اس چیز کو وہ حسب موقع سادہ اور درست یا پیچیدہ اور بالواسطہ

[illegible] منت آدمی ہے [illegible] مانت سے کام [illegible]

[illegible] ملنے والی مخلوق کے رنج والم سے متاثر ہو کر اپنی باطنی طاقت حاصل کرلیتا ہے [illegible]

اس دکھیا سنسار کو محبت اور راحت کے راگ سناتا ہے۔ گاندھی نفس کشی اور قربانی کی شکل میں اپنا فرض ادا کرتا ہے اور ٹیگور [illegible]

کے حسین اور روح افزا مناظر میں مصیبت بھری دنیا کو زندگی کا خوش گوار پہلو دکھاتا ہے۔ دونوں نے روحانیت کے اعلیٰ تخیل کو

برقرار رکھا ہے جن کی بدولت ہندوستان کا نام روشن ہے۔

کیلے کی غذائیت

کیلا بجائے خود ایک مکمل غذا ہے۔ یہ نہ صرف اپنی غذائیت کے لحاظ سے بلکہ جسم میں مدافعتِ امراض کی قابلیت پیدا کرنے کے لحاظ سے بھی بہت اہم تسلیم کیا گیا ہے۔ کیلے کی حیاتینیں اور اس کے معدنی اجزا جسم کے لئے بہت مفید ہیں۔

کیلے میں حیاتین (A) جو جسم میں متعدی امراض سے بچنے کی قوت پیدا کرتی ہے اور حیاتین B (یا G) جو ہاضمے کے لئے مفید ہے اور Pellagra سے بچاتی ہے دونوں کافی مقدار میں موجود ہیں۔ اسی طرح حیاتین C کی بھی اس میں کافی مقدار ہے جو ہڈیوں اور پٹھوں کی نشوونما میں بہت مدد دیتی ہے۔

کیلے میں پوٹاسیم اور کیلسیم نمکوں کی کثرت ہے۔ یہ نمک نہایت طاقت بخش ہوتے ہیں اور چونکہ ان میں کھار ہوتا ہے اور نتیجۃً ان سے غذا کو جزو بدن بننے میں مدد ملتی ہے اس لئے کیلا بہت معتدل اور قابلِ اعتماد خوراک ہے۔ کیلا حرارتِ غریزی پیدا کرنے کے اعتبار سے بھی بہت اہم ہے۔ اس لحاظ سے چار کیلے اعلیٰ قسم کے گندم کے آدھ سیر آٹے کی روٹی کے برابر ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی آبادی

نئی مردم شماری کے مطابق یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو ہندوستان کی کل آبادی ۳۸۸٬۸۰۰٬۰۰۰ تھی۔ اس تعداد میں ۴۷٬۳۲۲٬۰۰۰ افراد خواندہ ہیں۔ گزشتہ مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی ۳۳۸٬۱۰۰٬۰۰۰ تھی۔ گویا نئی مردم شماری کے مطابق کل آبادی میں ۱۵ فی صدی اضافہ ہوا ہے۔ ایک لاکھ یا اس سے زائد آبادی والے شہروں میں اضافۂ آبادی خاص طور پر نمایاں ہے۔ بڑے صوبوں میں سے صوبہ سرحد کی آبادی میں سب سے زیادہ یعنی ۲۵ فیصدی اضافہ ہوا ہے۔ اس کے بعد بنگال کا درجہ ہے جہاں کل آبادی میں ۲۰ فی صدی اضافہ ہوا ہے۔ بنگال میں خواندہ افراد کی تعداد سب سے زیادہ یعنی ۹٬۷۲۰٬۰۰۰ ہے۔ خواندگی میں مدراس دوسرے درجے پر ہے۔ جہاں خواندہ افراد کی تعداد ۶٬۴۲۰٬۰۰۰ ہے۔

حامد علی خاں

[illegible] سے موسوم ہوا۔

بزمِ "ہمایوں"

اس مہینے "ہمایوں" کے حجم اور کاغذ کی کیفیت میں آپ کو فرق محسوس ہوگا۔

گزشتہ دو سال سے کاغذ کے نرخ میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ آخر نوبت [illegible]

۱۲۰۰۰ روپے

[illegible] روپے

[illegible] ۴۳۰۰۰ روپے

مشین گن ۱۸۰۰ روپے

رائفل ۱۰۰ روپے

بڑا بم بار ہوائی جہاز ۲۷۰۰۰۰ روپے

"لڑاکا" ہوائی جہاز ۱۴۰۰۰۰ روپے

"دیکھ بھال کرنے والا" ہوائی جہاز ۱۲۰۰۰۰ روپے

"ہوائی" بم ۲۲۰ روپے

ایک بڑا بحری جہاز ۸۴۰۰۰۰۰۰ روپے

کروزر ۳۰۸۰۰۰۰۰ روپے

طیارہ بردار جہاز ۵۳۲۰۰۰۰۰ روپے

محافظ جہاز ۵۵۰۰۰۰۰ روپے

سرنگوں سے راستہ صاف کرنے والے جہاز ۸۰۰۰۰۰ روپے

تارپیڈو کشتی ۶۰۰۰۰۰ روپے

نازی سینما

فرانس پر جرمنوں کا اثر و رسوخ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اس کی تازہ مثال یہ ہے کہ مقبوضہ فرانس میں نازیوں نے بہت سی سینما کمپنیاں خرید لی ہیں۔ ایک مشترکہ فرانسیسی جرمن فلم ساز کمپنی جس کے نگراں ڈاکٹر گوئبلز بتائے جاتے ہیں، اس غرض سے قائم کی گئی ہے کہ وہ ان سینماؤں سے اپنی جدید ضروریات کے مطابق کام لے۔

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

بزمِ "ہمایوں"

اس مہینے "ہمایوں" کے حجم اور کاغذ کی کیفیت میں آپ کو فرق محسوس ہوگا۔

گزشتہ دو سال سے کاغذ کے نرخ میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اس گرانی نے نایابی کی صورت اختیار کر لی ہے چنانچہ فروری کے پرچے کے لئے ہمیں وہ کاغذ مل ہی نہیں سکا جس پر "ہمایوں" اب تک چھپتا رہا ہے۔

آپ کاغذ کی گرانی کا اندازہ اِس بات سے کر سکتے ہیں کہ جنگ سے قبل جو کاغذ ہم پانچ روپے آٹھ آنے فی ریم کی شرح سے خریدتے تھے وہی کاغذ سالگرہ نمبر کے لئے ہم نے چھبیس روپے فی ریم کے نرخ سے خریدا اور وہ بھی بہت تلاش کے بعد لاہور بھر میں صرف ایک دکان سے مل سکا۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ فروری کے پرچے پر جو کاغذ صرف ہوا ہے اور جنگ سے قبل جس کی قیمت دو روپے آٹھ آنے فی ریم سے زیادہ نہ تھی اُس کے لئے ہم نے اب چودہ روپے فی ریم ادا کئے ہیں یعنی اس کاغذ کی قیمت پہلے کے مقابلے میں چھ گنا ہو چکی ہے اور پھر مصیبت یہ ہے کہ اِس کا حسبِ ضرورت ملنا بھی آسان نہیں۔ موجودہ حالات میں اُردو اخبارات و رسائل کا تو ذکر ہی کیا بڑے بڑے انگریزی اخبارات بھی جن کی اشاعت لاکھوں تک پہنچتی ہے ایک مدت سے گھٹیا کاغذ کے استعمال کرنے اور صفحات کے گھٹانے پر مجبور ہو چکے ہیں۔

اب تک ہم اِن مشکلات کا مقابلہ خاموشی سے کرتے رہے ہیں۔ اگر کاغذ محض گراں ہی ہوتا تو شاید چندے میں اضافہ کرنے کا سوال قابلِ غور ہو سکتا لیکن اب کاغذ صرف گراں اور نایابی کی حد تک گراں ہی نہیں بلکہ عملاً اور حقیقتہً نایاب ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ ہمہ گیر گرانی کے زمانے میں چندہ بڑھانا نامناسب بھی معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ چندہ تو حسبِ سابق ہی رہے مگر حجم میں کچھ کمی کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کمی عارضی ہے اور حالات کے رو براہ ہوتے ہی دوبارہ صفحات بڑھا دیئے جائیں گے۔

ہماری کوشش یہ ہوگی کہ حجم کی کمی کے باوجود مضامین کی تعداد میں حتی الامکان کمی نہ ہو اور "ہمایوں" قارئین کو ہر مہینے مضامین نظم و نثر کا تقریباً پہلے ہی کے برابر مواد پہنچاتا رہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر آئندہ مہینے سے ہر صفحے کی سطروں میں کافی اضافہ کر دیا جائے گا اس کے علاوہ نظم کے ہر صفحے پر پہلی روش کے خلاف ایک سے زاید نظمیں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اس مہینے ان تجاویز پر کچھ عمل شروع ہوا ہے لیکن پورا عمل آئندہ مہینے سے ہوگا اور جنگ کے خاتمے تک شاید ہم اسی حالت کو برقرار رکھنے پر مجبور ہوں گے بلکہ ممکن ہے کہ ہماری مجبوریوں میں اور اضافہ ہو جائے۔

ہمیں توقع ہے کہ اِن مشکلات میں قارئینِ "ہمایوں" ہم سے پورا تعاون کریں گے اور انہیں اس حقیقت کا احساس ہوگا کہ اب "ہمایوں" کو پہلے سے زیادہ اُن کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔

حامد علی خاں

[illegible]

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(ذوق)

بیادگار عالیجناب فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کیے جاتے ہیں

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱؎ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کیے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لیے ۱؎ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸؎

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھیے

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳ - لارنس روڈ، لاہور

Picture Printed at Half-Tone Press, Ram Nagar, Lahore

مطبوعات

ظالم محبت۔ یہ ناولٹ محترمہ حجاب امتیاز علی کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ سید سجاد حیدر یلدرم "مقدمہ" میں لکھتے ہیں "عزیزہ حجاب امتیاز علی نے بزم اُردو میں ایسی جگہ حاصل کر لی ہے کہ شمع جس وقت اُن کے سامنے لائی جاتی ہے تو ساری محفل ہمہ تن گوش ہو جاتی ہے۔ حجاب کے تخیل نے ایک نئی دنیا خلق کی ہے جو ایک دائمی قوس قزح، دائمی رنگ و بو، دائمی حسن و عشق کی دُنیا ہے۔ وُہ ایک نقاش ہیں عکاس نہیں۔ اُن کے افسانوں کے کریکٹر ایک مستقل خاندان کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ خدا کرے یہ حضرات ہتی دُنیا تک جئیں اور یہ جزیرے اور یہ پہاڑ اور یہ دریا جنہیں آپ کسی اٹلس میں تلاش نہ کیجیے گا، اس آب و گل کے کرہ سے کبھی نہ ٹکرائیں۔ روحی اِن کی زندگی کے کارنامے اپنے دلکش انداز میں لکھتی رہیں" یلدرم صاحب نے اٹلس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وُہ پورا درست نہیں۔ کتاب کے شروع میں ایک دلکش سہ رنگی تصویر ہے "نہر عطوص" یہ نام تو واقعی کسی اٹلس میں نہ ملے گا مگر نہر ان کا ہر مداح اور سومنتان کا ہر سیاح آپ کو بتا سکے گا کہ یہ منظر کہاں جلوہ نما ہے، کتاب پر قیمت درج نہیں شاید مصنفہ کی "نئی دنیا" میں ایسی دلکش چیزیں قارئین کو مفت مل جاتی ہوں۔ ملنے کا پتہ۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور۔

سی پی میں کانگرس راج۔ صوبہ متوسط کی کانگرسی وزارت نے اپنے عہدِ حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کتاب میں اُسے نہایت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ چشم دید واقعات اور صحیح اعداد و شمار کا ایک عبرت انگیز مرقع ہے۔ ہر مسلمان بلکہ ہر انصاف پسند ہندوستانی کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ (۱) مرزا اسمٰعیل بیگ سکرٹری مسلم لیگ ناگپور (سی پی) (۲) دفتر کانفرنس گزٹ۔ علی گڑھ (یوپی)

منتخب داغ۔ داغ کے کلام کا یہ انتخاب بڑی تقطیع کے ۲۷۴ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اس انتخاب کی خوبی کی ضمانت یہ ہے کہ اسے حضرت احسن مارہروی مرحوم نے مرتب کیا تھا جو داغ کے قابل ترین شاگردوں میں سے تھے۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہ انتخاب حضرتِ احسن مرحوم کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اسے شائع کرنے کی سعادت حضرتِ احسن کے فرزند رشید جناب سعید کے حصے میں آئی ہے۔ ابتدا میں سعید صاحب نے اپنے والدِ ماجد کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں۔ اس کے بعد حضرتِ احسن مرحوم کا فاضلانہ مقدمہ شامل ہے۔

انتخاب کے متعلق اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ایک اچھے شاعر کے کلام کا انتخاب ایک اچھے شاعر اور نقاد نے کیا ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت نفیس ہے۔ حضرتِ داغ اور حضرتِ احسن کی تصویریں شامل ہیں۔ قیمت مجلد ۵ر پتہ۔ مطبع انوار احمدی الہ آباد (یوپی)

تصاویر

سندھ کے نظارے کے اوپر کی چھوٹی تصویر مدیر ہمایوں نے اپنے کیمرے سے لی۔ یہ کلفٹن کراچی کے کنارے مندر کا کبوتر خانہ ہے۔

قطعہ تاریخ علامہ اقبال مرحوم نے جولائی ۱۹۱۸ء میں حضرتِ ہمایوں کی وفات پر اُن کے صاحبزادے میاں بشیر احمد کو لکھ کر بھیجو

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

 [illegible]

بھی ظاہر رچا ہتے ہیں اور ساتھ ہی وہ ہندوستان کی عورتوں سے جگہ جگہ شکایت بھی کرتے ہیں کہ وہ کیوں اپنی اتنی بے قدری کرتی ہیں خاص کر اپنے حسن کی۔ ہر عورت اُن کے خیال میں ایک چلتی پھرتی زندہ تصویر ہے اور جس طرح ایک مصور اپنی تصویر کی زیبائش میں اپنی ساری عقل اور طاقت صرف کر دیتا ہے اسی طرح عورت کو بھی اپنی عقل کو اپنے کو حسین بنانے میں خرچ کرنا چاہیئے۔

ہمارے ملک میں اُن مصنفوں کو جنہوں نے عورتوں کے بارے میں لکھا ہے تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا طبقہ تو وہ ہے جو عورتوں کی بڑھتی ہوئی آزادی کو نہایت خوف زدہ نظر سے دیکھتا ہے اُس کو اس میں سوائے خرابیوں کے اچھائی تو مشکل سے نظر آتی ہے۔ یہ طبقہ اس بڑھتی ہوئی رَو کے سامنے ایک بند باندھتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ پرانے زمانے کے رسم و رواج کی تعریف میں بہت کچھ لکھتا ہے اور ساتھ ہی اس ترقی کے جس کو وہ خطرناک اور زہر آلود پاتا ہے خلاف بہت کچھ لکھتا ہے۔ دوسرا طبقہ اُن مصنفوں کا ہے جو عورتوں کو اعتدال کی چال چلنے کی تبلیغ کرتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو چال زمانہ چل رہا ہے اُس کو بالکل روکنا تو ناممکن ہے۔ لیکن کسی ترکیب سے زمانہ کی چال کو اس طرح جوتنا چاہئے کہ انسان آگے بڑھے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ طبقہ بھی عورتوں کی آزادی کی طرف خواہ وہ دماغی ہو یا سماجی۔ ڈرتے ڈرتے ہی دیکھتا ہے

تیسرا طبقہ مصنفین کا وہ پایا جاتا ہے جو اس آزادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اور آگے بڑھ کر اُس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس تیسرے طبقہ میں فلک پیما کا شمار ہے۔ اور وہ پہلے دو طبقوں کا مذاق اس طرح اڑاتا ہے۔ ایک مرد کہتا ہے "کہنے والے یوں کہہ رہے ہیں کہ لڑکیوں کو تعلیم دینے کا اگر یہ نتیجہ ہے کہ وہ آبائی طرز خیال کو چھوڑ کر دنیا کے نیک و بد کی نسبت خود شخصی رائے قائم کریں تو اس تعلیم کو دور ہی سے سلام ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تم سمجھیں کہ تعلیم سے قومی لیڈروں کا اصل مطلب کیا ہے؟ وہ مطلب یہ ہے کہ تعلیم تو تم پا جاؤ۔ مگر کہو وہی جو بزرگ کہتے آئے ہیں۔ پڑھو لکھو سب کچھ مگر چلو نانی دادی کے نقش قدم پر اور جگہ تو تعلیم حالات حاضرہ سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ہے۔ مگر ہمارے ہاں تعلیم اس لئے دی جا رہی ہے کہ ہم زمانے کا مقابلہ کر سکیں۔ زمانہ ہمیں اگر دو قدم آگے کی طرف لے جاتا ہے تو تعلیم کے زور سے چار قدم پیچھے ہٹیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ہندوستان میں جو جوان عورتوں کو عشق و محبت کی آزادی نہیں۔ اُس کا اظہار فلک پیما اپنی ایک مشہور حکایت ساڑھی اور سوٹ میں ظاہر کرتے ہیں۔ ساڑھی تو اُس کہانی میں ہندوستانی تہذیب کا ایک شرمیلا باعصمت اور حیادار نمونہ ہے اور سوٹ جو یورپ سے ہندوستان لایا گیا ہے یورپ کی زندگی کا نمائندہ ہے یہ دونوں اتفاق سے ایک جگہ مل جاتے ہیں اور بات کرنے لگتے ہیں۔ سوٹ باتوں کے دوران میں یوں کہتا ہے "میں اس ملک میں جب سے آیا ہوں۔ دراصل جلا بھنا رہتا ہوں۔ میرے وطن میں بہت ہی ذلت ہوتی پھر بھی یہ خوشی ضرور رہتی کہ کبھی کبھار کوئی اچھا سا فراک میری گود میں بیٹھتا۔ گاہے ماہے قہقہوں کی لہر مجھ سے فراک تک اور فراک سے مجھ تک رواں ہوتی۔ چہل پہل میں وقت گزرتا۔ مگر جس دن سے یہاں آیا ہوں میری تو مٹی خوار ہے۔ یہ سنتے سنتے کہ حد سے تجاوز نہ کرو۔ اعتدال سے کام لو۔ چلو تو سنبھل کر۔ بیٹھو تو سمٹ کر۔ دیکھو تو جھک کر۔ پاس رہو مگر دُور دُور۔ میں تو جان بلب ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو جو پھٹ پھٹا کر اس دنیا سے چل دوں۔

رہے ہیں۔ ویسے تو ان کی تحریر میں ظرافت فلسفہ نکتہ چینیاں۔ مذہبی اور دیگر تنقیدیں۔ عشق و محبت سب ہی کچھ ایک نرالی ادا سے موجود ہے لیکن میں اس وقت فلک پیما کا مطالعہ صرف اس نظر سے کروں گی کہ وہ عورت کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود اس بات کو مانتے ہیں کہ وہ عورت کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے اور ایک جگہ اپنے ایک ملاقاتی سے کہلواتے ہیں "جناب آپ پر تو صنفِ نازک کی پرستش کا بھوت سوار ہے۔ عورت نہ ہوئی کمبخت الف لیلہ کی داستان ہو گئی کہ ختم ہونے میں نہیں آتی"۔ ہندوستان کی بے بس اور بے کس عورت کو دیکھ کر اُن کو غصہ آتا ہے اور ہندوستانی لڑکی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں "لڑکی ہندوستانی گھروں کا ایک پالتو جانور ہے۔ جسے پالنے والے عارضی نمود کی خاطر وقتاً فوقتاً ذبح کرتے ہیں۔ ذبح ہونے پر اس کی نسل بڑھتی ہے"

وہ سماج میں ہر فرد کے لئے ایسی آزادی چاہتے ہیں کہ ہر شخص اپنی زندگی اپنی مرضی سے بنائے اور خاصکر عورتوں کی پوری آزادی چاہتے ہیں وہ عورتوں کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ ان کو اپنے اوپر پورا اختیار ہو ——— ان کو اپنا پورا پورا مالک ہونا چاہئے۔ سفید کریں یا سیاہ یہ اُن کی مرضی۔ فلک پیما اُن خیر خواہ انسانوں کو جن کا پیشہ صرف عورتوں کو نصیحتیں کرنا ہے بہت بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا ایک جگہ اُن کی ایک عورت ایک خط میں یوں لکھتی ہے "صنفِ نازک کے سب سے بڑے دشمن وہ ہیں جو ہم سے نہایت رقّت آمیز خلوص سے کہتے ہیں" بیبیو ذرا سوچ سمجھ کر قدم بڑھاؤ"

فلک پیما کے دل میں ایک عورت کی اتنی عزت ہے کہ وہ اُس میں فیصلہ کی قوت پاتے ہیں اور عورتوں کو نصیحت کرنے والوں کو وہ عورت کا خیر خواہ بالکل نہیں مانتے بلکہ وُہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ عورتوں کے دماغ اور سمجھ اور فیصلہ کی سخت توہین کرتے ہیں۔ ان کو کبھی اپنی طاقت سے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا نہیں دیکھ سکتے اور ہر وقت اُن کو بچوں کی طرح انگلی پکڑ کر چلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ نہیں چاہتے کہ یہ عورتیں کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں اپنے کو پہچانیں اور اپنا فیصلہ خود کریں۔ لہٰذا فلک پیما کی ایک اور عورت ان لوگوں کو اس طرح مضبوطی سے جواب دیتی ہے "میں تو دل سے چاہتی ہوں کہ مجالس میں عورتوں کا ذکر شد و مد سے ہو۔ اس بات کی ہمیں ذرہ برابر بھی پروا نہیں کہ نکتہ چینیاں ہوں گی۔ کیا لوگ ابھی سے بھول گئے کہ وہ دن کچھ پُرانے نہیں ہوئے جب ہمارا ذکر ہی مفقود تھا۔ بہت کوئی کمبخت مجبور ہوتا تھا تو یوں ذکر کرتا تھا "گھر میں طبیعت اچھی نہیں" مہربانی کر کے اپنے سب دوستوں سے ضرور کہئے کہ بیباک عورتوں کی ایک فوج تیار ہو رہی ہے اور یہ بات ذرا نمک مرچ لگا کر کہئے یعنی اس طرح کہ یورپ میں عورتوں نے مردوں کو وہ ناچ نہیں نچایا جو عنقریب ہندوستان میں رائج ہوگا"

فلک پیما ہندوستانی عورتوں میں وہی آزادی دیکھنا چاہتے ہیں۔ جیسی کہ یورپ و امریکہ کے درمیانی اور اونچے طبقہ کی عورتوں کو حاصل ہے وہ چالیس سال سے ہندوستان کے درمیانی اور اوپر کے طبقہ کا مطالعہ کر رہے ہیں اور اُس میں عورت کا پردے میں رہنا۔ عورت کا لکیر کا فقیر بن کر چلنا۔ شادی بیاہ ہر معاملہ میں اُس کی رائے کو غیر ضروری سمجھا جانا اور سب سے زیادہ نوجوانوں میں عشق اور محبت کا ناپید ہونا اُن کو بہت ہی ناگوار ہے عورت کو وہ اِن سب بندھنوں سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ وُہ اُس کی شخصیت کا

([illegible])

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

([illegible])

[illegible]

([illegible])

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

([illegible])

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

سات گونڈ لوک گیت[1]

یہ لوک گیت بدقسمت گونڈوں کے دُکھ درد کے ترجمان ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے قدیم ترین باشندوں میں سے ہیں لیکن آج کل وسطِ ہند کے جنگلوں میں آباد ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اکبر کے زمانے تک اُدھر کئی گونڈ ریاستیں بن چکی تھیں جن کی کافی طاقت تھی۔ چند چھوٹی چھوٹی ریاستیں تو اب بھی موجود ہیں مگر انہوں نے "راج گونڈ" کا لقب اختیار کر کے عام غریب گونڈوں کو ایک طرح کی حقارت سے دیکھنا شروع کر رکھا ہے۔ بن باسی گونڈ کسان غریبی کی گود میں جنم لیتا ہے اور غریبی کی گود ہی میں اُسے موت لے لیتی ہے۔ گیتوں کے ترجمے میں اُن کی سادگی کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۔ درختوں کے درمیان میں بنسری بجاتا ہوں
لیکن کون پروا کرتا ہے اِس غریب بن باسی کی؟
نہ میری ماں ہے، نہ بھائی، نہ کوئی یار دوست دُنیا بھر میں ——
دن بھر میں بنسری بجاتا ہوں
درختوں کے درمیان میں بنسری بجاتا ہوں۔
میری ایک ماں ہے، بھائی بھی، اور کچھ یار دوست بھی جو میرے
ساتھ کھانے پینے میں شریک ہیں۔
لیکن اُن میں سے ایک بھی اِس غریب بن باسی کی مدد نہیں کرتا۔
یک بیل کی چھاؤں میں کوئی بیٹھا ہے۔
اُسے بچھو کاٹتا ہے اور وہ روتا ہے۔
کون پروا کرتا ہے بن باسیوں کی؟
درختوں کے درمیان میں بنسری بجاتا ہوں۔

۲۔ ہائے! کیسے بھروں گا اس سال اپنے بچوں کے پیٹ؟
فصل دھوکا دے گئی۔
لگان تو ادا کر ہی سکتا ہوں ہل بیچ کر، بیل بیچ کر
لیکن کیسے بھروں گا اس سال اپنے بچوں کے پیٹ؟

۳۔ بارہ مینہ برستا ہے
گھر کے اندر ایک لڑکی بیٹھی رو رہی ہے۔

۴۔ ہمارے گاؤں کا زمیندار بہت غریب ہو گیا ہے۔
اُس نے اپنی بہن کو بیچ دیا ہے اور ایک دھوتی خرید لی ہے۔

۵۔ ماہی گیر کے گھر ایک بیٹے نے جنم لیا ہے ——
سر پر جال رکھے ہوئے۔
"سنگھی" "مچھلی" دَھر دَھر رو رہی ہے ——
ہائے! میری جان کا ایک دُشمن پیدا ہو گیا۔

۶۔ شیروں سے بھرپور ہے یہ جنگل، ہم کیسے بچیں گے؟
وہ ایک شیر سے ملتا ہے اور کہتا ہے ——
یہی لکھا ہے میری قسمت کی پوتھی میں
کہ میں مارا جاؤں!
شیروں سے بھرپور ہے یہ جنگل، ہم کیسے بچیں گے؟
تنگ پہاڑی درے ہیں ——
درے میں، جہاں کیچڑ کی بھرمار ہے،
شیروں کے نقشِ پا دکھائی دیتے ہیں
شیروں سے بھرپور ہے جنگل، ہم کیسے بچیں گے؟

۷۔ خوشحال آدمی خوشی کا نغمہ گاتا ہے۔
مگر غمگین آدمی غم کے سُر چھیڑتا ہے۔
کیسے بتا سکتا ہوں میں اپنی زندگی کے غم
انہیں تو صرف خدا ہی گن سکتا ہے۔
گھر سے آتی ہوئی آوازیں سُن کر تم معلوم کر سکتے ہو
کہ وہاں کوئی غم ہے یا خوشی۔

دیوندرست

---

[1] دیہاتی گیت کے لئے یہ لفظ گجراتی، بنگالی، ہندی اور پنجابی میں استعمال کیا جا رہا ہے اور حال ہی میں "آل انڈیا ریڈیو" نے بھی اسے قبول کر لیا ہے۔

تاثرات

جانے وہ کس خیال میں اس درجہ محو ہے — دیکھا نہیں ندیم نے جی بھر کے رُوئے یار
وہ صبح چاک چاک گریباں لئے اُٹھی — اے رات تیری تیز روی پر خدا کی مار

میں تیرے التفاتِ فراواں سے تھک گیا — ساغر کا دَور روک لے اے ساقیٔ جمیل
آخر وہ مست بھی تو کھڑے ہیں سبو بدست — جن کے لبوں کو راس نہیں موجِ سلسبیل

شیشم کی ایک شاخ سے جب فاختہ اُڑی — پتّوں نے سر پٹخ کے کہا "جلد لوٹیو"
میں جا رہا ہوں اور تمہیں کچھ خبر نہیں — دیہات کے اُداس پہاڑوں کی چوٹیو

پنگھٹ پہ کل کسی نے سراہا تھا تھام کر — یوں آنکھ بھر کے دیکھا کہ میں لڑکھڑا گیا
چنگاریاں چھٹکنے لگیں دل کے آس پاس — اک بھولا بسرا عہد مجھے یاد آ گیا

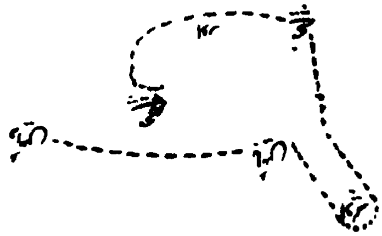
شہنائیوں کے شور میں ڈولی جونہی اُٹھی — اک نوجواں کہیں سے پکارا "مجھے بچاؤ"
ڈولی سے سر نکال کے بولی حسین دُلھن — "کیا کر رہے ہو۔ جاؤ بھی۔ للہ۔ جاؤ۔ جاؤ"

اُف یہ طویل رات، یہ پُر ہول ظلمتیں — بیٹھا ہوں کتنی دیر سے آغوش وا کئے
آرائشِ جمال میں تم ہو ابھی مگن — اور میں نے آسماں کے ستارے بھی گن لئے

احمد ندیم قاسمی

[illegible]

[illegible]



[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(٢)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(١)

ڈوہڑے

یہ سارے معجزے سائنس کے ہیں — کہ قابو میں عناصر آ گئے ہیں

پلٹ رہوارِ تخیل سُبک سیر — کہاں میں اور کہاں یہ جنتِ غیر
زمینِ ہند کی جانب رواں ہو — طوافِ ارضِ محسودِ جہاں ہو
یہاں کا تو خدا ہی دوسرا ہے — دیارِ ہند کا عالم جُدا ہے
جو خطہ ہے قدامت کا ورق ہے — وہی قیس اور لیلےٰ کا سبق ہے
وہی بیہڑ وہی کہسار جنگل — وہی وادی وہی میدان چٹیل
وہی ہر گاؤں اور ویرانیاں ہیں — وہی جہل اور وہی نادانیاں ہیں
وہی کھیتی وہی بیل اور وہی ہل — وہی ہے ادکھلی سر اور موصل
وہی چھپر وہی دھنی وہی بانس — وہی کوڑا وہی کرکٹ وہی پانس
وہی کھڑی وہی گدڑی وہی ٹاٹ — وہی کونا وہی ٹوٹی ہوئی کھاٹ
جو گھر ہے نکبت و عسرت کا گھر ہے — مصیبت جان کو آٹھوں پہر ہے
وہ جاڑا ہو کہ گرمی ہو کہ برسات — مشقت اور چلاکا ہی ہر دن رات
نہیں ثابت کوئی کپڑا بدن پر — نہ روٹی پیٹ بھر کر ہے میسر
پسینہ اپنا جب دن بھر بہایا — تو مٹھی بھر چبینا ہات آیا
پڑے بیمار تو ہے کون پرساں — دوا دارو میسر ہے نہ درماں
یونہی کچھ روز بستر پر تڑپ کے — چلے راہِ عدم کو ٹھنڈے ٹھنڈے
اٹھے بھائی بھتیجے اور بیٹے — چلے میت کو گدڑی میں لپیٹے
جلا دینے کا بھی ساماں نہ پایا — کسی ندی پہ لے جا کے بہایا
یہ ہے افسوس اس دہقاں کی حالت — کہ جس کے خون سے ملتی ہے دولت

نظر شہروں پہ بھی اب ڈالئے ایک — یہاں بھی دیکھئے حالِ بد و نیک
چراغوں کی جگہ بجلی ہے روشن — ملیں دو چار ہیں دو چار انجن
بجائے چاہ ہے پائپ کا پانی — اسی کے رحم پر ہے زندگانی
مہیا ہیں کچھ اسبابِ تماشا — کھلے ہیں تھیئٹر ٹاکی سنیما
ہوئی شام اور جنٹلمین نکلے — سنیما کے لئے بے چین نکلے
سرِ بازار ڈالے ہاتھ میں ہاتھ — چلی جاتی ہیں مسٹر کے مسز ساتھ
یہی آزادیٔ ہندوستان ہے — اسی میں مست کالج کا جواں ہے

بنائیں ہیں پڑی تعلیم کی بھی — بڑے کالج ہیں یونیورسٹی بھی
نہ پوچھو کیا ہے اس تعلیم کا حال — یہاں ہے ڈھول میں بکّال ہی کھال
لٹائی باپ کی گاڑھی کمائی — بہت عمر اور بہت صحت گنوائی
تو ڈگری کوئی ہم کو ہات آئی — نیازیں دیں خوشی ہم نے منائی
جوانی ہی میں پیری آ گئی ہے — خمیدہ ہے کمر عینک لگی ہے
لئے ڈگری چلے کالج سے بھی ہم — کہ نکلے جس طرح جنت سے آدم
کہیں بھی پوچھتا کوئی نہیں بات — دھرے بیٹھے ہیں خالی ہات پر ہات
بہت دن جب ہوئے صرفِ تگا پو — کھلی قسمت ہوئے دفتر کے بابو
زن و فرزند و دختر کا لئے بار — اجل کی راہ میں ہیں گرم رفتار

ہزاروں میں ہوئے بابو جو دو چار — تو بیڑا ہندیوں کا ہو گیا پار
گلے میں ڈگریوں کا طوق ڈالے — پڑے پھرتے ہیں در در علم والے
کہیں جائیں کوئی پرساں نہیں ہے — کہیں اس درد کا درماں نہیں ہے
ہمیں سوئی بنانا بھی نہ آیا — ہمیں تھگلی لگانا بھی نہ آیا
ہمیں تو مانگ کھانا بھی نہ آیا — ہمیں بندر نچانا بھی نہ آیا
وہی ہم ہیں وہی بھاجی وہی ساگ — وہی ہم ہیں وہی ڈھپلی وہی راگ

[illegible] دہلوی

[illegible]

میں باقی نہ رہا تو اس کی قسمت پر ہمیشہ کے لئے مہر لگ گئی، ہائے ایک پھولا پھلا چمنِ علم و ادب نذرِ خزاں ہو اہے اور کس کی بدولت صرف غزل دشمنی کی بدولت، دیکھا آپ نے غزل دشمنی کا انجام

ڈاکٹر لطیف صاحب آج کل اڈک میٹ میں مقیم ہیں، مجھے آج تک اُن سے حصولِ نیاز کا موقع نہیں ملا، مگر یہ تحقیق معلوم ہوا ہے چونکہ وہ بھی آپ کی طرح غزل دشمن تھے اور غزل دشمن ہونے ساتھ غالب دشمن بھی، اس لئے وہ بھی ملازمت سے علیحدہ کئے جا چکے ہیں اور اب پاکستانی منطقے قائم کرنے کے خیال سے جی بہلایا کرتے ہیں، کاش! غزل دشمن اصحاب عبرت پکڑیں۔

علیم صاحب اپنی مسلسل غفلتوں کی بدولت اپنی ملازمت کھو چکے ہیں اور بیکار ہیں، مگر اُن کے رنگین مشاغل حسبِ گنجائش و توفیق بدستور جاری ہیں، علاف صاحب کا بھی یہی حال ہے، قریشی صاحب بھونگیر میں صدر مدرس ہیں، رشدی صاحب جالنا ضلع اورنگ آباد میں کسی تعلیمانی عہدے پر فائز ہیں، اختر صاحب بدستور انسپکٹر آبکاری کے عہدے پر مامور چلے جا رہے ہیں، وہ غزل بھی کہتے ہیں اور نظم بھی مگر غزل سے لگاؤ دوچند ہو گیا ہے، مختصر یہ کہ ان اہلِ عقل و ہوش اور ذی علم اصحاب میں سے کوئی بھی آپ کی توقع کی موافق غزل دشمن نہیں، جو غزل کہہ سکتے ہیں وہ برابر کہتے رہتے ہیں، جو نہیں کہہ سکتے وہ سنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ زندہ باد غزل!

اختر صاحب کا دیوان یعنی مجموعۂ غزلیات حال ہی میں "انوار" کے دلچسپ نام سے اور ماہر القادری صاحب کا مجموعۂ غزلیات "محسوساتِ ماہر" کے نام سے شائع ہو ہے یہ دونوں مجموعے اشاعت و قبولیتِ عام پا رہے ہیں، دشمنانِ غزل آتشِ حسد سے جلتے ہیں تو جلا کریں، پائندہ باد غزل۔

بارش یہاں بھی نہیں اور بقول آپ کے ہلکی ہلکی بدلیاں کبھی کبھی آتی ہیں اور گیلی دگیلی پانی لئے ہوئے بالا بالا گزر جاتی ہیں، مگر اس کے باوجود موسم کافی دلکش ہے، رات کو اکثر کمبل اوڑھنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، دن کو بالعموم ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہتی ہیں غرض وہ گرمی و حبس کی اذیت جو وہاں ہے یہاں بالکل مفقود ہے۔ ایسا بالیقین اس وجہ سے ہے کہ یہاں خدا کے فضل سے دشمنانِ غزل بلحاظِ تعداد بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر، اور اگر کچھ ہیں بھی تو بالکل غیر اہم اور ناقابلِ اعتنا، واہ رے فیضانِ غزل۔

احسان احمد دعا کے جواب میں پیار کہتے ہیں، عبد العزیز صاحب ٹھیکیدار سے کبھی کبھی سرِ راہ ملاقات ہو جاتی ہے بفضلہ بخیریت ہیں مگر معلوم نہیں کس محلے میں مقیم ہیں، جب سے یہاں آیا ہوں عبد الحمید خاں کی صورت تک نہیں دیکھی، کچھ علم نہیں کہ حیدر آباد ہی میں ہیں یا کہیں باہر، مرزا لشبیر علی صاحب سے میں واقف نہیں کہ یہ کون صاحب ہیں، اگر کسی زمانے میں واقفیت ہو گی تو اب بھول چکا ہوں، خدا معلوم آپ نے مذکورۂ بالا اصحاب کے حالات خصوصیت سے کیوں دریافت فرمائے ہیں، آخر ان لوگوں کو غزل دوستی یا غزل دشمنی سے کیا تعلق؟

گھر میں سلام و دعا پہنچا دیجئے، امجا دمیاں اور سعیدہ بی بی کو دعا، ابرار صاحب، انیس احمد خاں صاحب، دیدار حسن خاں صاحب، اور التفات احمد خاں صاحب کی خدمت میں سلام مسنون مع اشتیاقِ ملاقات

والسلام

ہاں خوب یاد آیا، ایک ذرا سی شکایت باقی رہ گئی ہے جسے با میدِ توجہ درج ذیل کرتا ہوں، یہ تو مجھے پرچے سے معلوم ہے کہ آپ کا رسالہ "کلیم" رسالہ "نیا ادب" میں مدغم ہو چکا ہے اور رفیقہ "نیا ادب" کلیم کے دوگونہ مرتب نام سے اشاعت پذیر ہے، مگر یہ بالکل معلوم نہیں کہ میں آج تک اُس سے کیوں محروم ہوں کیا اس محرومی کا بھی میری غزل سے کوئی تعلق ہے

دوسرا اسلام

[illegible] ۱۹۴۸ء

یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر میں نے ذرا دیر کی تو آپ حسبِ عادت مفلس ہو چکے ہوں گے، مگر میں اس کے باوجود آپ کو تکلیف دیتے ہچکچاتا ہوں اس لئے نہیں کہ آپ سے دُور رہنا مجھے گوارا ہے یا آپ کے حصولِ نیاز کا کچھ کم متمنی ہوں، بلکہ صرف اس لئے کہ میں ایک مدتِ دراز تک آپ کے لئے بہت سی تکالیف کا باعث رہ چکا ہوں اور اب تا حدِ امکان یہ زحمت دینی نہیں چاہتا، لیکن اس پر بھی اگر میرا جلد حاضرِ خدمت ہونا ضروری ہو اور آپ مجھے بہ آسانی اخراجاتِ سفر بھیج سکتے ہوں تو میں بسر و چشم تعمیلِ ارشاد کو حاضر ہوں۔ میں اس صورت میں یہ سمجھوں گا کہ میری خوش قسمتی نے مجھے میری تمنا میں میرے ارادہ کردہ اور قرار دادہ وقت سے پہلے کامیاب کر دیا ورنہ اوائل یا زیادہ سے زیادہ اواخرِ اکتوبر تک تو حسبِ وعدہ حاضری کرتا ہوں، یعنی میں بالیقین ختمِ اکتوبر سے پہلے حیدرآباد چھوڑ چکا ہوں گا۔ بلا لحاظِ غزل دوستی یا غزل دشمنی تمام غزل پسندوں اور تمام متغزلین دوست اصحاب کی قسم!

یہ آپ نے کیا تحریر فرمایا کہ "اگر میں یہ جانتا کہ آپ تل اوٹ پہاڑ اوٹ والے آدمی ہیں تو کبھی آپ سے دل نہ لگاتا"۔ فلسفیانہ دماغ اور شاعرانہ طبیعت کا مالک ہوتے ہوئے آپ کے قلم و زبان سے ایسے غیر فلسفیانہ اور غیر شاعرانہ خیالات کا اظہار تعجب انگیز ہے۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تو انسان گوارا اشیا گوارا تعلقات اور گوارا معاملات سے دلچسپی و انہماک رکھنے کے ساتھ ساتھ سینکڑوں مکروہات بھی انگیز کرنے پر مجبور ہے اور شاعرانہ نقطۂ نظر سے دُنیا کی کوئی چیز غیر مرغوب اور مکروہ ہے ہی نہیں، تمام عالم حسن ہی حسن ہے۔ پھر اگر آپ نے ایک اہم ہستی ہو کر ایک غیر اہم ہستی سے، ایک غزل دشمن ہو کر ایک غزل پرست سے اور جوش ہو کر آزاد سے دل لگایا اور اس کو نباہ نہ کیا تو یہ کوئی ایسا شاذ یا غیر معمولی واقعہ نہیں کہ اس پر اظہارِ تعجب یا اظہارِ تاسف کرنا ضروری سمجھا جائے۔ اب رہ گیا تل اوٹ پہاڑ اوٹ ہو جانے کا معاملہ تو جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے اس معاملے میں بھی پہل آپ کی طرف سے ہوئی یعنی اُدھر آپ لکھنؤ تشریف لے گئے اِدھر میں حیدرآباد چلا آیا، بالکل اُسی طرح جس طرح اس واقعے سے چند روز پہلے دریا گنج میں پردہ باغ کے قریب ایک چوراہے پر آپ مجھ کو دیکھ کر بطورِ مذاق مشرق کی طرف مڑ گئے تھے اور میں مغرب کی طرف، یہ ایک ایسا خاموش مذاق تھا جس پر ہم دونوں مل کر خوب ہنسے تھے، مگر اُس وقت کس کو یہ معلوم تھا کہ یہی مذاق چند روز بعد سنجیدگی و اصلیت کا روپ بدل کر دہرایا جانے والا ہے جو ایک خاصی مدت کے لئے ہم دونوں کو دُور دُور پھینک دے گا۔ چنانچہ پھر جب کچھ روز بعد سنجیدگی و اصلیت کے روپ میں دُہرایا گیا تو آپ نے شمال کی راہ لی اور میں نے جنوب کی۔ دونوں واقعوں میں صرف سمات اور مسافتوں کی کمی و بیشی کا فرق ہے ورنہ دونوں کے خد و خال تک ایک ہیں۔ یہاں میں پھر آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ دونوں مرتبہ پہل آپ نے کی یعنی پہلے آپ تل اوٹ پہاڑ اوٹ ہوئے اور پھر میں۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگرچہ دونوں مرتبہ پہل آپ کی طرف سے ہوئی مگر اس کی ذمہ داری بھی میری ہی محرومیٔ قسمت ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ میری غزل پرستی نے مجھ کو یہ روزِ بد دکھایا ہو یعنی آپ میری غزل پرستی سے تنگ آ کر مجھے چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہوں۔ بہر حال کوئی وجہ ہوئی ہو، میں ابھی تک غزل کو آپ کی طرح گشتنی و گردن زدنی نہیں سمجھتا، کیونکہ بفضلہ تعالیٰ غزل پھر غزل ہے۔

آپ کا سوز خواں، بسورنے والا بیوۂ عالمِ فانی، آج کل بیمار بھی ہے اور بیکار بھی، اس کی حالت قابلِ رحم و کرم ہے، قابلِ طعن و تشنیع اور شایانِ سرزنش نہیں۔ کاش! آپ غزل دوستی اور غزل دشمنی سے بالا ہو کر غور فرماتے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وُہ چرخ پہ اُڑتے ہوئے بادل کے سفینے!
رُکتی ہوئی آواز، وُہ دُکھتی ہوئی سانسیں!
جلتی ہوئی آنکھیں، وُہ دھڑکتے ہوئے سینے!
وُہ گرم تنفس، وُہ دہکتے ہوئے اعضا!
ہونٹوں کی وُہ خشکی، وُہ جبینوں کے پسینے!
روحوں میں وُہ طوفان مچاتی تھی محبت
دونوں کو اُڑا ئے لئے جاتی تھی محبت!!

(۳)

یاد آتی ہے رہ رہ کے محبت کی کہانی
کاٹے نہیں کٹتی ہے یہ ویران جوانی
جس دُکھ سے میں دن رات پریشان ہوں اے دوست!
سچ سچ کہو کیا تم بھی پریشان نہیں ہو؟!
خود رفتہ و آشفتہ و حیران ہوں اے دوست!
تم بھی یونہی آشفتہ و حیران نہیں ہو؟!
جس وضع سے میں بے سر و سامان ہوں اے دوست!
کیا ویسے ہی تم بے سر و سامان نہیں ہو؟!
میں عشق کا روندا ہوُا انسان ہوں اے دوست!
پامالِ الم تم بھی مری جان! نہیں ہو؟!
ایسا ہے تو گمنام فضاؤں سے صدا دو
فریاد کی آواز سے آواز ملا دو!؟

ذوقی

[illegible]

(٨)

[illegible]

(١)

[illegible]

[illegible]

مجید۔ نہیں تائی جان۔ آج رہنے دیجئے، پھر کسی دن سہی۔ میں کوئی غیر تو نہیں، اب اجازت ہی دیجئے۔

ماں۔ (جاتے ہوئے) نہ بیٹا یہ نہیں میں مانتی۔ پانچ منٹ اور ٹھہرو۔ چائے پی کر جانا۔ (جاتی ہے)

(کچھ دیر دونوں خاموش رہتے ہیں۔ عثمان سگرٹ سلگاتا ہے اور مجید کو بھی پیش کرتا ہے۔ دونوں الگ الگ سگرٹ لگاتے ہیں اور ایک منٹ کے لئے سگرٹ پیتے رہتے ہیں۔ عثمان اِدھر اُدھر ٹہلتا ہے)

مجید۔ عثمان!

عثمان۔ (چونک کر مجید کی طرف دیکھتا ہے) !

مجید۔ کوئی بات ضرور ہے۔ کیوں نہیں بتاتے شاید میں کچھ تمہاری مدد کر سکوں۔

عثمان۔ (ٹھہر کر) میری کوئی بھی مدد نہیں کر سکتا

مجید۔ یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟

عثمان۔ (آہستہ آہستہ) میں جانتا ہوں۔ اس لئے۔

مجید۔ پھر بھی کچھ تو کہو۔ تسنیم ہی کی بات معلوم ہوتی ہے

عثمان۔ ہُونہہ!

مجید۔ مگر تم تو کبھی اس سے بات بھی نہیں کیا کرتے تھے ولایت جانے سے پہلے۔ تمہیں یاد ہے چچی نسیمہ ہمیں اکثر بلا بھیجتی تھیں۔ ان دنوں تسنیم کالج میں پڑھتی تھی۔ اور چچی نسیمہ کے پاس ہی رہتی تھی۔ اگر تم چاہتے تو وہ سو دفعہ تم سے اس کی شادی کر دیتیں۔ وہ تو خود چاہتی تھیں اور تسنیم بھی!

عثمان۔ شاید!

مجید۔ مگر ان دنوں تمہیں ولایت جانے کی دھن تھی۔ مجھے یاد ہے وہاں کی عورتوں کا خیال کرکے تمہیں کوئی ہندوستانی عورت پسند ہی کب آتی تھی۔

عثمان۔ بیوقوفی کسی ایک شخص کی ملکیت نہیں۔

مجید۔ اور جب کبھی ہم وہاں جاتے تو تسنیم فقط تمہیں ہی دیکھا کرتی!

عثمان۔ (جیسے سُن کر تکلیف ہوتی ہے) جانے دو!

مجید۔ (جیسے عثمان کی تکلیف کا زیادہ احساس نہیں) سچ کہتا ہوں، تھی بھی بہت کامنی! یاد ہیں اس کی آنکھیں؟ واللہ ایسی روشن تھیں جیسے ان کی پتلیوں کے پیچھے شمعیں جل رہی ہوں! اور اس کی پلکیں! واللہ کتنے احمق تھے تم!

عثمان۔ (جس کے لئے مجید کی باتیں ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہیں) ہونہہ!

مجید۔ مگر اب کیا لکیر کو پیٹ رہے ہو۔ سانپ نکل گیا۔ اس کی شادی تو ایک سال ہوا ہو گئی۔ خاوند بھی اس کا کوئی ایسا بُرا نہیں دو اڑھائی سو تنخواہ لیتا ہے۔ اور یوں بھی معقول آدمی ہے۔

عثمان۔ (سگرٹ کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے) جانتا ہوں۔

مجید۔ تو پھر کیوں یہ حالت بنائی ہے۔ کہ گھر میں سب تم سے نالاں ہیں؟

عثمان۔ کیا کروں

مجید۔ عقل سے کام لو اور کیا کرو۔ جب مل سکتی تھی، تو اس کی طرف دیکھتے نہیں تھے۔ اور مجھے یقین ہے وہ بھی تمہیں چاہتی تھی۔ یاد ہے تمہاری بکواس کس غور سے سنا کرتی تھی۔ اور جب کبھی چچی نسیمہ نے ہم دونوں کو بلایا۔ مجھے تمہارا دم چھلا سمجھ کر۔ تو جانتے ہو تسنیم کس طرح صاف ستھری ہو کر بیٹھی ہوتی تھی جیسے دُھلی

کر آیا ہے۔

عثمان۔ (بے ساختہ طور پر ہنس کر) بہت خوب! آپا غضب کر دیا۔ واللہ عجیب دماغ پایا ہے تم نے (اور ہنستا ہے)

راشدہ۔ (عثمان کی اس بے ساختہ ہنسی سے کچھ کھسیانی ہو کر) میم سے نہیں تو کسی اور سے ہو گا قول تم ضرور ہار آئے ہو۔

ماں۔ (عثمان سے جو ابھی ہنس رہا ہے تشویش ناک لہجے میں) بیٹا سچ سچ بتاؤ۔ کہیں ایسا تو نہیں؟

عثمان۔ (مذاق میں مسکراتے ہوئے) شاید!

ماں۔ بیٹا سچ مچ بتاؤ۔ کہیں کسی میم سے تو نہیں وعدہ کر آئے۔ میم نگوڑی تو ہندوستان تک پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ میرا دل تو دھک دھک کرنے لگ گیا ہے۔

عثمان۔ (مسکراتے ہوئے) میں تو شاید نہ بھی کرتا مگر آپا سے ڈرتے ہوئے میں نے سوچا کہ ہندوستانی بھابی کی تو ان کے سامنے جان جائے گی۔ کوئی میم ہی کر لاؤں۔ اس سے تو آپا ڈریں گی۔

راشدہ۔ میم سے ڈرتی ہے میری پیزار۔ موئی کافر!

عثمان۔ آپا کافر نہیں، بے چاری مُشرکن ہے۔

راشدہ۔ کافر ہی ہوئی نا۔ میں ایسیوں کے منہ لگتی ہوں۔ کر ہی آئے ہو نا۔

ماں۔ (غمگین آواز میں) عثمان تمہیں میرے سر کی قسم سچ مچ بتاؤ کیا واقعی کچھ کر آئے ہو۔ اچھا بھیجا تھا تمہیں ولایت۔

مجید۔ تائی جان آپ فکر نہ کریں۔ عثمان مذاق کر رہا ہے۔ میں اس کے لہجے کو پہچانتا ہوں۔

ماں۔ (عثمان سے) کیوں بیٹا؟

عثمان۔ ٹھیک کہتا ہے اماں۔ آپا کو بہت دُور کی سوجھتی ہے میں ایسی لعنت میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ اور پھر مجھے معلوم تھا کہ آپ کو یہ امر بہت ناگوار ہو گا۔

ماں۔ تو بیٹا یہیں شادی کر لو۔ ہمیں تسلی ہو جائے گی تمہیں بھی شاید چین آ جائے۔ بیوی بھی ایسی بیاہ کر لاؤں کہ چاند کا ٹکڑا ہو۔

عثمان۔ اماں یہ تو ٹھیک ہے مگر مجھے ابھی ضرورت نہیں۔ آپ بار بار نہ کہئے۔

راشدہ۔ اماں اس سے کیوں اتنا پوچھتی ہو۔ کہیں دیکھ دا کھ کر کر لو۔ خود بخود مان جائے گا۔

عثمان۔ (جلدی سے) خدا کے لئے یہ نہ کرنا۔ ورنہ آپ کو بڑی ندامت ہو گی۔ کیونکہ میں ہرگز نہیں مانوں گا۔

راشدہ۔ رہنے دو ہرگز نہیں ماننے کا۔ میں جانتی ہوں تم کو۔ تمہاری وہی بات ہے "پکا ہُوا نہیں کھانا پھینک جائے تو کھا لیتا ہے"۔

عثمان۔ (لال پیلا ہو کر) آپ کا مطلب؟

راشدہ۔ صاف صاف تو کہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہاں جاتے ہو تم آج کل!

عثمان۔ کہاں؟

راشدہ۔ نہ پوچھو مجھ سے۔ میں ہمیشہ سے تمہارا پردہ رکھتی ہوں۔

ماں۔ کیا ہے بیٹیا؟

عثمان۔ (اور چیں بجبیں ہو کر) بیہودہ بکتی ہے

راشدہ۔ تم تو ہو ہی منہ پھٹ اور گستاخ! ورنہ بتاؤ تم چچا ذوالفقار کے ہاں دس چھوڑ بیسیوں مرتبہ انہی دنوں میں نہیں گئے؟

پنجابی مَثل

راشدہ۔ (ہاہا) اب تو تم بہت لفاظ ہو گئے ہو۔

مجید۔ (مسکراتے ہوئے) آپ ہی کی دعاؤں کا اثر ہے۔ آپ بزرگ ہیں۔

راشدہ۔ میرے بھائی آج کل بزرگوں کو کون پوچھتا ہے۔ عثمان ہی سے پوچھو کہ یہ کیوں ہر ایک سے لڑتا ہے؟

عثمان۔ آپا یہ جھوٹ بولنا کب سے سیکھا ہے۔ میں تو نہ آج نہ کل کسی سے نہیں لڑتا۔ آپ ہی کی سمجھ میں کوئی فتور ہے جو ہوا کو تلواریں مارتی ہیں۔

راشدہ۔ دیکھا اماں آپ نے عثمان کی یہ عادت تو شروع ہی سے تھی کہ سوائے اپنے ہر ایک کو بے وقوف سمجھتا تھا۔ اب تو کھلم کھلا گالیاں دینے لگ گیا ہے۔

عثمان۔ اپنی عادت تو دیکھئے۔ مبالغہ کرنے میں جو کمال آپ نے حاصل کیا ہے وہ کس کو ہے۔ میں نے آپ کو کب گالیاں دی ہیں۔

راشدہ۔ دی نہیں ہیں تو دے دو گے۔ تم سے کیا بعید ہے۔

عورت۔ بیٹا! راشدہ تم سے بڑی ہے۔ تم اس طرح نہ بولا کرو۔ تمہارا مزاج ہی آج کل چڑچڑا ہو گیا ہے معلوم نہیں کیا چاہتے ہو؟

عثمان۔ یہی تو بات ہے جو مجھے غصہ دلاتی ہے۔ آپ کیوں اس بات پر اصرار کرتی ہیں کہ مجھے کچھ چاہئے۔ میں کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں کہ یہ آپ کا وہم ہے۔ میں تو فقط آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ ہر وقت میرا قصہ نہ لے بیٹھا کیجئے۔ آپ کو کوئی اور بات نہیں ملتی؟

راشدہ۔ تمہاری بات نہ کریں تو اور کس کی کریں۔ اپنی طرف تو دیکھو۔ کسی سے بات تم نہیں کرتے اندر آتے ہی نہیں۔ یا باہر بیٹھے رہتے ہو یا دوستوں کے ساتھ ادھر اُدھر فضول پھرتے رہتے ہو۔

عثمان۔ آپا تم یہ کیوں نہیں بھول جاتیں کہ اب میں بچہ نہیں ہوں۔

ماں۔ بیٹا راشدہ غلط بھی کیا کہتی ہے۔ تم تو ہم سے بولتے بھی نہیں۔

مجید۔ (جو اب تک بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا) یہ آج کل کسی سے بھی نہیں بولتے۔

ماں۔ اس کی کوئی وجہ بھی ہو!

راشدہ۔ جب ہم کہتے ہیں کہ تمہاری شادی کر دیتے ہیں تو وہ غصہ آتا ہے کہ الاماں!

عثمان۔ تمہارے لئے ہر سوال کا جواب اور ہر بات کا حل شادی ہے۔

راشدہ۔ کم از کم یوں پریشان تو نہ پھرو گے

ماں۔ بیٹا تم کیوں نہیں ٹھنڈے دل سے سوچتے۔ آخر تمہارا دل جو اُداس رہتا ہے تو اس کا کچھ باعث بھی ہوگا۔

عثمان۔ (ذرا غصے سے) میں کہتا ہوں آپ کو سرے سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں بالکل اُداس نہیں۔

راشدہ۔ اب کیا تم سچ بول رہے ہو۔

مجید۔ عثمان بھئی معاف کرنا۔ مجھے یا تو چلا جانا چاہئے یا پھر تائی جان سے متفق ہو کر میں ضرور کہوں گا کہ اگر تم واقعی خوش نہیں تو اس کا کچھ تدارک کرو۔

راشدہ۔ اماں میں ایک بات بتاؤں؟

عثمان۔ } ایک ساتھ { اب کوئی اور بہتان مجھ پر تھوپ دو گی
اماں } { کہو

راشدہ۔ عثمان اس لئے شادی نہیں کرتا کہ یہ کسی میم سے وعدہ

ہو تو ان سے ملے بغیر چلے جاتے ہو۔ آپا بھی پوچھتی تھیں۔

مجید۔ (رکھاوٹ سے) آج نہیں پھر کسی دن سہی۔ آج کچھ کام ہے، تو اب چلتا ہوں (اُٹھتا ہے)

عثمان۔ چھوڑو یار کام تو روز ہی ہوا کرتے ہیں۔ اگر تم ملے بغیر چلے گئے تو سب گھر والے مجھی پر گلہ کریں گے۔

(اتنے میں بائیں طرف کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک پچاس برس کی عورت داخل ہوتی ہے۔ اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ ہاتھ میں کچھ سلائیاں اور ایک اُون کا گولہ ہے شاید کسی بچے کا سوئیٹر بن رہی ہے۔ اس کے آنے پر مجید رُک جاتا ہے۔ سلام کرتا ہے)

عورت۔ مجید بیٹا تم دیر سے آئے ہوئے ہو کیا اندر نہیں آنا تھا۔

مجید۔ (عثمان کی طرف دیکھ کر) اب آنے ہی کو تھا۔ ان سے باتیں کرتے کچھ وقت لگ گیا۔

عورت۔ تمہاری والدہ تو اچھی ہیں؟

مجید۔ جی! ابھی پرسوں ہی ان کا خط آیا تھا۔ لکھا تھا اگر آپ سے ملوں تو ان کا سلام پہنچا دوں۔

عورت۔ میرا بھی سلام لکھ دینا۔ بڑے دنوں کی چھٹیوں میں ان کو بلاؤں گی۔

مجید۔ کوئی تقریب ہے کیا؟

عورت۔ تقریب تو کوئی ایسی نہیں۔ ننھے کی سالگرہ ہے میں چاہتی ہوں کہ اسی بہانے ہم سب اکٹھے ہولیں۔ ابھی عثمان کے واپس آنے کی دعوت بھی نہیں دی۔ دو مہینے ہو گئے اسے آئے ہوئے۔

عثمان۔ اماں واپس آنے کی اتنی دیر بعد کیا ضیافت کرو گی۔ جانے دو۔ اب تو پُرانی بات ہو چکی۔

عورت۔ بیٹا تمہارے لئے پُرانی بات ہو چکی۔ ہماری خوشی تو تمہیں دیکھ کر دن دونی ہوتی ہے۔

عثمان۔ (ہنس کر) ذرا اس خوشی کو قابو میں رکھئے نا۔

عورت۔ (مجید سے) بیٹا تم نہیں کچھ عثمان کو سمجھاتے۔ آج کل معلوم نہیں یہ کیوں اتنا بیزار رہتا ہے تمہارا تو آپس میں سگے بھائیوں کا سا پیار تھا۔

عثمان۔ اماں چھوڑو بھی میرے قصے کو۔ ہر وقت میرا ہی ذکر کوئی اور بات کرو۔

عورت۔ بیٹا مجید کوئی غیر تو نہیں۔

مجید۔ تائی جان آج کل میں غیر ہی ہوں۔

عورت۔ یہ کیوں!

مجید۔ انہیں سے پوچھئے۔

(اس وقت دروازہ پھر کھلتا ہے اور ایک خوش قامت اور خوش لباس جوان عورت داخل ہوتی ہے جو اپنے آپ سے بہت خوش ہے۔ آنکھوں میں مسکراہٹ ہے۔ اس کی عمر ۲۰ سال کی ہو گی۔ مجید کے الفاظ وہ سن لیتی ہے)

راشدہ۔ کس بات کی پوچھ گچھ ہو رہی ہے

مجید۔ سلام کہتا ہوں آپا۔

راشدہ۔ (ہنس کر) بڑے بے مروت ہو تم۔ مگر کیا کریں کہنا ہی پڑتا ہے، برخوردار جیتے رہو،

مجید۔ آپ نہ بھی کہیں، میں نے تو ایک خوشگوار فرض ادا کر دیا ہے۔

[illegible]

ایسی اشد ضرورت نہیں کہ ملازمت اور وہ بھی ناپسندیدہ قسم کی ملازمت اختیار کروں۔ مگر ہر کسی کا مجھ سے یہ گلہ ہے کہ ولایت سے کچھ بن کر کیوں نہیں آیا۔ اور اگر فقط پڑھ پڑھا کر ہی آنا تھا تو آتے ہی کسی اعلیٰ درجے پر ملازم کیوں نہیں ہوگیا۔ کیوں بیکار پھر رہا ہوں۔ اور اگر بیکار ہوں تو پشیمان کیوں نہیں۔ اور اگر شرمندہ نہیں تو کوئی کام کیوں نہیں کرتا۔ دن رات پسینہ میں کیوں غرق نہیں رہتا۔ اور پھر تم جانتے ہی ہو اپنی تائی اماں کو اور ہماری آپا کو بیاہی کیا گئی ہیں اور ماں کیا بنی ہیں بس ہر معاملہ میں دخل دینا اور ہر بات پر رائے زنی کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکا ہے۔ اب مجھ سے یہ گلہ ہے کہ میں ان کے تقاضوں کا جواب مبہم الفاظ میں کیوں دیتا ہوں۔

مجید۔ تقاضے!

عثمان۔ (جوش میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھرتے ہوئے) تقاضے ہیں بھائی تقاضے! تمہیں نہیں معلوم۔ بات بات پر جرح، پل پل کے بعد اشارہ۔ اماں تو خیر اتنا نہیں کہتیں مگر آپا نے تو جینا مشکل کر دیا ہے۔ اب مجھ سے یہ شکایت ہے کہ آمدنی معقول ہے تو مرتا ہوں نہیں، شادی کیوں نہیں کرتا۔ میں کہتا ہوں ابھی آمدنی اتنی نہیں۔ اور بھائی بھی ہیں۔ انہیں بھی شاید جنگ کے بعد ولایت بھیجنا پڑے۔ بتاؤ میں کیوں شادی کے جھمیلوں میں پھنسوں۔ کہتی ہیں اگر آمدنی اتنی نہیں تو ملازمت کیوں نہیں کرتے۔ غرض یہ کہ آزاد کیوں ہو۔ جس وقت جی ہو گھومنے کیوں چلے جاتے ہو۔ پھر یہ کہ میرے دوست کیوں مجھ سے آ نا ملتے ہیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ ولایت سے موٹر کیوں خرید لایا۔ اور اگر لے بھی آیا تو اسے اتنا چلاتا کیوں ہوں۔ بند کیوں نہیں کر دیتا اور اگر چلاتا ہوں تو گھر والوں کو روز سیر کیوں نہیں کراتا۔ سیر نہ سہی ان کی بڑی بوڑھی رشتہ دار عورتیں جو انہیں روز ملنے آتی ہیں۔ انہیں رات کے نو نو بجے شہر کے کسی تنگ و تاریک کوچے میں کیوں نہیں پہنچانے جاتا۔ غرض یہ کہ جیتا کیوں ہوں اور اگر جیتا ہوں تو ایسے جینے پر لعنت کیوں نہیں بھیجتا!

مجید۔ (اس غیر معمولی جوش سے متاثر ہو کر) یہ نئی بات سن رہا ہوں۔ تائی اماں سے تو ایسی توقع نہیں اور نہ انہوں نے کبھی تمہیں کسی بات کے لیے تنگ ہی کیا ہے مگر آپا راشدہ مزاج کی کچھ تیز ہیں۔

عثمان (قدرے ٹھنڈا ہو کر) بھائی آپا بے چاری کا بھی اتنا قصور نہیں۔ یہ برادری کی عورتیں جو روز کسی نہ کسی بہانے آتی رہتی ہیں انہیں جینے نہیں دیتیں۔ ہر روز میری شادی کا سوال اٹھا دیتی ہیں۔ بھلا بتاؤ تمہیں خدا کی مار! تمہیں اور کوئی بات نہیں سوجھتی۔ پرائی باتوں میں کیوں دخل دیتی ہو۔

مجید۔ عثمان یہ تو ہماری سوسائٹی میں خلوص کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ جب تک یہ لوگ کرید کرید کر ایک دوسرے کی خانگی باتیں نہ پوچھیں خیال ہوتا ہے کہ رشتہ داروں میں محبت اور ہمدردی غائب ہو گئی ہے۔

عثمان۔ (دیا سگرٹ سلگاتے ہوئے) عجب تماشا ہے۔ ہمدردی کا اظہار کرتی پھریں اور کسی کو دم لینا مشکل ہو جائے۔

مجید۔ مگر یار یہ سمجھ میں نہ آیا کہ تم اتنے پریشان کیوں ہوتے ہو۔ آخر یہ باتیں تو ہر جگہ ہوتی ہی ہیں۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ آدمی جوان ہوا۔ معلوم ہوا کہ کھانا پتیا ہے تو عورتوں کو ایک کی دماغی خارش شروع ہو جاتی ہے۔ جس کا علاج ایک

[illegible]

[illegible]

(۷)

[illegible]

(۶)

[illegible]

([illegible])

[illegible]

(۵)

[illegible]

([illegible])

[illegible]

([illegible])

[illegible]

([illegible])

[illegible]

(۱)

[illegible]

مَارَأَیتُ شَیئًا اِلاَّ رَأَیتُ اللّٰہَ قَبلَہٗ

بجتا ہو ستار، اور مضراب نہ ہو؟ — پھیلی ہوئی چاندنی ہو، مہتاب نہ ہو؟
میں، ہیں نہیں ہو سکتا، نہ ہو تو جب تک — ممکن ہی نہیں، حباب ہو، آب نہ ہو؟

مَارَأَیتُ شَیئًا اِلاَّ رَأَیتُ اللّٰہَ بَعدَہٗ

میرے ہی مکان سے وُہ ناگہ نکلا — سمجھا تھا جسے دُور، وہ ہمرہ نکلا
ہیں محو رہا نفی میں جس کی دن رات — آخر ہیں وہی اِلٰہ اللہ نکلا

مَارَأَیتُ شَیئًا اِلاَّ رَأَیتُ اللّٰہَ مَعَہٗ

یا مظہرِ ذات ہے شعاعِ خورشید — یا نقشِ صفات ہے شعاعِ خورشید
ہر حال میں ہے شانِ معیت ثابت، — خورشید کے سات ہے، شعاعِ خورشید

وہ پردے میں اپنا جلوہ دکھلاتا ہے — تنزیہ کو تشبیہ سے سمجھاتا ہے
اس کو تنہا کسی نے دیکھا ہی نہیں، — جب آتا ہے کسی کے سات آتا ہے

مَارَأَیتُ شَیئًا اِلاَّ رَأَیتُ اللّٰہَ

ہم نے کون و مکاں میں تجھ کو دیکھا — ہر وہم میں، ہر گماں میں تجھ کو دیکھا
ذات اور صفت میں جب کوئی فرق نہیں — جس کو دیکھا۔ جہاں میں تجھ کو دیکھا

احمد حسین امجد

گوئیے شعراء

ردئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ

اے کاش! نظر کبھی اِدھر جا سکتی   اے کاش! کبھی سمجھ یہ سمجھا سکتی
جو شخص بُرا بھلا نہیں گا سکتا   اُس کو کبھی شاعری نہیں آسکتی

شاعر بننا ہے تو خوش آوازی سیکھ   اربابِ نشاط کی سی طنّازی سیکھ
اِس سے پہلے کہ شعر کہنا سیکھے   جا اور باقاعدہ گلے بازی سیکھ

میں ہی کامل نہ تم، یہ کچھ راز نہیں   دونوں صاحب کمالِ ممتاز نہیں
تم میں یہ کمی کہ شعریت سے محروم   مجھ میں یہ کمی کہ ہیں گلے باز نہیں

پوشاکِ ترنّمات کرھتی کیونکر   ندّی موسیقیت کی چڑھتی کیونکر
گر شعر و غنا بہم نہ مل کر بڑھتے   اولادِ "تان سین" بڑھتی کیونکر

جدید شاعری

اذہان دُورنگی کی طرف جانے لگے   یک رنگ لب و لہجہ سے شرمانے لگے
طبعِ شعراء کا دوغلا ہونا تھا   اشعار بھی دوغلے نظر آنے لگے

آزاد انصاری

دیو۔ پہلے دیوتا یعنی غیر معمولی قوائے روحانی اور فوق البشر اوصاف رکھنے والے کو کہتے تھے اب اندر سبھا کا لال دیو اور کالا دیو آپ جانتے ہی ہیں۔ یہی حال، یارِ غار اور قل آعوذی، گُرو گھنٹال، بگلا بھگت، چالاک، شیخی اور مشیخت وغیرہ کا ہے۔ لفظوں کے معنوی تنزل کی اور بہت سی مثالیں ہیں، یہاں اسی قدر کافی سمجھی جاتی ہیں۔

بعض الفاظ اہلِ زبان کی اعلیٰ کلچر کا ثبوت ہیں۔ بھنگی کی افادیت اور نفس کُشی ظاہر ہے۔ اس نے مہذب اور شائستہ جماعت میں مہتر، حلال خور جمعدار اور پہلوان نام پائے۔ نہایت ناکامیاب شخص کو بھتا اور اور کند ذہن اور ناسمجھ کو خوش فہم کہا گیا۔ ایسے شخص کو جو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے ہر شخص کے تمسخر اور پھبتی کا شکار ہو نقلِ محفل کہا گیا۔ بحث یا معاملے میں فریقِ مقابل کے نامعقول عذر کو عذرِ لنگ نام دیا گیا۔ دہات کے رہنے والے کو اس کی حیثیت کی تمیز کے بغیر چودھری کہتے ہیں اور کمہار کو بھگت جی اسی نوع میں آتا ہے سنگترہ کو رنگترہ اور شراب کو رام رنگی کہنا۔

لفظ رسوم کا آئینہ دار۔ راجپوتوں میں رسم تھی جب کوئی سخت کام یا مہم پیش آتی تو سب سرداروں کو جمع کیا جاتا۔ وہ ایک حلقہ باندھ کر بیٹھتے بیچ میں پان کا ایک بیڑا رکھ دیا جاتا۔ اس کام یا مہم کی دقتیں وغیرہ جتائی جاتیں اور دعوت دی جاتی کہ جو رضا کاری کے طور پر اس کام کا ذمہ لے وہ سامنے آئے جو شخص اس کام کا ذمہ لیتا وہ اس بیڑے کو اٹھا لیتا۔ اب بیڑا اٹھانا کے معنی قرار پائے کسی مشکل کام کے سرانجام کی ذمہ داری۔ مُردے کے پھول، جوہر رجیوہر، اور ساکھا وغیرہ اسی ذیل میں آتے ہیں۔

لفظوں کا اپنی اصل چھپانا۔ بعض لفظوں کی اصل دریافت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے جس خاندان کے وہ ظاہر معلوم ہوتے ہیں، حقیقت میں اس سے نہایت مختلف الاصل ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں مقیش کو لیجئے۔ لغات میں اس کے معنی یہ دئے گئے :-

"مقیش۔ ع۔ وہ شے جس پر چاندی یا سونے کے چپٹے اور باریک تار لپٹے ہوں چاندی کی جوڑی۔ چاندی کے تار۔"

ہماری زبان میں محض چاندی یا سونے کے تاروں کو مقیش کہتے ہیں۔ یہ لفظ ٹھیٹ عربی نہیں معرب تسلیم کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس کی شکل عربی الفاظ کی سی ہے۔ اُردو لغات میں مقیش کو اُردو لکھا ہے۔ وہ اُردو ہو یا عربی یا معرب اس کی اصل چھپی ہوئی ہے۔ اس کا ماخذ اس کے وجود سے ظاہر نہیں ہوتا۔ اسی کو میں اصل چھپانا کہتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ سنسکرت میں مکیش آفتاب کا نام ہے۔ اور کیش بالوں کو کہتے ہیں دونوں لفظوں سے مرکب کے معنی ہوئے سورج کی کرن۔ جب مقیش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر ایک طرف سے ڈورے میں گتھ دیتے ہیں اور پوشاک کے حاشیہ پر باہر کو نکلا ہوا ٹانک دیتے ہیں۔ تو مسالہ کی اس چیز کو کہتے بھی کرن ہیں یہ خفا اس وقت ہوتی ہے جب ایک لفظ اپنے وطن سے باہر اور دُور چلا جاتا ہے ایسا ہی ایک لفظ کُتن ہے۔ اہلِ ہند نے سب سے پہلے روئی کات کر کپڑا بنایا۔ یہ کُتن عرب میں جاکر قُطن بنا اور یورپ میں جاکر کاٹن۔

آپ نے دیکھا کہ لفظوں کی سوانح عمری کتنی دلچسپ ہے۔ لیکن یہ تحقیق دقت طلب بھی ہے۔ اس بارے میں جس قدر دقتِ نظر اور احتیاط سے کام لیا جائے کم ہے۔

کیفی

ہیں تاریخی شہرت رکھتا ہے اس نام سے نسبت پا کر عدل کی صفت اور بین ہوگئی۔

(۳) سارنگی خود بول رہی ہے کہ میں سارنگ دیو کی دست پروردہ ہوں۔

(۴) ایک خاص وضع کی جوتی جو شاہزادہ سلیم سے منسوب اور دوسری وضع کی جوتیوں سے متمیز ہے۔

(۵) جہانگیری۔ پونچے کا زیور جو ملکہ نورجہاں نے اختراع کیا اور جہانگیر بادشاہ کے نام سے منسوب کیا۔

(۶) نادر شاہ کی کڑی سیاست۔ استبداد اور جلال مشہور ہیں۔ اِس شخصیت سے منسوب ہو کر گنجفہ میں نادری اور سیاست میں نادری حکم یعنی اٹل حکم۔ اور نادر گردی یعنی استبداد۔ یہ مرکب لفظ وضع ہوئے۔

(۷) مرہٹوں کی حکومت میں دفتر کے پیچیدہ دستور العمل کی وجہ سے جسے آج کل کے زمانے کا لال فیتا سمجھئے معاملات کے فیصل ہونے میں دیر لگتی تھی اور محکمہ کی رپوٹوں میں قلم بہت گھسایا جاتا تھا اس وجہ سے مرہٹی گھس گھس کا وجود ہوا۔ یعنی معاملات کے طے ہونے میں غیر معمولی اور بے ضرورت دیر لگ

(۸) مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد پنجاب میں طوائف الملوکی، بے ضابطگی اور بدانتظامی کا غلبہ رہا۔ اس سے سکھا شاہی کا مرکب پیدا ہوا

عام لفظ پارس کا اثر قبول کرتے ہیں۔ عربی میں مدینہ محض شہر کے معنی رکھتا ہے چنانچہ اسی مدینہ سے مدنیت اور تمدن مشتق ہیں لیکن جب سے پیغمبر اسلام مکہ سے ہجرت کر کے اس شہر میں پناہ گزیں ہوئے اور آخر تک وہیں رہے لفظ مدینہ کو علَم کا امتیاز حاصل ہوگیا اور اب مدینہ کہیں یا مدینۂ منورہ مُراد وہی خاص شہر ہوتا ہے۔ یہ شرف اس لفظ کو محض پیغمبر اسلام کی قیام گاہ ہونے سے نصیب ہوا۔ اسی کو پارس کا اثر کہا گیا ہے۔ لوہا پارس پتھر سے چھُو کر سونا بن جاتا ہے۔ یہ تو محض افسانوی گپ ہے مگر آپ دیکھتے ہیں کہ ایک لفظ کسی ممتاز شخصیت کی قربت سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔

یہی حال گنگا لفظ کا ہے۔ ویدک عہد میں گنگا صرف دریا کا نام تھا۔ آریہ لوگ جب ہندوستان میں پھیلے اور ان کو عروج ہر قسم کا حاصل ہوا اور انہوں نے ایک خاص دریا کے پانی کی جانچ کی جو ہردوار کے مقام پر میدان میں داخل ہوتا ہے تو گنگا صرف اسی ایک دریا کا نام رہ گیا اور مدینہ کی طرح علَم کی حیثیت اس کے حصے میں آگئی۔

یہی حال حج اور جاترا کا ہے: دونوں کے معنی تھے جانا، سفر کرنا۔ مگر اب یہ لفظ ایک خاص معنی کے حامل ہیں جس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ یہی کیفیت شہید، عید، دسہرہ اور پیغامبر جیسے لفظوں کی ہے۔ ابھی جو بیان ختم ہوا ہے اُسے لفظوں کا ارتقاء سمجھنا چاہئے۔ انسانوں اور قوموں کی طرح لفظ کو بھی تنزل کا نشانہ بنتا پڑتا ہے۔

لفظوں کا تنزل۔ بعض لفظ اپنے عظیم الشان بلکہ مقدس مقام سے گر کر بالکل مختلف بلکہ ذلیل معنی میں استعمال ہونے لگتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

لن ترانی۔ یہ کلمہ خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ کی جانب خطاب ہوا تھا مگر اب بے جا شیخی اور ڈینگ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

صلوٰة۔ اس لفظ کے معنی ہیں رحمت، درود اور یہ لفظ پیغمبر اسلام کے نام سے خاص تعلق رکھتا تھا اور رکھتا ہے لیکن اُردو میں اس کے معنی ہوئے بُرا بھلا کہنا، گالی۔

رام کہانی۔ نام تھا سری رام چندر جی کی زندگی کے حالات کا۔ اب فضول طول طویل کلام کے معنی میں یہ مرکب لفظ استعمال ہوتا ہے۔

کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اہل ہند جہاز رانی اور سمندر کے سفر سے بیگانہ نہیں تھے اگرچہ اس وقت وہ بحری قوم نہیں ہیں۔ آپ نے دیکھا کیونکر لفظ نے مردہ تاریخ کو پھر زندہ کر دیا۔ لانچ Launch کا لفظ بھی پرتگالی مشرق سے یورپ کو لے گئے۔ میرا خیال ہے کہ بیچ Beach کا لفظ بھی ہندوستان سے یورپ گیا۔ بیچ اس ریتیلے میدان کو کہتے ہیں جو ساحل اور سمندر کے بیچ میں واقع ہو۔

الفاظ کون بناتا ہے۔ عالم اصطلاحیں گھڑتا ہے۔ ادیب محاورے بناتا ہے۔ شاعر صنائع بدائع کی پیدائش کا سبب ہوتا ہے لیکن عام الفاظ، عام لوگ بناتے ہیں۔ ان میں بڑا حصہ اہل حرفت کا ہے ان کا تصرف کا سلیقہ اور تخلیق لفظ کی قابلیت حیرت انگیز ہے 'بسولی' درانتی، دریسی، 'دوفٹا'، کھڑکی، نلائی، گڈائی، آری، رندہ، کھرپا، کرنی، یہ سب لفظ ثقات یا ادیبوں یا شاعروں نے نہیں پیدا کئے بلکہ اُن لوگوں نے پیدا کئے جن کے پیشے میں ان کی ضرورت تھی۔ سپاہی کے ایک اور اوزار 'تلوار' کو لیجئے۔ اصل میں یہ "تزوار" تھا تزآر درخت کو کہتے ہیں۔ پہلے درخت کاٹنے کو ایک اوزار بنایا گیا اور "تزور" کی نسبت سے اسے تزدار کہنے لگے۔ پھر اس سے جانور بھی مارنے لگے۔ رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے وہ اوزار جو درخت کاٹنے کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔ سپاہی کا نہایت کارآمد ہتھیار بن گیا۔ اسی طرح بہت سے لفظوں کی سوانح عمری مرتب ہو سکتی ہے۔ لفظیت اور معنویت کا مطالعہ اور تحقیق [illegible] کے علاوہ لسانیات کی جان ہے۔ بھادوں کی سہانی پھوار کو دیکھ کر انسان نے اپنی تفریح کے لئے فطرت کی وارفتگی اور غیر مستقل مزاجی سے مقابلہ کیا خزانہ اور مال سے کام لیا جس کے نتیجے کو وُہ پھوارہ کہتا ہے اب وہ جب چاہتا ہے۔ پھوار کے مزے لوٹتا ہے۔ فارس کی زبان میں 'پھ' نہ تھی' فوارہ" کہنے لگے۔

جاپانی میں بندہ ۔ لفظ اپنے ماخذ کی تحقیق سے ظاہر کرتے ہیں کہ وُہ اپنے ساتھ کیا کیا لائے جاپان کی زبان میں ہندوستانی زبان کے الفاظ کا وجود اس امر کی خبر دیتا ہے کہ جاپان کی کلچر ہندوستان کی کلچر سے کہاں تک متاثر اور مستفید ہوئی۔ بہت سے لفظ ہمارے وطن کے لہجے کے خفیف تغیر کے ساتھ جاپانی میں موجود اور اپنائے ہوئے ملتے ہیں ان میں سے ایک لفظ بندہ ہے جو جاپانی خط کے آخر میں اپنے نام کے پہلے لکھتا ہے۔ جیسا کہ ہندوستان میں بڑوں کے نام خطوط کے بارے میں اب تک کم و بیش دستور ہے[1]۔

لفظوں پر ذی رسوخ ناموں کا تاریخی اثر ۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عظیم الشان ہستی کی نسبت سے منسوب ہو کر ایک لفظ کے معنی متاثر ہوتے ہیں جیسے (۱) جدھشٹر راستبازی (۲) نوشیروانی انصاف (۳) سارنگی (۴) سلیم شاہی (۵) جہانگیری (۶) نادری۔ نادری حکم۔ نادر گردی (۷) مرہٹی گھس گھس (۸) سکھا شاہی وغیرہ۔

تشریح :- (۱) پانڈوں میں بڑا بھائی جدھشٹر راست بازی اور سچ بولنے کے لئے مشہور تھا۔ جب یہ صفت ہستی سچائی کے ساتھ مربوط ہوئی تو اس لفظ کے معنی میں بہت ترقی ہو گئی۔

(۲) عدل یا انصاف ہمیشہ اعلیٰ صفات سمجھے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ خدا کے ناموں میں 'نیا نیکاری' کا لفظ داخل ہے نوشیروان عدل گستری

[1] مسٹر جنجیرو تاکوکوشو کا مضمون۔ رسالہ ینگ ایسٹ مطبوعہ ٹوکیو بابت اپریل ۱۹۲۶ء میں

لفظ

جس طرح حرف صَوت کی نمائندگی کرتا ہے لفظ جذبات و احساسات اور خیالات کی نمائندگی کرتا ہے لفظ کے اجزائے ترکیبی حرف ہیں اور زبان کے اجزائے ترکیبی لفظ ہیں۔

لفظ کی اہمیت۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لفظ "کُن" سے یہ دُنیا یہ تمام کائنات پیدا ہوئی۔ بتایا جاتا ہے کہ لفظ "آدم" کی عظمت اور برکت بیان سے باہر ہے۔ یہ ذکر اس غرض سے کیا گیا ہے کہ "لفظ" محض لفظ کی اہمیت پڑھنے والوں کے ذہن پر نقش ہو جائے۔ لفظوں سے عبارت اور عبارتوں سے ادب کی تشکیل ہوتی ہے، لفظ ہی زبان کا سرمایہ اور مُول ہوتے ہیں، لفظوں سے ایک زبان اور ادب کا درجہ قائم ہوتا ہے، انسانوں کی طرح لفظوں پر بھی جوانی، بڑھاپے اور موت کا عمل ہوتا ہے، چنانچہ لفظ پیدا ہوتے ہیں جوان ہوتے ہیں سٹھیاتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔ زبان میں رائج ہونا لفظ کی جوانی ہے کم استعمال میں آنا اُس کا بڑھاپا ہے اور متروک ہو جانا اُس کی موت ہے۔

علمِ ادب کی بارہ قسموں میں اگرچہ اول نمبر علمِ لغات کو دیا گیا ہے لیکن متقدمین کے نزدیک علمِ لغات کی ہستی لغت یعنی لفظ اور اُس کے معنی تک محدود تھی، اس کی صرفی اور صوتیاتی حیثیت کی طرف برائے نام توجہ تھی۔ ایسے لفظ بہت سے ہیں جو اپنی تاریخ میں اپنا شجرۂ نسب پوشیدہ رکھتے ہیں۔ بہت سے زمانے کے انقلابوں اور قوم کے سانحوں کی تواریخ کے امانت دار ہیں بہت لفظ ایسے ہیں جو ایک قوم کی سیاسی، اخلاقی یا معاشرتی ترقی یا زوال کی روئداد اپنے میں لئے ہوتے ہیں۔ ان سب امور کے دفتر کو فلسفۂ لغات کہنا درست ہوگا۔ آگے چل کر ان امور کے زیرِ نظر لفظ کی حیثیت سے بحث کی جائے گی یہاں اُردو کے الفاظ کو ادبی اور تواریخی روشنی میں دیکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

لغات کی اہمیت۔ دُنیا کو دُون اور ہیچ اور پنج روزہ کوئی کچھ ہی کہے۔ لغات کی ایک مکمل کتاب کو اس کی سوانح عمری سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ کوئی چیز کوئی سانحہ اور واقعہ ایسا نہیں ہوتا جو اُس وقت ظہور میں آچکا ہو اور اس کتاب میں درج نہ ہو۔ اگر ایک قوم کی تاریخ کے دفتر فنا ہو جائیں اور اس کی زبان کا لغت موجود ہو تو اس کی مدد سے اس قوم کی تاریخ پھر مرتب ہو سکتی ہے مثال کے طور پر ایک لفظ "ناؤ" کو لیجئے۔

"ناؤ" پانی میں چلنے والی سواری کو ہماری زبان میں کہتے ہیں۔ فارسی میں بھی دریائی اور سمندری سواری کا نام ہے۔ وہاں واؤ اُڑا کر ناخدا بنا لیا۔ ناؤ خدا بھی فارسی ادب میں آیا ہے آج کل ہندوستانی سمندری قوم نہیں ملنے جلتے اور نہ وُہ مغربی نفسِ معنی میں سمندری قوم ہیں ہی۔ لیکن یہی ہندوستانی "ناؤ" ہند کے سمندروں سے چل کر مغرب میں پہنچی اور وہاں اس نے nautical اور navigation اور navy اور nausea پیدا کئے۔ ہومر جہاز کو naus کہتا تھا۔ ناؤ جیسی ایک اور آبی سواری کو ہمارے ہاں بجرا کہتے ہیں اس لفظ سے اٹلی کا [illegible] اور لاطینی [illegible] بنا اور [illegible] کی اصل بھی یہی لفظ بجرا بتایا جاتا ہے۔ پس ناؤ اور بجرا یہ دو لفظ اس امر کے ثابت

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible] | [illegible]

اندھیر نگری

شاعری نظموں کے کارن اماں بی دُکھ سہتی ہیں ۔۔۔ واقف ہیں خاموش فضا میں فکر کی دھاریں بہتی ہیں
دن بھر گھر کے کام کاج میں دُور دُور ہی رہتی ہیں ۔۔۔ لیکن رات کو پوتوں[ع۱] سے روز ایک کہانی کہتی ہیں

جس میں اکثر کسی بادشاہ کی سات بیٹیاں ہوتی ہیں

بادشاہ بیٹے کی خاطر جیتے جی مر لیتا ہے ۔۔۔ دوا، دُعا، تعویذ اور گنڈے سبھی جتن کر لیتا ہے
بیگم سے ہر مُلّا "سیانا" نذر پیٹ بھر لیتا ہے ۔۔۔ پہلا مُرغ و مُشک دوسرا "گھنٹا" (رشوت کا بچہ) "گوگر" (گوگل) لیتا ہے

قسمت دُور سے ٹھینگا دکھلاتی ہے اُمیدیں روتی ہیں

بادشاہ اِن ساتوں سے کرتا ہے کسی دن کوئی سوال ۔۔۔ یا یہ حکم کہ لائے کوئی "امرت" اور جائے پاتال
یا دشمن کے ہاتھوں تخت و تاج و حرم سرا پامال ۔۔۔ اَدَل بَدَل کر وہی مضامیں وہی تخیّل وہی مآل

القصہ ہر روز امّاں بی پوتوں کو سُلا کر سوتی ہیں

مُجھ کو یہ یکساں افسانے پہلے پہلے بار ہوئے ۔۔۔ پھر آہستہ آہستہ اُس عادت سے دو چار ہوئے
جس کے ہوتے مُجھ کو نوبت نقّارے بیکار ہوئے ۔۔۔ شور و غل سے "قطعِ سماعت" (قطعِ نظر کی وضع پر) جب چاپا اشعار ہوئے

وہ اشعار کہ جن کی خوشبوئیں کانٹے سے چبھوتی ہے

آج رات جب دادی کو اُن کے پوتوں نے گھیر لیا ۔۔۔ یہ بستر پہ چڑھ بیٹھا تکیوں کا اُس نے ڈھیر لیا
ٹھہرو۔ کہہ کر موصوفہ نے "قِتّی" کا رُخ پھیر لیا ۔۔۔ کھا کر پان۔ فسانے کا عنوان غضب اندھیر لیا

وُہ اندھیر کہ جس کا مُنہ ارواحِ خبیثہ دھوتی ہیں

بولیں۔ نام کہانی کا ہے "اندھی نگری، چوپٹ راجے" ۔۔۔ اس نگری میں بھولے بسرے ایک گرو و چیلے آئے
سُنیں صدائیں۔ ٹکے سیر کوئی بھاجی لے کوئی کھا جا کھائے ۔۔۔ چیلے اِس من بھاتی ریت پہ ریجھے اور گرو گھبرائے

بولے جلدی بھاگو "موجیں" یاں دریا کو ڈبوتی ہیں

ع۱۔ میرے بھتیجے
[illegible]

[illegible]

آنکھ اُٹھا کر تمہارے بھائی کو نہ دیکھوں گی۔ حیا ہماری جان ہے۔ جب شہر والیاں دیدے پھاڑ پھاڑ کر ہمارے مردوں کو دیکھتی ہیں تو ہم لوگ دل ہی دل میں کانپ جاتے ہیں۔ مجھ سے تو تم نے پوچھ لیا۔ جس سے تمہاری نسبت ٹھہری ہے اُس کا نام کیا ہے کیسا ہے؟

خادمہ۔ اشرف، اکھڑ سا ہے مگر یہ سمجھ لو کہ ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے ہیں۔ آج اُسے خط لکھوں گی۔ دہلی گیا ہوا ہے۔

لاڈو۔ خط لکھتے ہوئے تمہیں حجاب سا معلوم نہیں ہوتا؟

خادمہ۔ ہرگز نہیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ کبھی وہ مجھے کہہ لیتا ہے کبھی میں کچھ سُنا دیتی ہوں۔ آج تو تمہاری بابت لکھوں گی۔

لاڈو۔ بڑی دیدہ دلیر ہو۔

خادمہ۔ خدا حافظ لاڈو

لاڈو۔ اللہ بیلی، خادمہ

(۵)

جب خادمہ گھر پہنچی تو عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی۔ ایک طرف تو اس کا دل لاڈو کی جاذب شخصیت کا قائل تھا۔ حیران تھی کہ گاؤں کی ان پڑھ کمسن اور یہ غرور و وضع داری۔ دوسری طرف اسے اپنے نقطۂ نگاہ کا پاس تھا کہ اگر رسوم کی قیود توڑی نہ جائیں تو دُنیا چلے کیسے؟ جب خادمہ پر اس قسم کی ذہنی جھلاکا دار ہوتا تو ہمیشہ اپنے منگیتر کو خط لکھنے بیٹھ جاتی۔ اکثر خط تو لکھ کر پھاڑ دئے جاتے تھے مگر اس بار اُس نے یہ خط ڈاک میں ڈال ہی دیا۔

خط

اشرف امیرے اشرف

جہالت کا ایمان ہٹلر کے فولادی tanks سے زیادہ مضبوط اور زیادہ خطرناک ہے۔ تہذیب تعلیم کے تلعے لاڈو کے ایمان کی تاب نہیں لا سکتے۔ سر ہو رہے ہیں وہ نصب العین جس پر تمہیں اور مجھے اس قدر فخر تھا، لاڈو کی گفتگو کے سامنے پوچ ہیں۔ تمہارا اور میرا دعویٰ یہ تھا کہ گاؤں اور شہر ایک جان دو قالب ہو سکتے ہیں مگر مجھے تو سو سال تک بھی یہ بات ممکن نظر نہیں آتی اور قصور سارا ہم شہریوں کا ہے۔ انگریزی تعلیم اور تمدن نے گاؤں اور شہر کے درمیان خلیج نہیں سو سمندر حائل کر دیئے ہیں، شہر والے کتابوں اور کتابوں کے مندرجہ نظریوں کے زور سے ان سمندروں کو خشک کرنا چاہتے ہیں۔ ایں خیال ست و محال ست و جنوں۔ کاش تم یہاں ہوتے۔ کس حقارت سے اور صحیح حقارت سے لاڈو دیہات سدھار کے لئے کارکنوں کے لتے لیتی ہے۔ کیا اس سے ملنا چھوڑ دوں، مگر اشرف اشرف!! میں جو تندرستی اور توانائی کا شہر بھر کے لئے نمونہ ہوں لاڈو کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ چال اس کی غضب کی ہے، طاقت میں مجھ سے دو نی۔ قد میں مجھ سے دو انچ اونچی، اپنے ایمان کی حدود کے اندر قطعی آزاد اور نڈر، شہر والے تو پچاس سال تک ایسی لڑکی پیدا نہ کر سکیں گے۔ کیا ہی شاندار ماں بنے گی ہمیں شرم آنی چاہیے کہ ایسی شیرنی کو تعلیم کے چڑیا گھر میں بند کرنے کی کوشش کریں۔ سنو اشرف! لکھن پور میں اصلاح کی کوشش جرم ہے، ہم کچھ اُن سے سیکھیں تو بہتر۔ اُن کو کچھ سکھانے کے قابل ہم ہرگز نہیں کیسی مجھے شکست ہوئی اور کہاں سے ہوئی، سارا میرا غرور خاک میں مل گیا۔ اُس خاک میں جو لاڈو کو قدرتی طور پر عزیز ہے۔ باغ کی تتلیوں کا جنگل کی ہرنیوں سے کیا مقابلہ۔

خادمہ

ڈو۔ ہم زمین کے کیڑے ہیں مگر فرق یہ ہے کہ کتابیں بدلتی
رہتی ہیں زمین نہیں بدلتی اور ہم زمین کے کیڑے نہیں بدلتے
اڑے ہیں اپنی باتوں پر۔ جب تک آسمان میں پانی ہے اور
زمین پر جاٹ کی محنت ہے کچھ نہ کچھ پیدا ہوتا ہی رہے
گا۔ کوئی آئے کوئی جائے ہم ہیں اور ہماری زمین ہے۔

ادمہ۔ خدانخواستہ میں یہ تو نہیں کہتی کہ آپ بدلیں یا زمینداری
چھوڑ دیں۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ گھر اچھے صاف ہوں، لباس
صاف ہوں، کچھ تعلیم کا چرچا ہو۔

ڈو۔ ہم اگر شہر میں جاکر وہاں کی موٹی موٹی بیویوں سے کہیں کہ
چکی پیسو، کنوؤں سے پانی نکالو، دودھ خود دوہ کر بچوں کو
گھی مکھن پر پالو۔ زیور زیادہ نہ پہنو، گاڑیوں میں نہ بیٹھو تماشوں
پر نہ جاؤ تو کیا آپ پسند کریں گی؟

ادمہ۔ میں تو پسند کروں گی مگر شہر والیاں ہرگز آپ کی اچھی
نصیحت پر عمل نہ کریں گی۔

اڈو۔ یہی حال ہمارا سمجھ لو۔ جب شہر سے ساڑھیاں پہنے گاؤں
میں سلائی سکھانے اور چرخہ چلانے کا سبق دینے کچھ بھدی
بھدی عورتیں آتی ہیں تو جی میں آتا ہے کہ اپنے کتے اُن پر
چھوڑ دوں۔ مگر کون اپنے کتوں کا منہ پلید کرے۔ لیکن
آپ کو چاہئے کہ کم از کم چار سمجھدار انسانوں کو یہ تو سمجھا دیں
کہ گاؤں والوں پر اور ظلم کیا کم ہیں کہ اب ہر تیسرے چوتھے
دن شہر کی کائیں کائیں والیاں دیہات سدھار کے نام
پر خواہ مخواہ ہماری پُر لطف زندگی کو بدنام کرتی ہیں۔ کوئی
مہتروں کی جمعدارنی بنتی ہے، کوئی جلاہوں کی سرداری کی
دعویدار ہوتی ہے۔ کوئی کہتی ہے چرخہ چلاؤ۔ کوئی کہتی
ہے کہ مزارع لگان نہ دیں۔ کوئی کہتی ہے زمین سب بانٹ
دو۔ کسی کے پاس چھ سات گھماؤں سے زیادہ نہ ہو۔ کیا
شہروں میں صرف پاگل آباد ہیں۔

خادمہ۔ میں تو پاگل نہیں ہوں۔ مجھے تم جیسی بہن نہ سہی چند
دن کی سہیلی مل گئی۔ سو اب جاتی ہوں۔

لاڈو۔ میرا خیال ہے کہ اب تم یہاں کم آؤ گی۔

خادمہ۔ تم نہ بھی بلاؤ گی تو بھی تمہاری شادی پر تو ضرور آؤں
گی اور اگر تمہارے باپ نے اجازت دی تو خود تمہیں
دلھن بناؤں گی۔

لاڈو۔ دیکھا جائے گا مگر ایک بات بتاؤ۔ سب گاؤں
والے کہتے ہیں کہ میری زبان بہت چلتی ہے۔ کہتے ہیں کہ
نمبردار کے لاڈ سے میرا سر پھر گیا ہے۔ مگر سارے
گاؤں میں اپنی عمر کی لڑکیوں سے دُگنا کام کرتی ہوں۔ کیا
سچ مچ میں بہت بکّی ہوں؟

خادمہ۔ ہرگز نہیں۔ تم تو بہت پیاری باتیں کرتی ہو۔ اگر
تم شہر میں ہوتیں تو لونڈے پاگل ہو جاتے۔

لاڈو۔ میں پاگلوں سے دُور ہی بھلی۔ ارے میرا بھائی آگیا۔
اب تمہیں کہاں چھپاؤں۔

خادمہ۔ میں کیوں چھپنے لگی اور میں تو جا رہی ہوں۔

لاڈو۔ میرا بھائی تو تمہاری طرف دیکھے گا نہیں۔ تم کیا
اسے دیکھو گی؟

خادمہ۔ جی چاہا تو دیکھ لوں گی۔

لاڈو۔ یہ بھی ہم میں تم میں فرق ہے۔ ہماری تربیت یہ
ہے کہ اگر ساری عمر بھی تمہارے گھر میں آتی جاتی رہوں تو

لاڈوں

لاڈو۔ اگر اُن آپ کی مُنہ بولی بہنوں کو کوئی غیر مرد ستائے تو کیا آپ کے بھائی جا کر لڑیں گے؟

خادمہ۔ نہیں۔

لاڈو۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن ہماری وضع یہ ہے کہ اگر میں آپ کو اپنی زبان سے ایک دفعہ بہن کہہ دوں تو میرا والد آپ کے والد کا بھائی۔ میرے بھائی آپ کے بھائی اور میری زندگی تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ بکھن کی اولاد اس بات میں مشہور ہے کہ چور ہیں مگر بے ایمان نہیں۔ شہر والے ہر آئے گئے کو بھائی بہن بنا لیتے ہیں۔ ہم لوگ سو دفعہ سوچ کر ہزار دفعہ آزما کر پھر یہ لفظ زبان سے نکالتے ہیں۔ اگر میں آپ کو بہن کہہ دوں تو آپ کے لئے بڑی مشکل ہو جائے۔ ہم لوگ چور آپ لوگ وکیل۔ یہ رشتہ کیسے نبھے۔

خادمہ۔ مگر اب تو تم چوری نہیں کرتے ہو اور میری نظروں میں تو تم ہزاروں سادھوؤں سے اچھے ہو۔ بات کے پکے ہو۔ مقروض نہیں ہو۔ آن رکھتے ہو۔

لاڈو۔ ان سے بھی اچھی بات یہ ہے کہ پانچ پشتوں سے آج تک بکھن کی اولاد میں سے کسی مرد نے پرائی عورت کو نگاہِ بد سے نہیں دیکھا۔ ہمارے ہاں اس بات کی بہت سخت قسم ہے اور اگر شبہ بھی ہو جائے تو اس مرد کا گاؤں میں زندہ رہنا مشکل ہے۔ اسی وجہ سے بکھن کی اولاد کا میل کسی اور سے ہونا مشکل ہے۔ ہم جو کہتے ہیں اسے اپنی عقل کے مطابق نباہتے ہیں۔ ہم لوگوں کو اپنے بزرگوں کے چور مشہور ہونے سے ذرہ برابر بھی عار نہیں بلکہ ہمارا فخر یہ ہے کہ دشمن کی چوری کرنا عیب نہیں مردانگی ہے۔ چوری ہمارے مردوں نے چھوڑ دی ہے مگر چوری کا ہنر ہم نے ہاتھ سے نہیں گنوایا۔ ہمارے بزرگ اب بھی ہر نوجوان کو پوری طرح یہ فن سکھاتے ہیں۔ میرے باپ نے خود ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ جس کی کہو چوری کرا دوں۔ لڑکیوں کو لاٹھی چلانا سکھایا جاتا ہے۔ میں اکیلی شہر کے دس آدمیوں کا لاٹھی سے مقابلہ کر سکتی ہوں۔ مگر آپ کو اس دُنیا کا کیا پتا۔ آپ مُنہ دُھلانا جانیں۔ خاک سے بچیں۔ بیماری سے ڈریں۔ کُتا بھونکے تو گھوڑے سے گر پڑیں۔ بہن بننا ہے تو لاٹھی چلانا سیکھو۔

خادمہ۔ لاڈو سچ کہتی ہو۔ میں تمہاری بہن بننے کے قابل نہیں۔

لاڈو۔ میں تمہیں دادا لدّھو کی باتیں سناؤں تو بڑی حیران ہو۔

خادمہ۔ ضرور سناؤ۔

لاڈو۔ دادا لدّھو بڑا گرانڈیل جوان تھا اُونچائی میں تو اس کے برابر ارد گرد کے چالیس پچاس گاؤں میں کوئی نہ تھا۔ سکھوں کا راج تھا۔ اتفاق سے سکھوں کا توپ خانہ، جس میں زیادہ تر مسلمان تھے، ہمارے گاؤں کے پاس اُترا۔ گاؤں کے مزارع ڈر کے مارے جنگل میں جا چھپے۔ لدّھو کی عمر اُس وقت تیس سال کی تھی۔ دو بڑے بھائی، دو بھتیجے اور خود لدّھو بکھن کی اولاد تھی۔ یہ گاؤں میں رہے۔ توپ خانے والے لوٹنے کے لئے آ گئے۔ لدّھو نے بڑے دونوں بھائیوں سے کہا کہ بھتیجوں کو لے کر بھاگ جاؤ۔ میں سمجھ لوں گا۔ وہ لدّھو کا کہنا مان کر کھسک گئے۔ اتنے میں توپ خانے کے دس جوان تلواریں تانے کچھ سوار کچھ پیادہ گاؤں کی طرف بڑھے۔ لدّھو نے اپنی بہتر سے بہتر لاٹھی سنبھالی۔

گڑا دبچے ایک اور سوراخ میں تھا اور دوسری جست میں وُہ کوٹھے پر دندنا رہی تھی۔

لاڈو۔ یوں چڑھو نا۔

خادمہ۔ نہ بہن مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔

لاڈو بڑی بے تکلفی سے اُسی طرح اُتر آئی کپڑے دیوار کی مٹی سے ضرور آلودہ ہوئے مگر اس نے جھاڑنے کا خیال تک نہ کیا۔ کھیل کی خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

لاڈو۔ آؤ گُھٹر گُھٹر کھیلیں۔

خادمہ۔ وُہ کیا ہوتا ہے؟

لاڈو۔ میں تمہیں گُھٹر بنا کر کندھے پر لاد کر چلوں۔ تم گرنے کی کوشش کرو۔ اگر تم گر جاؤ تو میں ہار گئی۔ اور اگر دس قدم تک تمہیں میں نے گرنے نہ دیا تو تم گُڑ کی بھیلی ہار گئیں۔

خادمہ۔ منظور

لاڈو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ خادمہ کے پیچھے آکر جھک کر اس کے ہاتھ پچھلی طرف تھام ایک ریلے میں اسے کندھے پر ایسے لاد لیا کہ خادمہ کی کمر ٹھیک شانے پر منہ آسمان کی طرف ہاتھ دونوں قابو میں۔ خادمہ نے لاکھ جتن کئے کہ کسی طرح کروٹ لے کر گر سے مگر لاڈو بے تحاشا اُچھلتے ہرنی کی طرح دس نہیں پندرہ قدم بھاگ نکلی۔ پھر خود ہی کہنے لگی۔ اچھا تم مجھے اتنا ہی فاصلہ اٹھا کر لے چلو میں گروں گی نہیں۔ خادمہ اُٹھا تو لائی مگر کمر دُہری ہوگئی۔ حالانکہ خادمہ خود کافی بلند قامت تھی مگر لاڈو سے دو انچ چھوٹی تھی اور اس کی ہڈی بہت وزنی تھی

یہ کھیل ختم ہوا ہی تھا کہ جلاہے کی عورت روٹیاں لے آئی

لاڈو۔ دادی! مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔ جلدی نکالو۔

بڑھیا جُلاہی نے چارپائی کھینچ کر اس پر دسترخوان بچھا دیا۔ لاڈو ساگ کا سالن لے آئی۔ جُلاہی نے دو کٹورے لسّی کے رکھ دئے خادمہ نے حلوا اور انڈے کی (Sandwiches) اور چار کیلے چن دئے۔ سرہانے کی طرف لاڈو نے خادمہ کو بٹھایا۔ پائنتی کی طرف لاڈو بیٹھی۔ جلاہی رومال ہلاتی رہی کہ مکھیاں نہ آئیں اور کھانا شروع ہوگیا۔

خادمہ نے بیسن کی روٹیوں کی تعریف کی۔ لاڈو نے حلوے کو بہت پسند کیا اور دس منٹ میں یہ کھانا ختم ہوگیا۔ خادمہ نے خلافِ معمول لسّی پیٹ بھر کر پی۔ لسّی تھی بھی بہت اچھی۔ تصوّر میں اپنی میز کے تکلّف اور اس چارپائی کی سادگی کا مقابلہ کرتی رہی اور دل ہی دل میں کہہ اُٹھی کہ جہاں تک مزے کا تعلق ہے یہ بیسن کی روٹی کسی مُرغ پلاؤ سے کم نہیں۔

کھانا ختم ہوتے ہی لاڈو نے جلاہی سے کہا

لاڈو۔ دادی! بہت ہی مزہ آیا۔ یہ روٹیاں تم بچوں کے لئے لے جاؤ۔ یہ حلوا بھی۔ اور کیلے ضرور لے جاؤ

جلاہی دعائیں دیتی رخصت ہوئی اور اب لاڈو اور خادمہ میں پھر باتیں شروع ہوئیں۔

لاڈو۔ آپ یہ خیال کرتی ہوں گی کہ ہم لوگ بہت کورے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ ہم لوگ بات کے پکّے ہیں۔ شہر میں آپ کی کئی مُنہ بولی بہنیں ہوں گی؟

خادمہ۔ (کچھ دلچسپی سے چونک کر) ۔ جی ہاں تین چار ہیں اور مجھے ان سے بہت محبت ہے۔ کئی دفعہ جی میں آیا ہے کہ آپ سے کچھ تعلقات بڑھ جائیں تو ان کو بھی ساتھ

پورے چھ دن خادمہ نے مکھن پور کی طرف رُخ نہ کیا مگر اتوار کو جی کڑا کر کے آخر پھر مکھن پور کی طرف یعنی مکھن پور میں اسی کنویں کی طرف گئی جہاں لاڈو سے ملی تھی۔

لاڈو۔ بسم اللہ۔ میں تو سمجھی کہ آپ خفا ہو گئیں۔

خادمہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

لاڈو۔ امیر آدمیوں کا کیا پتا؟

خادمہ۔ بہن خدا کے لئے مجھ پر شبہ نہ کرو۔ تم بھی اپنے گھر کی امیر ہو۔ نمبردار کی بیٹی ہو۔ میرا باپ تو نمبردار نہیں ہے۔

لاڈو۔ وہ ہار میں نے ڈرتے ڈرتے لیا۔ جب آپ کا نوکر آیا تو میرے والد گھر میں نہ تھے۔ ماں ہے نہیں۔ صرف دونوں بھائی گھر میں تھے۔ اُن سے پوچھ کر لیا۔ یونہی لٹکا دیا کیونکہ ہمارے ہاں کنواری لڑکیاں ہار نہیں پہنتیں۔ بڑی اچھی خوشبو والے پھول تھے۔ میری کوٹھری مہک گئی۔

خادمہ۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ہار تم نے لے لیا۔

لاڈو۔ آج اتفاق سے تم اچھے موقع پر آئی ہو۔ ہمارے مرد سب ایک غیر گاؤں کی برات میں گئے ہیں۔ مجھے کام کم ہے۔

خادمہ۔ تم کیوں نہیں گئیں۔

لاڈو۔ (ذرا سے تن کر) چودھری مکھن کی بیٹیاں غیر برادری کی برات میں شامل نہیں ہوتیں۔

خادمہ۔ مجھے یہ پتا نہ تھا۔

لاڈو۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ آج مجھے فرصت ہے۔ ہی جلاہی کے ہاں سے بیسن کی روٹیاں پکوائی ہیں۔ ایک گھڑی تک گرم گرم وہ لائے گی مگر آپ بیسن کی روٹیاں کیوں کھانے لگیں۔

خادمہ۔ واہ میں خوب کھاؤں گی۔ میں تمہارے لئے خود بنا کر گاجر کا حلوا لائی ہوں۔ بڑا مزہ ہو کہ ہم دونوں مل کر کھانا کھائیں۔

لاڈو۔ ضرور۔ مگر آؤ تب تک کھیلیں۔ یہ کہہ کر لاڈو کنوئیں کے احاطے سے باہر ایک خالی کھیت کی طرف بڑھی۔ خادمہ کافی مضبوط تھی مگر دس قدم میں لاڈو سے ندرے پیچھے رہ گئی حالانکہ لاڈو کچھ تیز نہ چل رہی تھی۔

لاڈو۔ نرم زمین پر آپ لوگوں کو چلنے کی عادت نہیں۔ کیا کھیل کھیلو گی؟ آؤ مجھے پکڑو۔ خادمہ نے بہت کوشش کی کہ لاڈو کو پکڑ لے مگر وہ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر چکر کاٹ کر نکل جاتی۔ خادمہ کا دو منٹ میں سانس پھول گیا۔ اب وہ کہنے لگی کہ اچھا تم بھاگو میں تمہیں پکڑوں گی۔ خادمہ دس قدم بھی نہ بھاگی تھی کہ اس نے لپک لیا۔

لاڈو۔ یہ کھیل تمہیں نہیں آتا۔ آؤ واپس کنوئیں پر چلیں کوٹھے پر چڑھیں۔

خادمہ ہانپتی ہوئی، دُھول جو کھیت سے اُٹھی اس سے کھانستی ہوئی واپس کنوئیں کی طرف گئی۔ وہاں لاڈو نے کہا کہ آؤ اس کوٹھے پر چڑھو۔

خادمہ۔ سیڑھی تو ہے نہیں کیسے چڑھوں؟

لاڈو۔ (مسکرا کر) ناخن اٹکانے کی جگہ ہو تو انسان آسانی سے کوٹھے پر چڑھ سکتا ہے۔

یہ کہہ کر اُس نے پاؤں کا انگوٹھا دیوار کے اینٹ بھر کے سوراخ میں رکھا۔ ایک ہاتھ اونچا کر کے دیوار کے ایک کونے پر جمایا اور پھر جو اچکی تو بائیں پاؤں کا انگوٹھا زمین سے ڈیڑھ

خادمہ۔ یہ تو سب کچھ بالکل ٹھیک ہے۔

لاڈو۔ (بات کاٹ کر) ٹھیک کا کیا مطلب؟ خدا کا حکم ہے۔ اس میں کون دخل دے سکتا ہے۔ ہم ٹھیک یا غلط کہنے والے کون؟

خادمہ۔ (سنبھل کر) ہاں بہن، مجھ سے غلطی ہوئی، معاف کر دو۔

لاڈو۔ میں معاف کرنے والی کون، خُدا اپنے فضل و کرم سے معاف کر دے۔

خادمہ۔ جی ہاں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ گھروں میں اور جسموں میں اگر صفائی رکھی جائے تو خُدا کو پسند ہے۔ غیر ضروری طور پر خاک میں اٹے رہنا کچھ اچھا نہیں۔

لاڈو۔ میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں۔ آپ لوگوں کو خاک سے نفرت ہو تو الگ بات ہے۔ ہم لوگ تو خاک کی کمائی کھاتے ہیں۔ ہم مٹی کے ہمارا نام مٹی ہیں۔ ہم خاک کو کیسے بُرا کہہ دیں۔ لیجئے آپ کا گھوڑا آگیا۔

خادمہ۔ اچھا بہن۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ چلی جاتی ہوں مگر میرا بہت جی چاہتا ہے کہ تم مجھے بہن بنا لو۔ مجھے تم بہت پیاری معلوم ہوتی ہو۔ کیا پھر کبھی تم سے ملنے کا موقع ہوگا؟

لاڈو۔ اپنے والد سے پوچھوں گی۔ میرا خیال ہے کہ اگر آپ یہ تھوتھیرے کے بچوں کے مُنہ دھلانے کا دھندا چھوڑ دیں اور شریفوں سے ملاقات بڑھائیں تو میرے والد کو اعتراض نہ ہوگا کہ میں آپ سے مل لوں۔ مجھے بھی آپ بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ آپ بہت دماغ دار حکومت والی ہوں گی مگر آپ تو بہت سیدھی سادھی معلوم ہوتی ہیں۔

خادمہ۔ اچھا خدا حافظ

لاڈو۔ اللہ بیلی

(۴)

اس دن گھر جا کر خادمہ جو شگفتگی کا سرچشمہ تھی اپنے میں پژمردہ سی الگ پڑی رہی۔ چوٹ جتنا اس کا خ اُس سے بھی کم نکلی۔ مالش تک کی ضرورت نہ ہوئی مگر ہے کہ کمرے سے نکلنے کا نام نہیں لیتی۔ ماں نے باپ بہنوں سبھی نے پوچھا۔ اتوار کا دن تھا۔ سب گھر مگر خادمہ پر چپ کا روزہ واجب ہوگیا۔ دوپہر کے لئے میز پر نہ گئی۔ یونہی ذرا ذہور کمرے میں منگ لیا اور پھر سوچ میں پڑ گئی۔ سہ پہر کا وقت اُس صرف کیا کہ اپنے منگیتر کو خط لکھتی رہی اور بع شام کو آخر کمرے سے نکلی مگر نہ کھیل کا شوق نہ سیر تھوڑی دیر بہن بھائیوں سے گرنے کا حال اور د کا قصہ بیان کرتی رہی۔ مگر لاڈو سے جو گفتگو ہو کا ذکر اُس نے کسی سے نہ کیا۔ شام کے قریب نوکر کو بلا کر کہا کہ ایک سفید موتیے کا ہار لکھن پو کے گھر لاڈو کے باپ کو لاڈو کے لئے دے آئے کہہ دے کہ لاڈو کی بہن خادمہ نے سلام کہا۔ کہلا بھیجا ہے کہ چوٹ بالکل نہیں آئی۔ بہن کا نے نوکر کے سامنے استعمال تو کر لیا مگر اُس کے یہ بات چبھتی رہی کہ لاڈو نے ایک دفعہ بھی ا۔ کہہ کر مخاطب نہ کیا۔

دودھ پیش کرتی ہے۔

جانٹی۔ ضرور گرم گرم پی لیجئے

خادمہ۔ آپ کی مہربانی۔ پی لیتی ہوں۔ بہن آپ کا نام کیا ہے؟ میرا نام خادمہ ہے۔

جانٹی۔ میرا نام لاڈو ہے مس صاحب۔

خادمہ۔ خدا کے لئے مجھے مس ٹس نہ کہو۔ مسلمان ہوں تمہاری بہن ہوں ہماری عمر میں بھی کچھ فرق نہیں۔ میں شاید تم سے کچھ چھوٹی ہی ہوں۔ ابھی اُنتیس سال کی بھی نہیں۔ شاید تم قدرے چھوٹی ہو۔

لاڈو۔ ہم لوگ نام سے تو بلاتے نہیں۔ خیر مس نہیں کہتی۔

خادمہ۔ آپ تو چودھری ہیں نا؟

لاڈو۔ جی! میں نمبردار کی بیٹی ہوں۔ ہمیں آپ کا سب حال معلوم ہے۔ آپ کے دادا وکیل تھے، آپ کے والد بیرسٹر ہیں۔ سب ہمارے مرد جانتے ہیں کہ آپ کے پاس بہت دولت اور حکومت ہے۔

خادمہ۔ (ہنس کر) حکومت تو خاک نہیں۔ روٹی کھانے کو خدا دے دیتا ہے۔

لاڈو۔ آپ سے باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا ہے مگر مجھے کام بہت ہے کاشت کا زمانہ ہے۔ دونوں بھائیوں کی روٹی کھیت میں لے جانی ہے

(یہ دیکھ کر کہ لاڈو نتھ پہنے ہوئے نہیں)

خادمہ۔ اچھا یہ تو بتا دو کہ تمہاری شادی کب ہوگی؟

لاڈو۔ (بڑی سادگی سے) جس سے میری نسبت ٹھہری تھی وہ بچارا گذر گیا۔ اب اس کے چھوٹے بھائی سے ایک سال کے بعد ہوگی

خادمہ۔ (پیار کے لہجے میں) تمہیں وہ پسند ہے؟

لاڈو۔ (بے تکلفی سے) میرے باپ کو پسند ہے۔ اچھا ہی ہے مگر مجھے اس میں کیا دخل؛ ہم لوگ کوئی شہری تھوڑے ہیں کہ بزرگوں کی باتوں کی جانچ پرتال کریں۔ بڑوں کا فیصلہ ہمیشہ ٹھیک ہوتا ہے۔ اچھا میں اب آپ سے ایک بات پوچھوں؟

خادمہ۔ ضرور۔

لاڈو۔ آپ مسلمان ہوکر فرنگیوں کا لباس، فرنگیوں کی عادتیں کیوں اختیار کرتی جارہی ہیں۔ ہمارے سب مرد آپ کے والد کی بہت عزت کرتے ہیں مگر آپ پر اُن کو تعجب ہوتا ہے۔

خادمہ۔ کیا بُرا کرتی ہوں کہ بچوں کا مُنہ دُھلا دیتی ہوں۔

لاڈو۔ مُنہ دُھلایا پھر گھڑی میں ویسا ہوگیا۔ کوئی نیک کام سکھاؤ۔

خادمہ۔ صاف رہنا بھی نیکی ہے اور صفائی سے انسان بیماریوں سے بچتا ہے۔

لاڈو۔ بیماری تو خدا کے حکم سے آتی ہے۔

خادمہ۔ خدا نے انسان کو عقل دی ہے اور بیماری سے بچنا بڑی عبادت ہے۔

لاڈو۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، خیرات کرو اور اپنی عاقبت سنوارو۔ بیماری اور تکلیف آنی جانی چیزیں ہیں۔ خدا سے گناہوں کی معافی مانگو۔

پھرنے سے نہیں روکتا؟

خادمہ۔ میرے والد نے اجازت دے دی ہے۔

دوسری گاؤں والی۔ آپ مسلمان ہیں تو آپنے بھنگی کے لڑکے کا مُنہ کیوں دھویا؟

خادمہ۔ مسلمان، مہتر، سب خدا کے بنائے ہوئے ہیں اور بچوں میں فرق کرنا ٹھیک نہیں۔

گاؤں والی۔ ہم تو سمجھے کہ آپ آہستہ آہستہ گاؤں کو عیسائی کرنے کا پینترا جما رہی ہیں مگر ہمارے چودھری بڑے سخت ہیں۔ انہیں پتہ لگا تو آپ کا یہاں آنا بند ہو جائے گا۔

خادمہ۔ وہ کیسے؟

گاؤں والی۔ پہلے تو وُہ آپ کو آرام سے منع کریں گے اور پھر بھی آپنے نہ مانا تو آپ کے گھوڑے غائب کر دینگے

خادمہ۔ آپ کون ہیں؟ آپ بھی اُن میں سے ہیں؟

گاؤں والی۔ ہم تو جلاہے ہیں۔ ہماری کیا مجال کہ ہم چودھریوں کی بات میں دخل دیں۔

خادمہ۔ جب کوئی منع کرے گا تو ہم نہ آئیں گے۔

(۳)

دوسرے ہفتے کے اختتام پر خود خادمہ پر بھی کچھ واضح ہونے لگا کہ کھن پور کی فضا میں شہری گلاب کا پھول کانٹا سا بن رہا ہے۔ گاؤں والوں کی مہمان نوازی کے چرچے اس نے سُن رکھے تھے مگر تعجب کرتی رہ گئی کہ مسلمانوں کا گاؤں اور لوگوں کو معلوم کہ میں مسلمان ہوں مگر چودھری جماعت کا کوئی فرد مرد تو کجا کوئی عورت یا لڑکی بھی پاس نہیں پھٹکتی

مہتروں اور جلاہوں کے بچے بھی مُنہ دُھلوانے سے کتراتے نظر آئے۔ بجھے سے دل سے لوٹنے کے وقت معمول کا رستہ چھوڑ کر خیالات میں غرق ایک پگڈنڈی پر گھوڑا قدم قدم چلا کر روانہ ہوئی۔ ایک کنوئیں کے پاس کھیت سے اچانک ایک مہیب کُتا نکل کر گھوڑے کو بھونکا۔ خادمہ ڈھیلی ڈھالی بیٹھی تھی گھوڑے نے پہلو کی طرف جست کی اور خادمہ زمین پر آ رہی۔

آناً فاناً ایک نوخیز سی جاٹنی نے بڑھ کر

"بسم اللہ بسم اللہ"

کہہ کر خادمہ کو اُٹھا لیا اور متردّد ہو کر پوچھا "چوٹ تو نہیں آئی؟"

خادمہ۔ نہیں بہن۔ بچ گئی۔ بے خیال بیٹھی تھی، گھوڑا جھجکا میں گر گئی۔

جاٹنی۔ چوٹ کا پتہ نہیں چلتا۔ کنوئیں پر ذرا دم لے لو، چارپائی پر لیٹ جاؤ گرم دودھ پی لو۔ پھر اگر کوئی چوٹ نہ ہوئی تو گاڑی بلوا کر اس میں چلی جانا۔ تمہارا گھوڑا تو بھاگ گیا اور تمہارا نوکر اس کے پیچھے گیا۔ اب گھوڑا شاید گھر جا کر دم لے۔

خادمہ۔ بہن آپ ہرگز فکر نہ کریں۔ کہنی پر شاید کچھ خراش ہو اور پاؤں ذرا مڑ گیا ہے۔ مگر کچھ تکلیف نہیں اور گھوڑا میرا ابھی آتا ہوگا۔

جاٹنی کمر میں مضبوطی سے بازو دے کر خادمہ کا بوجھ سنبھالے اسے کنوئیں کی طرف لے جاتی ہے اور چارپائی پر بٹھا دیتی ہے۔ پیتل کے صاف چمکیلے کٹورے میں گرم

اور چھاؤنی دونوں خوب ترقی پر، کارخانے، کوٹھیاں، سکول، ہسپتال، جیل خانہ سب کچھ۔ جیسا شہروں کا قاعدہ ہے محلّے والے خود ایک دوسرے کو نہیں جانتے نہ کسی کو شہر سے خاص محبّت ہے۔ کوٹھیوں کے رہنے والے تو اکثر خالص پردیسی ہیں۔ ایک کو دوسرے سے کچھ بھی سروکار نہیں۔ ملتے ضرور ہیں مگر ایسا ہی جیسے شہر والے ملتے ہیں۔ نہ باپ دادا کا قصہ، نہ زمین کی پیداوار کا چرچا۔ اخباروں کی باتیں کر لیتے ہیں۔ افسروں کا تذکرہ آجاتا ہے جلسوں میں شرکت ہو جاتی ہے۔ مگر ملا کر رکھنے والی، بکھرنے سے روکنے والی کوئی رسّی نہیں ہے۔ ہر گھر، ہر دکان، ہر کوٹھی، ہر دفتر ایک جزو پریشان ہے ان گھروں دکانوں بنکوں میں پوجا اسی دیوتا کی ہوتی ہے جو الگ رکھنے میں یکتا ہے یعنی

زر

کی۔

شالکوٹ کی ایک کوٹھی میں معمول سے کہیں زیادہ تمول ہے اور غیر معمولی آزادی۔ یعنی لڑکیاں برجس پہنے ہیٹ لگائے گھوڑوں پر سوار ہوتی ہیں۔ دنیا انگلیاں اٹھاتی رہے مگر دولت کے نشے میں کون دنیا کی پروا کرتا ہے۔

ایک لڑکی جس کا نام خادمہ ہے جب شہر کی سڑکوں پر گھوڑا اڑاتے اڑاتے اکتا گئی تو ایک دن مکھن پور جا نکلی۔ مکھن پور شالکوٹ سے صرف تین میل دور ہے کچا رستہ ہے مگر سایہ دار، اور خادمہ کو گاؤں کا منظر بے انتہا دلفریب معلوم ہوا۔ اکثر ادھر جانے لگی۔ یہاں تک کہ گاؤں والے اس کے گھوڑے کے حلیہ سے، اس کی سواری کے ڈھنگ سے کافی واقف ہو گئے مگر کسی گاؤں والے نے کبھی اس کی شکل کو نہ دیکھا۔ یہی سمجھتے رہے کہ کوئی نیم فرنگن شالکوٹ سے محض سیر کے لئے آتی ہے۔

خادمہ نے کچھ دنوں بعد ایک نوکر بھی ساتھ لانا شروع کیا۔ یعنی نوکر بھی سوار اور یہ بھی سوار اور اب گاؤں کے بالکل پاس بلکہ گلیوں میں سے بھی نکلنا شروع کیا، ایک دن گاؤں والے کیا دیکھتے ہیں کہ نوکر کے پاس بالٹی ہے۔ اور یہ دونوں گھوڑوں سے اتر کر، گھوڑوں کو درخت سے باندھ کر ایک کنوئیں سے بالٹی میں پانی بھرنے لگے۔ پھر لوگوں نے یہ دیکھا کہ اس نیم فرنگن عورت نے ایک بچے کو پیار سے بلایا۔ اس سے باتیں کیں اور پھر اس کا منہ ہاتھ اس لڑکی نے خود صابن سے دھو دیا۔ بال صاف کر دیئے۔ سفید تولیے سے اس کے منہ گردن کو پونچھ دیا اور سوار ہو کر واپس چلی گئی۔ دوسرے دن پھر یہی ہوا۔ تیسرے دن تو کئی بچے جمع ہو گئے۔ ایک دو بچوں کی مائیں بھی آئیں

گاؤں والی عورت۔ مس صاحب آپ کیوں یہ کام کرتی ہیں۔

خادمہ۔ مجھے صاف بچے پیارے معلوم ہوتے ہیں دیکھو، خدا نظر نہ لگائے، اس بچے کا کیا چاند سا مکھڑا نکلا ہے۔

گاؤں والی عورت۔ آپ تو عیسائی ہیں پھر آپ نظر کی بات کیوں کرتی ہیں؟۔

خادمہ۔ خدا نہ کرے کہ میں عیسائی ہوں۔ الحمد للہ۔ مسلمان ہوں۔

گاؤں والی۔ تو آپ کا مرد آپ کو اس طرح باہر بے پرد

لاڈو

(۱)

گاؤں کا نام تھا مکھن پور۔ کسی جاٹ نے جس کا ماں باپ نے لاڈ سے مکھن نام رکھ دیا تھا یہ گاؤں آباد کیا۔ ابھی تک اس کی اولاد کے قبضے میں ہے۔ پندرہ بیس گھر تو مکھن کی اولاد کے ہیں۔ چالیس پچاس گھر ان لوگوں کے مزارعوں اور متعلقین کے یعنی دو گھر لوہار اور بڑھئی کنبہ کے، چار گھر خاکروبوں کے، چھ سات گھر جلاہوں کے، ایک تیلی کا ایک موچی کا ایک مُلّا کا اور باقی کاشتکاروں کے۔

مُلّا کے لفظ سے شاید خیال ہوا ہو کہ مکھن مسلمان تھا۔ ہرگز نہیں۔ مکھن کا بیٹا لدھو مسلمان ہوا اور یہ صرف پانچ پشت کا واقعہ ہے۔ مُلّا صرف لدھو کے وقت آیا اور نماز روزہ سکھا گیا۔ لدھو نے اُسے رہنے کے لئے گھر دیا۔ ویسے بہت خاطر تواضع کی مگر جب مُلّا نے کہا کہ مسجد بناؤ، مسجد کے لئے علی الدوام زمین معافی کے لئے دو تو لدھو نے انکار کر دیا۔ اس دن سے گھر تو مُلّا کی اولاد کے قبضے میں ہے مگر جب کبھی عمارت کا سوال اُٹھا تو لدھو نے یہی جواب دیا کہ میرے باپ کی نصیحت ہے کہ گاؤں میں کبھی پکّی عمارت نہ بنانا اور میں اپنے بیٹوں کو نصیحت کر جاؤں گا کہ کبھی پکّی قبر بھی نہ بنوائیں۔

جاٹ کی سعادت مندی کا یہ کرشمہ ہے کہ آج تک مکھن پور میں پختہ اینٹ کی عمارت نہیں، قبر نہیں، دُکان نہیں۔ کئی دکاندار آئے مگر مکھن کی اولاد ہمیشہ مُصر رہی کہ پکّی دُکان نہ بننے دیں گے اور آخر کار وہ دکاندار چلے گئے۔ مکھن پور میں یہ ہر ایک کی زبان پر ہے کہ اگر دُکان قائم ہو جاتی تو اب تک گاؤں اُجڑ جاتا۔ مکھن کی اولاد کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ عورت کو دُکان پر بیٹھنے کو سب سے زیادہ ذلت تصور کرتے ہیں۔ مکھن کی اولاد کی شکل و شباہت کے متعلق صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ کیا مرد کیا عورتیں سب کشیدہ قامت ہیں۔ آنکھیں موٹی موٹی ہیں مگر محض واقعاتی نگاہوں کی مالک۔ جادو پاس نہیں پھٹکا۔ رنگ بھی سنہری گندمی نہیں بلکہ کچھ پھیکے بے نمک سانولے پن کے چھوٹے بھائی کے لگ بھگ۔ مگر ایک چیز میں مکھن کی اولاد لاجواب ہے یعنی چال میں۔ سب کے سب ایسے سبک رفتار ہیں کہ انسان دیکھتے کا دیکھتا رہ جائے۔ مکھن اپنے زمانے میں ایک نامی گرامی چور تھا مگر صرف اُسی کی گھوڑی یا اونٹنی یا بھینس چُراتا تھا جس سے عداوت ہو یا ضد ہو۔ مکھن کے بیٹے پوتے بھی اس شغل سے متنفر نہ تھے مگر تین پشت سے انگریزی عملداری کے زور نے واضح کر دیا کہ ضد پوری کرنی ہو تو بجائے چوری کے یا لاٹھی چلانے کے وکیل چلانا زیادہ مفید ہے۔

(۲)

شہر کا نام ہے سیالکوٹ۔ بڑا شہر، چھاؤنی بھی اور شہر

ماہی گیر کے بھی ہیں جال　　موت کے ہیں یہ سب دلّال

اے دل اے دل واپس آ

باہر ردّ و کد بھی ہے　　کینہ اور حسد بھی ہے

جور و ستم بے حد بھی ہے　　خوفِ نگاہِ بد بھی ہے

اے دل اے دل واپس آ

اب یہ ہرزہ گردی چھوڑ　　گھر کی جانب باگیں موڑ

اپنے آپ سے رشتہ جوڑ　　باقی سب زنجیریں توڑ

اے دل اے دل واپس آ

باہر کیا کرتا ہے طلب　　کیوں پھرتا ہے روز و شب

تو ہے ناداں ہائے غضب　　تیرے اندر ہی ہے سب

اے دل اے دل واپس آ

دشت میں ہے نہ جبل میں ہے　　مٹّی میں ہے نہ جل میں ہے

ملتا سب کچھ پل میں ہے　　سب کچھ تیری بغل میں ہے

اے دل اے دل واپس آ

عبد الحکیم

اے دل اے دل واپس آ

رُخ سورج نے پھیرا ہے باہر سخت اندھیرا ہے
تاریکی نے گھیرا ہے رات سے دُور سویرا ہے

اے دل اے دل واپس آ

بندۂ نفسِ امّارہ بےکس بےبس بےچارہ
تو نہیں کوئی سیّارہ کیوں پھرتا ہے آوارہ

اے دل اے دل واپس آ

راہ میں ڈسنے والے ہیں بچھو ہیں اور کالے ہیں
پاؤں میں تیرے چھالے ہیں موت نے ڈورے ڈالے ہیں

اے دل اے دل واپس آ

باغ میں صیّادِ اہلِ ہوس بیٹھے ہیں لے کر دام و قفس
اب تُو نہیں پر رنگ جا بس تُو ہے ایک اور وہ ہیں دس

اے دل اے دل واپس آ

ہے وُہ بحرِ تلاشِ مال جس میں رہتے ہیں گھڑیال

کچھ ہی دُور اسی سمندر کے کنارے ہم سے رخصت ہوئی، ایک بادبانی کشتی کی طرح وُہ افق کی طرف چل دی اور پھر آہستہ آہستہ نظر سے غائب ہوگئی۔ اُس کے محبّت بھرے پیغام ہمیں آتے رہے، آتے رہے اور پھر ختم ہوگئے، وُہ اُس کی آواز اور اُس کے پیغام سبھی ختم ہوگئے نہیں اُس کی آواز اب بھی ہمارے دل میں گونج رہی ہے اُس کے پیغام اب بھی موجود ہیں مگر وہ خود . . . . . .

کیا یہ مضمون اس طرح ختم ہوگا! کیسے ہو سکتا ہے ؛ دل میں آنسو بھرے ہوں مگر ابھی ہمیں اِن آنکھوں سے دیکھنا ہے، جگر خون ہو رہا ہے مگر ابھی اِس جسم میں سانس باقی ہے اور ہم کس دنیا میں رہتے ہیں جہاں آج کل ہزاروں لاکھوں ماں باپ کی آنکھوں کے چاند تارے خاک و خون میں لتھڑ رہے ہیں۔

کوئی گھر ہے جہاں دو ایک اور کوئی گھر ہے جہاں سوائے ایک آدھ بیکس و نامراد کے باقی سبھی موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ نوعِ انسان ماتم میں ہے شاید لاکھوں ہی ہم سے زیادہ رنجیدہ اور ہم سے زیادہ دُکھی ہوں گے ذرا سوچیں کہ یہاں کتنے تھوڑے دل ہیں جنہیں کبھی نہ کبھی غم کی ٹھیس نہ لگی ہو۔ اپنی زندگی میں ہم نے ہزاروں خوشیاں دیکھیں آخر غم کی باری بھی آنی تھی سو اب ہماری تقدیر و تدبیر یہی ہے کہ اس صدمے کو سہیں سہے جائیں اور جب تک ہو سکے اس رنج و راحت کی دُنیا میں ہمّت کے قدموں سے چلیں اور محبّت و ہمدردی کی راہ پر گام زن ہوں!

سمندر سامنے ہے کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وُہ کھلا ہُوا رستہ ہے جو ہمارے بند وطن سے دوسرے ملکوں کو جاتا ہے اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ وُہ نہ ختم ہونے والی شاہراہ ہے جو اس فانی دُنیا سے کسی اور نہ معلوم کیسی دُنیا کی طرف جاتی ہے، جہاں خدا جانے کیا کچھ ہے ؟!

ہاں سمندر سامنے ہے۔ موجیں اُٹھتی ہیں ہوائیں چلتی ہیں کہیں سے آ رہی ہیں کہیں کو جا رہی ہیں: ؎

بے تاب ہے اِس جہاں کی ہر شے — کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے

لیکن جیسے غیب سے ایک آواز آتی ہے: ؎

انجام ہے اِس خرام کا حُسن — آغاز ہے عشق انتہا حُسن!

بشیر احمد

"تُو مجھ سے کتنی دُور ہے اے پھل!"

"میں تیرے دل میں پوشیدہ ہوں اے پھول!"

میں ایک راستوں کی دُنیا میں ہوں۔ رات آتی ہے۔ اپنا دروازہ کھول اے میرے گھر کی دنیا!

ٹیگور — (ترجمہ از منظر بشیر)

ہندوستانی ہر دو موسیقی سے ربط پیدا کرلیا ہے کوئی تھہوون کی سمفنی (نغمہ) سے لَو لگائے بیٹھا ہے کوئی ہندی راگ میں محو ہے کوئی ریڈیو کی سُوئی گھما رہا ہے اور ملک ملک کی خبریں اور گانے سُن سُنا رہا ہے۔ اتنے میں راگ رنگ ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ اب پڑھائی کا گھنٹہ آگیا۔

ایک دن میری بیوی نے طنزاً کہا کہ آپ ہمایوں کے ایڈیٹر بنتے ہیں اور اُردو کے بڑے معاون لیکن چراغ تلے اندھیرا۔ آپ کے بچے ٹِٹ بِٹ ٹِٹ بِٹ انگریزی ہی بولتے ہیں۔ میں شرمایا لیکن جب یہ یاد آیا کہ حاجی سر عبداللہ ھارون کے بچے اور سید امتیاز علی تاج کی بچی بھی اس میں ہمارے بچوں کی ہمنوا ہے تو ذرا تسلی ہوئی۔ پھر سوچا کہ اگر مولوی عبدالحق صاحب شادی شُدہ ہوتے اور کئی بچوں کے باپ، تو باوجود انجمن ترقی اُردو کے کُل ہند پروپیگنڈا کے غالباً وُہ بھی اپنے گھر کو انگریزی کی لُوٹ مار سے محفوظ نہ رکھ سکتے۔ تاہم ارادہ کیا کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ گھر میں ہم پنجابی بولتے ہیں مگر بچے اردو بولتے ہیں لیکن دقت یہ ہے کہ سکول سینما ریڈیو گراموفون ان سب نے کچھ ایسا اثر کیا ہے کہ اب انگریزی اُن کی اُردو پر غالب آتی جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے کراچی میں اپنی فرصت کا ایک کام یہ قرار دیا کہ یکے بعد دیگرے تینوں بچوں کے ساتھ اُردو پڑھوں پڑھاؤں اس طرح مجھے بھی اُردو کے آسان اور عام وخاص ادب سے پھر روشناس ہونے کا موقع ملا۔ غالب اور اقبال کو جتنا بھی پڑھو وہ ہمیشہ تروتازہ معلوم ہوتے ہیں۔ گھر کی اس معلّمی سے میں نے فائدہ بھی اُٹھایا اور لُطف بھی

پڑھ پڑھا کر کھانا کھا کر سہ پہر کو ہم سب اپنے اپنے کمرے میں لیٹ جاتے۔ بچوں کو ہدایت تھی کہ وہ سو جایا کریں لیکن وُہ عموماً بجائے سونے کے مختلف انگریزی رسالوں کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے۔ میں بھی اپنے کمرے میں الگ تھلگ پہلے اپنی ڈاک اپنے سرہانے رکھ لیتا پھر تمام اخبار رسالوں پر ایک نظر ڈال لیتا۔ ڈیلی گزٹ (کراچی) اور ٹریبیون تو صبح آجاتے۔ سہ پہر کو سول ملٹری، انقلاب، مدینہ، ہندوستان، ہماری زبان، منشور، نوائے وقت، ایسٹرن ٹائمز، حمایت اسلام، مناوی، تہذیب نسواں، ہمایوں ان سب کی خریداری، سرپرستی یا ملکیت کا حق ادا کرتا۔ ان کی رطب و یابس سے اپنے دل و دماغ کو بھرنا اور اپنے جسم و رُوح کو مضمحل کرلیتا کبھی پنجاب یونیورسٹی کے کاغذات آجاتے، کبھی پنجاب پبلک لائبریری کی فہرستِ کتب، کبھی انجمن حمایت اسلام اور پنجاب مسلم لیگ کے نوٹس اور کبھی پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی کارروائیاں ان سب پر دستخط کرکے کچھ ایسا محسوس کرتا گویا میں بھی ایک کام کا آدمی ہوں۔ یہ ذرا ذرا سی خود فریبیاں نہ ہوں تو متمدن انسان اتنے آرام سے زندگی نہ گزار سکے۔ لُطف یہ ہے کہ یہاں میں نے کبھی کبھی ''ہمایوں'' بھی پڑھا ورنہ لاہور میں تو صرف اُس کا سرورق ہی دیکھنے میں آتا۔ یاد رکھئے جس رسالے کے دو ایڈیٹر ہوں ایڈیٹر اور جائنٹ ایڈیٹر تو پہلا نام کا اور دوسرا کام کا ایڈیٹر ہوتا ہے۔

مضمون تھا سمندر کے کنارے پراور میں کبھی گھر میں بند رہا کبھی کہیں گھوما کبھی کہیں کھو گیا۔ ہم سمندر کے کنارے چار پانچ مہینے رہے اب چند دن باقی ہیں۔

وُہ راتیں یاد رہیں گی جب نیند نہ آتی تھی لیکن رات کی خاموشی میں سمندر کی مسلسل راگنی برابر سنائی دیتی تھی۔

وہ شامیں یاد رہیں گی جب سمندر کے کنارے بھیگی ہوئی ریت پر گھنٹوں چہل قدمی کی۔

اور کونسا دن تھا جب سمندر کو دیکھ کر ہمیں وہ محبوب ہستی یاد نہ آگئی جو ساڑھے تین سال ہوئے یہاں سے

اعلانِ آزادی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ برطانیہ اور روس بے تکلفی سے ایران کے غریب خانے میں جا پہنچے۔ چرچل نے ہندوستانیوں کو یقین دلایا کہ خدانخواستہ اوقیانوسی اعلان ہندوستان پر عائد نہیں ہوتا بعض ناشکرے ہندوستانیوں نے اس پر احتجاجی جلسے کر دیئے —— اخبار پڑھنے والا کوئی تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سبھی کچھ گویا میں ہی کر رہا ہوں اور کوئی یہ کہ اگر میں ہوتا تو یہ کام زیادہ اچھی طرح کرتا۔

برٹرنڈرسل کی کتاب Power "طاقت" پڑھنی شروع کی۔ باوجودیکہ رسل دہریہ ہے ایک خدا پرست بھی اُس کی کتابوں سے بے حد فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ "طاقت" پسندی کا جذبہ نوعِ انسان میں مختلف زمانوں میں مختلف صورتوں میں رُونما ہوا۔ دولت فوجی قوت قانونی حکومت پروپگنڈا وغیرہ۔ طاقت وروں کو اپنی طاقت نوعِ انسان کی بہبود کے لئے استعمال کرنی چاہئے اس کے لئے ہمدردی کے جذبات درکار ہیں اور وُہ ایک تو مذہب و اخلاق کی اشاعت سے اور دوسرے سیاسی و معاشی حالات کی تبدیلی سے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ ہمارا نصب العین فرد کی بہتری ہونا چاہیئے جماعت کی تنظیم صرف اس کے لئے ایک ضروری آلۂ کار ہے۔ تمام قسم کی حکومتوں میں صرف صحیح قسم کی جمہوریت ہی مہذّب انسان کے لئے مفید ہو سکتی ہے اور آمریت تو کسی حال میں قابلِ تعریف نہیں۔ اس سے میرے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال اُٹھا کہ آخر وہ کس قسم کی جمہوریت ہے جو ہندوستان کے لئے مفید ہو سکتی ہے؟ معلوم ہُوا کہ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور اِدھر کھانے والے بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں۔

انگریزی کے ایک چینی مصنف لن یُوٹانگ کی کتاب (The Importance of Living) "جینے کی اہمیت" کے بعض حصے پڑھے۔ خوب زندگی بخش کتاب ہے۔ مصنّف کہتا ہے کہ مغربی تہذیب نے سرگرم زندگی کا جو نصب العین انسان کے سامنے پیش کیا ہے وہ تباہ کن ہے چینی نظریۂ حیات فرد اور جماعت دونوں کے لئے زیادہ مفید اور دل خوش کن ہے حقیقت پسندی تخیّل اور حسّاسیت کے ساتھ انسان میں ظرافت کا عنصر بھی ہونا چاہیئے تاکہ وہ زندگی کو علیٰحدہ کھڑا ہو کر دیکھ سکے۔ خیال و عمل میں سادگی ہونی چاہیئے علم کی غلمندی سے گزر کر انسان بیوقوفی کی عقلمندی تک پہنچ جائے اور زندگی کے غموں کو محسوس کرتا ہوا ایک مسخرے فلسفی کی طرح اُس کی ہنسی اُڑائے۔ دُنیا میں سنجیدگی بہت زیادہ ہے اور فانی انسان ہمیشہ زندہ رہنے کی فکر میں گھُلا جاتا ہے۔ اپنی خواہشات کے پورا کرنے میں وُہ عموماً خدا کو خواہ مخواہ تنگ کرتا رہتا ہے۔ اخیر میں مصنّف کہتا ہے کہ گو میں کافروں میں ایسا کافر ہوں جو ہمیشہ خدا پر یقین رکھتا ہو لیکن جو غلط فہمی کے ڈر سے لوگوں میں اس کا چرچا نہ کرے۔ کائنات خوبصورت ہے اور عظیم الشان ہے۔ انسان ایک باوقار ہستی ہے جس کے لئے موت ضروری ہے جیسے دُکھ درد۔ اُسے چاہیئے کہ زندگی کی نعمتوں سے لُطف اُٹھائے اور جب اُس سے کچھ اور بن نہ پڑے تو رضائے الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے اور مطمئن رہے۔

اِس جنگ نے بچوں تک کو اخبار بین بنا دیا ہے ایک ورق ابّا کے ہاتھ میں ہے ایک امّی کے پاس باقی بچوں میں حصہ رسدی تقسیم ہو گئے ہیں۔ نقشوں کا مطالعہ ہو رہا ہے جنگی مباحثہ ہو رہا ہے۔ اخبار بینی کے بعد دیسی پردیسی گانا بجانا ہونے لگا۔ بچوں نے انگریزی

سے اس بارے میں مشورہ کیا کہ کس طرح مسلمان لڑکیوں کے لئے اُردو کا ایک نصاب تیار کر کے ایک کُل ہند نسوانی اُردو یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اُمید ہے کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) اس بات میں اُن کا ہاتھ بٹائے گی۔ اس سکول میں زیادہ تر پنجابی گجراتی اور سندھی مسلمانوں کی لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ مجھے تعجب ہوا جب ایک جماعت کی لڑکیوں نے ہماری آمد پر اقبال کی مشہور نظم "دُعا" خوش الحانی سے پڑھ کر ہمیں سنائی:۔

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے　　جو رُوح کو تڑپا دے اور قلب کو گرما دے

مردہ قوموں میں بھی اب ایک پُرجوش زندگی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔

حال میں سندھ کے چند باہمت مسلمانوں نے حیدرآباد کے شہر میں جامعۂ عربیہ یعنی ایک عربی یونیورسٹی بنانے کی تحریک جاری کی ہے جس میں صنعت وحرفت اور موجودہ علوم کی تعلیم بھی دی جائے گی۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن جو عربی کے بڑے عالم ہیں اس تحریک میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔

جب اس دفعہ میں کراچی آیا اور سمندر کے کنارے آکر ڈیرے ڈالے تو کچھ صحت کے تقاضے سے اور کچھ دل خوش کرنے کو یہ مصمم ارادہ کیا کہ یہاں کے قیام کا زمانہ خالص سُستی میں گزاروں گا۔ لیکن افسوس کہ نہ آج کل کا انسان کامل فرصت سے لُطف اُٹھانا جانتا ہے اور نہ آج کل کی دُنیا اُسے یہ لُطف اُٹھانے دیتی ہے چنانچہ خود یہ مضمون ایک حد تک لکھنے والے کی خود پسندی یا خود نمائی پر دلالت کرتا ہے۔ خودداری کے لفظی اور اصلی معنی شاید یہی اپنے آپ کو اپنے آپ میں سنبھال کے رکھنا لہٰذا خوددار یا خود سنبھال آدمی وُہ ہے جو اپنے تجربوں کو قلم بند نہ کرے مصنف یا انشا پرداز تو ہوتا ہی ہے خود بھینک یا خود دکھاؤ۔

یہاں میری فرصت کا پہلا شغل تو یہ تھا کہ ستیارتھی صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ فرصت کے اوقات میں آپ کی کتاب "میں ہوں خانہ بدوش" کا مقدمہ لکھ دوں گا سو جب جون میں کلفٹن کی ریت اور کراچی کی چمک دمک نے آشوبِ چشم کا تحفہ دیا تو پہلی فرصت اُن کے گیتوں اور اپنی واہ واہ میں صرف کی۔

باقی فرصتوں کی خانہ پُری یوں ہوتی تھی۔ رات کو پسوؤں سے ملاقات ہوتی تو صبح چڑچڑا مزاج لے کر اُٹھتا جیب میں جامعۂ ملیہ کے اُردو کے سو شعر ڈالتا اور آدھ میل پر سمندر کے کنارے کالی عینک پہنے ایک بنچ پر اُس نل کے قریب جا بیٹھتا جہاں اُس وقت ایک مدراسی پولیس والا ایک الہ آبادی مندر کا پجاری ایک ٹیگور صورت دیوانہ کلرک اور ایک سندھی پان سگرٹ والا باری باری آکر اپنے گھڑے بھرتے اور میں اُن کی بے علم بے دولت اور بظاہر بے فکر سی زندگی پر غور کرتا۔ پھر گھر آتا۔ اخبار دیکھتا۔ برطانیہ نے کریٹ خالی کر دیا۔ جرمنی نے روس پر دھاوا بول دیا۔ گاندھی جی نے غنڈوں سے لڑنے کی اجازت دے دی۔ وائسرائے نے ڈیفنس کونسل بنائی مسٹر جناح نے تادیبی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ V کا نشان ہمہ اُوست کی طرح ہر جگہ لہرانے لگا۔ جاپانی چینی ہند کی سیر کرنے آنکلے۔ سر سکندر جناح کے گلے مل گئے۔ روزویلٹ اور چرچل کی اوقیانوسی ملاقات ایک مشترکہ

بخش مقامات یہ اُس کی دولت کے خزانے ہیں جن سے ایک ترقی یافتہ حکومت کما حقہٗ فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سندھ میں ترقی کے لئے بہت گنجائش ہے اور وُہ کئی باتوں میں بہت پس ماندہ ہے۔ سندھ کو یکم اپریل ۱۹۳۶ء سے جداگانہ صوبہ بنا دیا گیا اور اب اُس کی ایک اپنی لیجسلیٹو اسمبلی ہے لیکن سندھ کی حکومت میں وزارتیں اس طرح بنتی اور ٹوٹتی ہیں جس طرح فرانس میں ہوتا آیا ہے۔ سندھ میں خواندگی بہت پست حالت میں ہے اور اگرچہ اب سندھی زبان جو تقریباً ۴۷ لاکھ نفوس کی زبان ہے ایک تعلیمی زبان بنائی جا رہی ہے مگر سچ یہ ہے کہ یہ ایک ترقی یافتہ زبان نہیں محض ایک مقامی بولی ہے جسے خواہ مخواہ ایک علمی زبان کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ اگر پنجاب کی طرح یہاں بھی اُردو کو فروغ دیا جاتا تو اس سے نہ صرف سندھ کا ہندوستان کے دوسرے حصّوں سے زیادہ قریب کا تعلق پیدا ہو جاتا بلکہ اُردو کا زیادہ وسیع لٹریچر سندھیوں کی روز افزوں ترقی کا ایک آسان ذریعہ بن جاتا۔ مگر آج کل بعض سیاسی مصالح کی بنا پر اپنی زبان کا نعرہ جا بجا بلند ہو رہا ہے۔ اسے کہتے ہیں ترقیٔ معکوس۔ یہاں کئی لوگوں کو اس کا احساس ہونے لگا ہے اور اسی احساس اور ضرورتِ وقت کی وجہ سے کراچی اور بعض دوسرے شہروں میں اب کثرت سے اُردو مدارس کھلنے لگے ہیں۔ کراچی میں اُردو کا اتنا چرچا ہے کہ یہاں سندھی جاننے کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی۔ میں جہاں کہیں گیا جس کسی سے ملا میں نے ہندوستانی اور اسلامی ہر نقطۂ نظر سے اُردو کی اہمیت پر زور دیا۔ اسی سلسلے میں مجھے دو ایک تقریریں بھی کرنی پڑیں یہاں اکثر اُردو کے پبلک و پرائیویٹ مشاعرے ہوتے رہتے ہیں دو ایک صحبتوں میں میں نے بھی حصہ لیا اور لُطف اُٹھایا۔

سندھ کے مسلمان پنجاب کے مسلمانوں سے کئی باتوں میں ابھی پیچھے ہیں لیکن ایک سندھی مسلمان نے دورانِ گفتگو میں مجھ سے خوب کہا کہ زیادہ پیچھے ہونے کی وجہ سے یہی اُبھریں گے بھی پہلے۔ انسان کی حالت بہت بُری ہو جاتی ہے جب کہیں جا کر وُہ اسے اچھا بنانے کی فکر کرنے لگتا ہے مسلمانوں میں یہاں تعلیم کی اتنی کمی ہے کہ پانچ چھ ہندوؤں کے مقابلے میں ایک مسلمان پڑھا لکھا ہوتا ہے۔ سندھ کا سب سے بڑا کالج ڈی جی آرٹس و سائنس کالج ہے جو دیارام گدومل کی یادگار میں قائم کیا گیا۔ اس میں ۱۴۰۰ کے قریب طلبا ہیں۔ آرٹس کالج میں تقریباً ۷۰ طلبا ہیں۔ ان میں سے ۱۹ لڑکیاں ہیں جن میں ۴ یا ۵ مسلمان ہیں۔ جتنی ہندو لڑکیاں اس کالج میں پڑھتی ہیں اتنے لڑکے نہیں پڑھتے۔ بعض مخیّر مسلمانوں نے اس تعلیمی کمی کے پورا کرنے میں دلیری سے پہلا قدم اُٹھایا ہے۔ حاجی سر عبداللہ ہارون نے جو ہندوستان کے مسلمان تاجر اُمرا میں ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں علاوہ دوسرے قومی کاموں کے اسّی ہزار روپے کے عطیے سے چھوٹے پیمانے پر ایک سندھی سکول موسومہ "جامعہ اسلامیہ و یتیم خانہ" ۱۹۲۷ء سے قائم کر رکھا ہے جس میں مسلمان نوجوان علاوہ تعلیم پانے کے صنعت و حرفت کے مختلف کام سیکھتے ہیں۔ یہاں کی پوری قوم موجودہ تعلیم کی مخالف تھی۔ چند دُور اندیش بوروں نے اپنے کٹ مُلاؤں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر کے ۱۹۰۶ء میں "کراچی اکاڈمی" کی بنیاد ڈالی جس کی سرپرستی میں اس وقت چار سکول چل رہے ہیں۔ ان میں ایک لڑکیوں کا سکول ہے۔ جس کے متعلق "اکاڈمی" کے ایک زبردست کارکن طیب علی صاحب علوی نے مجھ

ایک گروہ علما کا بھی تھا۔ کہتے ہیں کہ جب اِن میں سے کچھ گھبرا گئے اور انہوں نے لَوٹنا چاہا تو محمد بن قاسم نے یہ شعر پڑھ کر انہیں غیرت دلائی،

اَلا لَیتَ اللُّحیٰ کانت حَشیشاً ۔ فَتَعلِفُھا دَوابُّ المُسلِمینا

(کاش تمہاری داڑھیاں گھاس ہوتیں کہ مسلمانوں کے جانور اُنہیں چر سکتے)

یہ لوگ مکران کے رستے سمندر کے کنارے کنارے آئے تھے۔ دیبل اور سیوان پر لڑائی ہوئی اور سندھ عربوں کے قبضے میں آ گیا جہاں تقریباً پانچ صدیوں تک اُن کی حکومت رہی۔ مختلف انقلابات کے بعد آخر سندھ مغلیہ سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اکبر سندھ کے علاقے میں امرکوٹ میں پیدا ہوا تھا۔ اور اُس کی ایک سندھی بیگم بھی تھی۔ اورنگ زیب کے عہد میں صرف ٹھٹہ (سندھ) میں بقول ہملٹن چار سو مدرسے تھے۔ لاہور کے مشہور ولی میاں میر بھی ٹھٹہ کے رہنے والے تھے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر سندھ کے میر برسر اقتدار ہوئے اور اُس افراتفری کے زمانے میں یہاں کی شائستگی آپ اپنی مثال تھی۔ ۱۸۴۳ء میں سندھ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اِس قبضے کی نوعیت اُس ذومعنی برقی پیغام سے ظاہر ہوتی ہے جو کہا جاتا ہے کہ سر چارلز نیپیر نے گورنر جنرل کے نام بھیجا "I have Sinned (Sind)" (میں نے گناہ کیا یا میں نے سندھ لے لیا)۔

سندھ کا علاقہ فقط دریائے سندھ کی وجہ سے ایک آباد علاقہ ہے ورنہ یہ بھی راجپوتانہ کے صحرا کا ایک حصہ ہوتا۔ دریا کی نسبت سے علاقے کا نام بھی سندھ پڑ گیا۔ آریا جب ہندوستان میں پہلے پہل آئے تو انہوں نے یہاں کے سب سے بڑے دریا کو سندھو پکارا جس کے معنی سنسکرت میں سمندر کے ہیں۔ اس سے علاقے کا نام سندھ پڑا۔ پُرانی فارسی میں سندھ ہند بنا اور پھر اُس سے ہندوستان نے اپنا نام پایا۔ دریائے سندھ سندھ کے لئے وُہ کام کرتا ہے جو دریائے نیل مصر کے لئے یعنی سندھ کا وجود محض دریائے سندھ کے دم سے ہے۔ سندھ کا رقبہ ۴۶۳۷۸ مربع میل ہے۔ یہ ہندوستان کا سب سے گرم اور سب سے خشک صوبہ ہے۔ ۱۹۳۲ء میں آبپاشی کے لئے "سکھر براج" مکمل ہوا۔ نہریں جو اس سے نکلتی ہیں اُن سب کی لمبائی تقریباً چھ ہزار میل ہے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا انتظام آبپاشی ہے۔ اس پر کئی کروڑ روپے صرف ہوئے۔ اس کے علاوہ خیرپور کی ریاست کی تقریباً ۷۵ لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوتی ہے۔ سندھ میں صرف ۴ انچ سالانہ بارش ہوتی ہے لیکن یہاں کی زمین زرخیز ہے اور ۶۰ فی صدی لوگ زراعت پیشہ ہیں اگرچہ اس وقت صوبے پر ۷½ کروڑ زرعی قرضے کا بوجھ ہے لیکن یقین کیا جاتا ہے کہ نئی نہروں سے سندھ کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جائے گی۔ سندھ کی آبادی ۴۵ لاکھ کے قریب ہے جس میں مسلمانوں کی نسبت ۷۳ فی صدی ہے سندھ کے دس گیارہ لاکھ ہندو بظاہر ہندو لیکن دراصل نانک شاہی سکھ ہیں جو عام ہندوؤں کی طرح بتوں کی پوجا نہیں کرتے گو عام سکھوں کی طرح وُہ اپنے بال بھی نہیں بڑھاتے۔ سندھ کے صوبے کے سالانہ اخراجات تقریباً ۳½ کروڑ اور آمد صرف تقریباً ۲¾ کروڑ ہے اور ایک کروڑ سالانہ حکومتِ ہند کی طرف سے بطور عطیہ کے حاصل ہوتا ہے۔ سندھ اس عطیے کا ہر طرح مستحق ہے وُہ مغرب کی طرف ہندوستان کا دروازہ بھی ہے اور دربان بھی۔ کراچی ہندوستان کا سب سے بڑا ہوائی اڈا ہے۔ سندھ کے معدنی وسائل اُس کی ماہی گیری کی پیداوار اُس کی زرخیز زمین اُس کی صحت

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اپنے سروں پر بڑے بڑے [illegible] کا بوجھ لادے ہوئے ہیں اور بس"

"زندگی کے سمندر پر کسی نے صرف [illegible] کو اپنا رہبر بنا کر کبھی قدم نہیں رکھا صرف خدا واحد ہے اور صرف وہی وحدت پسند ہے"

صحراؤں اور پہاڑوں کا ذکر بھی وہ بڑی شان سے کرتا ہے لیکن بہتر ہے کہ شاہ کی صحبت سے کسی اور جگہ لطف اٹھایا جائے۔ یہاں گنجائش نہیں۔ مجھے دوستوں سے جو کچھ پمفلٹ ملے اُن سے میں نے سندھ کے متعلق کچھ چوں چوں کا مربہ اکٹھا کر لیا۔ سندھ کی تاریخ کے بعض واقعات مشہور ہیں۔ غالباً آج سے پانچ ہزار سال پہلے شمالی سندھ میں لاڑکانہ یا لاڑکانہ کے شہر کے نزدیک وُہ تمدن پھولتا پھلتا تھا جسے آج موہن جودارو کا تمدن کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ آریاؤں سے زیادہ قدیم تمدن کے مالک تھے۔ انہوں نے صنعت و حرفت میں خاصی ترقی کی تھی ایک صرف زمین دوز نالیوں سے اُن کی ترقی کا پتہ چلتا ہے۔ آریا آئے اور انہوں نے اِس تمدن کا صفایا کر دیا۔ مہابھارت کے زمانے میں سندھ کا راجہ جیدراتھ تھا۔ ایلور کئی صدیوں تک دارالسلطنت رہا۔ کچھ عرصہ سندھ سکندرِ اعظم کی سلطنت میں شامل رہا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے یہاں کے راجہ چچ کی سلطنت میں پنجاب بھی شامل تھا۔ ۷۱۲ء میں راجہ داہر کے وقت میں جب کہ ولید مسلمانوں کا خلیفہ تھا مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا لشکر محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ پر حملہ آور ہُوا۔ اِس حملے کا سبب یہ تھا کہ عربوں کے چند جہاز لُوٹ لئے گئے تھے۔ اُس وقت محمد بن قاسم کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ فوج کی تعداد تھوڑی تھی اور اُس کے ساتھ

اس مضمون کے چھپنے سے پہلے "عالمگیر" کا سالانہ جون نمبر ۱۹۶۱ء میری نظر سے گزرا۔ اِس میں رفعت ہاشمی صاحب کا مختصر لیکن دلچسپ مضمون "شاہ عبداللطیف بھٹائی" دیکھا۔ کیا اچھا ہو اگر "صحرا" کی سی چند اور نظمیں اُردو میں منتقل کر دی جائیں۔

نہ میں جتی نہ میں انسی نہ میں مائی نہ میں باپ
ذات سچل دی کی پچھ دے نالے تا نایاب

یہ سندھی صوفی شاعر سچل کے اشعار ہیں مائی ماں ہے اور باپ باپ اور آخری مصرع کے معنی ہیں
پوچھتے ہیں وُہ کہ غالب کون ہے؟ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!
یہ سندھی ہمیں گوارا تھی۔ اس کے بعد انہوں نے شاہ کی چند کافیاں گائیں جو ہم کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے مگر
کرتے رہ گئے۔ شاہ کا رعب تو خیر مجھ پر بیٹھ ہی چکا تھا لیکن اس سندھی نوازی کا اک یہ اثر مجھ پر ضرور ہوا کہ
کافیاں اور ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال یاد آگئے اور جی میں آیا کہ انہیں پھر غور سے پڑھ کر ان سے لطف
صوفی مجلس والی رات سے یاد تھا کہ بے تاب صاحب اُردو میں بھی گا سکتے ہیں۔ میں نے درخواست کی
مشہور غزل گائی۔ ان کا گایا ہوا یہ شعر اب تک کانوں میں گونج رہا ہے:

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

اُردو کی ہمہ گیری ظرف۔ کلام کی تاثیر انسانی ہمدردی اور حقیقت بینی کا بلند نصب العین — مجلس پر وجد سا طاری ہو گیا۔
اکتوبر میں راہور واپس آ کر گاہے گاہے یہ محفلیں یاد آتیں۔ اسی سلسلے میں پنجابی کی مشہور کتابیں ہیر رانجھا سوہنی مہینوال اور
بُلھے شاہ کی کافیاں خرید کر اپنے سرہانے رکھ لیں کہ جب کبھی رُوس جرمن جنگ سے جی اُکتا جائے تو ان کی صحبت میں تھوڑا وقت
گزار لیا جائے۔ انہیں دنوں میں پنجاب پبلک لائبریری میں ایک نئی انگریزی کتاب نظر پڑی "شاہ عبد اللطیف بھٹائی"
اس کے مصنف ایک آئی سی ایس انگریز ایچ ٹی سارلے ہیں جنہوں نے ۱۹۴۰ء میں اسے چھپوایا۔ اس کے ۲۲۴ صفحات
ہیں اور یہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں تاریخ ہے دوسرے میں ادب اور تنقید اور تیسرے میں شاہ عبد اللطیف کے
"رسالو" کی بعض نظموں کا انگریزی نظم میں ترجمہ دیا گیا ہے۔ مصنف نے گوربخشانی صاحب کی علمیت کی داد دی ہے۔
انگریز مصنف نے یہ کتاب خاصی محنت اور توجہ سے لکھی ہے۔ اس وقت اس کا خلاصہ جو میں نے بنایا میرے سامنے ہے اور خطرہ ہے کہ اگر
یہ زیادہ دیر تک سامنے رہے گا تو یہ مضمون سمندر کے کنارے کی بجائے" شاہ جو رسالو" سے متعلق ہو جائے گا۔ مصنف کہتا ہے کہ شاہ
عبد اللطیف جس کے کلام میں زیادہ تر فارسی اور تھوڑا بہت عربی اور کچھ بلوچی اور ہندوانہ اثر پایا جاتا ہے ایک سچا مسلمان موحد صوفی
تھا جس نے رسمی فارسی شاعری سے ایک حد تک کنارہ کر کے سندھ کی دیہاتی زندگی اور مقامی عشقیہ قصوں کے پس منظر کو لیا اور
پھر اُس پر اپنے رنگ میں اسلامی تصوّف کی پُر درد تصویر کھینچی اُس کا کلام ہندوستانی راگنیوں کلیان کھمبات سوہنی وغیرہ کے
مطابق مرتب کیا گیا ہے۔ جو نظم جس راگ میں گائی جاتی ہے اُس کے عنوان کے نیچے درج کی گئی ہے۔ اس طرح شاہ عبد اللطیف

کا کلام ہندو مسلمانوں دونوں میں برابر ہر دلعزیز ہو گیا ہے۔ نظم کا حصہ* "شاہ جو رسالو" (منتخب) سے لیا گیا ہے۔ "شاہ جو رسالو" کا آغاز یوں ہوتا ہے :-

اوّل اللہ علیم اعلیٰ عالم جو دَھڻي	(سب سے پہلے ہے اللہ علیم اعلیٰ کُل عالم کا مالک
قادر پنھنجي قدرت سين قائم آھي قديم	(قادر، ازلی، اپنی قدرت سے آپ قائم
والی واحد وحدہٗ رازق رب رحیم	(والی، واحد، روزی دینے، رحم کرنے والا خدا
سو ساراہ سچو ڈي چئي حمد حکيم	(حمد کرو اُس خدا کی جو شفا دیتا ہے
کري پاڻ کريم جوڙون جوڙيهان جون	(جو سچا ہے اور سب پر مہربان ہے)

پنجابی شاعر زیادہ سے زیادہ دریا کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اِدھر سندھ کا دریا دریاؤں کا بادشاہ ہے اور خود سمندر سندھ کے پاؤں دھو کر پیتا ہے۔ شاہ عبداللطیف نے سمندر کا کئی جگہ ذکر کیا ہے :-

"جُدائی کے سمندر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے ہر علیحدہ اور جُدا روح کو غرق کر دیتے ہیں"

"وُہ جو سمندر میں تیر سکتے ہیں تھوڑے پانی اور گہرے پانیوں میں ہر ایک جگہ بے دھڑک تیرتے ہیں لیکن وہ جو تیر نہیں سکتے اپنے سروں پر بڑے بڑے عماموں کا بوجھ لاد لیتے ہیں اور بس"

"زندگی کے سمندر پر کسی نے صرف "میں" کو اپنا رہبر بنا کر کبھی قدم نہیں رکھا۔ صرف خدا واحد ہے اور صرف وہی وحدت پسند ہے"

صحراؤں اور پہاڑوں کا ذکر بھی وُہ بڑی شان سے کرتا ہے لیکن بہتر ہے کہ شاہ کی صحبت سے کسی اور جگہ لطف اٹھایا جائے۔ یہاں گنجائش نہیں۔ مجھے دوستوں سے جو کچھ پمفلٹ ملے اُن سے میں نے سندھ کے متعلق کچھ چوں چوں کا مربّہ اکٹھا کر لیا۔ سندھ کی تاریخ کے بعض واقعات مشہور ہیں۔ غالباً آج سے پانچ ہزار سال پہلے شمالی سندھ میں لاڑکانہ یا لاڑکانہ کے شہر کے نزدیک وُہ تمدن پھولتا پھلتا تھا جسے آج موہن جدارو کا تمدن کہا جاتا ہے یہ لوگ آریاؤں سے زیادہ قدیم تمدن کے مالک تھے۔ انہوں نے صنعت و حرفت میں خاصی ترقی کی تھی ایک صرف زمین دوز نالیوں سے اُن کی ترقی کا پتہ چلتا ہے۔ آریا آئے اور اُنہوں نے اِس تمدن کا صفایا کر دیا۔ مہابھارت کے زمانے میں سندھ کا راجہ جیدراتھ تھا۔ ایلور کئی صدیوں تک دارالسلطنت رہا۔ کچھ عرصہ سندھ سکندرِ اعظم کی سلطنت میں شامل رہا آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے یہاں کے راجہ چچ کی سلطنت میں پنجاب بھی شامل تھا۔ ۷۱۲ء میں راجہ داہر کے وقت میں جب کہ ولید مسلمانوں کا خلیفہ تھا مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا لشکر محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ پر حملہ آور ہوا۔ اِس حملے کا سبب یہ تھا کہ عربوں کے چند جہاز لُوٹ لئے گئے تھے۔ اُس وقت محمد بن قاسم کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ فوج کی تعداد تھوڑی تھی اور اُس کے ساتھ

* اس مضمون کے چھپنے سے پہلے "عالمگیر" کا سالانہ جون نمبر ۴۲ء میری نظر سے گزرا۔ اِس میں رفعت ہاشمی صاحب کا مختصر لیکن دلچسپ مضمون "شاہ عبداللطیف بھٹائی" دیکھا کیا اچھا ہو اگر "صحرا" کی سی چند اور نظمیں اُردو میں منتقل کر دی جائیں۔

نہ میں جتی نہ میں انسی نہ میں مائی نہ میں باب

ذات سچل دی کی پچھ دے نالے تا نایا ب

یہ سندھی صوفی شاعر سچل کے اشعار ہیں مائی ماں ہے اور باب باپ اور آخری مصرع کے معنی ہیں:۔

پوچھتے ہیں وُہ کہ غالب کون ہے؟ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

یہ سندھی ہمیں گوارا تھی۔ اس کے بعد انہوں نے شاہ کی چند کافیاں گائیں جو ہم کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے مگر سب سبحان اللہ اور واہ وا کرتے رہ گئے! شاہ کا رُعب تو خیر مجھ پر بیٹھ ہی چکا تھا لیکن اس سندھی نوازی کا اک یہ اثر مجھ پر ضرور ہوا کہ مجھے پنجاب کی بُلھے شاہ کی کافیاں اور ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال یاد آ گئے اور جی میں آیا کہ انہیں پھر غور سے پڑھ کر اُن سے لُطف اُٹھایا جائے۔

صوفی مجلس والی رات سے یاد تھا کہ بے تاب صاحب اُردو میں بھی گا سکتے ہیں۔ میں نے درخواست کی تو انہوں نے ظفر کی مشہور غزل گائی۔ ان کا گایا ہوا یہ شعر اب تک کانوں میں گونج رہا ہے:۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اَوروں کے عیب و ہنر

پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

اُردو کی ہمہ گیری ظفر کے کلام کی تاثیر انسانی ہمدردی اور حقیقت بینی کا بلند نصب العین — مجلس پر وجد سا طاری ہو گیا!

اکتوبر میں لاہور واپس آ کر گاہے گاہے یہ محفلیں یاد آتیں۔ اسی سلسلے میں پنجابی کی مشہور کتابیں ہیر رانجھا سوہنی مہینوال اور بُلھے شاہ کی کافیاں خرید کر اپنے سرہانے رکھ لیں کہ جب کبھی رُوس جرمن جنگ سے جی اُکتا جائے تو اِن کی صحبت میں تھوڑا وقت گزار لیا جائے۔ انہیں دنوں میں پنجاب پبلک لائبریری میں ایک نئی انگریزی کتاب نظر پڑی "شاہ عبد اللطیف بھٹائی" اس کے مصنف ایک آئی سی ایس انگریز ایچ ٹی سارلے ہیں جنہوں نے ۱۹۴۰ء میں اسے چھپوایا۔ اس کے ۴۲۲ صفحات ہیں اور یہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں تاریخ ہے دوسرے میں ادب اور تنقید اور تیسرے میں شاہ عبد اللطیف کے "رسالو" کی بعض نظموں کا انگریزی نظم میں ترجمہ دیا گیا ہے۔ مصنف نے گوربخشانی صاحب کی علمیت کی داد دی ہے۔ انگریز مصنف نے یہ کتاب خاصی محنت اور توجہ سے لکھی ہے۔ اِس وقت اس کا خلاصہ جو میں نے بنایا میرے سامنے ہے اور خطرہ ہے کہ اگر یہ زیادہ دیر تک سامنے رہے گا تو یہ مضمون سمندر کے کنارے کی بجائے "شاہ جو رسالو" سے متعلق ہو جائے گا۔ مصنف کہتا ہے کہ شاہ عبد اللطیف جس کے کلام میں زیادہ تر فارسی اور تھوڑا بہت عربی اور کچھ بلوچی اور ہندوانہ اثر پایا جاتا ہے ایک سچا مسلمان موحّد صوفی تھا جس نے رسمی فارسی شاعری سے ایک حد تک کنارہ کر کے سندھ کی دیہاتی زندگی اور مقامی عشقیہ قصّوں کے پس منظر کو لیا اور پھر اُس پر اپنے رنگ میں اسلامی تصوّف کی پُر درد تصویر کھینچی۔ اُس کا کلام ہندوستانی راگنیوں کلیان کھمبات سوہنی وغیرہ کے مطابق مرتب کیا گیا ہے۔ جو نظم جس راگ میں گائی جاتی ہے اُس کے عنوان کے نیچے درج کی گئی ہے۔ اس طرح شاہ عبد اللطیف

چار ماہ یہاں رہے اور اب جانے سے دو روز پہلے شاہ کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ میں نے صرف ڈاکٹر صاحب کی طرف مُنہ پھیر لیا۔ وہ پڑھنے لگے:۔

ساھڙُ سا سُوھڻي سائرُ پڻ سوئي
(سائڑ سا سوہنی سائڑ پنڑ سوئی)
آھي ٻڃوئي گجھہ گجھاندڙ گالڙي
(آہے بجوئی گجھ گجھاندر گالڑی)

ساہر بھی وہی ہے جو سوہنی ہے اور دریا بھی وہی ہے یہ سبھی ایک ہیں۔
یہ ہے ایک بالکل پُراسرار بات! انتہا درجہ پُراسرار!

اب مہمان پر مہمان آنے لگے۔ ایسی حالت میں اُستادی شاگردی کے سلسلے کا جاری رکھنا شاہ کے حضور مہمانوں سے ڈاکٹر صاحب سے اپنے ۴۸ سال کے سِن سے گستاخی اور بے انصافی اور بے ادبی تھی۔ قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اتنی تھوڑی سی دیر میں شاہ کے کلام کا کیا انتخاب ہو سکتا تھا۔ دوسرے دن اپنی تسلی کے لئے میں نے ایک کتاب "شاہ جو رسالو" (منتخب) خرید کر اپنے کتب خانے میں داخل کر لی۔ یہ تھا میری "شاہ دانی" کا لبِ لباب۔ اب چائے شروع ہوئی۔ یہ ایک سندھیوں اور پنجابیوں کا مجمع تھا۔ ہاں ایک یوپیا بھی تھا۔ پہلے چند لمحے خاموشی سی طاری رہی جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کریں اور کیا کہیں۔ ادیبوں کی سی باتیں کریں یا انسانوں کی سی۔ اتنے میں میں نے اُن صاحب کو دیکھ پایا جنھوں نے صوفی مجلس میں "تاب بے تاب" والی نظم گائی تھی۔ اور جنھیں میں نے اپنے دل میں پروفیسر بے تاب کا نام دیا تھا۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ یہ پروفیسر رام پنجوانی سندھ کالج میں سندھی کے معلّم ہیں۔ میں نے کہا براہِ کرم ہمیں "وہ تاب بے تاب" پھر سنا دیجئے لیکن افسوس ہے کہ یہاں کوئی ساز نہیں۔ ہمارے میزبان نے کہا اِن کا ساز ہمیشہ اِن کے ساتھ رہتا ہے۔ میں نے حیرانی سے دیکھا۔ یہ ایک تپائی پر بیٹھ گئے اور تپائی سے ایسی صفائی اور خوبی سے طبلے اور ساز کا کام لیا کہ ہم دنگ رہ گئے۔ اِن کی آواز میں سوز تھا ہاتھوں میں موسیقی اور نظر میں ایک طرح کی وارفتگی۔ یہ واقعی حضرتِ بے تاب تھے۔ اک سماں بندھ گیا:

نہ میں تاب نہ بے تاب نہ میں ابر و آفتاب
نہ میں گویا نہ میں جویا نہ میں سوال نہ جواب
نہ میں خاکی نہ میں بادی نہ میں آگ نہ میں آب
نہ میں شیعہ نہ میں سنی نہ میں گناہ نہ میں ثواب
نہ میں شرعی نہ میں ورعی نہ میں رنگ نہ میں رباب

تو وہ بیس روز کے لئے عزلت گزیں ہوگیا۔ اکیسویں دن غسل کر کے وہ زمین پر اپنے اوپر ایک چادر ڈال کر لیٹ گیا اور اپنے مریدوں سے گانے کی درخواست کی۔ تین دن تک یہ لوگ اپنے گیت گاتے رہے آخر تیسرے دن شاہ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ رومی اور چینی مصوروں کی کہانی شاہ نے بیان نہیں کی بلکہ اُس نے جو اشارہ رومی کی طرف کیا ہے وہ مولانا روم صاحبِ مثنوی ہیں۔ اور یہ دلکش کہانی جو اُن کی مشہور مثنوی میں پائی جاتی ہے اس طرح شروع ہوتی ہے:

چینیاں گفتند ما نقاش تر رومیاں گفتند ما را کر و فر .... الخ

ڈاکٹر صاحب مثنوی کا ایک عمدہ یورپی نسخہ اُٹھا لائے اور اُس میں یہ کہانی نکال کر خالص ایرانی لہجے میں پڑھنے لگے۔ اسی سلسلے میں علمِ السنہ پر بھی گفتگو ہونے لگی۔ میں گھبرانے لگا۔ چائے کا وقت قریب آرہا تھا۔ ابھی مہمانوں کا ریلا آنے والا تھا۔ میرے اصرار پر ڈاکٹر صاحب نے "شاہ جو رسالہ" نکالا اور "سُر سھنئي" کے عنوان کے تحت میں پڑھنا پڑھانا اور سمجھانا شروع کیا۔ یہ کیا تھا "سوہنی مہینوال" کا قصہ۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے سمجھایا کہ شاہ یہ عشقیہ قصے بیان نہیں کرتا بلکہ اُن کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کر کے حقیقت کا نقشہ کھینچتا اور معرفت کا سبق دیتا ہے مثلاً:۔

گھڑو ڀڳو تہ گھورِ لُو، آسَرَ مَ لاھيج (سندھی)

(گھڑو بھگو تہ گھوریو آسرم لاہیج) (اُردو تلفظ)

لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، تُرھي اِن تَرِيج

(" " " " ترہے اِن ترِیج)

جيباڻي ھيج، پَسين مُنهُ مهارَ جو۔

(جیبانے ہیج، پسیں مُنہ مہارَ جو)

سوہنی ہر رات دریا کے پار ایک گھڑے پر بیٹھ کر اپنے محبوب مہینوال سے ملنے جایا کرتی تھی۔ جب اُس کے والدین ایسا کرنے سے نہ روک سکے تو ایک دن اُنہوں نے ایک کچا گھڑا وہاں رکھ دیا۔ سوہنی بے سوچے سمجھے اسے دریا میں ڈال کر چل دی۔ دریا کے عین بیچ میں پہنچی تو گھڑا ٹوٹ گیا۔ سوہنی ڈوب گئی۔ اُدھر سے مہینوال اُس کی چیخ پکار سن کر دریا میں کود پڑا اور اُسے بچانے کی ناکام کوشش میں وہ بھی ڈوب گیا۔ آخر دونوں کو گاؤں والوں نے ایک ہی قبر میں ساتھ ساتھ دفن کر دیا۔ ہمارا شاعر کہتا ہے:۔

"اگر گھڑا ٹوٹ گیا تو ٹوٹ جانے دے مگر تو آسرا نہ چھوڑ

تو خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو بلکہ اُسی (رحمت کی) ناؤ کے سہارے تیر

کہ صرف سچی محبت کے ذریعے ہی تو بہار کا جلوہ دیکھے گا"

اتنے میں دو ایک پروفیسر مہمان آگئے۔ میں نے درخواست کی کہ تھوڑا سا اَور۔ اِن لوگوں نے کہا کہ آپ کمال کرتے ہیں کہ

کتاب کے تیسرے حصے میں مصنف نے شاہ لطیف کے شاعرانہ کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جرمن ڈاکٹر ٹرمپ کے مرتب کردہ شاہ لطیف کے دیوان موسوم بہ شاہ جو رسالو" میں ۲۶ سُروں کلیان کھمبات سارنگ سوہنی وغیرہ کے تحت میں شاہ کا کلام درج ہے۔ اُس کا محبوب خدا ہے اُس کی شراب شرابِ معرفت ہے۔ ایک جگہ وُہ کہتا ہے کہ اگر ہزاروں سورج بھی نکل آئیں اور چوراسی چاند بھی چڑھیں تو خدا کی قسم محبوب کے بغیر ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا۔

وُہ کہتا ہے اُونٹ کو ذرا باندھے ہی رکھو کہ آوارہ نہ پھرے۔ (یہ انسان کی روح ہے) پھر کہتا ہے کہ کولھو کا اونٹ آنکھ بند ھا گھومے جاتا ہے۔ (یہ انسان کی قسمت ہے) ایک نظم میں ایک نہایت دلکش کہانی کی طرف اشارہ ہے کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ نے رُومی اور چینی مصوّروں کو بُلا کر تصویر سازی میں ایک دوسرے سے اُن کا اس طرح مقابلہ کرا دیا کہ ایک بڑے ایوان کے عین بیچوں بیچ پردہ ڈال کر ایک دیوار پر چینیوں سے اور اُس کے بالمقابل دوسری دیوار پر رُومیوں سے نقش و نگار بنانے کو کہا۔ چینیوں نے طرح طرح کی تصویریں بنائیں، رومیوں نے اپنی دیوار کو صرف صاف شفاف کر کے خوب چمکا دیا جب پردہ بیچ میں سے اُٹھا دیا گیا تو بادشاہ نے دیکھا کہ ایک طرف چینیوں کی خوبصورت تصویریں نظر آتی ہیں اور دوسری طرف اُنہیں تصویروں کا صاف عکس۔ بادشاہ دونوں جماعتوں سے خوش ہوگیا شاہ لطیف کہتا ہے کہ اسی طرح انسان کو بھی چاہیئے کہ وُہ اپنے دل کو ایسا شفاف کرلے کہ اُس میں سب خدائی رنگوں کا عکس صاف نظر آنے لگے۔ انسان میں خدا کا جلوہ منعکس ہے۔ در اصل دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں خدا ہم سے کچھ بھی دُور نہیں، دل کو صاف کر دو پردہ ہٹا دو وُہ آپ سے آپ نظر آجائے گا۔ ایک شعر میں وہ کہتا ہے کہ خدا کا سچا عاشق عزازیل تھا دوسرے سب اپنی خواہش کے تابع تھے۔ وُہ مردُود ہوا تو صرف انتہائے عشق کی وجہ سے ہوا کیونکہ اُسے خدا سے اتنی محبت تھی کہ وُہ خود خدا کے کہنے پر بھی اُس کے سوا کسی کے آگے سر جھکانے پر تیار نہ تھا۔

علاوہ سندھی اور بلوچی روایات کے شاہ لطیف کے کلام میں حسنؓ حسینؓ، سسّی پنّو، سوہنی مہار اور ہیر رانجھو وغیرہ کے قصّوں کی طرف جا بجا اشارات ہیں۔ مجازی عشق سے اُس نے حقیقی عشق کا رستہ نکالا ہے۔

اِس کے بعد مقررہ دن میں چائے پارٹی کے وقت سے گھنٹہ بھر پہلے ڈاکٹر گوربخشانی کے ہاں پہنچا۔ پہلے میں نے شاہ لطیف کے متعلق چند سوالات کر کے اپنے بعض شکوک رفع کئے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے لئے شاعرِ سندھ کے متعلق ایک مختصر سا نوٹ لکھ رکھا تھا۔ اُس سے معلوم ہوا کہ شاہ (لفظ "شاہ" کے معنی سندھ میں شاہ عبداللطیف کے ہیں) کی زندگی کے تین حصّے تھے پہلا اکیس برس کی عمر تک اِس زمانے کے، خیر میں وہ اپنے باپ کے مُرید مرزا مغل بیگ کی لڑکی کا دلدادہ ہو گیا اور جب اسے حاصل نہ کر سکا تو تین چار سال کے لئے گھر سے نکل گیا اور ہندوستان میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ یہ اُس کی زندگی کا دوسرا حصّہ تھا۔ اپنے سفر سے واپس آکر اُسے گوہرِ مُراد مل گیا لیکن وہ لاولد رہا۔ اُس کا قول تھا کہ عشقِ الٰہی کے ڈھونڈنے والے اور تارک الدنیا لوگ یہ میرے بچے ہیں۔ عمر کے آخری دس سال شاہ نے بھٹ کی صحرائی خلوتوں میں گزارے۔ جب اُس کی موت کے دن قریب آئے

وہ ایک زبردست صوفی شاعر تھا۔

شاہ لطیف کا شجرۂ نسب ستائیسویں پشت میں حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب تیمور ہرات میں آیا تو اُس کی فوج میں ۲،۶۲،۳۱۲ سپاہی تھے۔ شاہ لطیف کے ایک بزرگ سید مرالی تیمور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ۲،۶۲،۳۱۲ ہی روپے اُس کی نذر کئے۔ تیمور اس سے بہت خوش ہوا اور اس کے بیٹوں کو بڑے عہدوں پر فائز کر دیا۔ ایک بیٹا سید حیدر شاہ تیمور کے ہمراہ ہندوستان چلا آیا۔ یہاں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے وُہ ہالہ پہنچا جہاں اُس نے شادی کر لی۔ ایک بیوی اُس کی یہاں تھی دوسری ہرات میں۔ اور دونوں کے ہاں اولاد ہوئی۔ شاہ لطیف اِس ہالوی خاندان کا ایک رُکن تھا۔ اس کے صدیوں بعد شاہ لطیف کے باپ شاہ حبیب نے بھی دو شادیاں کیں۔ شاہ کی ماں شاہ دیانو ساکن ہالہ کی بیٹی تھی۔ یہ شاہ دیانو مخدوم عربی بھی کہلاتا تھا کیونکہ وہ عرب سے آیا تھا۔ اپنے جوشیلے پن اور متلون مزاجی کی وجہ سے وہ "دیوانو" یا دیانو کہلانے لگا۔ ہالہ میں آج تک "دیانی فقیروں کا ڈیرہ" ہے۔ شاہ لطیف نے مدرسے میں بہت تھوڑی تعلیم پائی لیکن اُس نے خود مطالعہ کر کے مختلف علوم میں خاصی دسترس حاصل کر لی۔ قرآن مجید مثنوی مولانا رُوم اور شاہ کریم کا سندھی دیوان اِن تینوں کتابوں کو وُہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ شاہ لطیف کا سارا کلام مختلف اسلامی اور صوفیانہ تلمیحات سے بھرا پڑا ہے کہتے ہیں کہ شروع میں شاہ لطیف صرف الف کا حرف ہی پڑھ سکا۔ اُستاد نے باپ کے پاس شکایت کی۔ باپ نے پوچھا تو بیٹے نے جواب دیا کہ صرف الف ہی پڑھنے کے قابل ہے باقی حروف سب بیکار ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ اللہ کا لفظ الف سے شروع ہوتا ہے اور اسی میں سب کچھ آ جاتا ہے۔ باپ بیٹے کی ذکاوت سے خوش ہوا لیکن اُسے سمجھا بجھا کر دوسرے حروف پڑھنے پر بھی راضی کر لیا۔ شاہ لطیف نے بعد میں بھٹ میں سکونت اختیار کی۔ اسی واسطے اُسے بھٹائی کہتے ہیں۔ یہاں اُس کا روضہ ہے جس سے اُس کی تاریخ وفات کا بھی پتہ چلتا ہے :-

گفت ایں رحا مریدنِ ارتحالِ پیر گردیدہ محوِ عشق وجودِ لطیف پیر

دوسرے مصرعے سے ۱۱۶۵ھ ہجری کا سن نکلتا ہے۔ بھٹ میں آج تک ہر سال شاہ لطیف کی یادگار کے طور پر ایک میلہ ہوتا ہے بھٹ حیدر آباد (سندھ) سے تقریباً ۲۵ میل پر واقع ہے۔

شاہ لطیف اوائل عمر ہی سے خلوت پسند اور معرفت کا دلدادہ تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ ایک درخت کے اُوپر اپنی تنہائی میں چھپا بیٹھا تسبیح پھیر رہا تھا کہ دو عورتیں درخت کے نیچے آئیں۔ ایک نے دوسری سے پوچھا کہ وُہ کتنی بار اپنے دوست سے مل چکی ہے جواب ملا کہ دوستوں کی ملاقات ایسی چیز نہیں جس کا حساب کتاب رکھا جائے۔ یہ سنتے ہی تسبیح شاہ لطیف کے ہاتھ سے گر پڑی اور اِس کے بعد اُس نے تسبیح پھیرنی چھوڑ دی۔ ایک دفعہ سنگر دنہر کے پاس کچھ بکریاں آئیں اور انہوں نے پانی پی کر نہر میں مینگنیاں کر دیں۔ شاہ نے سوچا کہ جب تک وُہ پیاسی رہیں اُنہوں نے ایسی حرکت نہ کی لیکن جب اُنہیں پانی مل گیا تو انہوں نے یہ بے جا حرکت کی۔ اِس پر اُس نے کہا کہ محبوب کے دیدار سے اُس کی جُدائی انسان کے لئے بہتر ہے۔

عاشق آپ معشوق بہ آپی   دوجھا بیچ سماوے کون
بیدل سُن العشق ھو اللہ   اس بن مار جیواوے کون

عام سندھی بھی پنجابی سے کچھ ملتی جلتی ہے۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا بلکہ سارا مضمون ختم کر چکا تھا کہ حاتم علوی صاحب کی وساطت سے میں ڈاکٹر ایچ ایم گوربخشانی اسسٹنٹ پرنسپل ڈی جی کالج سے ملا۔ ڈاکٹر گوربخشانی نے حال ہی میں شاہ عبداللطیف پر تین جلدوں میں سندھی میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ وُہ انگریزی سنسکرت عربی فارسی سندھی پنجابی اُردو وغیرہ کئی زبانیں بخوبی جانتے ہیں۔ میں بالکل ایک کاروباری آدمی کی طرح اُن سے ملنے گیا جیسے کوئی امریکی کسی غیر ملک کی سیر کو آئے۔ اور جلد جلد اپنا مطلب حل کرنا چاہے۔ میں نے جاتے ہی شاہ عبداللطیف کا ذکر چھیڑ دیا اور سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ "آپ شاہ کی شاعری سے خوب واقف ہیں تو مجھے اُس کا تھوڑا سا نمونہ دکھا اور سمجھا دیجئے۔ کیا واقعی آپ شاہ کو ایک بڑا شاعر سمجھتے ہیں؟ کاش آپ اُردو جانتے اور اُردو میں شاہ پر ایک کتاب لکھ دیتے۔"
ڈاکٹر صاحب نے اطمینان سے جواب دیا: "علوی صاحب سے میں ذکر کر چکا ہوں کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اور آپ کے عزیز میرے ہاں فلاں روز چائے پر آئیں۔ میں چند اَور علمی ادبی اصحاب کو بھی بُلالوں گا۔" میں گھبرا گیا اس قسم کی چائے سے میری ادبی پیاس کیسے بجھ سکتی تھی؟ بلکہ اس کا اثر تو اُلٹا ہوگا اور میں اپنے مدعا سے محروم رہ جاؤں گا۔ میں نے چائے پارٹی سے گریز کرنا چاہا مگر وہ نہ مانے۔ آخر یہ طے پایا کہ پارٹی سے ایک گھنٹہ قبل میں اُن کے ہاں آجاؤں اور وہاں صرف ہم دونوں موجود ہوں اور ضروری باتیں کریں۔ میں نے دوبارہ پوچھا "شاہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا انگریزی یا اُردو میں اس کی شاعری پر کوئی کتاب ہے؟ اگر نہیں تو آپ لکھئے اور کیا آپ اُردو جانتے ہیں؟" اُنہوں نے جواب دیا "شاہ واقعی دُنیا کے بہترین شاعروں میں شمار ہونے کے قابل ہے میں اُسے حافظ کے برابر سمجھتا ہوں۔ اور انگریزی اُردو میں کوئی ایسی کتاب نہیں۔ اور اُردو میں مَیں نے غالب اور اقبال کا کلام پڑھا ہے۔" اُن سے غالب اور اقبال کا ذکر سُن کر میں خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ چائے اور لطیف "ادبی گفتگو کا دن مقرر ہو گیا۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے انگریزی میں شاہ کے متعلق ایک کتاب دی جو ۱۸۸۹ء میں ایک سندھی لیلا رام وطن مل کی لکھی ہوئی تھی میں اسے لے آیا اور پڑھنا شروع کیا۔ دیباچے میں مصنف لکھتا ہے کہ اُس نے آٹھ سال تک شاہ لطیف کے کلام کا مطالعہ کیا اور اِس غرض سے وُہ دو سال قرآن حدیث تصوّف وغیرہ سے واقفیت حاصل کرتا رہا۔ پنجابی میں اُس نے ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال بھی پڑھے۔ اس کتاب سے جس کا سرورق غائب ہے معلوم ہُوا کہ شاہ عبداللطیف سندھ میں ہالہ حویلی کے گاؤں میں جو بھٹ سے تقریباً ۱ میل پر واقع تھا سنہ ۱۱۰۲ھ یعنی سنہ ۱۶۸۹ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۴ صفر سنہ ۱۱۶۵ھ (بمطابق سنہ ۱۷۵۲ء) کو ۶۳ سال کی عمر میں مر گیا (اسی زمانے میں پنجاب میں وارث شاہ نے اپنی ہیر رانجھا سنہ ۱۷۶۶ء میں لکھی۔) شاہ لطیف کو سندھ کا بُلّھے شاہ سمجھنا چاہیئے۔

کے کنارے لے آئی۔ اسی طرح اُمر اور مرومی اور رانا اور مومل کے قصے ہیں۔ سب سے زیادہ گیت سچو کے ہیں جو سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی کی مدد سے سندھی سے ترجمہ کرنا سوہان رُوح ہے۔

کاش تو بول سکے اے کوّے!
اور بتائے کہ میرے محبوب کا کیا حال ہے؛
کیونکہ جُدائی نے مجھے بے حال کر رکھا ہے
اور غم میری دردمند رُوح پر چھا گیا ہے (سچو)

سوہنی کہتی ہے:-

کاش میں ہمیشہ ہی اپنے محبوب کے پہلو میں رہوں
اور جونہی یہاں سے چلوں فوراً ہی اُس کے پاس پہنچ جاؤں
کاش میں اس کنارے زیادہ دیر نہ ٹھہروں
لیکن افسوس کہ پانی گہرا ہے اور موجیں تیز ہیں
اور میں تیرنا نہیں جانتی۔ سو میں اپنی "چاٹی" لوں گی
اور ایک بار جب میں چل دوں گی تو ہرگز نہ لوٹوں گی
بلکہ وہاں پہنچ کر اپنی "چاٹی" کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی
اور پھر کبھی اس کنارے واپس نہ آؤں گی
یوں گیت گاتا ہے اصغر کہ "محبت کی نظروں میں
یہ دریا جو اتنا چوڑا ہے محض ایک ندی ہے ذرا سی!"
یہ اصغر شاعر ہمارے راشدی صاحب کے جدّ امجد تھے۔

دوسری کتاب "دیوانِ بیدل" سندھی میں ہے۔ اس سندھی شاعر نے کئی زبانوں میں شعر کہے ہیں

عربی:- صرفت العمر جہلاً فی الخطایا — حسبت معجباً خیر البرایا

(یعنی تُو نے اپنی جہالت کی وجہ سے خرابیوں میں عمر گزاری۔ تجھے دھوکا ہوا کہ تُو لوگوں میں سب سے افضل ہے)

فارسی:- عشقش نہ منصبے ست کہ ہر خس بدو رسد — بلک از ہزار خاص یکے کس بدو رسد

اُردو:- دو جگ کا بادشاہ ہے مستِ شرابِ عشق — عالی ہے ہر جناب سے لاشک جنابِ عشق

اس کی ملتانی سے ملتی جلتی سندھی کے بعض شعر سمجھ میں آجاتے ہیں:-

[illegible]

وہاں کی زبان کے حروف اور چند فقرے سیکھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔ جب یہ سیکھ لیتا ہوں تو شوق اور اُس کے ساتھ میرا مبلغ علم پورا ہو جاتا ہے۔ سندھی قاعدہ حاصل کر کے چند روز میرا یہ معمول ہو گیا کہ کسی باغ میں جس سیر کرنے والے یا کسی پارٹی میں جس سندھی جاننے والے واقف کار کو دیکھ پاتا فوراً جیب سے سندھی قاعدہ نکال کر سبق لینا شروع کر دیتا۔ پہلے چند سبق بہت دلچسپ تھے۔ ایک یہ بھی لُطف آیا کہ حروف کے ساتھ ساتھ تصویریں تھیں۔ پھر بچپن کے مزے لئے۔ "سنڌي ٻاراڻو ڪتاب" یعنی سندھی کی کتاب بچوں کے لئے مزیدار ہے۔ پہلے کتاب کا عنوان ہی لیجئے۔ دیکھئے سندھی کا رسم خط عربی ہے فارسی نہیں۔ یہ دو نقطوں والی ڌ ہماری دھ ہے۔ سندھیوں کو دو چشمی حروف پسند نہیں اُن کے ہاں دو آنکھوں کی جگہ نقطے ہی نقطے ہیں۔ معمولی ب کے علاوہ ایک اور دو نقطوں والی ٻ ہے اگر ملاحظہ ہو کہ نقطے ایک دوسرے کے نیچے ڈالے گئے ہیں (اُس کا تلفظ میں نے بیسیوں دفعہ کیا مگر صرف یہ سمجھ میں آیا کہ معمولی ب انسان کی آواز ہے اور دُو نقطی ٻ بکری کی آواز ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ اوّل تو بکری سندھی میں اس ٻ سے لکھی جاتی ہے اور دوسرے یہ آواز بالکل بکری کی "بے بے بے" سے ملتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے سندھ کے صحراؤں میں بکریاں کثرت سے ہوتی ہیں جب ہی انسانوں کو ان معصوم ہستیوں کی زبان سے بھی آشنا ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح عجب نہیں اگر سندھی میں اونٹ کی آواز کی نشانیاں بھی پائی جائیں کیونکہ یہ عربی جانور ماشاء اللہ یہاں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ یہاں مہذب سڑکوں پر اکثر ربر کے پہیوں والی گاڑی کھینچتے ہوئے اونٹ میں نے دیکھے جو ایسی بے نیازی سے مُنہ اُٹھائے چلے جا رہے ہیں کہ میں نے بے اختیار اُنہیں ذوق کے اس شعر سے خطاب کیا کہ؎

مُنہ اُٹھائے ہوئے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے — ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا

مگر اونٹ صاحب سندھی اور عربی کے سوا کچھ سمجھتے تو جواب دیتے۔ انجمن ترقئ اُردو (ہند) کو انجمن ترقئ اُردو (کراچی) کی توجہ اس طرف مبذول کرانی چاہئے۔ سندھ خواہ ہندوستان میں شامل ہو یا پاکستان میں اُس کے انسانوں حیوانوں کو اُردو ضرور سیکھنی پڑے گی۔

ب کے نیچے یوں ڀ چار نقطے ڈالے جائیں تو وہ بھ ہو جاتی ہے۔ اب بیچاری ت کی باری ہوئی ت ث کے علاوہ یہاں تین اَور ت نما حروف ہیں یہ ٺ ہے ٹھ اور یہ ٽ ہے ٹ اور یہ ٿ ہے تھ۔ پھر پ کے ساتھ ایک ڦ بیٹھی ہے یہ پھ ہے۔ ج کے بعد ڄ ہے یہ بی ملی جیم ہے پھر جھ ہے جو جھ اور گھ کے علاوہ سندھ کی تنہا دو چشمی ہستی ہے۔ پھر ایک اور ج آتی ہے جس میں ن ملا ہوا ہے۔ ڃ چھ ہے۔ دال کے خاندان میں بھی کھلبلی مچی ہے ڌ ہے دھ، پھر دو ڈالیں ہیں ڏ ڊ ڍ ڙ (پنجابی ڈڈّو کا بھائی) یعنی مینڈک کی بولی ہوئی ڈال ہے اور ڊ یعنی معمولی انسانی ڈال۔ ڍ ہے ڈھ۔ ڙ گیا ہے ڑ۔ گ دو بلکہ تین ہیں ایک معمولی گ ہمارے گ جیسا یعنی گدھوں والا گاف اور دوسرا ڳ ہے ڳو والا (لفظاً تو ہمارے پنجابی ڈھگے کا بھائی ہے لیکن حرفاً مختلف ہے)۔ پھر ڱ ہے ن ملا گ۔ اور ک ہے کھ۔ اور ہمارا کاف ہے یوں ڪ۔ ن کا ایک اور کرخت بھائی ہے ڻ جو ڑنڑ پکارا جاتا ہے۔ اور یوں یہ عجائبات تمت بالخیر ہوتے ہیں۔ سندھی میں کل ۵۲ حروف ہیں اگر سیکھنے ہوں یا محض دیکھنے بھی ہوں تو یہ لیجئے حاضر ہیں:۔

خُدا کی قدرت اور غازی صاحب کی برکت کہ عین کھاری سمندر کے کنارے اِس کھوہ میں میٹھے پانی کا چشمہ جاری ہے سینکڑوں عقیدت مند ہر روز دُور دراز مقامات سے آتے ہیں اور یہ مقدس پانی پیتے اور اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ یہ کہہ کر اُس نے گلاس پیش کیا۔ نیم اندھیرے میں مجھے کچھ تری سی دکھائی دی۔ کہنے کے مطابق میں نے اپنا بوٹ اُتار دیا اور چشمے کی زیارت کو آگے جھکا لیکن زیارت کرنے کے بعد میں نے پانی پینے سے معذوری ظاہر کی۔ خضر آبِ حیات پیش کر رہا تھا، سکندر ہی کو پینے کی توفیق نہ ہوئی۔ جواری نمبر۲ نے کہا دیکھئے ہندوؤں نے بھی مندر سمندر کے کنارے بنایا اور بہتیری کوشش کی مگر اُن کی کھوہ میں سے پانی نہ نکلا پر نہ نکلا۔ میں نے خیال کیا واہ یہ بھی خُدا کی مہربانی اور ایشور کی کرپا ہے کہ روزِ روشن میں ہندو مسلمان اپنی اپنی کھوہ میں رام اور رحمان سے لَو لگائے بیٹھے ہیں۔ اُدھر کبوتر پل رہے ہیں اِدھر میٹھے پانی کی سبیل لگی ہے اللہ اکبر! منظر اور میں اپنے قیام کے آخری دنوں میں اپنا اپنا کیمرہ لئے جا بجا جا کر تصویریں لیتے رہے۔ ایک دن ہم غازی کی درگاہ میں بھی جا پہنچے۔ مجاور صاحب فوراً اپنی کھوہ سے نکل کر نیا عمامہ پہن کر کسی سینما سٹار کی طرح شوق سے تصویر اُتروانے کو تیار ہو گئے۔ میرے تجربے میں تصویر کھچوانے کا شوق ہر زندہ ہستی کو دامن گیر ہے۔

ایک دفعہ ایک سندھی آئی سی ایس مسٹر کرپلانی نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ سندھی زبان میں ایک زبردست شاعر گزرے ہیں شاہ عبداللطیف، اُنھوں نے کہا انہیں دُنیا کے بہترین شاعروں میں شمار کرتا ہوں۔ سوندھ میں آکر مجھے اکثر شاہ عبداللطیف یاد آتا۔ ایک سندھی ہندو میرا یہ شوق دیکھ کر ایک رات ہمیں صوفیوں کی ایک مجلس میں لے گئے مجلس ایک ہندو "صوفی" کے بنگلے میں منعقد ہونے والی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ ہر اتوار کو یہ لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں۔ کمرے میں ایک تخت تھا جس پر ایک داڑھی والے بزرگ کی بڑی تصویر رکھی تھی۔ اس کے سامنے سب لوگ عورتیں مرد فرش پر بیٹھے تھے، ہم بھی بیٹھ گئے۔ جو عقیدت مند آتا وہ داڑھی والے بزرگ کی تصویر کے سامنے جا کر سر جھکاتا اپنے ہاتھوں کو چُومتا اور فرش پر بیٹھ جاتا۔ میں نے اپنے "فرشتۂ رحمت" سے پوچھا یہ کن بزرگ کی شبیہ مبارک ہے۔ جواب ملا کہ یہ ہیں "سخی قبول محمدؐ" جو ۹۸ سال کی عمر میں تھوڑا عرصہ ہوا عالمِ بقا کو سدھارے۔ یہ بڑے بزرگ تھے بڑے صوفی تھے بہت لوگ اِن کے معتقد ہیں۔ تیس چالیس آدمیوں میں ہمارے علاوہ دو تین آدھی اور پوری داڑھی والے مسلمان تھے باقی سب ہندو مرد عورتیں تھیں۔ رفتہ رفتہ گانا بجانا شروع ہوا ہارمونیم گھڑا ستار سارنگی اِن سب سے معرفت کی تانیں نکلیں خاص سماں بندھ گیا جس سے معتقدین پر ایک خاص کیفیت چھا گئی۔ موسیقی نے مجھ پر بھی اثر کیا۔ ایک نوجوان ہندو نے جو کراچی میں سندھی کے پروفیسر ہیں بڑے جوش سے ایک کافی گائی جس کے الفاظ کچھ اس طرح تھے "نہ میں تاب نہ میں بے تاب نہ میں آب و تاب تاب!" لیکن سچ یہ ہے کہ اُن کے نغموں نے آب و تاب بھی پیدا کی اور تاب بھی اور بے تابی بھی، شاید صوفیوں کی دُنیا میں نفی اثبات کے معنی رکھتی ہو! ایک شخص کے پاس بیاض تھی میں نے اُٹھا کر دیکھی تو اُس میں شاہ عبداللطیف کی ایک آدھ کافی بھی تھی۔ مطلوبہ تعارف ہو گیا۔

اِنہیں شاہ عبداللطیف کے نام اور کلام کی کشش کے سبب میرے دل میں اُمنگ اُٹھی کہ میں ایک سندھی قاعدہ حاصل کر کے سندھی کی اب ت سیکھ لوں۔ زبانیں سیکھنے کا یوں بھی مجھے شوق ہے۔ جس ملک یا صوبے میں جاؤں کم از کم

ہزار روپیہ کا بیمہ کرالیا اور کمپنی سے یہ طے کرلیا کہ اگر میری بیوی خُدانخواستہ ڈوب گئی تو کمپنی فوراً مقررہ رقم ادا کردے گی۔ اِس کے بعد ایک طرف تو ان حضرت نے اپنی بیوی سے بے حد محبت کرنی شروع کردی اور دوسری طرف اُن تمام مقامات کا جائزہ لینا شروع کیا جہاں سے عدم آباد کو سیدھا رستہ جاتا ہو۔ اتنے میں وُہ بھلی مانس حاملہ ہوگئی۔ اب اِس عقلمند کو اور بھی فکر لاحق ہوگئی چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ایک دن آپ اُسے محض تھوڑا سا زیور پہنا کر کلفٹن کے سامنے والی خطرناک چٹانوں میں (جو سمندر کے عین بیچ میں واقع ہیں) سیر کے لئے گئے اور شام کے وقت اُسے احتیاط سے سمندر میں دھکا دے کر شور مچانا شروع کر دیا ہائے میری بیوی ہائے میری بیوی۔ ملاح بھاگے آئے تو کہا یہ سنبھالو میری سونے کی گھڑی میں تو ابھی مرتا ہوں۔ اُنہوں نے دم دلاسا دیا۔ مجبوراً مان گئے۔ مقدمہ چلا اور دو دفعہ چلا جب کہیں جاکر یہ فیصلہ ہوا کہ اِس باوفا شوہر کو سرکار کے خرچ پر جلد اپنی چہیتی بیوی کے پاس پہنچا دیا جائے۔ آل انڈیا نسوانی کانفرنس کو ایسے بیوی پھینک مردوں کے حق میں خاص ریزولیوشن پاس کرنا چاہئے!

ہندوستان کی بعض اور سوغاتیں بھی یہاں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ پیر پرستی کا خوب زور ہے۔ "خواجہ خضر" سندھ کے "زندہ پیر" ہیں ہندو بھی انہیں دریائے سندھ کا دیوتا مانتے ہیں۔ سکھر کے مقام پر دریا میں ایک جزیرے پر ایک درگاہ اُن کے نام سے منسوب رہی۔ علاوہ بریں پیر پگاڑا شاہ، پیر ظاہر الدین، داتا لاکھ پرشاد اور اور خُدا جانے کون کون؟ اس پیر کے پیرو اُسے خُداوند مانتے ہیں اُس داتا کے ہاں مرد عورت اور عورت مرد بن جاتی ہے۔ نہ مسلمان اِس مرض سے بری ہے نہ ہندو۔ مغرب کم از کم اِس بلا سے تو محفوظ ہے۔ کیا پیر پرستی خدا پرستوں ہی کے لئے وقف ہے؟ "ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!" ہمارے قریب سمندر کے کنارے ہندو مسلمانوں کے ماتھا ٹیکنے کی جگہیں ہیں۔ ایک طرف پیئر[1] (Pier) کے ساتھ ایک مہادیو کا مندر ہے جس کے باہر جلی حروف میں لکھا ہے کوئی غیر ہندو اندر نہ آنے پائے۔ مندر ایک کھوہ میں بنا ہے۔ اندر ایک مورتی ہے کچھ پجاری ہیں ایک لمبے بالوں والا سادھو بھی بھبھوت رمائے بیٹھا ہے۔ ساتھ ایک کبوتر خانہ ہے۔ جس میں سینکڑوں پالتو کبوتر ہیں۔ جتنا دانہ پانی اِن پرندوں کے لئے مہیا کیا جاتا ہے شاید اِن کے بعض ہمسایہ انسانوں کو کبھی نصیب نہ ہوتا ہو۔

چار پانچ سو گز کے فاصلے پر ایک ٹیلے کے اُوپر غازی عبداللہ شاہ کا مزار ہے۔ نیچے ٹیلے کی کھوہ میں ایک پنجابی مجاور صاحب مع اپنی بکریوں گایوں اور حواریوں کے جلوہ گر ہیں۔ مجھے دیکھ کر ایک حواری نے کُرسی آگے رکھ دی۔ میں بیٹھ گیا۔ مجاور صاحب فرمانے لگے یہ حضرت غازی عبداللہ شاہ کا مزار ہے جو سندھ میں محمد بن قاسم کے ہمراہ چھ سو سال ہوئے آئے اور یہیں شہید ہوئے۔ میں نے سوچا کہ محمد بن قاسم کو یہاں آئے چھ دُونی بارہ۔ بارہ سو سال ہوگئے مگر میں نے بحث چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے بعد اشارہ ہُوا تو ایک دوسرا حواری مجھے کھوہ کے اندر لے گیا اور کہا کہ دیکھئے

[1] پیئر ساحلی مقامات میں ایک کئی سو گز لمبی پُل نما عمارت ہوتی ہے عموماً سمندر کے کنارے پانی میں ایک آبی تفریح گاہ کے طور پر بنائی جاتی ہے۔ لیکن کلفٹن کا یہ پیئر پانی تک نہیں پہنچتا۔

اپنے محل میں محصور ہو جائے تو اُسے لوگوں کی حالت سے اَور بھی کم واقفیت ہوتی ہے۔ اُس کی نزاکت اَور لطافت اُسے اجازت نہیں دیتی کہ وُہ ایک ہمدرد دل رکھتے ہوئے بھی عام لوگوں کے رنج و راحت میں شریک ہو اَور اس طرح زندگی کی اُونچ نیچ سے آگاہ ہو سکے۔ پھر بھی غربت اَور عُسرت کی ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ کوئی شخص جس میں ذرا سا احساس بھی باقی ہے اپنے گرد و نواح سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہماری کوٹھی سے دو تین سو گز کے فاصلے پر نشیب میں ایک چھوٹی سی بستی ہے جس میں دس بارہ ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں ہوں گی۔ یہاں سے ہر صبح و شام چند بچے سمندر کے گھونگے اور سیپیاں لے کر آتے اور سیر کرنے والوں سے خریدنے کو کہتے ہیں جن سے میں نے پوچھا تو معلوم ہُوا کہ یہ بھیل ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے جھگڑالو اپنے محلوں اور گھروں میں مزے سے بیٹھے ہیں اور ملک کے اصلی باشندوں کو جھونپڑیاں بھی نصیب نہیں!

صبح و شام سمندر کی سیر کو جاتے ہوئے بیسیوں مچھیرے نظر آتے تھے۔ ان کے علاوہ کوئلے والے تھے۔ میرے لئے یہ ایک نئی بات تھی کہ کوئلہ سمندر سے بھی نکلتا ہے۔ ایک کوئلے والے سے میں نے پوچھا جو کوئلے کا ایک بہت بڑا ٹکڑا شاید من ڈیڑھ من کا اپنی پیٹھ پر اُٹھائے لئے آ رہا تھا کہ وُہ ہر روز کتنا کوئلہ سمندر سے لاتا ہے اور کتنی کمائی کر لیتا ہے۔ اُس نے کہا پندرہ آنے روپیہ روز کما لیتا ہوں۔ میں نے پوچھا ہر روز؟ اُس نے کہا صاحب یہ صرف انہیں دنوں میں ہے جب کہ سمندر اپنی جوانی پر ہوتا ہے۔ اِدھر سمندر صرف دو تین چار مہینے جوش میں رہتا ہے اور اپنا سارا کوئلہ باہر نکال پھینکتا ہے۔ پھر جب بارش کے موسم کے بعد سمندر ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو کوئلہ آنا بند ہو جاتا ہے۔ اگر مجھے یہ نہ بتایا جاتا تو میں شاید یہی سمجھتا کہ یہ سارا کوئلہ برطانوی بحری بیڑے کی خیرات ہے ہمارے ملک کے لئے۔

ایک دن میں نے یہاں کے اخبار میں پڑھا کہ دن دہاڑے تین ڈاکٹروں پر چند ڈاکو آ پڑے اور ذرا اُن کی مرمت کر دی ایک ڈاکٹر صاحب نے جو ہندو تھے دُہائی بھی دی کہ میں تو مسلمان ہوں مگر اتنے میں مسلمان ڈاکٹر صاحب بھی پٹ چکے تھے۔ پولیس کا بیان ہے کہ مہذب حضرات کی طرف سے کچھ چھیڑ خانی ہوئی تھی۔ اسی طرح کا واقعہ ایک دن ہمارے تین بچوں کو بھی پیش آیا۔ ایک دن شام کے وقت تین عدد ڈاکو ان کو سمندر کے کنارے گھیر بیٹھے۔ لیکن یہ ڈراما جلد ختم ہو گیا۔ ایک ڈاکو منظر کو الگ لے گیا اور اُس سے کلمہ پڑھنے کو کہا۔ یہ نمازی تھے فوراً فر فر کلمہ پڑھ دیا۔ اس پر خدا ترس ڈاکو نے دوسروں سے اصرار کیا کہ یہ سب رہا کر دیئے جائیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اِن مُبلغین کو خاطر خواہ سزا مل گئی۔ لیکن ذرا غور کرو تو ایسے واقعات عموماً اُس بے پناہ غربت کا پتہ دیتے ہیں جو یُوں تو ہندوستان جنت نشان کے ہر کُنجِ عافیت میں پناہ گزیں ہے لیکن جو خاص کر سندھ سے ریگستان میں جلوہ نما ہے۔ ایسے واقعات کی فہرست میں ہمارے ہندو بھائی بھی مسلمانوں سے پیچھے نہیں۔ چنانچہ (Oyster Rock) سمندر کی چٹانوں والے سنسنی خیز قتل کا مقدمہ ہمارے دورانِ قیام ہی میں ہوا۔ ایک دُور اندیش شخص من سکھانی نے جس کی آمدنی ۵۵ روپیہ ماہوار تھی فروری سنہ ۴۰ء میں ایک خاتون سے شادی کی اور شادی کے جلد بعد مختلف بیمہ کمپنیوں سے خط و کتابت کر کے اپنی شریمتی کا تقریباً بیس

پنجابی کی ایک ضرب المثل ہے "ذات کی چھپکلی اور شہتیروں سے ہمکنار" یہ حال ہم ½ فی صدی "مہذب" ہندوستانیوں کا ہے۔ "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے" مٹن چاپ چھری کانٹے سے کھا رہے ہیں لیکن اس کے بعد جو سالن کی نوبت آئی تو بائیں طرف رکھی ہوئی انگریزی پلیٹ میں سے دیسی چپاتی دائیں ہاتھ سے کھا رہے ہیں۔ دُھوبی کا کُتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ یہ درست ہے کہ اب پُرانی دُنیا کبھی واپس نہیں آسکتی لیکن ہماری نئی نویلی پیوندلگی دُنیا بھی ہمارے لئے اطمینان بخش ہرگز نہیں۔ مشرقی سُستی اور مغربی چُستی کا ملاپ کچھ کامیاب نہیں رہا۔ اپنے پُرانے تمدّن کو ہم حقارت سے دیکھتے ہیں لیکن نئے فلسفے نے ہمیں زیادہ سے زیادہ نفسیاتی تجزیہ کرنا، بے چین رہنا، انگریزی ہندوستانی کو ملا کر بولنا، اپنی آمد سے اپنا خرچ بڑھانا ہر تیسرے دن کسی پارٹی میں شریک ہونا ہر دوسرے دن سینما دیکھنا اور ہر روز تازہ ترین خبروں کے لئے اخبار پڑھنا سکھا دیا ہے۔ اس کا کیا انجام ہوگا؟ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اس وقت رَو تیز ہے ہم سب بہے جا رہے ہیں۔ دیکھئے کیا ہو؛

سندھ کی سیاست عام ہندوستانی سیاست سے بہتر نہیں شاید بدتر ہی ہو۔ یہاں بھی کانگرس ہے لیگ ہے ترقی سی ہے لیکن زیادہ تر جاہ طلبی ہے خود غرضی ہے تعصب ہے۔ مسلمان ۷۰ فی صدی ہیں لیکن زیادہ تر غیر مسلم اثرات کے تحت میں ہیں۔ کانگرس اور صوبوں میں عدم تعاون کرتی ہے لیکن یہاں وزارت سے تعاون ہے۔ ہندو مسلم کشمکش کی ایک نہایت دلچسپ اور سبق آموز مثال یہاں سننے میں آئی۔ محکمۂ تعلیم والوں نے ایک علمی اصلاح کا اعلان کیا کہ قاعدے اور کتابوں میں جو غلط اعراب لگائے جاتے ہیں وُہ درست کئے جائیں۔ مخالفین نے اعتراض کیا کہ یہ عربی کی نقل ہوگی اور محض مسلماتی کا مظاہرہ۔ مصلحین نے مثال دے کر کہا کہ لفظ بکری میں بجائے ی کے زیر رکے نیچے لکھی جانی چاہئے مخالفین نے اصرار کیا کہ ی کے نیچے سے زیر نہ ہٹائی جائے۔ میرے پاس سندھی کا ۱۹۳۲ء کا سرکاری قاعدہ ہے جس میں کتاب کے نام میں سندھی کا لفظ یوں لکھا ہے سندِھی۔ اس بات پر سخت شورش برپا کی گئی کہ ی کے نیچے سے زیر نہ ہٹائی جائے۔ واہ رے ہندی جذبۂ قومیت! ہلکی نظر سے دیکھئے تو کئی مزیدار چیزیں دکھائی دیتی ہیں یہاں کی بعض توندل اور بعض منحنی شخصیتیں بُھلائی نہیں جاسکتیں۔ ایک دفعہ کہیں پڑھا تھا کہ دُبلے آدمی چڑچڑے ہو جاتے ہیں لیکن موٹے آدمی زندہ دل رہتے ہیں۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ انسانی چربی میں بہت کچھ سما جاتا ہے فربہی بہت کچھ ہضم کر لیتی ہے وُہ گھبراتی نہیں بے چین نہیں ہوتی مست رہتی ہے جو آئے سو آئے اور سر سے گزر جائے اِس لئے فربہ آدمی اچھا سیاست دان بن سکتا ہے۔ وُہ اصول پرست نہیں ہوتا مصلحت وقت کو دیکھتا ہے نہ را آفت آئے اُس کے کان پر جوں نہیں رینگتی اور سو جائے تو کوئی اُسے جگا نہیں سکتا؎

سودا کے جو بالیں پہ گیا شورِ قیامت　　　　خدّامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

سندھ میں بھی "فربہ خواہ مخواہ معتبر" کا تجربہ ہوا۔

ہم امیر لوگ غریبوں کی حالت سے بہت کم آگاہ ہوتے ہیں اور پھر اگر کوئی امیر گوشہ نشین ادیب یا پاکباز فلسفی بن کر

یا نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اُس کی ہیں   جس نے یہاں یہ شکل اختیار کی کہ   پنڈوں سمندر کے کنارے
رنجگہ اُس کا ہے دکھ اُس کا ہے کھجلی اُس کی ہے   پسوؤں کی فوج جس کے گھر ہیں مہماں ہوگئی

پسوؤں پر بہت سی فتوحات پا کر بھی پاؤں کی کھجلی نہ گئی کسی نے کہا تم کو وہم ہوگیا ہے ڈاکٹر نے کہا اعصابی کمزوری ہے میں نے بھی سوچا کوئی ایسی ہی چُلبلی وجہ ہوگی کہ اتفاقاً ایک دن صبح کو میرے سندھی سلیپر پر دو چار چیونٹیاں چلتی دکھائی دیں میں نے پاؤں تلے سے جھٹک دیا۔ چیونٹیوں کے ساتھ ایک دو پسو بھی قلابازی لگاتے گرے۔ تحقیقات سے معلوم ہُوا کہ پسوؤں کی قوم سے جوراتوں کو اپنا کاروبار کرتی ہے۔ چیونٹیوں نے ایک صبح آ کر انسانی مال و متاع میں سے حصہ طلب کیا، طرفین میں گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی جس سے پسوؤں کے مورچے کا پتہ چل گیا کہ اُنھوں نے "گھر بنایا تھا سکوتِ دامنِ بیزار میں"۔ یہ انہیں اہلِ سکوت کی حرکت کی برکت تھی جس نے ایک خاموش طبع انسان کو یوں "مجبورِ نوا" کر دیا ؎

یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر   زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

یعنی ایک معمولی سے جسمانی حادثے نے دنوں اور راتوں کو روحانیت کے بند دروازے قطعاً وا کر دیئے۔ کیا عجب ہے کہ نوعِ انسان کی بعض بڑی بڑی مہمات دراصل کسی پسو قسم ہستی کے مذاق کا نتیجہ ہوں!

ناانصافی ہوگی اگر میں اِن "روحانیات" سے مرعوب ہو کر انسانی دلچسپیوں کی کہانی بیان نہ کروں۔ کراچی خوب جگہ ہے صاف ستھرا شہر ہے۔ سڑکیں بازار کھُلے عمارتیں شاندار موسم معتدل بلکہ کم از کم اکثر پنجابیوں کے لئے ضرورت سے زیادہ معتدل۔ کہتے ہیں کراچی کی آب و ہوا ہندوستان میں بہترین ہے مگر اپنا اپنا تجربہ اپنی اپنی پسند فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ طبیعت پر ذرا سستی سی چھائی رہتی ہے۔ لیکن ہماری چُستی کی کہانی سنیئے۔ ہوائی جہاز میں سمندر کی سیر کی چڑیا گھر اور اُس کے بندر دیکھے۔ بندرگاہ میں گئے، بادبانی دُخانی کشتیوں میں سوار ہوئے، کراچی کے پاس کی ساحلی سیرگاہیں منورا، سینڈ سپٹ، بلیجی (جس کا نام یاد رکھنے کے لئے میں نے "کلیجی" کا خیال کیا) یہ سب دیکھیں۔ یہاں طوفانی سمندر کی شان نظر آئی۔ بلیجی کراچی سے دس پندرہ میل پر واقع ہے اس کی مستقل آبادی بیس تیس کالے کلوٹے غریب آدمیوں پر مشتمل ہے۔ اُمرا نے یہاں اپنی اتوار کی چھٹی گزارنے کے لئے ذرا ذرا سی چوبی جھونپڑیاں بنا رکھی ہیں جن کی محافظت بلیجیوں کا کام ہے۔ میں بلیجی کے گاؤں میں گیا اور وہاں اُردو میں اُن لوگوں سے بات چیت کرتا رہا۔ میں نے پوچھا اِن پاس کی پہاڑیوں کا کیا نام ہے جواب ملا "جبل"۔ اِس جبلِ بلیجی سے مجھے فوراً جبل الطارق کا خیال آگیا!

ہم کراچی کلب کے ممبر ہوگئے لیکن ہم نے دیکھا کہ آج کل کی کلب کی زندگی میں اگر کوئی نہ شراب پیئے پلائے اور نہ جُوا کھیلے اور نہ ٹینس ہی کھیلے تو وہ باقاعدہ طور پر کلب باشی نہیں کرسکتا۔ کلب مغربی تہذیب کا ایک ادارہ ہے۔ "مہذب" ہندوستانیوں کی زندگی مغرب کی یورش سے اَمل بے جوڑ ہو چکی ہے ؎

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے   واں کنڑ سب بلّوریں ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے

دیکھ کر مطمئن ہو گئے۔ ہمارے نصب العین کے اور ہمارے درمیان صرف چمکتی ہوئی ریت کا چھوٹا سا خطہ تھا۔ لیکن ہمیں جلد معلوم ہو گیا کہ لذتِ وصال اتنی آسان نہیں۔ پہلے تو یہ ہوا کہ سمندر کی زندگی بخش ہوا اس قدر تند و تیز نکلی کہ ہم بفضلہٖ چوبیس گھنٹے ریت پھانکنے لگے۔ کپڑوں پر، بدن کے روئیں روئیں میں کھانے پینے کی ایک ایک چیز میں ریگِ رواں کا جلوہ نظر آنے لگا۔ سمندر سمندر سمندر! یہ تو سامنے تھا ہی لیکن اس جنتِ نگاہ کے ساتھ جب ریت ریت ریت اور چمک چمک چمک مل گئیں تو جلوۂ جاناں سے نگاہیں خیرہ ہونے لگیں اور خصوصاً میری جس کا یہ حال ہے کہ

نزاکت اس گلِ نرگس کی دیکھیو بھیّا! شعاعِ مہر جو چھو جائے آنکھ ہو خیرہ

بہت کوشش کی کہ ریگستان کے نظارے سے عربستان کی یاد تازہ ہو اور اونٹوں والی گاڑیوں سے پاکستان کا سلسلۂ رسل و رسائل مگر ہندوستان کے اس شہری تہذیب کے خوگر اس ننھی نازک بدن بدیسی مہمان کو یہ تیز ہوا اور یہ چمک دمک راس نہ آئی پر نہ آئی۔ نازک آنکھوں کے لئے یہ "جلوۂ طور" نگاہ سوز ثابت ہوا۔ مجبوراً خانہ نشین ہونا پڑا۔ لیکن اہلِ معرفت کو چین کہاں نصیب، اُن کے لئے جد و جہد ہی زندگی ہے۔ اول تو نیند تیز ہواؤں ہی کی نذر ہو گئی پھر جو رتجگے کا ذرا لطف آنے لگا تو رات بھر بدن میں خارش ہونے لگی۔ ڈاکٹروں سے صلاح کی خود غور و خوض کیا گھر والوں کے سامنے قصہ بیان کیا مچھلی کھانی چھوڑ دی نیمبو پانی پینا چھوڑ دیا مسہل لیا دن کو بستر جھڑوایا کمرہ صاف کرایا مگر وہ اپنے آپ سے شبانہ کشتی بدستور جاری رہی۔ قریب تھا کہ میں خدا کی خدائی سے مایوس ہو جاتا کہ ایک رات جو میں نے اپنی برقی "ٹارچ" جلائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ پسوؤں کی جرمن فوج میرے قلب و عقب و میمنہ و میسرہ پر للہ بولتی ہوئی آ رہی ہے۔ بہت جھلایا۔ آنٹرا ہاتھ پاؤں پر امونیا چھڑکا، بدن پر تیل ملا، کسی حسینہ کی طرح منہ پر پوڈر کی تہہ جمائی لیکن جو ہونا تھا ہوا اور ہوتا رہا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ اب ہم نے اپنے عزیز و اقربا اور متوسلین و ملازمین کو جمع کر کے ایک اتحادی جنگی کونسل قائم کی۔ پلنگ کی نواڑ کھلوا دی، آبِ گرم سے اس کے پائے دھلوا دیئے، ایک ایک کونے میں فلٹ کی پچکاری چلوائی جب جا کے کہیں اس جرمن نما غنیم پر فتح پانے کے آثار سجھائی دینے لگے۔ اب جو کبھی اُن راتوں کا سماں پھر نظروں میں پھر جاتا ہے تو شب بیداری کی برکتوں سے دل بیزار ہو جاتا ہے چھٹی ساتویں جماعت کے کورس کی پڑھی ہوئی ایک نظم یاد آتی ہے کہ

جتنا دبایا اُتنا ہی اونچا اُچھل گیا ان کی تو پھرتیوں سے مرا جی ہی جل گیا

پسو ہمیں ستاتے ہیں صاحب پہاڑ پر

کراچی میں ان دنوں اپنے تینوں بچوں کو زیادہ انگریزی زدہ پا کر میں خود انہیں اردو پڑھانے لگا۔ دن کو رغبت کے ساتھ غالب و اقبال کے کلام سے لطف اندوز ہوتا اور رات کو خواہ مخواہ یہ اشعار وردِ زبان ہوتے، ؎

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

یا پھر وہ کسی بلا کے ایک دن معین ہونے والا شعر جس میں سوال کیا گیا ہے کہ "نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟"

آکسفورڈ جہاں بعد میں میں نے تعلیم حاصل کی اَور جہاں میرے بعد ہمارا اصغر گیا اور وہاں سے واپس نہ آسکا۔ دو خط والدِ مرحوم کے تھے جو انہوں نے کراچی کے ایک دوست کے نام مولن اور شملے سے مئی ۱۹۱۸ء میں لکھے۔ ان میں اپنے آئندہ پروگرام کا ذکر کیا ہے وہ پروگرام جو موت کے ہاتھوں اُسی سال ۲ر جولائی کو ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ خط میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اَور نیچے دستخط والدِ مرحوم کے تھے۔ کاغذ اور دستخط موجود ہیں دستخط کرنے والا چل دیا۔ یہ یادگاریں ہمارے لئے کتنی قیمتی اور کتنی دل خراش ہوتی ہیں!

کراچی کیا وہی کراچی ہے؟ کہتے ہیں اِس عرصے میں یہاں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں یہ شہر پہلے سے وسیع ہو گیا ہے بندرگاہ پہلے سے بڑی ہو گئی ہے۔ مانا جگہیں بھی تھوڑی بہت بدلتی ہیں لیکن اصلی تبدیلی تو انسان میں ہوتی ہے۔ پہلی بار جب میں نے کراچی کو بچپن کی آنکھوں سے دیکھا تو کراچی اَور تھی۔ دوسری بار جب میں نے اِس پر جوانی کی نظر ڈالی تو اَور تھی اَور اب اِس عمر میں زمانے کی اونچ نیچ سے گزر کر اسے دیکھ رہا ہوں تو یہ کچھ اَور ہی نظر آ رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا تو کچھ ویسی ہی رہتی ہے لیکن انسان اِسے اَور کا اَور بنا دیتا ہے۔

ایک بات مجھ میں تھی رہی اَور اب تک ہے سمندر کی کشش۔ جب ۱۹۱۰ء میں تعلیم کی غرض سے میں انگلستان گیا تو سمندر کو جی بھر کے دیکھا۔ قیامِ انگلستان کے دوران میں تو سمندر سے اکثر ہی واسطہ پڑتا تھا۔ انگلستان میں کوئی جگہ نہیں جو سمندر سے چھ گھنٹے کی مسافت سے زیادہ فاصلے پر واقع ہو۔ اسی لئے انگریزوں کو قدرت نے گویا زبردستی لیکن ساتھ ہی آسانی سے سمندر کا مالک بنا دیا اَور سمندر ہی کے طفیل یہ دُنیا کے پانچویں حصے پر حکمران ہو کر نپولین اور ہٹلر کو دُور باش کہتے آج تک اپنے گھر میں تقریباً محفوظ بیٹھے ہیں۔

کہنے کو تو ہندوستان کا ساحل کئی ہزار میل لمبا ہے اَور اس لئے یہاں کے باشندوں کو سمندر سے قریب کا تعلق ہونا چاہئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ کم از کم ہم شمالی ہندوستان والے خالص خشکی کے رہنے والے ہیں اَور سمندر کو ظاہراً ہماری زندگی سے دُور کی نسبت بھی نہیں ہمیں ناز ہے تو اپنے ہمالیہ اور اُس کی فلک بوس چوٹیوں پر یا پھر اُن پانچ دریاؤں پر جن کا نام لیوا پنجاب ہے۔

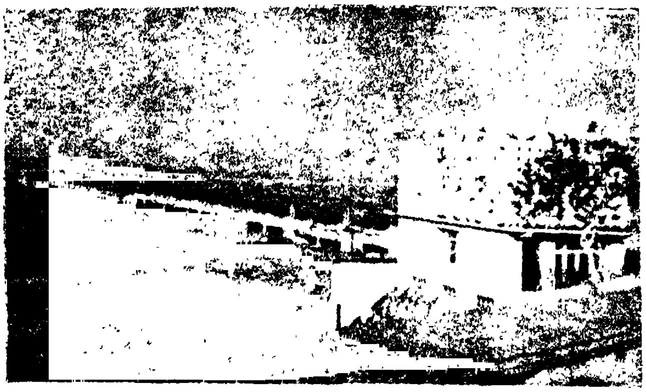
میں جب کہیں کسی نئی جگہ کی سیر کو جاتا ہوں تو وہاں پہنچتے ہی پہلے اُس کا نقشہ ڈھونڈتا ہوں۔ ایسا ہی میں نے یہاں کیا۔ ایک کتب فروش کی دُکان پر پہنچا۔ کہا کراچی کا "رہنما" اور نقشہ درکار ہے۔ نقشے کا نام سنتے ہی اُس نے کانوں پر ہاتھ دھرے اور مسکرا کر اُنگلی سے نفی کی علامت بنائی۔ میں حیران ہوا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اُس نے کہا چند دن ہوئے ہم نے کراچی کا نقشہ اپنی دکان کے باہر لٹکا رکھا تھا کہ ایک انگریز افسر غصے میں بھرا ہوا اندر آیا اور اُس نے کہا "تم لوگ لڑائی کے زمانے میں یہ نقشہ یہاں لٹکاتا ہے؟" یہ کہہ کر اُس نے نقشے کے پُرزے پُرزے کر دیئے تاکہ کہیں کوئی "پانچویں کالم" والا جرمن پسند شخص اس پر اپنا ہاتھ نہ ڈال سکے۔ میں نے "قانونِ تحفظِ ہند" کو یاد کرتے ہوئے اپنے گھر کا رُخ کیا۔ ابھی پچھلے مہینے مئی میں عراق میں وہاں کی نئی حکومت اور انگریزوں کے درمیان چپقلش ہوئی تھی، جرمن خطرہ کراچی میں تو آن کر نظر آ رہا تھا، کئی ہزار لوگ یہاں سے بھاگ نکلے تھے۔ ہم چھ مہینے کے لئے سمندر کے کنارے کلفٹن میں ایک کوٹھی کرایے پر لے چکے تھے ہم نے مصلحت اور ہمت اسی میں سمجھی کہ جرمن خطرے کے ہوتے ہوئے بھی ڈٹ کر اپنی جگہ پر قائم رہیں۔ شہر کو بلیک آؤٹ کے ذریعے کال کوٹھڑی بنانے کا محکمہ جسے انگریزی میں A.R.P اور سندھی میں "ھوائی حملی جی بچاءُ"

چند دن سمندر کے کنارے

سمندر سے مجھے ہمیشہ محبت رہی ہے۔ جب کبھی پہاڑ اور سمندر کا مقابلہ ہُوا میں نے ہمیشہ سمندر کا ساتھ دیا پہاڑ اٹل ہے لیکن سمندر میں جنبش ہے زندگی کی نشانی۔ میرا بس چلے تو میں سمندر کو ذوی العقول اشیاء کے زمرے میں جگہ دُوں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر جانداروں میں شامل ہے۔ پھر سمندر میں ایک اَور عجیب و غریب کیفیت پائی جاتی ہے۔ پہاڑ کثرت کی جلوہ گاہ ہیں تو سمندر وحدت کا آئینہ دار ہے۔ دُنیا کی تمام چیزوں میں شاید سمندر ہی ہے جو خدائے لایزال کی طرح واحد یکتا اور لامتناہی معلوم ہوتا ہے۔ جب میں سمندر کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہوں گویا میں خدا کے حضور کھڑا ہوں۔ وُہ افق تک اُس کی یکسانیت، وُہ دُور دُور اور اُس سے بھی دُور محض اُسی کا وجود، وُہ اُس کی پاکیزگی، وُہ اُس کی قوّت و عظمت، وُہ اس کی گہرائیاں ہر چند کہ یہ سبھی محدود ہیں مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوئی حد نہیں کوئی انتہا نہیں اور اگر ہے تو وہ لامحدودیت سے ہم کنار ہے۔ اگر میں اَن دیکھے خدا کا ماننے والا نہ ہوتا اگر میرا میلان یہ ہوتا کہ میں اُسے پوجوں جو دکھائی دے تو دُنیا کی سب چیزوں میں سے میں سمندر کو چُن لیتا اور اُس کے سامنے سرِ نیاز خم کرتا۔ اپنے سکون میں بھی مُتحرک، اپنی کثرت میں بھی واحد، اُس کی سخت گیری نرمیوں کا مجموعہ، انتہائی خاموشی اُس کی گہرائیوں میں، قیامت کی شورش اُس کے طوفانوں میں، ہر روز اُس کی شان نرالی، ہر لحہ زندہ ظاہر اور زبردست لیکن بایں ہمہ پُر اسرار اور ہمیشہ اپنے اندر مستغرق! ساحل سے دُور سمندر میں جہاں سمندر ہی سمندر ہو نیلے رنگ کی حکمرانی ہے۔ اُدھر اُوپر کو ہر طرف نیلا آسمان اور ادھر نیچے دائیں بائیں آگے پیچھے نیلگوں سمندر، اُدھر اُوپر خاموش و روشن آسمان اور ادھر نیچے بھی ایک آسمان زندہ و مُتحرک ہلتا ہلاتا جھولتا جھلاتا! ——
گویا ہماری سیمابی طشتری پر کسی کا "جام واژگوں"!

یہ تھے میرے خیالات سمندر کے متعلق، ایسی تھی میری عقیدت اُس سے جب اس دفعہ ۱۹۴۲ء کے موسمِ گرما میں مَیں نے اپنے بیوی بچوں سمیت کراچی کا رُخ کیا۔ اِس سے پہلے بھی مَیں دو بار کراچی آ چکا تھا۔ پہلی بار جب ۱۹۰۹ء میں سولہ برس کی عمر میں مَیں اپنے والد کی معیّت میں یہاں آیا اَور میں نے پہلے پہل سمندر کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا اور دوسری بار جنوری ۱۹۱۸ء میں جب والدِ محترم کی رحلت سے چھ ماہ قبل وُہ اور میں تبدیلِ آب و ہوا کی غرض سے یہاں آئے اور مجھے اس ہمایونی صحبت سے تنہا مستفید ہونے کا آخری موقع نصیب ہُوا۔

چند روز ہوئے دو تین خط ہاتھ آئے جن سے اُن گزرے ہوئے وقتوں کی یاد تازہ ہوئی منجملہ کے ایک کتاب میں سے میرے بہنوئی کا بھیجا ہُوا ایک تصویری کارڈ ملا جو لندن میں ۲۰ر جولائی ۱۹۰۹ء کا لکھا ہُوا تھا اور جو مجھے کراچی میں ۱۰ر اگست کو پہنچا۔ کارڈ پر آکسفورڈ کی تصویر تھی یعنی





کراچی میں سمندر کا نظارہ

علاج ہے پُرانے اداروں کی قطعی تبدیلی یعنی ایک عالمگیر انقلاب اخیر میں وہ کہتا ہے کہ جنگ کرو اس طرح کہ دنیا بھر کو ایک خاموش انقلاب سے بدل ڈالو اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو پھر یا تم اپنے لئے کہیں گڑھا کھود کر کچھ سونا دبا رکھو جس کے معنی ہیں کہ لوگوں کو دھوکا دو اور یا کسی طرف کو بھاگ نکلو اور پھر پکڑے جاؤ یعنی اس طرح زبردستوں کے آگے ذلیل ہو کر اپنا سر جھکا دو۔ شہرۂ آفاق فلسفی برٹرنڈ رسل کہتا ہے کہ میں ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ کا مخالف تھا اور بعد میں بھی میونخ تک میں صلح کا حامی رہا لیکن جب سے میں نے دیکھا ہے کہ جرمنی نے محض معاہدۂ ورسائی کی ناانصافی کا تدارک نہیں کیا بلکہ وہ اب خود دوسروں پر ظلم توڑ رہا ہے اور ایک عالمگیر سلطنت کی داغ بیل ڈالنا چاہتا ہے اُس وقت سے میں بھی جرمنی کے خلاف جنگ کا حامی ہو گیا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ "میں یہ تو مشکل ہی سے اُمید کر سکتا ہوں کہ اگر ہم جیت جائیں گے تو دنیا جنگ کے بعد ایک اچھی دنیا ہو جائے گی لیکن اگر ہم ہار جائیں گے تو غالباً ایک مدت تک دنیا جہنم کا نمونہ بنی رہے گی"۔ ہاں مجھے اس کی اُمید ہے کہ جنگ کے خاتمے پر لیگ اقوام سے کوئی مکمل ادارہ مرتب کیا جائے گا جس کے قیام سے ہمیں دُنیا کی فیڈریشن کی ایک جھلک دکھائی دینے لگے گی۔ مشہور انشا پرداز جوڈ لکھتا ہے کہ تمدن کا پہیہ پھر پھیر کر پھر وہیں آتا معلوم ہوتا ہے جہاں پہلے تھا۔ چنانچہ اشتمالی مصنف جان سٹریچی نے حال میں پہلی بار محبت اور صداقت کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اب اکثر سوشلسٹ اخلاقی تصورات کا اُس طرح ٹھٹھا نہیں اُڑاتے جیسا کہ وہ اڑایا کرتے تھے۔ اب زندگی کا مقصد صرف اس کا اپنا قیام نہیں بلکہ اُس میں اچھی زندگی کے عناصر یعنی حسن اور صداقت اور نیکی اور محبت بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں فرصت تعلیم اور مالی اطمینان کی ضرورت ہے۔ زندگی میں زری جدوجہد کافی نہیں باہمی محبت بھی ضروری ہے۔ مارکسیت نے صرف زندگی کے معاشی پہلو اور ذرائع پر زور دیا۔ سچی اشتراکیت ہمیشہ اخلاق اور مقاصد کو پیشِ نظر رکھتی ہے۔ جوڈ کہتا ہے کہ آکسفورڈ میں جو پچھلے دس سال اشتمالیت کا مرکز بنا رہا آج اخلاق کی پکار سنائی دیتی ہے مثلاً یہ کہ کیا خدا کا منشا تھا کہ یہ جنگ برپا ہو؟ آکسفورڈ کی مشہور یونین سوسائٹی میں حال میں ایک مباحثہ ہوا اور طلبا اس نتیجے پر پہنچے کہ جنگ کے بعد دنیا کی تجدید کی ضروری شرط یہ ہے کہ وہ منظم مذہب کے ذریعے سے خدا کی طرف پھر رجوع کرے۔ مباحثے کے بعد ایک شخص نے خوب کہا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ "خدا آنے والا انسان ہے"۔ دنیا کی آئندہ اصلاح یا درستی کے لئے قوت کا استعمال ضروری ہے لیکن بغیر محبت کے قوت صرف بے سود نہیں ضرر رساں بھی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے جون ۱۹۴۱ء میں اپنی ایک ریڈیو تقریر میں کہا کہ جنگ کے بعد دُنیا میں غالباً چار بڑے وفاق ہوں گے برطانوی امریکن وفاق، یورپی اور روسی اور جاپانی وفاق۔ سرمایہ داری کا نظام ختم ہو جائے گا معیشت کسی منصوبے کے ماتحت ہو گی لیکن یہ دُنیا نئی دنیا نہ ہو گی کیونکہ اداروں سے عقیدے نہیں بدلتے۔ انسانیت کے دل میں تلاطم ہونا لازم ہے نئے ادارے کافی نہیں یہ راہیں ہیں منزل نہیں۔ نئی دنیا کے لئے نیا ایمان ضروری ہے۔ نئی دنیا ایسے سیدھے سادے آدمیوں کی شکل میں ظاہر ہو گی جو بے غرض بے تکلف اور نیک آدمی ہوں گے جو دل کی بات کہیں گے اور وہ سب کے دل میں اُترے گی، وہ اداروں کو نہ بدلیں گے آدمی کو بدلیں گے۔ جو کچھ کام کا ہے وہ لے لیں گے مگر رُوح سب کی بدل دیں گے۔"

موجودہ جنگ میں کون جیتے گا اور کب تک؟ کس نظام کی فتح ہو گی اور کس حد تک؟ یا کیا سب ملیامیٹ ہوں گے یا سبھی تھک کے چور ہو جائیں گے؟ نہیں معلوم کیا ہو گا؟ —— ہاں دنیا بدلے گی ضرور، خدا کرے اچھی بدلے!

بشیر احمد

ایران میں داخل ہوئیں۔ اکتوبر میں افغانستان جرمنوں اور اطالویوں کے اخراج پر رضامند ہوگیا۔ اور دسمبر میں جاپان نے انگلستان اور امریکہ کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

جنگِ رُوس و جرمنی کے بعد ۱۴ اگست کو امریکی صدر رُوزولٹ اور برطانوی وزیرِاعظم چرچل نے بحرِ اوقیانوس میں مل کر ایک مشترکہ اعلان شائع کیا جو ممکن ہے دُنیا کی آئندہ تاریخ کے لئے ایک اہم ترین اعلانِ آزادی ثابت ہو۔ اس میں انہوں نے دُنیا کو یقین دلایا ہے کہ اُن کے پیشِ نظر کسی قسم کی فتوحات نہیں ہیں بلکہ وُہ تمام ملکوں کی چھنی ہوئی آزادی کو بحال کریں گے اور دُنیا میں ایک ایسا نظام قائم کرنے میں مدد دیں گے جس میں تمام قوموں کو خود اختیاری حاصل ہو دُنیا کی دولت میں اُن سب کو مناسب حصہ ملے اور سب قوموں کو غیر مسلّح کر دیا جائے تاکہ ہر کہیں امن وامان کا بول بالا ہو جائے۔ جرمنی نے اس تجویز کو بندر بانٹ تقسیم قرار دے کر جوابی اعلان کیا کہ اس کا صحیح جواب جرمنی کی تلوار دے گی یعنی وہی "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"۔ اس سلسلے میں ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ "اوقیانوسی" اعلان کے بعد بھولے بھالے ہندوستانی کہیں کہہ بیٹھے کہ یہ اعلان گویا ہم پر بھی عائد ہوگا۔ اس پر مسٹر چرچل نے غلط فہمی دُور کرنے کے لئے فوراً مزید اعلان کر دیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ بعض لوگوں کو شبہ ہے کہ اوقیانوسی اعلان بھی کہیں "دقیانوسی اعلان" ثابت نہ ہو!

یہ جنگ کیا اصولوں کی جنگ ہے؟ کیا جرمنی اور اطالیہ اور جاپان محض اپنی سلطنت بڑھانا چاہتے ہیں اور انگلستان اور روس اور امریکہ محض انصاف اور امن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی جنگِ عالمگیر کے بعد جرمنی کو کمزور کر دیا گیا اور جرمنی اور اطالیہ اور جاپان نے دیکھا کہ انگلستان اور فرانس نہ اپنے مقبوضات کو چھوڑنا چاہتے ہیں نہ اُن کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ باقی ماندہ ملکوں پر ہاتھ صاف کریں۔ سرمایہ داری اور سلطنت کی خواہش انہیں بھی تھی انہیں بھی۔ جب "مہذب" ترکیبوں سے قوت حاصل کرنا ممکن نہ رہا تو "محوری" طاقتوں نے علانیہ ڈاکو بن کر اِدھر اُدھر چھاپے مارنے شروع کئے یہاں تک کہ جنگ ٹھن گئی۔ اب دونوں فریق دُنیا والوں سے ایک "نئے نظام" کا وعدہ کر رہے ہیں۔ لیکن صرف بعد کے عمل ہی سے یہ پتہ چل سکے گا کہ وعدہ وفا ہوا یا نہیں۔ ہاں ہم ہندوستانی جس بلندی پر یا جس پستی میں ہیں وہاں سے ہماری نگاہیں صرف اوقیانوسی اعلان کی جمہوریت اور روسی اشتمالیت کی فتح میں نوعِ انسان کی بہبود و فلاح دیکھ سکتی ہیں۔

نئی دُنیا بنے یا نہ بنے لیکن دُنیا کے رہنے والے مدت سے اُس کے سنہری خواب دیکھ رہے ہیں۔ جنگ کے دوران میں ہمیں یہ لگتا ہے کہ یہ دل خوش کن سراب نظر آتا ہے اور کیوں نظر نہ آئے، دُنیا اُمید کے سہارے قائم ہے۔ مشہور انگریز سوشلسٹ مفکر ہیرلڈ لاسکی کہتا ہے کہ وقت آگیا ہے کہ اب ہم شہنشاہیّت کا خاتمہ کر دیں اور اُس کا ایک ثبوت ہم یہ دے سکتے ہیں کہ ہم ہندوستان کو آزاد کر دیں۔ اس کا اثر جرمنی اور اطالیہ اور امریکہ سب پر ہوگا۔ مشہور مُصنّف ایچ جی ویلز نے حال میں ایک مقالہ لکھا ہے "جنگ کر دو دھوکا دو یا سر جھکا دو" وُہ کہتا ہے کہ دنیا میں ایک عظیم انقلاب آگیا ہے۔ سائنس کی بدولت ہمارے پاس ہر شے کی بہتات ہے صرف اک امن کی ضرورت ہے کہ ہم دُنیا بھر کو نہال کر دیں۔ لیکن موجودہ نظام مہذب انسان کی بے چین سرگرمی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جس کا نتیجہ ہے باہمی کشمکش اور جنگ۔ سوم اگر ہم جنگ کا خاتمہ نہ کریں گے تو جنگ ہمارا خاتمہ کر دے گی"۔ اس کا ایک ہی

۱۹۴۱ء کا سب سے اہم واقعہ جرمنی اور رُوس کی جنگ ہے۔ اٹھائیس مہینے ہوئے کہ جرمنی اور روس کے غیر متوقع معاہدے کے بعد یکم ستمبر ۳۹ء کو جنگ یورپ کا آغاز ہُوا۔ یہ ایک حیرت انگیز واقعہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد جنگ ٹھنڈی پڑگئی لیکن ۹ راپریل ۴۰ء کو ناروے پر جرمن حملے کے ساتھ وُہ پھر بھڑک اُٹھی یہاں تک کہ ۲۲ رجون ۴۰ء کو فرانس نے جرمنی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ ایک اور زیادہ حیرت انگیز واقعہ تھا۔ پھر اس کے عین ایک سال بعد ۲۲ رجون ۴۱ء کو جرمنی نے رُوس پر دھاوا بول دیا اور یہ یقیناً اِن سبھی واقعات سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والا واقعہ تھا۔ دنیا عجیب وغریب سانحات کی عادی ہوچکی تھی لیکن اس نئی جنگ نے سب کو ششدر کردیا۔ کیا ہٹلر نے روس پر اس لئے حملہ کیا کہ بقولِ ہٹلر رُوس انگلستان سے ساز باز کر رہا تھا؟ یا اس لئے کہ چونکہ انگلستان پر حملہ نہ ہوسکتا تھا اب ہٹلر رُوس کو پامال کر کے دُنیا کا فاتح بننا چاہتا تھا؟ بہرحال ہُوا یہ کہ جرمن فوجیں رُوس میں بڑھیں اور بڑھتی گئیں۔ رُوس کے علاقوں پر بتدریج جرمنوں کا قبضہ ہوتا گیا لیکن لینن گراڈ اور ماسکو کو جلد فتح کر لینے کا منصوبہ پورا نہ ہوسکا۔ رُوس فرانس سے بدرجہا زیادہ مضبوط نکلا اور ہتھیار ڈال دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہُوا۔ جیسے ۴۰ء میں انگلستان نے ڈٹ کر جرمنی کی ہوائی طاقت کا مقابلہ کیا تھا ویسے ہی ۴۱ء میں رُوس نے ایسا مقابلہ کر دکھایا کہ دُنیا حیران رہ گئی۔ فن لینڈ کی لڑائی کے بعد رُوس نے اندر ہی اندر اپنی کمزوریوں کو دُور کرنے کی ہر تدبیر اختیار کی اور فرانس کی شکست سے بھی ہر ممکن سبق سیکھا۔ اور صرف رُوس کی فوج نہیں بلکہ اُس کی تمام آبادی جرمنوں کے خلاف سینہ سپر ہوکر کھڑی ہوگئی جس سے پوری طرح ثابت ہوگیا کہ اشتمالیت کس طرح رُوس کے رگ وپے میں سرایت کرچکی تھی کہ اب رُوس کا ایک ایک فرد آزادی اور اشتمالیت کے نصب العین کے لئے لڑنے مرنے پر تیار ہوگیا ہے۔ جرمنی اور رُوس کی جنگ نے جنگ کی کایا پلٹ دی۔ انگلستان سے ہٹ کر جرمنی کی توجہ اب رُوس پر ہوگئی جس سے انگلستان کو جنگ کی مزید تیاری کے لئے خاصی مہلت مل گئی۔

اس سے پہلے جرمنی یوگوسلاویہ یونان اور جزیرۂ کریٹ پر اور انگلستان عراق اور شام پر قابض ہوچکا تھا۔ اب جرمنی اور رُوس کی جنگ کے بعد جنگ اور پھیلی۔ اُدھر جرمنی نے دیکھا کہ اگر اُسے کامیابی حاصل کرنی ہے تو جلد حاصل کرنی چاہئے اس لئے اُس نے جان ومال کی پروا نہ کرتے ہوئے رُوس کے دو ہزار میل کے محاذ پر شبانہ روز جنگ جاری کردی اِدھر رُوس نے اپنے شہر جرمنوں کے حوالے کرنے سے پہلے اُنہیں خود تباہ کردینے کا طریقہ اختیار کیا۔ طرفین کے جان ومال کے نقصان کا فی الحال صحیح اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ رُوسی کہتے ہیں جرمنی کے تیس چالیس لاکھ آدمی کام آچکے ہیں۔ جرمن کہتے ہیں ہمارے پاس ۳۰ لاکھ رُوسی قیدی ہیں۔ اس جنگ کے نتائج اس قدر اہم ہوسکتے ہیں کہ اس وقت طرفین کو ہزاروں لاکھوں جانوں یا کروڑوں اربوں روپے کی مطلق پروا نہیں۔ گویا ہر ایک کے لئے سوال تخت یا تختہ کا ہے ہر ایک اپنے نصب العین کے لئے ہر چیز کی قربانی دینے پر تُلا بیٹھا ہے۔ ایسی ہولناک جنگ دُنیا نے نہ کبھی دیکھی نہ سُنی۔ ہتھیار ایسے تباہ کُن تباہی اتنی تند وتیز، صرف چند لاکھ فوجیں نہیں کروڑوں کی آبادیاں باہم گتھم گتھا ہیں، شاید قیامت اسی کو کہتے ہیں! یہ جنگ روز بروز پھیل رہی ہے، شاید اور بھی پھیلے یہاں تک کہ دُنیا کا ہر شہر اور گاؤں اس کا اثر محسوس کرنے لگے ۱۹۱۴ء-۱۸ء کی جنگ جنگِ عظیم تھی تو یقیناً یہ جنگ جنگِ اعظم ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں عالمگیر ہو رہی ہے۔ جون ۴۱ء میں جرمنی نے رُوس پر حملہ کیا۔ جولائی میں جاپان نے انڈوچائنا میں اپنے ہوائی اور بحری اڈے قائم کرلئے۔ اگست میں رُوسی اور انگریزی فوجیں

ہندوستان	دوسرے ملک
۲۶ر مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کے مقاطعہ کی قرارداد منظور کی	
۳۱ر گاندھی جی نے کانگریس کے سول نافرمانی کے پروگرام کو بدلنے سے انکار کردیا	
یکم نومبر۔ علی گڑھ میں مسلم لیگ کانفرنس	جرمنوں نے کرائمیا کے دارالسلطنت پر قبضہ کرلیا
۷ر	انقلاب اکتوبر کی چوبیسویں سالگرہ پر سٹالن کی تقریر
۸ر	میونخ میں ہٹلر کی تقریر کہ جرمن فتح یقینی امر ہے
۱۸ر	برطانیہ کی پیش قدمی لیبیا میں
۲۳ر	ماسکو پر نیا جرمن حملہ
۲۹ر لکھنؤ میں پاکستان کانفرنس اور لاہور میں اکھنڈ بھارت کانفرنس	امریکا کا الٹی میٹم جاپان کو
۳۰ر	جرمن فوجوں کی مراجعت راسٹوف سے
یکم دسمبر۔ بنگال کی وزارت کا استعفا۔ کانگریس اور دوسری پارٹیوں سے فضل الحق کا اتحاد	امریکا اور جاپان کے درمیان نازک صورتِ حالات
۴ر مولانا ابوالکلام پنڈت نہرو اور بعض ستیہ گرہیوں کی رہائی	
۷ر امرت سر میں ہندو سکھ لیڈروں کی کانفرنس	۷ر جاپان نے امریکا اور انگلستان کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا فلپائن اور ملایا میں اپنی فوجیں اتار دیں اور امریکا کے کئی جنگی جہاز ڈبو دیئے تھائی لینڈ (سیام) نے جاپان کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔
۸ر	
۱۰ر	جاپانی ہوابازوں نے برطانیہ کے دو بڑے جنگی جہاز ڈبو دیئے۔
۱۱ر فضل الحق کا اخراج مسلم لیگ سے	امریکا نے جرمنی اور جرمنی اور اطالیہ نے امریکا کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔ جرمنی اطالیہ اور جاپان میں فوجی اتحاد
۱۷ر مسٹر جناح پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں اور پنڈت نہرو ہندوستان کی مکمل آزادی کا	روس میں جرمن فوجوں کی مراجعت۔ ملایا میں جاپانی فوجوں کی پیش قدمی
۱۸ر	لیبیا میں جرمنوں اور اطالویوں کی پسپائی
۱۹ر جاپانی فتوحات پر کلکتہ میں گھبراہٹ	ملایا میں جاپانیوں نے پینانگ پر قبضہ کرلیا
۲۱ر برطانوی مزدور پارٹی نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ہندوستان کے رہنماؤں سے جلد سمجھوتا کیا جائے	ہٹلر کا اعلان کہ اس نے جرمن فوجوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

	ہندوستان	دوسرے ملک
۱۶؍ اپریل		یوگوسلاویہ پر مکمل جرمن قبضہ
۲۳؍		یونانی فوجوں نے جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے
۲؍ مئی		برطانوی اور عراقی فوجوں میں جھڑپ
۸؍	بمبئی کانفرنس نے مسٹر جناح کے خلاف بیان جاری کیا	
۹؍		وشی کا سمجھوتا جرمنی سے
۱۲؍		ہیس سکاٹ لینڈ میں ہوائی جہاز سے نیچے اُترا
۲۰؍		جرمنوں کا حملہ جزیرۂ کریٹ پر
۲۴؍	گاندھی جی نے غنڈوں کے خلاف تشدّد کا استعمال جائز قرار دیا	جرمنوں نے برطانوی جہاز ہُڈ کو غرق کر دیا
۲۷؍		جرمن فوج پھر سرحد پار کر کے مصر میں آ داخل ہوئی۔
۳۰؍		رشید عالی بغداد سے بھاگ نکلا۔ سارا عراق برطانیہ کے قبضے میں آگیا
یکم جون		برطانیہ نے کریٹ خالی کر دیا
۴؍		فرانس اور جرمنی کے درمیان باہمی امداد دینے کے معاہدے کی افواہ۔ سابق قیصر جرمنی کی وفات
۵؍	سارے ہندوستان میں خاکساروں پر قانونی پابندیاں	
۸؍		برطانوی اور "آزاد" فرانسیسی فوجوں نے شام پر حملہ کیا اور آزادی عطا کرنے کا وعدہ
۱۷؍		جرمن کونسل ممالکِ متحدہ (امریکہ) سے خارج کر دیئے گئے۔
۱۸؍		جرمنی اور ترکی کا سیاسی معاہدہ کہ وہ ایک دوسرے کے علاقے پر حملہ نہ کریں گے
۲۲؍		جرمنی نے رُوس پر دھاوا بول دیا (تین بج کر منٹ بوقت شب) برطانیہ اور امریکا نے رُوس سے کچھ مدد کا وعدہ کیا۔ جرمن فوجیں رُوس میں تیزی سے بڑھتی گئیں۔
۳۰؍	ڈھاکہ میں فرقہ وارانہ فساد	
۴؍ جولائی		"یوم آزادی" کی تقریب پر روزولٹ کا براڈکاسٹ کہ امریکہ کی آزادی انگلستان سے وابستہ ہے
۷؍	وائسرائے نے مرکزی اسمبلی کی مدت میں توسیع کر دی	امریکہ نے آئس لینڈ پر قبضہ کر لیا
۹؍		شام کی فرانسیسی حکومت نے عارضی صلح کی درخواست کی
۱۳؍		رُوس اور برطانیہ میں معاہدہ
۲۰؍		یورپ کی اَن دیکھی فوج: V کا نشان ہر جگہ نمودار ہوتا ہے

جہاں نما

۱۹۴۱ء کے اہم واقعات

ہندوستان	دوسرے ملک
۳ جنوری مولانا ابوالکلام صدر کانگرس قید کر لئے گئے	
۶ ”	روزولٹ امریکی صدر نے جمہوریتوں کو زیادہ امداد دینے کا وعدہ کیا
۷ ”	مشہور فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں کی وفات (جس نے تخلیقی ارتقا کا نظریہ پیش کیا تھا)
۱۷ ” لبرل لیڈروں کا بیان کہ انگلستان اپنے لئے ہندوستانیوں کے دل میں گرم جوشی پیدا نہیں کر سکا۔	
۲۲ ”	لیبیا میں جنرل ویول کی جارحانہ پیش قدمی۔ طبروق کی فتح
۲۳ ” مسٹر ایمری سکرٹری آف سٹیٹ کی تقریر کہ ہندوستان کا مسئلہ ہندوستانی ہی حل کر سکتے ہیں۔	
۲۴ ”	نجاشی ابی سینیا میں داخل ہوا
۲۶ ” کانگرس نے ”یوم آزادی“ منایا	
۲۸ ” سبھاش بوس کی روپوشی	
۸ ” فروری	ممالک متحدہ (امریکہ) میں انگلستان کو مالی و حربی امداد دینے کا قانون منظور ہوا
۱۰ ”	برطانوی فوجیں طرابلس تک بڑھیں (لیکن بعد میں پیچھے ہٹ آئیں)
۲۲ ” مسٹر جناح پھر مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے	
یکم مارچ، لاہور میں مسلم طلبا کی پاکستان کانفرنس (مسٹر جناح کی تقریر) لاہور میں ہندو اقلیتوں کی کانفرنس	بلغاریہ محوری طاقتوں سے مل گیا
۱۴ ” سر سپرو کی اپیل کہ کانگرسی اور لیگی لیڈروں کی باہمی گفت و شنید ہونی چاہئے	دشی کی فرانسیسی حکومت نے انڈوچائنا کے متعلق جاپانی مطالبات مان لئے۔
۲۵ ”	یوگوسلاویہ بھی محوری طاقتوں سے مل گیا
۲۷ ”	یوگوسلاویہ میں اس طلاپ کے خلاف بغاوت
۶ ” اپریل	جرمنی نے یوگوسلاویہ اور یونان پر دھاوا بول دیا
۱۲ تا ۱۴ ” آل انڈیا مسلم لیگ کا اٹھائیسواں سالانہ اجلاس مدراس میں (لیگ نے پاکستان کو اپنا سیاسی نصب العین قرار دیا)	
۱۳ ”	سوویٹ روس اور جاپان کے درمیان غیر جانب داری کا معاہدہ

اٹھاسپن

[illegible]

کے سالنامے دیکھئے اُن کے خاص نمبروں پر ایک نظر ڈالئے۔ گزشتہ سال میں حال کے شعراء، ریڈیو، افسانہ، تاریخ، ٹیگور وغیرہ مختلف موضوعات کے لئے خاص نمبر نکلے اور اب رسالے نری ادبیت کے لئے وقف نہیں ہیں۔ "جامعہ"، "سائنس"، "ہل"، "سیاست"، "نیا ادب" وغیرہ رسائل یا خاص علمی و اصطلاحی علوم کے حامل ہیں اور یا ہماری اقتصادی و معاشرتی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا کی طرف پھر توجہ ہوئی ہے۔ اُدھر حیدرآباد سے اس کا ابتدائی نمونہ جاری ہوا اور اِدھر لاہور سے "کتاب العلم" کی پہلی قسط۔ باوجود جنگ کی مشکلات کے ایسے کاموں کا ہونا یقیناً حوصلہ افزا ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کا قیام تو اُردو زبان کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن گزشتہ بیس سال میں اس ضمن میں اور قابلِ ذکر مساعی بھی ہوئیں جن میں سب سے نمایاں جامعۂ ملیہ دہلی کا کام ہے۔ ساتھ ساتھ کئی مقامات پر چھوٹی چھوٹی کوششیں کی گئیں مثلاً جامعۂ آگرہ اور انجمن ترقی اُردو (ہند) نے خالص اُردو نصاب اور اُردو کے امتحانات جاری کئے۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) اب محض ایک کتابیں شائع کرنے والی انجمن نہیں رہی بلکہ مقتضائے زمانہ سے اُس نے اُردو کے تحفظ و اشاعت کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے جو نہایت ضروری تھا۔ ملک بھر میں انجمنوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس سلسلے کی کڑیوں میں زیادہ ٹھوس کام کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ آج کل "انجمن آرائی" اور "رسالہ افزائی" کا دور ہے۔ امید ہے یہ زندگی کے آثار محض ظاہری ٹیپ ٹاپ، مخالفانہ پروپیگنڈا اور باہمی واہ وا تک محدود نہ ہو جائیں گے۔ دُنیا کی نئی تحریکات اُردو ادب کے پانیوں میں جا بجا ملکورے پیدا کر رہی ہیں اور اس کی کئی ندیاں بہ نکلنے کو ہیں۔ اُدھر زبان کی اشاعت و طباعت کے مسائل زیرِ غور ہیں، اِدھر ادب میں نئی شاعری اور انقلابی و اشتراکی خیالات کی نشو و نما کے علاوہ تعلیمی و تنقیدی حس بیدار ہو رہی ہے۔ سینما اور ریڈیو کے شعبوں میں زبان کے لئے نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں اور ترقی کی تازہ راہیں کھل رہی ہیں، یہ راہیں خواص و عوام کے لئے میل جول کا نیا طریقہ وضع کریں گی۔ ذریعۂ تعلیم کا نقیب قومی زبان کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا ہے، یہ نکتہ بھی اب حل کرنا پڑے گا۔

قومی زبان کا مسئلہ جو ایک صدی سے گاہے گاہے موسمی پھوڑے کی طرح پھوٹتا رہا ہے پچھلے پانچ برس سے پھر اپنی بھیانک شکل دکھا رہا ہے۔ ہندی والے اتھوا ہندوستانی یا محض ہندوستانی کی آڑ میں اور حال میں بعض اس آڑ کو چھوڑ کر سنسکرتی ہتھیاروں کی مدد سے راشٹر بھاشا کے تخت پر قبضہ کیا چاہتے ہیں وہ خواص و عوام میں اپنا پروپیگنڈا کر رہے ہیں لیکن دقّت یہ آ پڑی ہے کہ عام انسانوں میں بہت کم ہیں جو اُن کی زبان سمجھتے ہیں۔ گاندھی جی، سمپورن جی، راجندر جی، راجی جی وغیرہ اب علانیہ طور پر ہندی کی طرفداری کر رہے ہیں لیکن خوشی کا مقام ہے کہ سر تیج بہادر سپرو کی قیادت میں ہندوؤں کی ایک جماعت ہندوستانی اتحاد کے اس آخری نشان کو بلند رکھنے پر تُلی ہوئی ہے۔ گزشتہ سال دہلی میں ایک "اُردو سماج" بنائی گئی۔ اور دہیں اکتوبر میں جو گاندھی جینتی کا مشاعرہ ہوا وہ سو فی صدی اُردو مشاعرہ تھا، گاندھی جی کی تعریف خود ہندوؤں نے ہندی میں نہیں اُردو میں کی۔ خود گاندھی جی نے جولائی میں فرمایا کہ "قومی زبان ابھی بنی نہیں ابھی تو اُس کا جنم ہی ہوا ہے"۔ ہندی رسالہ سرسوتی (نومبر ۱۹۴۱ء) میں ایک مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ "صوبۂ متحدہ کے بہت سے ہندو تقریروں اور کتابوں میں تو کچھ نہ کچھ ہندی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن گھروں میں وہی اُردو فارسی کے گلا گھونٹ الفاظ بولتے ہیں۔ اس کی درستی کی بڑی ضرورت ہے"۔ سچ یہ ہے کہ اُردو مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی زبان ہے اور گو بدقسمتی سے اب اس کے محافظین میں مسلمان پیش پیش نظر آتے ہیں لیکن سربرآوردہ ہستیوں کا منظرِ عام پر آ کر کھلے طور سے اُردو کی حمایت کرنا ملک کے لئے ایک نیک فال ہے۔

بزمِ ہمایوں

آج ہمایوں کو جاری ہوئے بیس سال ہو گئے ہیں۔ یہ والدِ محترم کی یکتا ہستی کی یادگار ہے۔ نام اُن کا تھا کام اپنا لیکن سچ یہ ہے کہ یہ اُسی نام کی برکت اور اُسی ہستی کا اثر تھا کہ ہمایوں میں چند خوبیاں پیدا ہوئیں باقاعدگی، استقلال اور ایک خاص اخلاقی معیار۔ کبھی کسی وجہ سے کوئی کہہ دیتا ہے کہ ہمایوں اُردو کا بہترین رسالہ ہے تو اک خوشی سی محسوس کرنے کے ساتھ ہی میں کانپ جاتا ہوں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ بہترین رسالہ نہیں ہے مگر اس کے لئے یہ عزت کیا کم ہے کہ اُردو کی محفلِ ادب میں اک ذرا سی جگہ اسے بھی مل گئی ہے۔ ہاں ایک بات پر فخر کرنے کو آج جی چاہتا ہے اور وہ یہ کہ اُردو ادب کی تاریخ میں ہمایوں پہلا رسالہ ہے جو بیس سال کے عرصے میں ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا۔

جب ہمایوں جاری ہوا تو اس کی ایک خاص روش تھی۔ ارادہ تھا کہ اس کی یہ روش جوں کی توں قائم رہے۔ شکر ہے کہ قدرت نے اس ارادے کو منجمد ہونے سے بچا لیا اور ہمایوں بھی بعض باتوں میں زمانے کی نئی ضروریات کے پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ ہمایوں کی دسویں سالگرہ کے موقع پر ہمایوں کے دہ سالہ کام کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اگر اُس وقت کی حالت کا آج سے موازنہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ادب میں اور اُس کے ساتھ ہی ہمایوں میں بعض تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ پہلے افسانے زیادہ تر ترجمے ہوا کرتے تھے اب طبع زاد افسانوں کی کمی نہیں رہی مقامی حالات اور ذاتی تجربات کی بولتی چالتی تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔ بے قافیہ شاعری انقلابی شاعری اور نئی شاعری کے دوسرے نمونے اب جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ زمانے کی نئی تحریکات کا شوق سے مطالعہ کیا جاتا ہے باوجود ملکی تفرقوں کے ہندوستان کے حالات میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ تنقیدی اور دوسرے اصول اب محض خشک اصولوں کی طرح بیان نہیں کر دیئے جاتے بلکہ انہیں پرانے اور نئے ادب پر عائد کر کے مفید نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ اُردو پر جو بےجا حملے ہوتے رہے ہیں اہلِ اُردو اب نہ صرف اُن کی مدافعت کرتے ہیں بلکہ اپنی حالت کو مضبوط کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں گو ابھی کئی تعمیری کاموں کی طرف عملاً توجہ نہیں کی گئی۔ اُردو کا ذخیرہ نہ صرف غیر ملکی زبانوں کے ترجموں سے بھر رہا ہے بلکہ اب دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادب سے واقفیت حاصل کر کے اُن سے براہِ راست تعلق پیدا کیا جا رہا ہے۔ اس سے نہ صرف اُردو ادب کی بلکہ اُردو زبان کی توسیع ہو رہی ہے۔ اُردو کا دروازہ ہمیشہ نئے الفاظ کے لئے کھلا ہے بشرطیکہ ان نوواردوں کی بتدریج اور خوش اسلوبی سے کھپت ہو۔ اس سلسلے میں ریڈیو مفید کام کر سکتا ہے اگر اُس کی باگ ڈور خوش ذوق اور بلند نظر لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ پچھلے چند برسوں میں ریڈیوی مضامین کی بدولت ہمایوں اور دوسرے اُردو رسالوں میں بارہا ایسے مقالے چھپے جن میں دلچسپ اور عام فہم ادب کا دلکش ملاپ تھا۔

پچھلے بیس بائیس سال میں جہاں دنیا میں عظیم الشان تبدیلیاں ہوئیں، وہاں ہندوستان میں بھی ایک انقلاب آ گیا۔ اس انقلاب سے اُردو ادب خاص متاثر ہوا۔ خودداری، جدت پسندی، آزادی کی محبت، عوام کی بہتری، اپنی قومی چیزوں کا احیاء اور اُن کی قدردانی۔ انہوں نے "عروقِ مُردۂ مشرق" میں خونِ زندگی دوڑا دیا مانا اُردو ادب میں ابھی بہت سی کمیاں ہیں لیکن اب اُس میں نرا دُنیائے فانی کا رونا اور فرضی زلف و خال کے قصّے ہی نہیں۔ آج کل کے دس بارہ مشہور بلکہ بعض [illegible]

موری دروازے کے باہر والی کوٹھی) ان کے اعزاز میں کھانا ہوا۔ میرا حصہ اس میں زیادہ تھا۔ مجھے بہت تعجب ہوا کہ پروفیسر آرنلڈ فرش پر ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے۔ یہی سمجھا کہ سر سید احمد خاں کے جادو کا اثر ہے اور یہ جادو وہ میاں شاہدین کو سکھلا چکے ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ مجھ پر بہت مہربان تھے اور میاں شاہدین اور پروفیسر آرنلڈ نے بے انتہا کوشش کی کہ ۱۹۰۰ء میں سٹیٹ سکالر شپ مجھے مل جائے مگر یہ انعام میرے دوست مسٹر منوہر لعل (اب سر منوہر لعل فنانس منسٹر پنجاب گورنمنٹ) کی قسمت میں لکھا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں میاں شاہدین نے پھر سر توڑ کوشش کی کہ سٹیٹ سکالرشپ مجھے ملے مگر اس دفعہ خان فضل محمد خاں (آج کل وُہ حیدر آباد میں محکمۂ تعلیم کے ممتاز افسر ہیں) کو مل گیا۔ اس زمانے میں وہ اکثر مجھے بلاتے۔ دو ایک دفعہ شام پیادہ سیر کو مجھے ہمراہ لے گئے

۱۹۰۳ء یا ۱۹۰۴ء میں میاں شاہدین نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کو ایک مضمون میں "تماشا" کا لفظ استعمال کرکے مطعون کیا۔ اس کے برخلاف میں نے ایک لمبا مضمون آبزرور میں شائع کرا دیا۔ اس سے میاں شاہدین کو مجھ پر گلہ رہا۔ میرے مضمون میں زور اس بات پر تھا کہ حاجی شمس الدین، میاں علی محمد اور مولوی کرم بخش بہت پُرجوش کام کرنے والے ہیں۔ ان کی سرگرمی سے انجمن کہاں کی کہاں پہنچ گئی ہے۔ ان کے کام کو تماشا کہنا غیر مناسب ہے۔ میاں شاہدین کا ارشاد بالکل بجا تھا کہ جلسوں میں نمائش اور چندہ ضرور مگر اصل تعلیمی کام ندارد۔

۱۹۰۴ء–۵ میں ایک بہی بحث چھڑ گئی۔ انجمن والوں کو کئی حضرات "ٹھیکہ داران انجمن" کہنے لگے۔ اس پر میں نے کئی مضمون سول ملٹری اخبار میں لکھے۔ مولوی کرم بخش مالک اسلامیہ سٹیم پریس جواب اور جواب الجواب لکھتے رہے مگر انجمن والے آخر مجبور ہو گئے کہ جنرل کونسل مقرر کریں۔ میاں شاہدین کو اس سے خاص خوشی ہوئی کہ انجمن کے نظام میں تبدیلی ہوئی۔

۱۹۰۷ء میں کراچی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا ساتھ ہی میاں فضل حسین اور میاں محمد شفیع کی لیگوں کی رقابت کا قصہ زیر بحث رہا۔ وہاں میاں شاہدین، میاں محمد شفیع، میرے عم بزرگوار مرحوم خان بہادر شیخ محمد بخش اور میں سب ایک ہی کمرے میں ٹھہرے۔ میاں شاہدین کی ٹھوس ثقاہت پر کئی دفعہ خوش گپی کا عنصر فتح پا جاتا اور میں حیران رہ جاتا کہ ایسا بڑا لیڈر بھی ہنسی مذاق چہل میں حصہ لے سکتا ہے۔

۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۰ء کے اخیر تک میں صوبۂ سرحد میں رہا اور میاں صاحب سے ملنا کم ہوا۔ جب پنجاب واپس آیا تو اس کے تھوڑی دیر بعد وُہ جج ہو گئے۔ میرے دل میں کچھ حجاب سا پیدا ہو گیا کہ اگر زیادہ ملا تو کہیں یہ نوبت نہ آجائے کہ وُہ اپنے آپ کو جج اور مجھے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر سمجھنے لگیں۔ میں اس لطف سے بھی جاؤں کہ وُہ مجھے عزیز سے محض ایک ماتحت عہدہ دار خیال کرنے لگیں۔ اس زمانے میں میاں محمد شفیع سے ملنا زیادہ ہوا۔

میاں شاہدین کے حاسد یہ خیال پھیلاتے رہے کہ وُہ اپنے سوا کسی اور کا بڑھنا پسند نہیں کرتے۔ یہ خیال قطعی غلط تھا۔ وہ صرف ان اشخاص کو پسند نہ کرتے تھے جو اُن کے تعلیمی کام میں حارج ہوں۔ ایک ان کی خصوصیت یہ بھی کہ ہٹ کے پکے تھے۔ یوگ کا علم تو غالباً انہیں نہ تھا مگر عملاً وُہ پورے ہٹ یوگی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وُہ انگریزوں میں بہت مقبول نہ تھے۔ کسی سے دبتے نہ تھے، زمانہ ساز نہ تھے اور صاف گو تھے۔ مسلمانوں میں ہمیشہ وُہ مولوی شاہدین کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

ہمایوں اُن کی یادگار ہے۔ یہ رسالہ اُن کے صاحبزادے میاں بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا کی سعادت مندی کا شاہکار ہے۔ اگر بشیر سے مجھے دلی محبت نہ ہوتی، میاں شاہدین سے پُرانی عقیدت نہ ہوتی تو ضرور چند تعریفی جملے لکھتا۔ اب صرف بشیر کو یہ لکھ کر ختم کرتا ہوں۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

افسوس میاں صاحب مرحوم کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اور وُہ قبل از وقت گزر گئے۔ پنجاب کے ادیبوں میں اور رہنماؤں میں جو جگہ ان کے انتقال سے خالی ہوئی۔ اُن کے بعد پُر نہیں ہوسکی۔ ایک خاص امتیازی رنگ اُن میں تھا۔ جو اُنہی کا حصہ تھا۔ ان کی قابلیت۔ ان کی اصول پسندی اور ان کی ہمدردیٔ قومی دیر تک یاد رہے گی۔ ہمارے ہمایوں صاحب پنجاب کے اُن فرزندوں میں سے تھے جن پر پنجاب بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔

میاں شاہدین کا زمانہ

(از جناب میاں عبدالعزیز صاحب فلک پیما)

۱۸۹۴ء میں انٹرنس پاس کرکے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا۔ اُسی دن مرحوم خانصاحب شیخ عبدالعزیز سابق ایڈیٹر زمیندار داخل ہوئے۔ میری عمر کم اور قد کافی چھوٹا تھا۔ کالج میں ڈرتے ڈرتے دبک کر چلتا۔ حُسنِ اتفاق سے مرزا اعجاز حسین مرحوم اور مسٹر عبدالرشید چشتی مرحوم کے حلقۂ اثر میں ہم دونوں عزیز (مرزنگ والے کا نام Secundus اور میرا نام Primus ان دنوں میں زبان زد تھا) علمی مجلسوں میں حصہ لینے لگے۔ چشتی صاحب اس زمانے میں ینگ مین محمڈن ایسوسی ایشن کے سکرٹری تھے۔ صدر میاں شاہدین بیرسٹر تھے۔ موری دروازے کے باہر ان کی کوٹھی میں اس ایسوسی ایشن کے جلسے ہوتے تھے۔ کچھ بھی نہ تھا۔ خرچ بھی برائے نام تھا۔ میاں شاہدین کے ملازم ایک میز رکھ کر سیاں اور چند بنچ کوٹھی کے سامنے کھلی جگہ میں لگا دیتے اور ہفتہ وار جلسہ ہو جاتا۔ بحث اکثر پُر لطف ہوتی اور اخیر میں میاں شاہدین کی تقریر فصیح انگریزی کے قدر دانوں کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہوتی۔ میاں محمد شفیع بیرسٹر بھی اکثر شامل ہوتے۔ ایک دوسرے کو Learned Cousin کہہ کر تقریروں میں یاد کرتے۔ ہم چھوٹے چھوٹے اس جملے کے استعمال سے اکثر متحیر ہوتے مگر یہ جملہ برابر کئی سال چلتا رہا۔ میاں شاہدین نہایت لطف سے بعض دفعہ اپنے Learned Cousin کی رائے پر نکتہ چینی کرتے۔ لیکن ان دونوں میں بے انتہا محبت تھی۔

ایک تقریر کے دوران میں میاں محمد شفیع نے ذکر کیا کہ انہوں نے پانسو ناول پڑھے ہیں۔ آخری تقریر میں میاں شاہدین نہایت خوش طبعی سے فرمانے لگے کہ زندگی ضائع کرنے کا اس سے زیادہ کامیاب طریقہ انتخاب کرنا مشکل ہے۔ اُن کا اصل مطلب تو یہ تھا کہ ہم طالب علم ناول خوانی میں وقت ضائع نہ کریں مگر یہ جملہ میاں شاہدین کے خشک زہد اور میاں محمد شفیع کی طبعی رنگینی کا اچھا فوٹو تھا۔ چشتی صاحب کی مہربانی سے ۱۸۹۶ء میں مجھے سکرٹری مقرر کیا گیا۔ میرے زمانے میں ایسوسی ایشن کو کافی فروغ ہُوا اور Debates میں کچھ چمک سی پیدا ہوگئی۔ اتنا جتلا دینا ضروری ہے کہ اس زمانے میں ہم سب بہت پکے مسلمان تھے اور ہمارا اوڑھنا، بچھونا، ماوا و ملجا صرف ایک چیز تھی یعنی **قومی درد**۔ میاں شاہدین نوجوان مسلمانوں میں جوشِ خدمت کے اس احساس سے بہت خوش ہوتے۔ ویسے وہ زمانہ یہ تھا کہ نادانستہ ہم سب کا دلی اعتقاد تھا کہ اوپر خدا نیچے انگریز، دنیا انگریز کے اشارے پر چلتی ہے کئی واعظ ملکۂ معظمہ کی وفاداری کو مذہبی فریضہ بیان کرتے تھے مسلمان ہونا اور انگریز پرست ہونا گویا مترادف تھا۔

انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں میاں شاہدین کی انگریزی تقریر کو سننے کے لئے کالجوں کے طالب علم جوق جوق جمع ہوتے۔ صبح تو خیر تھے ہی مگر خوبی یہ تھی کہ آواز میں رس تھا اور رُکتے نہ تھے۔ جو دو ایک اور کبھی انگریزی تقریر کے لئے اس زمانے میں کھڑے ہوتے رُک رُک کر اٹک اٹک کر الفاظ کی تلاش میں سرگرداں ہو کر فقرہ ختم کرتے۔ میاں شاہدین کی تقریر میں قدرتی روانی تھی اور اس زمانے میں یہ بات اس قدر انوکھی تھی کہ انگریزی تقریر کو دلفریب بنانے میں میاں شاہدین کا کوئی ثانی نہ تھا۔

جب مسٹر آرنلڈ علی گڈھ سے قطعِ تعلق کرکے لاہور گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہوگئے تو میاں شاہدین کی کوٹھی میں رہی

ہوتی تو بیٹہ چلا کہ اُردو نظم و نثر دونو خوب لکھتے ہیں۔ میں خود بھی اُردو کا دلدادہ تھا۔ اس لئے ہمارا یہ شوقِ مشترک مزید ربطِ باہمی کا ذریعہ بنا۔ اور مجھے اُن سے اردو کی ترقی کی کوششوں میں بہت مفید مشورے ملے۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ انگریزی داں اصحاب سے اُردو میں تقریریں کرائی جائیں جن میں زبان کی سادگی اور صفائی کے ساتھ خیالات کی بلندی اور پختگی ہو۔ اور ان میں وُہ نئی معلومات جو مغربی کتابوں سے جمع کی گئی ہوں درج کی جائیں۔ کئی سال متواتر ایسے لکچروں کا انتظام ہم کرتے رہے۔ میاں صاحب نے خود بھی اس سلسلے میں تقریریں کیں۔ اور دوسروں کو بھی اُدھر راغب کیا۔ ایک سال جب وہ مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے تو اُن کا اُردو خطبۂ صدارت بہت کامیاب رہا۔ اور صوبجاتِ متحدہ کے بہت سے قابل حضرات نے اس کی تعریف کی۔ میاں صاحب سر سید احمد خاں مرحوم کے بے حد مدّاح تھے اور اپنی نثر میں انہی کے نمونے کی پیروی کرتے تھے۔ نظم میں مولانا حالیؔ مرحوم کی اخلاقی اور اصلاحی نظمیں انہیں پسند تھیں اور خود بھی جب کبھی شعر کہنے کے لئے فرصت پاتے تھے تو زیادہ تر ایسے اشعار لکھتے تھے جن میں مناظرِ فطرت کا نقشہ ہوتا تھا۔ یا اخلاق اور فلسفہ۔ ان کے بعد اُن کی نظموں کا مجموعہ ان کے خلف الرشید میاں بشیر احمد صاحب نے شائع کیا جو ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا ہے۔

عادات و اطوار میں میاں صاحب متانت کا نمونہ تھے۔ مگر اُن کی طبیعت میں ظرافت تھی۔ جو بعض اوقات عجیب پیرائے میں ظاہر ہوتی تھی۔ اس کی ایک دو مثالیں خالی از دلچسپی نہ ہوں گی۔ ایک دفعہ ایک صاحب ایران سے ہندوستان آئے۔ وہ لباس اور شکل و شباہت میں بارعب آدمی تھے مگر بدقسمتی سے شعر گوئی کو بہانۂ طلبِ زر بنائے پھرتے تھے۔ انہوں نے ایک فارسی قصیدہ کہہ رکھا تھا۔ یا کہیں سے حاصل کر لیا تھا جس کے الفاظ پُرشوکت تھے جس بڑے آدمی سے ملتے۔ قصیدے کے اخیر کے اشعار میں اس کا نام یا کچھ حالات درج کر کے اس سے انعام کے طلبگار ہوتے۔ وُہ میاں صاحب سے بھی ملنے آئے اور اس بات پر اصرار کیا کہ وُہ اُن کو قصیدہ پیش کرنے کی اجازت دیں۔ میاں صاحب تو قصیدوں کے شائق نہ تھے۔ بلکہ اس کو معیوب سمجھتے تھے کہ کوئی اپنی قابلیت یا ذہانت کو دوسروں سے کچھ مانگنے کا وسیلہ بنائے۔ انہوں نے عذر کیا کہ انہیں معاف رکھا جائے۔ مگر جب اُنہوں نے کہا کہ وہ مسافر ہیں اور اُن کا حق ہے کہ اُنہیں اپنے شہر کا مہمان تصوّر کیا جائے تو میاں صاحب نے اُن سے کہا۔ کہ وُہ ایک شام کو کھانا ان کے ہمراہ کھائیں۔ ایرانی صاحب نے سمجھا کہ جب کھانے پر آئیں گے تو قصیدہ سنا لیں گے اور میزبان کو انہیں رد یا پس دینے سے انکار کی گنجائش نہ رہے گی۔ میاں صاحب نے جس شام کے لئے انہیں مدعو کیا۔ اس کے لئے چند اور دوستوں کو بھی کھانے پر بلایا۔ میں بھی اُس دعوت میں شریک تھا۔ کھانے کے بعد ایرانی صاحب نے قصیدہ اپنی جیب سے نکالا۔ اور پڑھنا شروع کیا۔ بہت سے اشعار بندش اور لفظی خوبیوں کے لحاظ سے اچھے تھے۔ ہم لوگ خوب واہ واہ کرتے رہے۔ جب ایرانی صاحب اپنے اشعار پڑھ چکے تو میاں صاحب نے ہم لوگوں سے کہا کہ تم اپنے ہاں کے فارسی شعرا کا کلام سنائیں۔ میاں صاحب نے خود بھی چند شعر مہمان کو سنائے۔ جب رخصت ہونے کا وقت آیا تو ایرانی صاحب متوقع تھے کہ کچھ نقد بھی ملے گا۔ مگر میاں صاحب نے کہا۔ آپ نے ہمیں اشعار سنائے۔ ہم نے آپ کو۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔ بیچارے ایرانی کا اترا ہوا چہرہ اُس وقت دیکھنے کے قابل تھا۔ مگر اسے معلوم ہو گیا کہ قصیدے والا منتر ہر جگہ نہیں چلتا۔ ایک اور چھوٹا سا قصہ قابلِ ذکر ہے۔ سیرِ کشمیر کے دوران میں میاں صاحب مارتنڈ گئے جو ہندوؤں کا ایک مشہور مذہبی مقام ہے۔ وہاں کے برہمن پجاری بھولے بھالے مسافروں سے پیسے لینے کے طرح طرح کے ڈھنگ جانتے ہیں۔ اُن کے پاس بڑی بڑی کتابیں ہوتی ہیں جن میں ہر مسافر سے کچھ نہ کچھ لکھواتے ہیں اور اس کا نام اور پتہ محفوظ کر رکھتے ہیں۔ جب کوئی اور شخص اسی شہر سے آتا ہے۔ تو اس کو کتاب دکھا کر یہ کہتے ہیں کہ اس شہر کے لئے وُہ خاص پروہت ہیں۔ اس کی تھوڑی سی تواضع کر کے اس سے پیسے بھی لیتے ہیں اور کتاب میں اپنی بابت لکھوا لیتے ہیں کہ یہ اچھا پروہت ہے۔ میاں صاحب نے یہ قصہ مجھے سنایا کہ ایک ایسا آدمی انہیں وہاں ملا۔ اور انہیں ہندو سمجھ کر لاہور کے اور ہندو سیاحوں کے نام لینے لگا جو اس کی کتاب میں نام لکھ گئے ہیں۔ میاں صاحب سے بھی اس نے کہا کہ وُہ اس کی کتاب میں کچھ لکھ دیں۔ میاں صاحب نے انگریزی میں اس کی کتاب میں لکھ دیا "یہاں کے پجاری مسافروں کو بے وقوف بنانے میں مشّاق ہیں۔ مگر ان میں سے کئی خود بھی بے وقوف ہیں اور اُن میں یہ بڑا بے وقوف ہے"۔ اس نے جب بعد کو یہ سند کسی سے پڑھوائی ہو گی تو بہت پشیمان ہوا ہو گا۔

یادِ ہمایوں

از جناب شیخ سر عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا

رسالہ "ہمایوں" آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب مرحوم متخلص بہ ہمایوں کی ادبی خدمات کی موزوں یادگار ہے۔ میاں صاحب موصوف
بہت سی صفات کے جامع تھے۔ پنجاب کی چیف کورٹ کے سب سے پہلے مسلمان جج اور کچھ عرصہ کے لئے چیف جج کی حیثیت سے عدالت اور قانون کے میدان
میں انہوں نے بہترین شہرت حاصل کی۔ اور شاندار روایات ودیعت کی ہیں۔ مگر اُن کے جس کام نے ملک و قوم کے دلوں پر گہرا نقش چھوڑا ہے وُہ
اُن کی ادبی خدمات ہیں۔ تحریر و تقریر میں وُہ نہ صرف خود بہت ممتاز تھے۔ بلکہ بہت اور لوگوں کے ادبی شوق کو ترقی دینے میں اُن کا معتد بہ حصہ تھا۔
میاں صاحب پہلے اپنی عمدہ انگریزی دانی اور انگریزی زبان میں خوبی تقریر کی وجہ سے مشہور ہوئے اور پھر اُردو تقریروں میں اُنہوں نے نام پیدا کیا۔ وہ فصیح تھے
مگر جوشیلی تقریر نہیں کرتے تھے۔ اُن کی تقریر کے وقت یہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے آب رواں چل رہا ہے۔ مگر اس پانی کی رفتار میں شور و غل نہ تھا۔ جب وہ انگلستان
سے واپس آئے تو میں ابھی ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ یہ سُن کر کہ وہ اسلام پر انگریزی میں لکچر دیں گے۔ میں اُن کا لکچر سننے گیا۔ اُس پہلی تقریر کی لذّت میرے کان
اب تک نہیں بھولے۔ لب و لہجہ دلکش۔ الفاظ دلنشیں۔ اور مطالب پُرمغز۔ سامعین گرویدہ ہو گئے۔
لاہور میں قیام کے کچھ عرصہ بعد میاں صاحب نے کالجوں کے نوجوان طلبہ کو ایک دن اپنے ہاں جمع کیا اور ایک مجلس[۵] قائم کی۔ جس کے جلسے کئی سال
تک ان کے بنگلے میں ہوتے رہے اور وُہ فرائضِ صدارت انجام دیتے رہے اس سوسائٹی کا مقصد تھا کہ مسلمان طلبہ کو انگریزی میں
اچھی تقریریں کرنے کی مہارت ہو جائے اور وہ مفید علمی اور اصلاحی مضامین پر طبع آزمائی کریں۔ اس مقصد کے حصول میں میاں صاحب کو خاطر خواہ کامیابی
ہوئی اور انہوں نے بہت سے نوجوانوں میں خدمتِ قوم کا شوق پیدا کر دیا۔ جب کوئی مضمون اس مجلس میں پڑھا جاتا تھا تو اس کے بعد حاضرین میں سے جو
چاہے اس پر رائے زنی اور بحث کرتا تھا۔ اور اخیر میں صدرِ جلسہ اپنے خیالات کا اظہار کر کے شرکاء جلسہ کی رہنمائی کرتے تھے۔ میں بھی اتنے میں کالج میں داخل ہو گیا
تھا اور ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔ مگر چونکہ بہت سے مقرر مجھ سے اوپر کی جماعتوں کے طالب علم تھے۔ میں مباحثہ میں شریک ہونے سے جھجکتا تھا
دوستوں کے اصرار سے ایک دن میں نے بحث میں حصہ لیا۔ اُس دن میاں صاحب سے میری ملاقات ہوئی جلسہ ختم ہوتے ہی میاں صاحب اُس طرف
آئے جہاں میں تقریر کے بعد جا کر بیٹھا تھا۔ اور اُنہوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا "آپ نے یہ ظلم کیا کہ اس سے پہلے تقریروں میں شریک نہیں ہوئے۔
آپ چاہیئے کہ ہر جلسے میں تقریر کریں اور اس مجلس کے لئے وقتاً فوقتاً مضامین لکھیں۔ چنانچہ جو سلسلۂ مضامین میں نے انگریزی میں اُس وقت کے
مصنفینِ اُردو کے متعلق لکھا تھا اُن میں سے بیشتر اسی مجلس میں پڑھے گئے تھے اسی طرح میرے معاصرین میں بہت سے اور دوستوں کی مشقِ تحریر
زیرِ اُس دبستان میں ہوئی جس کے اعزازی صدر میاں محمد شاہ دین تھے۔
میاں صاحب کی انگریزی تحریر بہت پُرزور تھی۔ کشمیر کی سیر کے بعد انہوں نے لاہور کے انگریزی اخبار "سول ملٹری گزٹ" میں چند مضامین لکھے تھے۔ جن
میں لکھا تھا کہ جہاں قدرت نے خطۂ کشمیر کو خوب سے خوب تر مناظرِ فطرت سے آراستہ کرنے میں فیاضی سے کام لیا ہے، وہیں انسان نے افسرانِ حکومت کی بے پروائی
سبب وہاں کے باشندوں کو آرام اور خوشحالی سے محروم رکھا ہے۔ یہ مضامین ایسے دلچسپ تھے کہ اگر انہیں ڈھونڈ کر کتابی صورت میں شائع
کیا جائے تو بہت مفید اور دلچسپ ہوں۔ انگریزی تقریروں کے بعد میاں صاحب کی اُردو تقریروں کا شہرہ ہوا۔ مجھے پہلے معلوم نہ تھا کہ اُردو کتابوں
کا مطالعہ میاں صاحب نے بہت کیا ہے۔ کیونکہ اُن دنوں انگریزی خواں طبقہ کی توجہ اُردو کی طرف کم تھی۔ میاں صاحب سے جب ذرا اچھی واقفیت

[۵] اس مجلس کا نام محمڈن ینگ منز ایسوسی ایشن تھا۔

[illegible]

۱۶۰

چو سال فوت [illegible] - [illegible] المؤمن

۱۳۳۶ = [illegible]

[illegible]

لے میرا ہم تو نے سبھی



ہمایوں، جنوری ۱۹۴۲ء

کلامِ ہمایوں

ظالم ہے سنگدل ہے یہ تہذیب جس کو آج
تم سمجھے خاص رحمتِ پروردگار ہو
چاندی کا اس کا جسم ہے سونے کا اس کا دل
اِس تاک میں نگہ کہ گھر کا شکار ہو
کانوں پہ اِس کی آنکھ فلزّات پر نظر
دُھن ہے یہی کہ بھاپ ہو بجلی ہو تار ہو
تہذیب اور زمانے کی ہو جب کہ یہ روش
چشمِ کرم کا کیا کوئی امیدوار ہو

حضرتِ ہمایوں مرحوم

جون ۱۹۰۳ء

قولِ اصغر

کسی سے پوچھ دیکھو کہ زندگی میں تمہارا مقصد کیا ہے؟ تم یہ معلوم کر کے حیران ہو گی کہ کتنے ہی ہیں جن کا کوئی مقصد نہیں اور پھر دوسرے ہیں جو صرف آرام چاہتے ہیں اور جب ان کو بتایا جائے کہ تمہارا آرام ایک ایسی سوسائٹی میں جس کی بنیاد جبری عدمِ مساوات پر ہے ہمیشہ معصوم غریبوں کو تکلیف دے کر حاصل کیا جاتا ہے تو اُن کی آنکھیں حیرت سے کھُلی کی کھُلی رہ جائیں بس یا تو ایک اور تمدّن تعمیر کرو یا ایسے تمدّن میں رہو جہاں زندگی کے کوئی معنی ہیں نہ مقصد اور اگر کوئی مقصد ہے تو صرف اتنا کہ اُن لوگوں پر مسلسل ظلم ڈھائے جائیں جو بدقسمتی سے سوسائٹی کے نچلے طبقوں میں پیدا ہوئے۔ یہ ہے زندگی۔ یا اسے بدلو اور یا پھر اپنی پیدائش کے دن سے لے کر برابر جھوٹ میں پھولو پھلو۔ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ اپنی زندگیوں میں ہمیں ایک نئے دور کی اوّلین کرنوں کی جھلک بھی نظر نہ آئے گی تو میں یہی محسوس کروں کہ میں فقط بادل کا ایک ننھا سا ٹکڑا ہوں جو ہوا میں معلق ہے اور جسے صرف یہ انتظار ہے کہ اس طرح گمنامی کی گہرائیوں میں گر کر ناپید ہو جائے جیسے کوئی ایک قطرہ دوسرے بے حد و شمار قطروں کے ہجوم میں ممکن ہے یہ سب کچھ تخیّل کی آوارگی معلوم ہو لیکن کس قدر ناقابلِ برداشت ہے یہ بات کہ انسان زندگی کی دشوار گزار گھاٹی کو طے کر چکے اور پھر دیکھے کہ وہ کہیں بھی نہیں پہنچا!

انگلستان - ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۹ء بہن کی طرف خط

(ترجمہ از ب)

اصغر بشیر

فہرست مضامین

بابت ماہ جنوری [illegible]

جلد نمبر ۴۱ — نمبر ۱

تصاویر: [illegible]

نمبر	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
	کاروان ہمایوں	[illegible]	۲
	اول صفحہ	[illegible]	۲
	نعت، تاریخ وفات حضرت ہمایوں مرحوم	[illegible] اقبال	[illegible]
	بزم ہمایوں	شیخ سر عبدالقادر بی اے بیرسٹرایٹ لا	۳
	میں شاید دین کا رازدان	خان بہادر میاں عبدالعزیز ایم اے وزیر اعظم کپورتھلہ	۵
	بزم ہمایوں	بشیر احمد	۷
	جہان نما	.	۱۰
	چند دن سمندر کے کنارے	.	۷
	اے دل لے دل واپس آ (نظم)	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر جامعۂ عثمانیہ	۴۲
	[illegible] (افسانہ)	فلک پیما	۴۴
	اندھیر نگری (نظم)	حضرت شاد عارفی	۵۶
	نقطہ	جناب پنڈت برجموہن دتاتریا صاحب کیفی دہلوی	۵۸
	گوئٹے شعراء (نظم)	جناب حکیم الطاف احمد صاحب آزاد انصاری	۶۲
	ما رأیت شیئاً الا رأیت اللہ (نظم)	حضرت امجد حیدرآبادی	۶۳
	جام حقیقت (قطعات)	جناب پروفیسر محمد اکبر منیر صاحب ایم اے	۶۴
	جنون (ڈرامہ)	جناب پروفیسر سید فیاض محمود صاحب ایم اے	۶۵
	بیتی ہوئی یادیں (نظم)	حضرت ذوقی	۷۴
	وحشت (" ")	جناب شیخ محمد یوسف ظفر صاحب بی اے	۷۶
۱	دو دلچسپ خط	حضرت آزاد انصاری	۷۷
۲	بعد المشرقین (نظم)	جناب منشی شام موہن لال صاحب جگر بریلوی	۸۳
۲۱	رنگین برادری (" ")	جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی	۸۵
۲۲	پہاڑ کا جغرافیہ	حضرت جابر عجمی بی اے	۸۶
۲۳	تاثرات (قطعے)	جناب پیرزادہ احمد ندیم صاحب قاسمی بی اے	۸۸
۲۴	گیت	جناب سید مقبول حسین صاحب احمدپوری بی اے ایل ایل بی	۸۹
۲۵	لوک گیت	جناب دیوندر ستیارتھی صاحب	۹۰
۲۶	دو ہسپانوی گیت اور ایک چینی نظم	حامد علی خاں	۹۱
۲۷	محفل ادب		۹۲
۲۸	مطبوعات		۹۶

چندہ سالانہ [illegible]

جلد نمبر ۲۱
نمبر ۱

سالگرہ نمبر ۱۹۴۲ء

فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ جنوری ۱۹۴۲ء

تصاویر: (۱) مہذب جنگ کی تباہ کاریاں (سرورق) (۲) حضرت ہمایوں مرحوم (۳) عکس تحریر علامہ اقبال رح (۴) کراچی میں سمندر کا نظارہ (۵) کلفٹن کے سمندر کا کبوتر خانہ

چندہ سالانہ ۔ ششماہی (مع محصول)

سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء

یادگار ... آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم و مغفور

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں